خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماهنامه

جولائی 2015

نگران اعلیٰ

معراج رسول



انسانیت کے حال پر
ایک صاحب دانش کا نوحہ



سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و
شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے



ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات



چوروں کو پڑ گئے مور کے تناظر
میں ایک دلچسپ تحریر



اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی
شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر



لمبے ہاتھ رکھنے والے مجرموں
کی چھوٹی گردن کی پیمائش



عزت کے پاسبان کے
ہاتھوں ایک خونی واردات کا احوال



جھوٹی انا کی قیدی ایک حسینہ
کی عاقبت نا اندیشی کا عذاب

جلد45 • شمارہ07 جولائی2015 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021)
E-mail:jdpgroup@hotmail.com



آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ



اپنے گھر کے اندھیروں سے ڈر کر
سمندر پار روشنی پانے والوں کا قصہ



شیطان کی شرارتی چالوں کو
بے نقاب کرتی عبرت انگیز روداد



ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ محبت کی
عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دلربا سلسلہ



تنہائی کا عذاب جھیلنے والے
ایک شخص کی محبتوں کا اظہار



ولی باپ اور ولی بیٹے کے کشف و
کرامات کے سبق آموز واقعات



خطرات کے کھلاڑی
کی مہم جوئی کا لرزہ خیز انجام



منظور نظر کی نظروں میں رہنے
کے لیے ایک اندھے راستے کا زندہ ماجرا

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

دو سوال

ہم دیکھتے ہیں کہ چرندے، پرندے، درندے، گزندے، خزندے اور آبی جانور نہ ٹھٹھے لگاتے ہیں، نہ ہنستے ہیں اور نہ مسکراتے ہیں۔ بس انسان ہی ایسا جانور ہے جو مسکراتا ہے، ہنستا ہے اور ٹھٹھے لگاتا ہے۔

بات شاید یہ ہے کہ دوسرے جانور بے حس نہیں ہیں جو اس نامہربان دنیا میں مسکرائیں، ہنسیں اور ٹھٹھے لگائیں اور وہ بردبار بھی ہیں...... اور انسان بہت حساس کہلائے جانے کے باوجود بے حس ہے اور عاقل اور باشعور ہونے کے باوصف بردبار نہیں ہے۔ انسان نے لاکھوں برس میں جو ترقی کی ہے اس کی اصل وجہ اس کا صرف عاقل ہونا ہی نہیں ہے، بے حس ہونا بھی ہے۔ وہ کیسی کیسی قدریں انتہائی بے حسی اور بے رحمی کے ساتھ پامال کردیتا ہے اور ساتھ ہی ان قدروں کے قصیدے بھی پڑھتا ہے۔ وہ کیا کچھ نہیں کرگزرتا۔ کیسے کیسے جرم ظہور میں آتے نہیں دیکھتا اور سب کچھ بھول کر اپنے کاروبار میں لگ جاتا ہے۔ یاد رکھا جائے کہ جانور، قدریں پامال نہیں کرتے۔ ان کے ریوڑ، ان کے غول اپنے دشمن کے خلاف مہیب منصوبے نہیں بناتے۔ انسان نے اپنے بہت قصیدے کہے ہیں۔ اسے اپنی ہجو بھی سننی چاہیے۔ منطق نے اس عالی شان جانور کی چند تعریفیں کی ہیں۔ ان میں سے ایک ''حیوان ناطق'' ہے۔ دوسری ''حیوان ضاحک'' یعنی ہنسنے والا جاندار اور تیسری ''راست قامت'' جاندار۔

میرے خیال میں ان تعریفوں میں سب سے درست تعریف حیوان ضاحک ہے۔ اس لیے کہ وہ اس دنیا کو اپنے جرائم اور مظالم کے ذریعے جہنم بنا کر کوئی ندامت محسوس نہیں کرتا بلکہ اس پر مسکراتا، ہنستا اور ٹھٹھے لگاتا ہے۔ وہ اپنی نوع کے لوگوں کو نیست و نابود کر کے کس قدر فخر محسوس کرتا ہے۔ فتح کے جشن مناتا ہے۔ جانور اپنے حریف جانوروں کو ہلاک کر کے فتح کا جشن نہیں مناتے۔ یہاں انسان کی طرف سے جو بات کہی جائے گی وہ یہ ہے کہ انسان عقل اور شعور رکھتا ہے اور جانور عقل اور شعور سے محروم ہیں۔ ذرا سوچیے کہ یہ جواب کتنا معقول ہے یعنی انسان چونکہ عقل اور شعور رکھتا ہے اس لیے زمین پر تباہی پھیلاتا ہے۔ اپنی نوع کے افراد کا بڑی مہارت اور ہنرمندی کے ساتھ خون بہاتا ہے۔ قانون بناتا ہے اور خود ہی انہیں توڑ دیتا ہے۔ چونکہ وہ عاقل ہے، چونکہ وہ باشعور ہے۔

چشم بددور انسان اب لاکھوں برس کا ہوگیا ہے۔ اس کی عمر پینتیس لاکھ برس سے کیا کم ہوگی۔ شاید زیادہ ہی ہو۔ اس مدت میں اس نے عجیب عجیب کمالات دکھائے ہیں۔ ہم اس پر چوٹیں کرنے سے باز نہیں آئیں گے مگر یہ بات ماننی پڑے گی کہ دنیا اس کی عقل اور اس کے علم کے کرشموں کی دنیا ہے۔ توانا ترین جانوروں اور ڈائنوسارز کی دنیا نہیں ہے جن کے سامنے وہ پدا ہے۔ مگر جاننا یہ ہے کہ آخر یہ عالی شان پدا چاہتا کیا ہے۔ کیا وہ اپنی عقل اور اپنے علم کا حق ادا کررہا ہے؟ کیا وہ جتنی عقل رکھتا ہے اس میں اتنی ہی معقولیت بھی پائی جاتی ہے؟ کیا اس نے جتنا علم حاصل کیا ہے، اتنا ہی وہ انسانیت سے بھی بہرہ مند ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی ''سمجھ بوجھ'' اور اس کی ہنرمندی نے شمال، جنوب اور مشرق اور مغرب کے رہنے والوں کو ہراس اور ہول میں مبتلا کردیا ہے۔ اس کی عقل اور اس کے علم نے نہ اس کو معقولیت سکھائی اور نہ انسانیت۔ سوچنا یہ ہے کہ اگر عقل معقولیت کا سرچشمہ نہیں ہے تو پھر معقولیت کا سرچشمہ آخر کیا ہے؟ اور اگر علم انسانیت نہیں سکھاتا تو پھر انسانیت آخر کس طرح سیکھی جائے؟







آپ کے خط

عزیز قارئین کرام

السلام علیکم!

جولائی 2015ء کا شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ رمضان المبارک کی باسعادت گھڑیوں سے فیض یاب ہوتے ہوئے عید کے خوشگوار لمحات کا انتظار ہورہا ہے۔ بجٹ نے تو خیر آمد سے قبل ہی دھوم مچائی ہوئی تھی مگر...... آنے کے بعد تو گویا دھما کا ہی کر ڈالا۔ جس میں معصوم بچوں کے استعمال کی ضروری اشیاء پر بھی جتنی بے رحمی سے مہنگائی کی قینچی چلائی گئی ہے اس سے حکمرانوں کے دلوں میں موجود عوام کے ''درد'' کا خاص طور پر احساس ہوا ہے۔ جبکہ ایک اہم وزیر نے تو انٹرنیٹ کو کراچی کے لوگوں کے لیے مفت قرار دے کر اس بھوکے اور بے روزگار عوام پر شاید کوئی احسان فرمایا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں قومی یا مذہبی کوئی بھی تہوار ہو عوام کے لیے بجائے خوشی کے ایک آزمائش بن جاتا ہے۔ بالخصوص رمضان المبارک اور عید کی رونقوں کو مہنگائی اور بے بسی کا اژدھا نگل جاتا ہے۔ ایسے میں غیر مسلم ممالک کے قوانین، قواعد وضوابط پر رشک آتا ہے جہاں وہ اپنے مخصوص تہواروں پر ہر طبقے کو خوشی منانے کا پورا حق دیتے ہوئے مہنگائی اور بے جا منافع خوری کو خدا حافظ کہہ دیتے ہیں۔ چائلڈ لیبر کے خلاف بڑے بڑے دعوے کرنے والے ادارے اور بااختیار طبقے کے لوگ جن کے دسترخوانوں پر انواع واقسام کے پکوان ضرورت سے زیادہ ہوتے ہیں، وہ اس دکھ سے قطعی آگاہ نہیں ہوسکتے جو بچے قلم کتاب چھوڑ کر کارخانوں میں محنت مزدوری کر کے بھی روزہ افطار کا سامان گھر نہیں لے جاسکتے بلکہ صرف حسرت بھری نگاہیں اونچی دکانوں اور پھلوں سے بھرے ٹھیلوں پر ڈال کر خالی ہاتھ گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ کیا کوئی رستہ ایسا نہیں نکل سکتا کہ پورے سال نہ سہی سال کا یہ ایک مہینا ہی ان کے لیے کچھ بے فکری لے آئے! لوڈشیڈنگ نے تو پہلے ہی نہ صرف گھروں میں بلکہ ذہنوں میں بھی اندھیرے بڑھائے ہوئے تھے اب بجلی کے نرخوں میں مزید اضافہ کر کے شاید پتھروں کے دور میں واپس جانے کی تیاری کی جارہی ہے۔ ہمارے پالیسی ساز کہاں ہیں؟ پہلے روزگار کے مواقع تو فراہم کیجیے پھر چاہے مہنگائی کے سارے شوق پورے کرلیں...... یہ صورتِ حال دیکھ کر ایک رپورٹ کا متن دل میں پھانس چبھو گیا جس کے مطابق جب دنیا کے سب سے محفوظ اور خوش حال شہروں کا جائزہ لیا گیا تو جاپان کا شہر ٹوکیو اس کامیابی میں سبقت لے گیا جہاں ذرائع نقل وحمل، مواصلات میں سلامتی، نکاسی آب، قدرتی آفات سے نمٹنے کی صلاحیتیں، مہنگائی پر کنٹرول، صحت اور تعلیم کا معیار بلند، فضائی وزمینی آلودگی پر قابو اور بالخصوص جرائم کی شرح انتہائی کم اور قانون کی بالادستی، غرض شہریوں کو تمام بنیادی سہولتوں کی بہ آسانی دستیابی۔ سرکار کی جانب سے جب اتنی سہولتیں حاصل ہوں گی تو کیوں نہیں وہاں کی اقتصادی صورتِ حال ترقی کی جانب گامزن ہوگی۔ آج کل ہمارے یہاں بھی بلدیاتی الیکشن کا شہرہ ہے دیکھیں کیا نتائج نکلتے ہیں' ماحول اور مسائل پر کنٹرول کے لیے کیا اقدامات کیے جاتے ہیں۔ بہرحال کم جگہ اور محتاط الفاظ میں بس اتنی ہی بات کی جاسکتی ہے۔ مزید بوجھل باتوں سے بچتے بچاتے ہم چلتے ہیں اپنی پُربہار محفل کی جانب کہ جہاں رمضان المبارک اور عید کی خوشیاں لیے دوست حاضر ہیں۔

✠ **اعجاز احمد راحیل**، ماہی ضلع ساہیوال سے حاضر ہیں ''دکھ، درد، غم زندگی کا حصہ ہیں مگر عجب بات ہے کہ یہ ہمیشہ اپنے ہی دیتے ہیں پھر بانٹتے بھی اپنے ہیں۔ پچھلے دنوں طبیعت کافی ناساز ہوگئی۔ کچھ پرانے درد جاگ اٹھے تھے۔ مجھے اسپتال ایڈمٹ ہونا پڑا (ایسی کیا بات ہوگئی بھئی...... اللہ آپ کو صحتِ کاملہ دے) پھر جس طرح اپنوں نے درد بانٹا وہ قابلِ تحسین ہے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ ابھی محبتیں، چاہتیں ناپید نہیں ہوئیں۔ محبت کرنے والے ابھی بہت ہیں۔ میں طاہر جاوید مغل صاحب، ناصر ملک صاحب، عبدالرب بھٹی صاحب، سید شکیل حسین کاظمی صاحب، محمد اکبر نائچ، عمران ، ملک سعید، بھائی تفسیر عباس بابر، مرتضیٰ احتشام، قیصر اقبال لالہ، ماہتاب گل رانا، مہرین ناز اور ان تمام بھائیوں اور دوستوں کا تہ دل سے متشکر ہوں جنہوں نے اس مشکل گھڑی میں حوصلہ دیا، رابطے میں رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب سسپنس کی بدولت ہوا۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ پاک ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کو قائم ودائم رکھے۔ ماہ جون کا سندر سا سسپنس بروقت مل گیا۔ سرورق پر موجود حنائی ہاتھوں والی محبوبہ دلنواز مست نشیلی آنکھوں میں خوشگوار لمحوں کا عکس سجائے پوری آب وتاب سے جلوے دکھارہی تھی۔ ماہ جون ہمیں بہت پیارا لگتا ہے۔ بہت سی یادیں اس ماہ سے وابستہ ہیں۔ جون ایلیا صاحب کا انشائیہ ہمیشہ کی طرح عمدہ ولاجواب تھا۔ اداریہ میں ایڈیٹر نے بہت تلخ حقائق بیان کیے ہیں جو کہ ان کے گہرے مشاہدے کی عکاسی کرتے ہیں۔ اپنی نٹ کھٹ محفل میں اس دفعہ ہارون ہیرس بھائی نمبر لے گئے۔ ہارون بھائی میں نے ناصر ملک صاحب کو اسٹوری لکھنے کے لیے کہا تھا۔ جی رحمانی کا تبصرہ پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ سسپنس امریکا میں بھی پڑھنے والے موجود ہیں۔ اس دفعہ سب سے پہلے عبدالرب بھٹی صاحب کی سودائے جنوں پڑھی۔ اسٹوری کی تعریف کے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اتنی عمدہ اور خوب صورت تحریر بہت کم ہی پڑھنے کو ملتی ہے۔ یہودیوں کے مکروہ عزائم، مجاہدوں کے چٹانوں سے حوصلے، بھٹی صاحب کا تیکھا اندازِ بیاں واہ...... سودائے جنوں ہم سب قارئین کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب میرے لائف ٹائم فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کا رات کا مسافر اپنی راہوں پر گامزن ہے۔ ہر منزل پر نئی داستان رقم کرتا جارہا ہے۔ ہارون کا کردار کافی جاندار ہے۔



اسٹوری پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہم بغداد شریف کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ محی الدین نواب صاحب کی ماروی کے بارے میں کیا لکھیں بس توبہ ہے...... اسٹوری پڑھ کر اب تو شادی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ الیاس سیتا پوری کی شیطان پورے کا مرتد بہت بہترین لگی۔ کرامت علی کی محبت میں دیوانگی کوئی انوکھی بات نہیں ''محبتاں دے وچ کئی رانجھے رل گئے'' کرامت کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ گوہری کا یہ کہنا میں ایک پیشہ ور عورت ہوں کسی سے بھی مل سکتی ہوں۔ میں کسی کی منکوحہ بھی نہیں، مقام افسوس ہے۔ شاید کچھ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ملک صفدر حیات کی ڈائری سے غلط فہم پڑھنے کو ملی۔ اللہ پاک ہر چیز پر قادر ہے اور وہی مالک کل کائنات ہے۔ یہ نقلی پیر فقیر کسی کو کیا دے سکتے ہیں؟ ایسے ہوس کے مارے ڈبا پیر لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ مشتاق اپنی زندگی سے گیا۔ شاہ جی جیسے کردار ہمارے معاشرے کے ناسور ہوتے ہیں۔ حضرت رابعہ بصری کی داستان پرنور بہت عمدہ رہی۔ اللہ کے ولیوں کا اپنا مقام ہوتا ہے۔ حضرت رابعہ بصری کی کرامات پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ منظر امام کی جاں نثار غم حیات سے غم جدائی جھیلنا مشکل ہوتا ہے۔ پروانے ہمیشہ شمع پر جل مرتے ہیں۔ کاشف زبیر صاحب کی نقشِ قدم لاجواب رہی۔ ایشلی کی تقدیر نے خوب آزمائش کی مگر اس نے اپنی بقا کے لیے ہمت سے کام لیا۔ پرویز بلگرامی کی اسٹوری انتقام دل سے پڑھے جانے کے لائق تھی۔ محبت میں واقعی بہت طاقت ہوتی ہے۔ تنویر ریاض کی نعم البدل ذہانت کسی کی میراث نہیں یہ تو اللہ کی دین ہوتی ہے۔ میریل کی ذہانت نے ایک قاتل کو بے نقاب کر دیا۔ شارٹ کٹ از ایم افضل انجم گو کہ مختصر تھی مگر بہت سبق آموز ثابت ہوئی۔ انسان ہمیشہ شارٹ کٹ اختیار کر کے راتوں رات امیر ہونا چاہتا ہے۔ ریت کی دیوار محبت سے بغاوت کبھی نہیں ہو سکتی اس کی اپنی طاقت ہوتی ہے۔ یہ اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ اس کی راہ پر چلنے والے اپنی ہار گوارا نہیں کرتے۔''

✲ محمد صفدر معاویہ، ضلع خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں ''جون کا شمارہ 18 کو اپنے شہر خانیوال میں ملا۔ سرورق کو بہت ہی خوب صورت اور اعلیٰ طریقے اور ذوق سے سجایا گیا۔ کہانیوں کے ناموں کو بہترین ترتیب دی گئی۔ محترم جون ایلیا کے پاس پہنچے تو دانش مندانہ باتیں کرتے نظر آئے۔ آپ کا اداریہ پڑھا، اللہ حکمرانوں کو عقل دے اور وہ قوم کے لیے اچھا سوچیں۔ والدین سے التماس ہے کہ وہ بے شک بچوں کو ہر خوشی دیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وقت سے پہلے ایسی چیزیں ان کے مستقبل کے لیے بہت خطرناک ہیں۔ تبصروں میں آئے تو اپنے بھائی ایچ بیبرس کو کرسیِ صدارت پر بیٹھے بہت اعلیٰ ارفع اور عمدہ تبصرہ کرتے پایا۔ مبارک ہو۔ جی رحمانی اگر ناموں سے شخصیت سازی ہوتی تو کبھی بھی مسلم قوم میں فساد نہ ہوتے۔ مرزا طاہر الدین بیگ اچھا تبصرہ لے کر شریک محفل ہیں۔ محمد حنیف گبول بہت شکریہ، آپ کی ذرہ نوازی ہے اللہ پاک کی ذات تمام بے گناہ اسیران کو جلد سے جلد قید سے چھٹکارا عطا فرمائے۔ اگر محکمۂ پولیس ٹھیک ہو جائے تو کوئی بھی بے قصور قید نہ ہو۔ انجم فاروق ساحلی بھی ناراضگی کے باوجود محفل میں موجود تھے۔ نوال اینڈ مشال کو سسپنس میں ویلکم کرتے ہیں۔ یوسف سانول بھی تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد محفلِ رونق۔ اسد عباس بھی شربت فولاد پی رہے ہیں۔ ابرار وارث جو چیز انتظار کے بعد ملتی ہے اس کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ الیاس سیتا پوری شیطان پورے کا مرتد لے کر آئے۔ اکبر کا کردار پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ نے حکومت دی تو اس نے فرعون و نمرود بننے کی کوشش کی۔ میر سامان کرامت علی سے ایک ناچنے والی بہتر نکلی۔ بعد میں جب اس نے اسلام کو سچ مانا تو گردن اڑا دی گئی۔ کاش ہمارے پہلے حکمران مسلمان اگر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے اور محمدؐ کی سیرت اپناتے تو آج ہم ذلت میں گرے ہوئے نہ ہوتے۔ کاشف زبیر کی نقشِ قدم میں ایشلی نے بہت بہادری کے ساتھ فرینک کو پولیس کے پھندے میں پھنسایا۔ ساتھ میں جیون ساتھی بھی ڈھونڈ لیا۔ ایسی بہادری کو سلام۔ سودائے جنوں کیا دھماکا خیز قسط تھی جہاں پر مجاہدین نے جنرل فرناش کو واصل جہنم کیا تو وہیں اپنے بہترین مجاہدین سے بھی محروم ہونا پڑا۔ کوئی بات نہیں وہ شہادت پا گئے اللہ تعالیٰ اور ساتھی دے گا۔ لیلیٰ پھر آزمائش کے بعد آزمائش میں گھری ہوئی ہے۔ ملک صفدر حیات یعنی کہ میں خود غلط فہم لے کر آئے۔ ملک نے نہ صرف ڈبا پیر کو پکڑا بلکہ مشتاق کے قتل کا پتا چلایا اور زرینہ کی عزت بھی بچائی۔ تنویر ریاض کی نعم البدل بھی اچھی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن عمدہ اشعار سے مزین تھی۔ محمد حنیف گبول اور راحیل کا شعر بہت پسند آیا۔ ایم افضل انجم کی شارٹ کٹ طارق بھی ہماری طرح نوجوانوں کی طرح جلد از جلد پالینے کی ہوس میں پھنس گیا۔ بے چارہ انسان اگر سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رزق میری قسمت میں لکھا ہے، وہ تو ملنا ہی ملنا ہے اور اس سے زیادہ کسی کو مل نہیں سکتا۔ پاکستان آ کر ماروی غائب ہو گئی۔ رزاق شاہد کو ہلر ریت کی دیوار لے کر آئے۔ پروفیسر صاحب صفیہ کے ساتھ عشق میں ناکامی کا انتقام عدنان اور عاتکہ کو دور کر کے لینا چاہتے تھے۔ تسلیم و رضا کا پیکر ضیا تسنیم بلگرامی رابعہ بصریؒ کے حالات و واقعات لے کر آئے۔ پڑھ کر بہت کچھ جاننے کو ملا۔ منظر امام جاں نثار لے کر آئے۔ ایک پروانہ پھر موم بتی پر مر گیا۔ منظر امام کچھ سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کی رات کا مسافر کیا انداز تحریر ہے۔ مغل صاحب کی کہانی بہت ہی عمدہ ہے۔ اللہ ہارون اور ابراہیم کی مشکل دور کرے۔ کترنیں بھی بہت عمدہ تھیں۔ اس دفعہ ہر تحریر بہت اعلیٰ تھی۔''

✲ سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خاں سے چلے آ رہے ہیں ''سسپنس کی محفل میں یہ میرا پہلا خط ہے (خوش آمدید) اور میں نے یہ طاہر جاوید مغل کی کہانی کی وجہ سے پڑھنا شروع کیا۔ 20 کو تپتی دوپہر میں آخری پیپر دینے کے بعد سسپنس خریدا۔ سرورق کافی دلکش تھا۔ سائڈ گھڑ سوار اور حسینہ کی مہندی اور انداز دونوں اچھے لگے۔ وکٹری اسٹینڈ پر ایچ بیبرس تھے، مبارک ہو۔ اعجاز احمد راحیل بہت اچھا لگا۔ آپ سے فیس بک پر بات کر کے اور آپ کا تبصرہ بہترین تھا۔ جبیں سسٹرز، اسد عباس اور قدرت اللہ نیازی کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے رات کا مسافر پڑھی۔ مہرو اور ابراہیم کا عشق دیکھ کر آنکھیں بھر آئیں۔ ہارون کی منزل کیا ہے دیکھتے ہیں۔ سودائے جنوں اسرائیلی فوج اور فلسطینی مجاہدوں کے درمیان جنگ پر مبنی



کہانی اچھی لگی۔ ماروی تو سر سے گزر گئی۔ شیطان پورے کا مرتد تاریخ پر مبنی کہانی نے اچھا تاثر چھوڑا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔"

✠ **اشفاق شاہین، کراچی** سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "سسپنس ہر ماہ ہمیں بروقت مل جاتا ہے، مدتوں سے زیرِ مطالعہ ہے بس لکھنے میں اکثر کوتاہی ہو جاتی ہے۔ پھر سے شاملِ احوال ہیں اور اس کی بھی ایک وجہ ہے، خیر جون ایلیا کا انشائیہ "خاکے" بصیرت آموز تھا۔ اپنی محفل میں پہنچے جہاں انچ بہرس کرسیِ صدارت پر براجمان ہیں۔ قدرت نیازی اور سعدیہ بخاری کے خط بہترین ٹھہرے۔ محسن طالب ارم طالب سسپنس میں خوش آمدید کرتے ہیں، تبصرے کی طرف۔ الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانی سے معلومات میں حد درجہ اضافہ ہوا۔ کاشف زبیر نقش قدم میں چھا گئے۔ ویری گڈ۔ سودائے جنوں بھی ٹھیک ہی جا رہی ہے۔ پرویز بلگرامی نے انتقام میں خوب لکھا۔ ملک صفدر حیات ایک بار پھر ایک گھناؤنے چہرے کو بے نقاب کرتے بہت اچھے لگے۔ ماروی میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ ماروی کا ردِعمل مراد کے نکاح پہ، مزہ دے گیا۔ تنویر ریاض کا نعم البدل خوب تھا۔ شارٹ کٹ مزہ دے گیا اور آخر میں اس کہانی کا تذکرہ جس نے ہمیں لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے "رات کا مسافر" کیا لفاظی ہے، طاہر جاوید مغل کے قلم میں۔ زبردست سسپنس بھی خوب۔ اپنے قلم کے جادو میں جکڑ لیا ہمیں۔ بہت زبردست۔ محفل شعر و سخن میں انتخاب لاجواب تھا خصوصاً شازیہ ریحان اور مہرین ناز کا انتخاب۔"

✠ **شفقت محمود، سالٹ رینج کھیوڑہ** کا گزشتہ شمارے پر تبصرہ حاضر ہے "سسپنس اور جاسوسی سے جان پہچان بہت طویل عرصے سے ہے جبکہ خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کی ہے (خوش آمدید) مئی 2015ء کا رسالہ 2 تاریخ کو ہی لے لیا تھا کیونکہ ہمیں پتا چل گیا تھا کہ مغل صاحب نے ایک بے مثال اسٹوری کا آغاز کر دیا ہے۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا اور امید ہے رات کے مسافر long time چلے گی۔ لیکن پتا نہیں طاہر جاوید مغل صاحب جو کہ ہمیشہ اپنی اسٹوری کو غیر محسوس طریقے سے ملک سے منتقل کرتے تھے جس پہ خاص حیرانگی نہیں ہوتی تھی۔ ہمیں پتا بھی ہوتا تھا کہ وہ باہر ضرور جائیں گے لیکن اس دفعہ وہ پہلی ہی قسط میں ایران کی طرف اڑان بھر گئے ہیں جو کہ کافی حیران کن ہے۔ اس کے بعد سودائے جنوں پڑھی۔ بہت اچھی لگی۔ قسط میں خواہشات کے پورے ہونے کے دلچسپ واقعات بیان کیے گئے۔ جہالت مآب پڑھ کر یہ لگا کہ شاید جہالت مآب کبھی ہمارے ملک نہیں آئے۔ کرسی تو بقول شاعر چھٹتی نہیں یہ کافر منہ سے لگی ہوئی۔ کاشف زبیر صاحب کی ایفائے عہد میں میاں صاحب سے بہترین انتقام لیا گیا ہے اور شہ مات میں چور کی چالاکی بہت اعلیٰ قسم کی تھی۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

✠ **بشریٰ افضل، بہاولپور** سے مئی کے شمارے پر تبصرہ لے کر حاضر ہیں "سسپنس لیٹ ملا لیکن ٹائٹل گرل نے دل موہ لیا کیا اندازِ دلربائی کھنکتی چوڑیاں، گلے میں ڈبل چین کانوں میں نازک سے ٹاپس اور بالوں کا جوڑا بنائے اسٹائل دیتے ہوئے گہری سوچ میں غرق نظر آ رہی ہے۔ انشائیہ جون ایلیا مرحوم کا (دنگل) ایک سچی کہانی ان کی یاد مسلسل تازہ رہتی ہے اور ہمیں معلومات ملتی ہیں۔ آپ کے خط میں پہنچے۔ انکل کی حقیقت پر مبنی گفتگو سنی۔ درست فرمایا آپ نے خدا ہمارے ملک پر رحم کرے (آمین) بلقیس خان کو کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ مبارکاں۔ وسیم احمد خان آپ کیا کرتے ہیں اوروں کی تقلید! ہمارے تبصرے کو ردی کی ٹوکری نے نگل لیا ہم تو دکھوں کے مارے لوگ ہیں 3 ماہ پہلے 16 مارچ کو بہن نے دنیا چھوڑی تو 16 مئی کو بڑے بھائی بھی ہمیں تنہا چھوڑ کر دارِ فانی کوچ کر گئے۔ (اللہ آپ کے عزیزوں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے) ہمیں یہ غم بھولے نہیں بھولتا۔ دل چاہتا ہے میں بھی ان دونوں کے پاس چلی جاؤں۔ (اللہ آپ کو ہمت دے۔ ایسا نہیں سوچا کرتے) خونی رشتے بڑے ظالم ہوتے ہیں بھلائے نہیں بھولتے۔ باقی سسپنس نہ پڑھ سکی، صدمے نے مہلت نہ دی۔ سب ساتھی میرے لیے دعا کریں۔ ہاں جب میں دنیا سے جاؤں گی تو میری دوست رقیہ آپ کو اطلاع دے گی آپ یقین کر لینا، واحد وہی دوست ہے جو میرا ہمیشہ ساتھ دیتی ہے دکھ سکھ میں۔" (مایوسی کفر ہے۔ اللہ آپ کی دوستی ہمیشہ قائم رکھے)

✠ **زیب حسن، اچھرہ، لاہور** سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "18 مئی کی شام کافی سہانی لگ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لاہور کی رونقیں پوری آب و تاب پر تھیں اور آج میں بھی مستی میں جھومتا ہوا اچھرہ بازار کی طرف جا رہا تھا کیونکہ آج مجھے سو فیصد یقین تھا کہ سسپنس کا دیدار ہو ہی جائے گا اور آخر کار مجھے سسپنس مل ہی گیا۔ سرورق شاندار تھا۔ دیہاتی دوشیزہ مکمل دیہاتی روپ میں چوڑیاں، مہندی اور تعویذ پہنے، چہرے پر ہلکی مسکان سجائے کافی اچھے موڈ میں لگ رہی تھی جبکہ پس منظر میں موجود گھڑسوار کافی عجلت میں لگ رہا تھا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کے ہوتے ہوئے کچھ اور پڑھا جائے یہ ناممکن ہے۔ لہٰذا بڑی شدت سے گہری رات ہونے کا انتظار کرتا رہا کیونکہ میری عادت ہے کہ میں مغل صاحب کی تحریریں رات کو جب ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہو، تنہائی کے عالم میں پڑھتا ہوں...... آدھی رات کو جب ہر طرف تنہائی اور اداسی نے ڈیرا جمایا تو میں نے دودھ پتی کا کپ حلق سے اتارا۔ ماحول میرے مزاج کے مطابق ڈھل چکا تھا۔ خاموشیاں اندھیری رات کو لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ دور کسی گلی سے ہلکی ہلکی میوزک کی آواز "اے عشق ہمیں برباد نہ کر"...... ماحول کو فسوں خیز بنا رہی تھی اور پھر رات کے مسافر کی ہمنوائی میں وقت کیسے گزرا بالکل پتا ہی نہ چلا۔ اک عجب سا درد ہوتا ہے مغل صاحب کی تحریروں میں۔ بلاشبہ ان کی ہر تحریر لاجواب اور لازوال ہے محبت، درد، جدائی، غم، ملن یہی سب کچھ تو چاہیے تھا ہمیں اس داستان میں۔ پتا نہیں کیوں میں جب بھی مغل صاحب کی کوئی داستان پڑھتا ہوں میری عجیب سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ رات کا مسافر کے اگلے حصے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ مجھے انتہائی خوشی اور فخر ہے کہ میری خواہش اور التجا پر یہ داستان لکھی گئی جس کے لیے میں ادارے کا اور اپنے فیورٹ محبتوں کے سفیر محترم طاہر جاوید مغل صاحب کا بے حد شکر گزار



ہوں۔ ایچ بھرس کا تبصرہ پسند آیا، کرسیِ صدارت مبارک...... راحیل بھائی آپ واقعی خوش قسمت ہیں۔ ناصر ملک صاحب جیسے عظیم مصنف سے ملنا کوئی معمولی بات نہیں۔ ناصر ملک صاحب کافی عرصے سے نظر نہیں آ رہے۔ قدرت اللہ نیازی صاحب میں بہت خوش ہوں اور آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ آپ میرے پڑوسی شہر کے ہیں۔ میں تحصیل شورکوٹ کے گاؤں حویلی بہادر شاہ سے ہوں اور خانیوال شورکوٹ کے نزدیک ہی پڑتا ہے۔ ابرار وارث یار مجھے رات کا مسافر پر آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ باقی یارانِ محفل کے خطوط بھی اچھے تھے۔ شیطان پورے کا مرتد بہت دلچسپ داستان تھی۔ گوہری کا کردار زبردست تھا ایک شرمناک پیشے سے منسلک ہونے کے باوجود دین الٰہی سے اس کی نفرت قابلِ تعریف تھی۔ افسوس میر سامان نے جان دے دی۔ ملک صفدر حیات کی غلط فہم روایتی جعلی پیروں فقیروں کو بے نقاب کرتی سبق آموز تحریر تھی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عورتیں ان جعلی پیروں کے ہتھے آسانی سے چڑھ جاتی ہیں۔ ریت کی دیوار، انتقام اور شارٹ کٹ بھی بہت زبردست تحریریں تھیں، بے حد پسند آئیں۔“

☒ اویس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ”سرورق ذاکر صاحب کی ذہانت کا ثبوت تھا۔ اندر انشائیے میں آگاہی کے موتی چنے۔ علم و حکمت کے گویا خزینے بکھیر دیے ہوں۔ اداریے سے مستفید ہوئے ایچ بھرس کو سرفہرست آنے پر مبارک باد، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ رمضان پاشا صاحب نے شعر کا اتنا اثر لیا کہ دل میں سوراخ ہوگیا؟ قابلِ افسوس بات ہے۔ الیاس سیتاپوری کا شیطان پورے کا مرید پڑھ کر تاریخ کے جہرِ دکھوں سے روشناس ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں دلچسپی سے پڑھی جا رہی ہے اور کامیابی سے جاری اور ساری ہے۔ پرویز بلگرامی کی انتقام کافی پراثر اور عبرت انگیز تھی۔ اولاد کے لیے ماں باپ سدا بہار درخت کے مانند ہوتے ہیں جو اپنی اولاد کو ہمیشہ سکھ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے برخلاف ملک نظیر صرف اور صرف دولت کا پجاری تھا ایسے لوگ اپنے اسٹیٹس اور دولت کا حصول کس طریقے سے ہو صرف اس پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ نعم البدل بھی اچھی تھی۔ ایک بچی نے عزم و ہمت سے اتنا بڑا اسٹینڈ لیا۔ شعر و سخن میں معیاری اشعار نے مزہ دیا۔ اقوالِ زریں پر مبنی کترنوں نے بھی لطف دیا۔ شارٹ کٹ بھی بہت اچھی لگی۔ بلاشبہ دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو بغیر محنت اور جانفشانی کے شارٹ کٹ اختیار کر کے دولت اکٹھی کرنا چاہتے ہیں۔ ریت کی دیوار بھی ایک سبق آموز کہانی تھی۔ ارشد زمان محبت کے صحیح مفہوم سے نابلد تھا۔ محبت کا جذبہ تو یہ ہے کہ محبوب کو ہر خوشی اور ہر سکھ دے دو، خود تہی دست ہو کر بھی محبوب کی خوشی میں خوش رہو۔ رابعہ بصری کا بڑا مرتبہ ہے۔ ان کی عبادات، ان کی ریاضت، ان کا تقویٰ یہ اللہ والوں کا امتیاز ہے۔ منظر امام کی جاں نثار بھی اچھی تھی۔ طاہر جاوید مغل کی رات کا مسافر بہترین سلسلہ ہے۔“

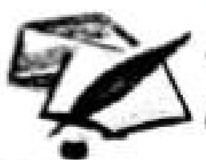
☒ محمد یوسف سانول، نور پور خوشاب سے شریک محفل ہیں ”سرورق حسین گوری لڑکی ہاتھ پر مہندی لگائے، گلے میں کالے دھاگے میں پرویا تعویذ محبت اور کلائی میں چوڑیاں اور آنکھوں میں شوخی لیے اس گھڑسوار کی منتظر لگ رہی جو دور نظر آتی حویلی سے اپنا گھوڑا دوڑاتے اس الھڑ مٹیار کی طرف آ رہا تھا۔ بہت اچھا لگا سرورق۔ پھر فہرست میں جا ٹھہرے۔ بہترین رائٹرز کے ناموں اور عمدہ عنوان سے بھری فہرست ملاحظہ کی۔ خاکے کے نام سے جون ایلیا صاحب فلسفہ حیات پر درس دیتے نظر آئے۔ بقول ایلیا صاحب کے یہاں تضاد ہی زندگی کا سب سے بڑا مقبول نظریہ ہے۔ اداریہ حسبِ سابق ایک تلخ سچ تھا۔ ایچ بھرس محفل کا وکٹری اسٹینڈ سنبھالے نظر آئے مسندِ صدارت پر مبارک باد۔ اعجاز راحیل، قدرت اللہ نیازی، محمد خان توحیدی کے زبردست تبصرے تھے۔ ابرار وارث صاحب آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ محمد صفدر معاویہ کو ننھی پری کی آمد مبارک ہو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے رات کا مسافر طاہر جاوید صاحب نے جو لکھا تو ایسا لگا کہ میں خود عبدالقادر جیلانی کے مزار کے پاس ہوں اور خود اس کہانی کا ایک کردار ہوں۔ اتنا وسیع تجربہ اور باریک بینی واقعی اللہ کی دین ہوتی ہے۔ بہت اچھی کہانی ہے اور پڑھنے کی جستجو ابھی موجود ہے اور اس کہانی کو ابھی طویل ہونا چاہیے۔ ماروی میں ماروی کی مراد سے لڑائی اور بلا بلی کی لڑائی مزہ آگیا۔ مراد اس بار تھوڑا سست نظر آیا اور محبوب ایکشن میں۔ اپنے اعتبار سے ماروی کا معیار اچھا جا رہا ہے۔ سودائے جنوں ملک کے سرفروشوں کی قربانیوں کی لازوال داستان نہتے فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم کا چشم کشا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب بڑی دلیری اور ہمت سے اسرائیل بھارت اور امریکا کے فریب اور دھوکے کو بیان کر رہے ہیں۔ اللہ تمام مجاہدین اسلام کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ شیطان پورے کا مرتد میں دین الٰہی اکبری دین کے بارے میں پڑھا اور افسوس ہوا کہ یہ بھی ہمارے مسلمان گزرے ہیں جن کی داستانیں ہمارے لیے شرم کا باعث ہیں۔ نقشِ قدم اچھی کہانی ہے ایشلی کی دلیری نے متاثر کیا اور فریک عین موقع پر دھوکا کھا گیا۔ انتقام ایک لاحاصل کہانی اور نہ سمجھ آنے والی کہانی تھی۔ غلط فہم ملک صفدر حیات ایک بار پھر ڈبا پیروں کا آپریشن کرتے نظر آئے۔ نعم البدل اچھی کہانی تھی اور واقعی میریل نے کمال کر دیا، قاتل کو بے نقاب کر کے۔ محفل شعر و سخن میں تمام گل پارے اچھے لگے۔ شارٹ کٹ واقعی شارٹ تھی۔ اب طارق صاحب کو شارٹ کٹ پر گزارہ کرنا پڑے گا۔ ریت کی دیوار شارٹ اسٹوریز میں ان کا مجموعہ تھی۔ بہت اچھی کہانی اور دل کو اداس کر گئی واقعی پروفیسر جیسے بزدل لوگ محبت کو بدنام کرتے ہیں۔ تسلیم و رضا کا پیکر رابعہ بصری کے بارے میں پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ جاں نثار منظر امام ایک بار پھر پرانا موضوع لے آئے۔ کترنیں اچھی تھیں۔ انکل جی شیش محل شروع کر کے کون سی کہانی ختم کرنے لگے ہو۔ ماروی یا سودائے جنوں؟ (یہ تو وقت ہی بتائے گا)“

☒ افتخار حسین اعوان، آزاد کشمیر سے تبصرہ کر رہے ہیں ”کافی عرصے بعد حاضری دے رہا ہوں۔ سوچا تھا کہ کبھی بھی اس محفل میں شرکت نہیں کروں گا (ارے ارے کیوں بھئی...... ایسی کیا بات ہوگئی؟) چند ناگزیر وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی چارہ نہ پاتے ہوئے حاضرِ خدمت ہوں۔

سرورق اس بار بالکل ہی متاثر کن نہیں تھا۔ بڑے بڑے بھدے، مہندی لگے ہاتھوں والی خاتون، گلے میں دھاگے سے بنا لاکٹ جیسے کسی بکری کے میمنے کے گلے سے اتار آگیا ہو پاکستان بننے سے پہلے کے کپڑوں کا ڈیزائن، ربڑ کی چوڑیاں اور کانوں میں کانٹے تو جیسے...... خیر جانے دیں لڑکیوں کی برائی کرنا بری بات ہے۔ جون ایلیا کے خاکے نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ خطوط کی محفل میں ہارون بھرس ٹاپ پر رہے۔ بھئی مبارکاں آپ کا تبصرہ جاندار تھا۔ ساتھ ہی اعجاز احمد راحیل تشریف فرما تھے جن کا درد بھرا تبصرہ اداس کرگیا۔ بھائی قدرت اللہ نیازی اور اکبر تارنج بھی اپنی جون میں نظر آئے۔ سعدیہ بخاری اٹک سے جاندار تبصرہ لے کر حاضر ہوئیں۔ ابتدائی صفحات ہمیشہ سے میرے فیورٹ رہے ہیں۔ تاریخ سے جنون کی حد تک عشق ہے۔ کبھی کبھی تو ڈرتا ہوں کہ یہ عشق کا عین ہی نہ ہوجائے۔ ماروی کو پچھلی کئی اقساط سے بہتر پایا۔ یہ قسط بہترین رہی۔ نواب صاحب نے ایک بات تو واضح کردی کہ عورت واقعی ایسی گتھی ہے جسے کوئی نہیں سلجھا سکتا۔ آخری لائنوں میں بلی (بشریٰ) اور بلے کی دلچسپ لڑائی لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی سودائے جنوں لاکھوں کروڑوں کہانیوں میں سے ایک ہے۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آزادی کے متوالوں اور سرفروشوں کی داستان ہمارے جذبوں کو مہمیز کرتی یہ کاوش سپر ہٹ رہی یہ قسط بھی، عابد کشمیری، لیلیٰ، زبیدہ، نائمہ کا کردار انتہائی پاورفل رہا۔ جذبۂ ایمانی صادق ہو تو مٹھی بھر مسلمان بھی دشمن کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔ ''بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی'' شاید انہی کے لیے کہا گیا ہے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت۔''

☸ رمضان پاشا گلشن اقبال کراچی سے لکھ رہے ہیں ''ماہ جون 2015ء کے سسپنس کا گیٹ اپ بہت عمدہ تھا۔ خالص مشرقی لڑکی بلکہ پکی پاکستانی دوشیزہ اور پس منظر میں ایک مجاہد گھوڑے پر سرپٹ دوڑا چلا آرہا ہے۔ فہرست کی ترتیب سادہ تھی پھر بھی اچھی لگ رہی تھی۔ انشائیہ حسبِ معمول کڑوا سچ تھا۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے ایرانی بھائی ایچ بھرس صاحب کو مبارک باد۔ موصوف کا تبصرہ قابل ستائش تھا۔ بھرس بھائی آپ کو میرا مختصر تبصرہ پسند آیا شکریہ۔ محمد اکبر تارنج آپ کو میرا شعر اچھا لگا، شکریہ۔ سودائے جنوں پر تبصرہ کرتے کرتے الفاظ ہی ختم ہوگئے۔ اب تو لغت میں بھی کچھ نہیں بچا پھر بھی اتنا لکھوں گا کہ جب سے سسپنس کا اجرا ہوا ہے تب سے اب تک اتنی اچھی کہانی نہیں چھپی اور ماروی تو ہے ہی پھڑ پھڑاتی کہانی۔ انتقام بہت ہی اچھی تھی۔ نقش قدم کہانی تو بہت ہی تھیلی کٹیلی تھی۔ انجام بھی ایسے ہی ہوتا تو لطف دوبالا ہوجاتا۔ نعم البدل میں مزہ نہیں آیا۔ غلط فہم ملک صفدر حیات نے اپنی جانفشانی سے ڈبا پیر کا قلع قمع کر ہی ڈالا۔ شارٹ کٹ بہت پسند آئی۔ دلہن کی ٹانگیں نہ ہونے پر طارق کو غم زدہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ریت کی دیوار نے دل و دماغ میں زبردست تہلکہ مچادیا۔ نئے قلم کار کو داد نہ دینا بدذوقی کے زمرے میں آتا ہے۔ کہانی جاں نثار پسند نہیں آئی۔ رات کا مسافر زیرِ مطالعہ ہے۔ اشعار کی محفل میں شازیہ ریحان کے شعر نے دل میں گہرا سوراخ کردیا۔ رضوان تنولی کا شعر بھی دل پر چیرا لگانے والا تھا۔ مرزا طاہر الدین بیگ کا شعر بھی من پسند تھا۔''

☸ محمد قدرت اللہ نیازی، خانیوال سے تبصرہ کررہے ہیں ''جون 2015ء کا شمارہ مئی کی ایک تپتی دوپہر کو دستیاب ہوا۔ سرورق پر موجود خاتون بھی گرمی کے زیرِ اثر نظر آئیں، انگلیاں غیر معمولی طور پر موٹی نظر آئیں۔ پس منظر میں گھوڑے پر سوار شخص تاریخی کہانی کا کردار لگا۔ جون ایلیا کے انشائیہ کے مطابق ہم صرف ایک دنیادار قوم ہیں اور دنیادار قوم میں ترقی نہیں کرسکتیں۔ ترقی کے لیے ایک درویشانہ طرزِ فکر ضروری ہے۔ اداریہ میں جہاں دیگر مسائل کا بیان ہے، وہاں ایک تلخ حقیقت کی طرف بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ جدیدیت کے نام پر ہم نے نئی نسل کو خطرناک آلات کے حوالے کردیا ہے۔ موبائل، انٹرنیٹ وغیرہ نے ہمارے اخلاق و کردار کا بیڑہ غرق کردیا ہے۔ بچے جوان ہونے سے پہلے ہی بوڑھے ہوجاتے ہیں اللہ ہمیں اپنی ذمے داریاں احسن طریقے سے نبھانے کی توفیق دے آمین۔ ایچ بھرس مردان کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ تبصرہ بہت پرمغز تھا اور جن رائٹرز کی تحریر کا آپ کو انتظار ہے اکثر قارئین ان کی تحریر کے منتظر ہیں۔ جہاں تک جھگڑے کا تعلق ہے تو یہ شادی شدہ زندگی کا حسن ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس میں انا کا آسیب شامل نہ ہو۔ اعجاز احمد راحیل کہانیوں سے زیادہ تبصرہ آپ نے رائٹرز پر کر رکھا ہے۔ آپ نے ان سے ملاقات کرلی اب ہمیں جلانا چھوڑ دیں۔ جی رحمانی اور حنیف کبول ویلکم ٹو سسپنس فیملی۔ جی بیٹا، آپ کی رفتار بہت سست ہے۔ طاہر الدین بیگ، جیسی سسٹرز اور دیگر احباب جنھوں نے تبصرے کی پسندیدگی کا اظہار کیا ان سب کا ممنون ہوں۔ سعدیہ بخاری آپ بھی خوش ہوں گی کہ سب سے طویل تبصرہ آپ کا رہا۔ محمد یوسف سانول اتنا حیران نہ ہوں بزرگوں کا حق بھی تو بنتا ہے نا۔ بشریٰ افضل کو مبارک باد دیں بس۔ ابرار وارث آپ کی کامیابی کے لیے دعاگو ہیں۔ محمد صفدر معاویہ رحمت مبارک ہو۔ ادریس احمد خان جو جھلک دکھا کر غائب ہوں انتظار بھی تو انہی کا رہتا ہے۔ سب سے پہلے مغل اعظم کی رات کا مسافر پڑھی۔ صبح و شام اور ہر منظر کا ایسا بیاں کہ آدمی سحرزدہ ہوجاتا ہے۔ ہارون کی اس دربدری کا سبب کوئی قدیم عہد بتایا جارہا ہے۔ ایک بات کہ ابوسیاف ایک بزرگ کے مزار کے خادم اعلیٰ ہیں۔ انہیں چاہیے تھا کہ ہارون کو اس غیر قانونی طریقے سے باہر جانے سے منع کرنا چاہیے تھا نہ کہ اجازت دینی چاہیے تھی۔ ابراہیم اور ہارون سمیت کویت جانے کے طلب گار مشکل میں نظر آرہے ہیں۔ کمال رشید اینڈ کمپنی کی نیت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ملک صفدر حیات کی غلط فہم میں زرینہ کو حاصل کرنے کے لیے ڈبا شاہ نے مشتاق کو زندگی سے ہی محروم کردیا۔ ملک صاحب ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اصل مجرم کو چھاپنے میں کامیاب ہوگئے۔ ایم افضل انجم کی شارٹ کٹ میں فرحت درانی اپنی تمام تر امارت اور امریکا سیٹل ہونے کے باوجود شاداب کے لیے مصنوعی ٹانگوں کا بندوبست نہ کرسکا جس پر حیرت ہے۔ مصنف نے لاٹری کے شوقین افراد کی نفسیات بہت بہترین انداز میں بیان کی۔ ایک مختصر تحریر انتقام پرویز بلگرامی کی تحریر کردہ پڑھی۔ مصنف کا ضیا تسنیم بلگرامی سے کیا رشتہ ہے؟ ضیا تسنیم بلگرامی نے رابعہ بصری کے حالاتِ زندگی سے واقفیت میں اضافہ کیا۔ رزاق شاہد کی ریت کی دیوار میں ارشد زمان کی محبت ریت کی دیوار ہی ثابت ہوئی۔ غیر جانب داری سے کہا جائے



تو ارشد ایک تنہا جوان کسی طرح بھی جاگیرداروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اگر وہ خوف زدہ تھا تو ٹھیک ہی تھا۔ صفیہ کی دلیری نے متاثر کیا۔ سودائے جنوں میں ڈاکٹر صاحب آزادی کے متوالوں کو اس طرح برسرپیکار دکھا رہے ہیں کہ ہم بھی خود کو ان کے ساتھ پاتے ہیں۔ ماروی ابھی نہیں پڑھی۔ ایم عمران قاسم اور مشال کا انتخاب محفل میں بہترین رہا۔"

✲ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے لکھ رہے ہیں "تبصرہ کرنا بھی ایک آرٹ ہے۔ سسپنس میں لکھنے والے اس آرٹ سے بخوبی واقف ہیں۔ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ اب دیکھیے ایچ بہرس صاحب نے کیا خوب لکھا ہے کہ اول نمبر پر ہیں ابرار وارث صاحب، کنول ناگرہ (مختصر) سعدیہ بخاری نے خوب تبصرہ کیا۔ تاریخ کے جھروکوں سے شیطان پورے کا مرتد اکبری دور کی ایک عبرت ناک کہانی۔ الیاس سیتاپوری ایک بڑا نام ہے اس لیے تحریر بھی زبردست ہوتی ہے۔ رات کا مسافر ابھی جاری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ رات کے مسافر کی صبح کب ہوتی ہے اور کتنی قسطوں کے بعد ہوتی ہے۔ اچھی اور سسپنس سے بھرپور تحریر ہے۔ منظر صاحب جاں نثار خوب لکھا اس لیے بے حد پسند بھی آیا مجنوں جان لینے نہیں جان دینے آیا تھا۔ منظر صاحب بہت خوب زبردست تحریر رہی۔ محبت اور اس میں ناکامی اور پھر محبت سے نفرت، یہی نفرت باپ کو بیٹی کے سامنے لے کر آگئی اور پھر آمنا سامنا۔ ایک ماں کے ہوتے ہوئے کوئی بیٹے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ بہت اثر انگیز اور رومان پرور کہانی مگر انجام بڑا ہی درد ناک۔ بہت شاندار تحریر۔ ایسی ہی اثر انگیز تحریر سسپنس کا حسن بڑھاتی ہیں پھر شارٹ کٹ اور امریکا یاترا طارق میاں جب حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بہت اچھی معاشرتی کہانی۔ غلط فہم ملک صفدر حیات کا ایک اور کارنامہ۔ ایسے نہ جانے کتنے شاہ جی اب بھی ہیں مگر دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہے۔"

✲ بلقیس خان، واہ کینٹ سے حاضر ہوئی ہیں "سرورق پر سونے کی تو تیتری والی خانہ بدوش قبول صورت تھی پس منظر میں تھکا ماندہ گھڑسوار۔ جون ایلیا کا ہر جملہ اقوال زریں میں شمار ہوتا ہے۔ ہمیں جو بھایا وہ یہ ہے "ہاں سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے دور کی سماجی، تہذیبی اور فطری سطح سے بہت نیچے کھڑے ہیں۔" محفل میں ہارون بہرس کا طوطی بول رہا تھا۔ تبصرہ طویل بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ یہ نہیں بتایا کہ ہمارے شہر میں کیا کر رہے ہو؟ کسی کی یادوں اور باتوں میں کھو کر ہمیشہ کی طرح دل کو لگنے والا تبصرہ تھا اعجاز احمد راحیل کا۔ اگرچہ ہمارا ذکر نہیں تھا۔ گزشتہ سے پیوستہ یعنی گزری کہانیوں پر خوب صورت جملے اچھے لگے۔ رضوان تنولی آپ تو کچے ضدی نکلے مجھے وش نہیں کیا۔ سعدیہ بخاری بڑے عرصے کے بعد فل فارم میں نظر آئیں۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ سعدیہ اور تھیں یہ سعدیہ اور ہے۔ شاباش اسی طرح آؤ اور خوب سناؤ۔ نوال، مشال، میری چھوٹی سی گڑیا جب میں آپ جتنی تھی تو اکثر دوستوں کو یہ مصرع لکھ کر بھیجتی تھی...... شرکتِ غم بھی چاہتی نہیں غیرت میری، تب میں لفظ غم کے معانی اور مفہوم سے نا آشنا تھی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ کہانیوں کی ابتدا سودائے جنوں سے کی۔ اسٹوری کا آغاز عابد شکمری اور نائمہ سے ہوا تھا اور اب وہی بے رحم موت کے خونی شکنجے میں جس کرب سے گزر رہے ہیں اسی اذیت میں خود کو گھرا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کسی ہندو نصرانی اور یہودی سے ہماری دشمنی نہ ہوتی اگر ہمارے درمیان جنرل واحدی اور ابن قصی جیسے سازشی، خودغرض اور بے ضمیر لوگ نہ ہوتے۔ تاریخی حقائق اور سچائی سے روشناس کرانے والے الیاس سیتاپوری کی شیطان پورے کا مرتد پڑھ کر بس دق رہ گئی۔ نمرود شداد اور فرعون تو مفت میں بدنام ہوئے پھر بھی اللہ پاک نے بادشاہ اور اس کے چیلوں کی رسی اتنی دراز رکھی۔ تسلیم ورضا کا پیکر، ایمان افروز تحریر تھی۔ پاک دامن رابعہ بصری کے متعلق معلومات تشنہ تھیں اس سے پہلے ضیا تسنیم بلگرامی نے سیراب کیا۔ آخری صفحات پر اپنے پیارے قلم کار طاہر جاوید مغل کی تحریر رات کا مسافر کی پہلی قسط تو سر سے گزر گئی تھی جیسے پی آئی کا طیارہ گزرتا ہے۔ اگر کچھ یاد رہا تو بدبودار بس کے مسافر اور مہرو کی تحفی لیکن دوسری قسط میں طاہر بھائی نے دردمند دل اور قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ ہارون کی حیثیت تو راوی جیسی لگتی ہے۔ اصل کردار ابراہیم اور فرح لگتے ہیں بظاہر۔ کمال رشید جیسے لوگ مر کیوں نہیں جاتے۔ طاغوتی قوتوں کے یہ پیروکار ہر جگہ پورے قد کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ ملک صفدر حیات کی تحریر غلط فہم میں شاہ جی کا کردار شرم ناک تھا۔ زرینہ برابر کی مجرم تھی مگر اس کو چھوٹ دے دی گئی۔ ریت کی دیوار کا پروفیسر تو چودھریوں کے جبر کا شکار مظلوم شخص تھا۔ جانے کیوں اسے تحقیر کا نشانہ بنایا گیا اور کم ہمت سمجھا گیا۔ محبت میں باز و تڑوا بیٹھا تھا اور کیا کرتا۔"

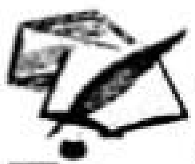
✲ سعدیہ بخاری، اٹک سے محفل میں شریک ہوئی ہیں "19 مئی کی چلچلاتی دھوپ اور گرمی میں سسپنس کا دیدار ہوا۔ اس جان لیوا گرمی کے موسم میں شربتی آنکھوں والی حسینہ کو سرورق پر بٹھا کے ڈاکٹر انکل نے آنکھوں کی ٹھنڈک دل کا قرار شربت روح افزا کا سامان کر دیا پس منظر میں گھوڑے والے انکل کو پینٹ کر کے صنفِ مخالف کی تاریخی حیثیت برقرار رکھی گئی۔ انشائیہ میں اتنی دانشمندانہ باتوں کو اپنے ٹھنڈے شمار روح افزا جیسے ذہن کے لیے بادِ سموم سمجھ کر نظر انداز کیا اور محفل خطوط کی طرف دوڑ لگائی جہاں ایڈیٹر کئی دلدوز اور جان لیوا قسم کی خبروں کی رپورٹنگ کرتے پائی گئیں جنہیں ہم ہمیشہ بھولے ہوتے ہیں آہ...... ایڈیٹر سے قارئین کو خوش دیکھا نہیں جاتا۔ رمضان المبارک، مہنگائی اور سیاست دانوں، حکمرانوں، ذخیرہ اندوزوں، منافع خوروں کی وہی ازلی بے حسی اور لالچ...... تبصروں میں پہلے نمبر پر سرورق کی حسینہ کی نشیلی آنکھوں سے گھائل شدہ بے ہوش ہارون بہرس براجمان ہیں۔ بھائی صاحب اس گرمی میں ایسی مہ جبیں کو دیکھیں گے وہ بھی اکلوتی آنکھ سے تو



نتیجہ بھی برآمد ہوگا۔ آپ کا تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس ماہ صنفِ نازک کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ ایڈیٹر سے ہمیں ایسی طوطا چشمی کی امید ہرگز نہیں تھی۔ پہلا تبصرہ اور ہمارا تبصرہ سب سے زیادہ تھا، یہ واحد خوشی ہے جس پر میں بقیہ شکوے نظرانداز کیے دیتی ہوں۔ رات کا مسافر سے ابتدا کی۔ ہارون کا سفر آگے ہی آگے کی جانب جاری ہے۔ بقول قارئین کے اس بار مغل انکل نے ہیرو کو شادی شدہ رکھا ہے لیکن کہانی کے انداز سے لگتا ہے ہارون لوٹ کر اپنے گھر ہی آئے گا جہاں اس کی دلہن اسی طرح اس کے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔ غلط فہم میں ملک صفدر حیات خاصا سنسنی خیز کیس لائے۔ یہ ڈبا قسم کے جعلی پیر فقیر اس دور میں بھی ایسے گل کھلاتے تھے لیکن موجودہ دور میں جب تعلیم اور دیگر ذرائع رسل ورسائل عام ہیں لوگ توہمات اور ایسے فراڈی پیروں عاملوں کے چکر میں گوڈے گوڈے ڈوبے ہوئے ہیں۔ سودائے جنوں صیہونی مکاریوں اور ان کے جدید ترین ہتھیاروں اور وسائل کے سامنے پی ایل او اور غضب خدا کے جانباز اپنے محدود وسائل لیکن آہنی عزم کے ساتھ سینہ سپر ہیں۔ کہانی میں ایکشن کچھ زیادہ ہی دکھایا گیا جس سے واقعات کچھ غیر حقیقی لگنے لگے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں تسلیم ورضا کا پیکر رابعہ بصری کی کرامات ومشاہدات پر مبنی تحریر پہلی بار پڑھی۔ اس سے قبل صرف ان کے نام سے واقفیت تھی۔ اللہ اپنی رحمت سے جن بزرگانِ دین کو بزرگی اور علمیت عطا کرتا ہے انہیں صبر اور بڑا دل بھی عطا کرتا ہے۔ مختصر کہانیوں میں اچھی کلیکشن پڑھنے کو ملی۔ کاشف زبیر منفرد مترجم کہانی نقشِ قدم کے ساتھ حاضر تھے۔ ایشلی جانسن اور قاتل فرینک کی آنکھ مچولی خاصی سنسنی خیز رہی۔ فرینک ایشلی کے پیچھے تھا اور حقیقی ملک الموت فرینک کے پیچھے پیچھے...... انتقام میں یہ بات عقل سے ماورا ہے کہ ایک مظلوم لڑکی ایک ہی خاندان کے تمام افراد سے وقتاً فوقتاً ٹکرائی اور مرنے کے بعد سب سے ایک ساتھ انتقام لے لیا۔ سب سے بہترین کہانی لگی تنویر ریاض کی قعر البدل۔ میریل کی ہمت اور بہادری نے بڑی عقل مندی سے چور کو بے نقاب کیا۔ ریت کی دیوار کارزارِ محبت میں پاؤں رکھنے والے ایک کم ہمت شخص کا قصہ۔ پروفیسر ارشد زمان کی بزدلی اور اپنی محبت کو یوں بیچ منجدھار میں چھوڑ دینا افسوس ناک پہلو محبت کا جبکہ چودھری عدنان کا اپنی محبت حاصل کرنے کے لیے ڈٹ جانا اچھا لگا۔ محبت کم ہمت لوگوں کے بس کا روگ نہیں۔ منظر امام حسب سابق ایک حساس موضوع کو ہلکے پھلکے انداز میں لائے۔ کہانی کا اینڈ دکھی کر گیا۔ محفل شعروسخن میں ڈاکٹر ساجد محبوب شیخ کا انتخاب پسند آیا، دیگر اشعار بھی اچھے تھے۔''

٭ رضوان تنولی کریڑوی، کراچی سے محفل کی زینت بن رہے ہیں ''ماضی کے جھروکوں سے جھلملاتا تبصرہ...... تندرست وتوانا معراج رسول اپنے برادر مرحوم اعجاز رسول کی سنگت میں جلوہ افروز ہوا کرتے تھے۔ عظیم تبصرہ نگاروں نے محفل کو فرش سے عرش تک پہنچایا ہوا تھا ماسٹر تبصرہ نگار یونس خان روغانی سے متاثر ہو کر 1998ء میں جب میرا پہلا تبصرہ شائع ہوا تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ادارہ سے ہمیں بہن جیسی شفیق ومہربان افسانہ نگار یمنیٰ احمد ملے گی۔ سسپنس کے چوٹی کے قلم کار اقلیم علیم، احمد اقبال، طاہر جاوید مغل، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، ناصر ملک سے گفتگو کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔ سرورق کی بجی سجائی صنفِ نازک کے حنائی دست، غزال آنکھوں کے کیا کہنے...... پس منظر میں مغلیہ دور کا گھڑ سوار ہمیں سالگرہ کی وش کے بجائے خاتون کا پیچھا کرتا معلوم ہوا۔ ارے ہمیں بھی تلوار لادو۔ پہلوان سوار کے ارادے خطرناک نظر آتے ہیں۔ جون ایلیا نے خاکے میں دل موہ لیا۔ اداریہ میں ماہ صیام کی عبادت اور رحمتوں کی دعا جزاک اللہ خواجہ مدنی اللہ پاک آپ کے بھائی کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ فردوس بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ الیاس سیتاپوری کی شیطان پورے کا مرتد کا تبصرہ پہلے جلال الدین اکبر کی مت ماری گئی تھی جو دین الٰہی ایجاد کر بیٹھا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے بڑے نام تک گمراہ ہوگئے۔ سوائے افسوس کے کیا کہا جائے؟ صرف اتنا کہوں گا جن کے آنگن میں امیری کا شجر لگتا ہے، ان کا ہر عیب زمانے کو ہنر لگتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی منفرد ونایاب سودائے جنوں، ڈاکٹر جی کے عمدہ الفاظ کا چناؤ، بہترین پلاٹ، شاہکار داستان۔ ملک صفدر حیات کی غلط فہم دل پر گہرا چرکا لگا گئی۔ تنویر ریاض کی قعر البدل میں بچی کی بہادری اچھی رہی۔ محی الدین نواب کی ماروی دلچسپ موڑ پر آپہنچی ہے۔ ماروی کا مراد، نامراد سے متنفر ہونا بہت اچھی علامت ہے۔ تسلیم ورضا کا پیکر ضیا تسنیم بلگرامی دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی عمدہ تحریر...... پیر لچھیال کی نگری کی سیر کروائی اپنے محبوب طاہر جاوید مغل نے، میرے غوث پیا کے در سے دستگیری عاشقوں کو ملتی رہتی ہے۔ محفل شعروسخن میں توصیف احمد، حاجراں ہاشمی، جبیس سسٹر کا انتخاب عمدہ رہا۔''

٭ طالب حسین طلحہ تحصیل حاصل پور منڈی سے تبصرہ کررہے ہیں ''جون کا شمارہ 18 تاریخ کو جیل سے رہائی کے بعد آزاد فضاؤں میں ملا۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھنے کے بعد آپ کی بجٹ اور مہنگائی کے بارے میں فکر انگیز تحریر پڑھنے کو ملی۔ کیا یہ مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ ہمارا مقدر رہے۔ لوگ امیر سے امیر اور غریب سے غریب ہورہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حکمرانوں کے دل نرم کردے، آمین۔ محفلِ یاراں میں صدارت کی کرسی پر اینج صبرس کو پایا جبکہ دیگر تبصروں میں حنیف گبول (اللہ تعالیٰ ان کو جلد رہائی دے، آمین) جی رحمانی صاحب دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ سعدیہ بخاری صاحبہ شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ نوال اینڈ مشال اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ آپ کی دعاؤں کی بدولت جیل سے رہائی ہوئی۔ انعم ریاض، بلقیس خان، احمد خان توحیدی، صفدر معاویہ صاحب کا بھی شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے آمین۔ محفل شعروسخن میں محمد حنیف گبول، رانا سجاد اختر، مہرین ناز، شازیہ ریحان، نوال اینڈ مشال کے شعر پسند آئے۔ کترنیں اس دفعہ کم تھیں۔ فلسطینی مجاہدین کی سودائے جنوں بہتر رہی۔ رابعہ بصری کی کرامات و مشاہدات پر مبنی تحریر تسلیم ورضا کا پیکر پڑھنے سے دل کو سکون ملا۔ ماروی پہلے سے بہتر جارہی ہے۔ شیطان پورے کا مرتد ابھی تھوڑی سی پڑھی ہے۔ بس اتنا پڑھ پایا ہوں۔''



⊛ زبیر حسین شیخ، ڈیرہ مراد جمالی سے محفل میں حاضر ہیں "مئی کی تپتی دھوپ میں جون کا شمارہ حسبِ معمول 20 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی نازک اندام حسینہ ہاتھوں میں مہندی لگائے، آنکھوں میں شرارت چھپائے اور ہونٹوں پر معصومیت بھری مسکان سجائے نئی نویلی دلہن کے روپ میں بہت بھلی لگی۔ گھوڑے پر موجود صنف وجاہت شاید اسی کے خوابوں کا شہزادہ جو اتنی بے چینی اور بے قراری سے اپنی محبت اپنی شہزادی کی جانب محوِ سفر تھا۔ اشتہارات اور فہرست کو پھلانگتے ہوئے جون صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جون ایلیا پر کیا تبصرہ کریں سمجھ نہیں آتا۔ صدارت ملنے پر انچ بیرس کو مبارک باد۔ پیشِ نظر تبصروں میں سب تبصرے کافی حد تک اچھے تھے لیکن رضوان تنولی کا تبصرہ کافی پسند آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے محبت کے شہنشاہ طاہر جاوید مغل کی رات کا مسافر پڑھی۔ کافی اچھی جارہی ہے۔ ان کا ہر ناول بہت اچھا بہترین، لازوال ہوتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں بھی پڑھی جو بہت دلچسپی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ ماروی کی اس قسط کے بعد لگتا ہے کہ ماروی کا اینڈ ہوگا۔ نواب صاحب پہلے کی تحریروں جیسی تحریریں نہیں لکھ رہے۔ ملک صفدر حیات کی ڈائری سے لی گئی تحریر بھی کافی اچھی تھی بس جیسے بھی کر کے مجرم کو تو پکڑنا ہوتا ہے۔ شیش محل کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اسما قادری بھی بہت اچھی رائٹر ہیں امید ہے ان کا ناول شیش محل کافی اچھا ہوگا۔ محفل شعروسخن میں رضوان تنولی کا شعر ٹاپ پر تھا۔ کافی اچھا اور بہترین لگا۔ کترنیں بھی کافی اچھی تھیں، اس مرتبہ باقی شمارہ زیرِ مطالعہ ہے یہ میرا پہلا خط ہے۔" (خوش آمدید)

⊛ رابعہ ناصر فیصل آباد سے تبصرہ کررہی ہیں "جناب محی الدین نواب صاحب سمجھ میں نہیں آتا کہ خط کہاں سے شروع کروں۔ میں گیارہ بارہ سال کی عمر سے آپ کی کہانیاں پڑھ رہی ہوں۔ ہمارے گھر میں سسپنس، جاسوسی ڈائجسٹ آتے تھے۔ ہم سب بہن بھائی آپ کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتے تھے اور ہیں۔ ہم سب آپ کے مداح ہیں۔ آدھا چہرہ ناول پڑھ کر میں ایک ماہ تک اس کے سحر میں گرفتار رہی۔ رسائل میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر آپ کی کہانیاں پڑھتی ہوں۔ میں نے صرف ماروی کے لیے سسپنس لگوایا ہے اب آپ تقریباً ڈیڑھ سال سے سسپنس کے آخری صفحات اور جاسوسی کے ابتدائی صفحات پر کیوں نہیں لکھتے۔ سسپنس میں سب سے پہلے فہرست میں آخری صفحات پر مصنف کا نام پڑھتی ہوں اور آپ کا نام نہ پا کر مایوس ہو جاتی ہوں۔ میں آپ کا انٹرویو رسالوں میں ڈھونڈتی رہتی ہوں۔ (نواب صاحب کا انٹرویو دلکش میں شائع ہو چکا ہے) مجھے بہت اشتیاق ہے آپ کے بارے میں جاننے کا۔ میں اپنا تعارف کروادوں۔ میرا نام رابعہ ناصر ہے۔ چالیس سال عمر ہے۔ چار بچے ہیں۔ بڑا بیٹا بی کام کے آخری سال میں ہے۔ بچے مجھے آپ کا دیوانہ کہتے ہیں۔ آپ کی ہر کہانی اپنی مثال آپ ہے۔ زندہ جاوید ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر دے۔ پلیز پلیز سسپنس کے آخری صفحات کے لیے لکھیں۔ میں نے بہت امید سے خط لکھا ہے۔ (آپ کی رائے نواب صاحب تک پہنچا دی گئی ہے۔ سسپنس کے صفحات پر ہی آپ کے جوابات مل سکتے ہیں۔ آپ کی محبتوں کا شکریہ۔ اللہ آپ کو خوش رکھے)۔"

⊛ محمد جاوید شبیر بربرہ علی پور، مظفر گڑھ سے محفل میں حاضر ہیں "کافی عرصے کے بعد حاضرِ خدمت ہوں لیکن آپ کے تینوں رسالوں کا مطالعہ باقاعدگی سے رہا ہے۔ جون کا شمارہ وقت پر مل گیا۔ سرورق اس دفعہ بہت ہی خوب صورت تھا۔ پرانا اسٹائل سسی پنوں یا ہیر رانجھا کے دور کا تھا۔ سابقہ سرورق سے مختلف اور پیارا تھا۔ آپ کے خط میں آپ کی باتیں پڑھیں جو سبق آموز اور کھری کھری باتیں تھیں۔ انکل ایک چیز کی سمجھ نہیں آتی کہ ہم مسلمان کروڑوں کی تعداد میں نمازیں پڑھتے ہیں، سخت گرمیوں میں روزے رکھتے ہیں۔ تہجد پڑھتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں حج وعمرہ کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، صدقہ کرتے ہیں، حقوق العباد پر پورا اترنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر بھی ہم پوری دنیا میں کمزور ہو رہے ہیں۔ ہم پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے شاید۔ جب تک ہم قرآن پاک کو نہیں سمجھیں گے، ہم اچھے انسان کیسے بنیں گے، ہماری تو بس صرف ایک ہی دعا ہے کہ اے پروردگار ہم مسلمانوں سے راضی ہو جا۔ سب سے پہلے رات کا مسافر پڑھی جو ایک اچھوتی تحریر ہے۔ یہ مغل صاحب کا ایک اسٹائل ہے کہ وہ ہر دفعہ نیا اور اچھوتا شاہکار لے کر آتے ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھ کر مزہ آجاتا ہے۔ رات کا مسافر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ عبدالرب بھٹی صاحب کی سودائے جنوں زبردست تحریر ہے۔ اس تحریر سے فلسطینیوں کے بارے میں تفصیل سے آگاہی ہو رہی ہے جو ہم تمام قارئین کے لیے ایک تحفہ ہے۔ شیطان پورے کا مرتد، نقشِ قدم، انتقام، غلط فہم، نعم البدل، شارٹ کٹ، ریت کی دیوار، جاں نثار منظر امام کی لاجواب تحریریں تھیں محفل شعروسخن کا معیار بھی کافی اچھا تھا۔ کترنیں بھی خوب تھیں۔ ایک چھوٹی سی فرمائش صرف ایک دفعہ تمام لکھاریوں اور قارئین حضرات کو مل بیٹھنے کا موقع دیں۔ صرف ایک تقریب کا اہتمام کریں، یہ ہم تمام قارئین کی دیرینہ خواہش ہے۔"

⊛ محبوب مصور سومرو، گوٹھ کوہری سے تبصرہ کررہے ہیں "ہم دعاگو ہیں کہ خدا کرے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم سدا سلامت رہے آمین ثم آمین (بہت شکریہ) عرض یہ ہے کہ ہم تو ہر پرچہ پڑھتے ہیں کبھی دیر تو کبھی سویر۔ ایسے پیاس رہتی ہے جیسے پانی کی کیونکہ یہ میگزین ہی ایسا ہے زندگی کی بھی معلومات ملتی ہیں۔ سسپنس کا تو ہر پرچہ ایک سے ایک بہتر ملتا ہے کیونکہ یہ میگزین ہی ایسا ہے وقت پہ آنے والا ہر کسی کو اپنا بنانے والا اور دل لبھانے والا۔ آپ کی اس محبت کی وجہ سے ہم تو اب اردو شاعری پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ ہم دعاگو ہیں کہ رب پاک آپ اور ہمارے اس میگزین کو اور بھی ترقی دے، آمین۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

زاہد چودھری، چھور کینٹ۔ محمد مرتضیٰ احتشام، جھنگ سٹی۔ اختر شاہ عالم، ڈھوک جمعہ جہلم۔ عتیق الرحمٰن، عمران زیب، فیصل آباد سمندری۔ محمد رشید سیال، ہروہڑی ضلع سکھر۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ غلام یاسین نوناری، چوک سرور شہید۔ عبدالجبار رومی، چوہنگ لاہور۔ میلاد فاطمہ انصاری، لاہور۔ محمد حنیف گبول، نیو سینٹرل جیل ملتان۔ جبیں، بہاولنگر۔ نادر سیال، میانوالی کندیاں۔ ڈاکٹر ساجد محبوب شیخ، لاہور۔

سرشتِ آدم

الیاس سیتا پوری

انسان جاہ و حشم کی چاہ میں رواداری سے دوری، رشتے داری کو نظر انداز کرنے اور مفاد پرستی کی کتنی حدیں پھلانگ لیتا ہے اس کا احساس کبھی صحیح وقت پر نہیں ہو سکتا کیونکہ اقتدار کا نشہ صحیح اور غلط میں تمیز کرنے ہی نہیں دیتا... اگر ایسا نہ ہوتا تو تاریخ میں ویسا بھی نہ ہوتا جو کچھ رونما ہو چکا... خیزران... تاریخ کا ایک ایسا کردار جس پر جب بھی قلم اٹھایا جائے گا اس کی ذات کا ایک الگ ہی رخ سامنے آئے گا... اس تہ در تہ شخصیت کی حامل صنفِ نازک نے ہر رشتے کو ایک الگ ہی انداز سے برتا اور خوب برتا... جبکہ اپنی برتری اس نے کسی بھی روپ میں کم نہ ہونے دی۔ کنیز سے لے کر دو ولی عہدوں کی ماں ہونے تک کا یہ سفر اس نے ایک زعم اور دبدبے کے جوش تلے طے کیا مگر آخر کب تک... ایک دن پہاڑ کو بھی فنا ہے پھر اس کی ہیبت کیسے تادیر قائم رہ سکتی تھی۔ آدم کی سرشت ہمیشہ اسے اپنے ہی رستوں پر چلاتی ہے۔ اس سے ہٹ کر وہ چلنا چاہے تو زندگی بڑے بڑے امتحان لیتی ہے... ایک ایسی ہی آزمائش والی رات خیزران کی زندگی میں بھی آئی جب ایک لختِ جگر فرماں روائی... سے کوچۂ عدم کو چلا، دوسرا ولی عہد کے عہدے پر فائز ہوا اور پوتے کی صورت میں تیسرے ولی عہد نے دنیا میں جنم لیا۔ تاریخ میں یہ رات ہمیشہ اہمیت کی حامل رہے گی... تین فرماں رواؤں کی ماں ہونے کا یہ اعزاز اس عورت کے حصے میں آیا جسے صرف اپنی ذات سے عشق تھا کیونکہ... اسے "نہ" سننے کی عادت ہی نہیں تھی۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

ابوجعفر منصور عباسی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا مہدی سریر آرائے خلافت ہوا۔ باپ نے خزانہ بھرا ہوا چھوڑا تھا اس لیے مہدی کو مالی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ابوجعفر منصور بڑا حریص تھا لیکن مہدی اس الزام سے بری تھا۔ اس نے دورانِ ولی عہدی جو کنیزیں خریدی تھیں ان میں بربری نسل کی خیزران بھی شامل تھی۔ اسے مہدی نے ایک لاکھ درہم میں خرید کر محل کی کنیز کی حیثیت سے داخل کر لیا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت پر بہترین علما مقرر کر دیے گئے۔ خیزران حسن و جمال اور دیگر کمالاتِ نسوانی میں فرد تھی۔ خیزران کے بطن سے ہادی اور ہارون پیدا ہوئے۔ ہادی جو عباسیوں کا چوتھا خلیفہ تھا اور ہارون جو بعد میں ہارون رشید کہلایا اور عباسیوں کا پانچواں خلیفہ تھا۔

ہادی اور ہارون کی پیدائش کے بعد مہدی نے خیزران کو آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ مہدی اس کے حسن و جمال اور دانش مندی سے اتنا متاثر تھا کہ خیزران نہایت آسانی سے اس کے کاروبارِ مملکت میں بھی شامل و شریک ہوتی چلی گئی۔ خیزران ہادی کی نسبت اپنے چھوٹے بیٹے ہارون کو زیادہ چاہتی تھی۔ چنانچہ جب مہدی نے اپنے بڑے بیٹے کی ولی عہدی کا اعلان کیا تو خیزران کو یہ بات سخت ناگوار گزری لیکن وہ مہدی کو اس کے اس فیصلے سے روک نہ سکتی تھی کیونکہ ہادی بڑا تھا اور قانون و اصول کی رو سے وہی ولی عہدی کا مستحق بھی تھا۔ دونوں بھائیوں میں سال ڈیڑھ سال کی چھوٹائی بڑائی تھی اس لیے یہ بات بھی مشتبہ تھی کہ ہادی کے بعد ہارون کو خلافت مل جائے گی۔ دونوں کی جوانی اور بڑھاپے کا ایک ہی دور تھا۔ اموات بھی آگے پیچھے ہو سکتی تھیں اور بہت ممکن تھا کہ ہارون، ہادی سے پہلے چل بسے۔ لہٰذا خیزران، ہارون کی خلافت کے لیے انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہارون کو خلیفہ بنانا کیوں پسند کرتی تھی؟ اس کا کوئی جواب ہو یا نہ ہو لیکن تاریخ ایک جواب ضرور فراہم کرتی ہے۔ ہادی سخت مزاج تھا اور اس کے عہدِ



خلافت میں شاید یہ ناممکن تھا کہ خیزران بدستور کاروبارِ مملکت میں دخیل ہوتی رہے۔ ہاں ہارون اس کا پوری طرح مطیع و فرمانبردار تھا۔ چالاک اور ہوشیار خیزران کسی ایسے وقت اور موقع کی تاک میں رہنے لگی جب وہ اپنے شوہر مہدی کو اس بات پر آمادہ کرلے کہ وہ ہادی کے بجائے ہارون کو اپنا ولی عہد نامزد کردے۔ بس یہیں سے محلاتی سازشوں کا آغاز ہوگیا۔ ہادی کو اپنی ماں کے ارادوں کا علم ہوچکا تھا۔

ہادی کا اوپری ہونٹ چھوٹا تھا اور اس میں سے دانت نظر آتے تھے۔ مہدی نے ہادی پر ایک آدمی تعینات کردیا جس کا کام یہ تھا کہ ہادی کے ساتھ ہر وقت موجود رہے اور جب بھی دانتوں کو ہونٹ کے باہر نکلا دیکھے فوراً آواز لگائے۔ ''ہادی! اطبق۔'' (ہادی ہونٹ بند کرو)

ہادی فوراً منہ بند کردیتا۔ خدمت گار کی اس تکرار نے ہادی کا نام ہادی اطبق کردیا۔

قصرِ خلد سے ہادی کو روح فرسا خبریں مل رہی تھیں۔ اس کی ایک ہمدرد اور غم خوار کنیز نے اسے مطلع کیا کہ تیری ماں تیری ولی عہدی سے خوش نہیں ہے۔ وہ ہارون کو ولی عہد بنانا چاہتی ہے۔ اس لیے تیرے لیے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اس خطرے کا نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے مقابلہ کیا جائے۔ ہادی کو مشیر بھی اچھے میسر نہیں تھے۔ خیزران کی ہارون پروری مشہور ہوتی جارہی تھی۔ ہادی بہت پریشان تھا کہ اس ہنگامے کا کس طرح مقابلہ کرے۔

اس دن ہادی بہت زیادہ پریشان تھا۔ اسے یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ اس کی ماں خیزران مہدی کو ہارون کی ولی عہدی پر مجبور کررہی ہے لیکن مہدی ایسا کرتے ہوئے خوف کھا رہا ہے۔ ہادی افسردہ، ملول قصر خلد میں داخل ہوا۔ کنیزوں نے خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا۔ ہادی نے محسوس کیا کہ ان میں ایک کنیز زیادہ خوش نہیں ہے۔ وہ ہادی کو دیکھ کر مسکرائی ضرور تھی لیکن اس کی مسکراہٹ میں کھنچاؤ تھا۔ ایک قسم کا تکلف پایا جاتا تھا جیسے وہ جبراً مسکرانے پر مجبور ہو۔ ہادی نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں گویا دریافت کیا۔ ''عریفہ! کوئی خاص بات؟''

عریفہ نظریں جھکا کر سامنے سے ہٹ گئی، گویا کہہ رہی ہو۔ ''یہاں نہیں، تخلیے میں بتاؤں گی۔''

قصرِ خلد پر اس کی ماں خیزران کی حکومت تھی۔ وہاں تخلیہ ناممکن تھا۔ درشت مزاج ہادی کچھ دیر تک عریفہ سے بات کرنے کے لیے بے چین رہا آخر اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ شام کو وہ اس کنیز کے ساتھ دجلہ کی سیر کرے گا اور وہیں تفصیلی باتیں کرے گا۔

سہ پہر کو وہ قصر خلد سے باہر نکلا تو اس کے بچپن کا ساتھی ابراہیم اس کے لیے بے چین کھڑا دکھائی دیا۔ ابراہیم نے ہادی کے ایک معلم کے ساتھ آنا جانا شروع کیا تھا لیکن پھر ہادی اور ابراہیم میں ایسی گاڑھی چھننے لگی کہ دیکھنے والے حسد و رشک کی آگ میں جلنے لگے۔ اس وقت ابراہیم ایک ستون کی آڑ میں چھپا کھڑا تھا۔ قصر کے اندرونی حصے سے نکلتے ہی، ہادی اطبق کی صدا لگانے والا خدمت گار سائے کی طرح ساتھ ہولیا۔ ہادی نے ستون کی آڑ میں کھڑے ہوئے اپنے دوست ابراہیم کو دیکھ لیا، حیرت سے منہ کھل گیا، بولا۔ ''ابراہیم! تو یہاں چھپا کیوں کھڑا ہے؟ خیریت تو ہے؟''

ابراہیم نے خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، پوچھا۔ ''امیر المومنین کہاں ہیں؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''وہ کہیں بھی ہوں لیکن قصر خلد میں نہیں ہیں۔''

ابراہیم نے ڈرے سہمے لہجے میں کہا۔ ''امیر المومنین مجھے آپ کے ساتھ دیکھنا پسند نہیں کرتے۔''

ہادی نے تیوریوں پر بل ڈال لیے، بولا۔ ''وہ نہ پسند کریں، میں تو پسند کرتا ہوں۔''

ابھی بات اچھی طرح پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ ہادی کے خدمت گار نے آواز لگادی۔ ''ہادی! اطبق۔''

ہادی کو غصہ آگیا۔ تند و تیز لہجے میں کہا۔ ''ابنِ جاریہ (لونڈی کے جنے) میں خلیفہ ہوجاؤں پھر تجھے سمجھوں گا۔ ہادی اطبق، ہادی اطبق کی رٹ لگا کر میرا بھیجا خالی کردیا ہے۔''

خدمت گار سہم گیا، بولا۔ ''بندہ پرور! میں بڑی مصیبت میں ہوں، اگر امیر المومنین کی بات نہ مانوں تو جان خطرے میں رہتی ہے اور اگر آپ کی بات نہ مانوں تو میرا مستقبل تباہ ہوجاتا ہے۔''

ابراہیم نے اسے مشورہ دیا۔ ''بے وقوف انسان! تجھے اپنے مستقبل کی فکر کرنا چاہیے، حال تو گزر گیا یا گزر جائے گا۔''

ہادی نے ابراہیم سے کہا۔ ''ابراہیم! کیا آج شام تو ہمارے ساتھ بجرے میں بیٹھ کر دجلہ کی سیر کرنا پسند کرے گا؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، بالکل پسند

کروں گا۔"

ہادی نے کہا۔" ابراہیم! تو جانتا ہے کہ بھائی ہارون کا اتالیق یحییٰ برمکی ہے اور برمکیوں کی عقل کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تو بھی اپنی عقل کو کام میں لا اور یحییٰ برمکی کے مقابلے میں تو مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نواز۔"

ابراہیم نے جواب دیا۔" میں اپنے قیمتی مشوروں کا ذخیرہ سنبھالے ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جب تک میں ہوں آپ کو ولی عہدی سے نہیں ہٹایا جاسکتا۔ میں یحییٰ برمکی تو نہیں ابراہیم ہوں۔ جس پر نمرود کی آگ حرام کردی گئی تھی۔"

ہادی نے اپنے خدمت گار کو ڈانٹا۔" تو بھاگ جا یہاں سے، میں چند ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔"

خدمت گار ہٹ گیا، ہادی نے کہا۔" ابراہیم! آج شام کو میری ایک کنیز میرے ساتھ دجلہ کی سیر کرے گی۔ میں چاہتا ہوں اس وقت تو میرے قریب ہی رہ اور اس کی باتیں سن کر مجھے مشورہ دے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

ابراہیم نے جواب دیا۔" قدر افزائی کا شکریہ، لیکن کسی کنیز سے بات چیت کرنے سے پہلے یہ یقین کرلینا بہت ضروری ہے کہ وہ کسی سازش کا حصہ تو نہیں ہے۔ میں سب سے زیادہ حضور والا کی ماں سے خوف زدہ رہتا ہوں کیونکہ اندر باہر حکومت انہی کی چل رہی ہے۔"

ہادی نے کہا۔" میں خود بھی ان سے خوف زدہ رہتا ہوں۔ وہ ہارون کو بلاوجہ پسند کرتی ہیں۔"

ابراہیم نے کہا۔" گستاخی معاف، ان میں حکمرانی اور دولت کی ذخیرہ اندوزی کا بے پناہ شوق پایا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ سخت مزاج بیٹے کی جگہ نرم دل ہارون کو ترجیح دیتی ہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ حضور والا اپنی ماں کو کسی طرح یہ ذہن نشین کروادیں کہ آپ کے برسر اقتدار آنے کے بعد ان کے اختیارات میں کسی قسم کی کمی نہیں آئے گی تو شاید وہ آپ کی ولی عہدی پر بھی راضی ہوجائیں۔"

شام کے سرمئی دھندلکے میں ہادی کنیز کو لے کر دجلہ کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں ابراہیم پہلے سے ہی موجود تھا۔ ساحل سے بجرا لگا ہوا تھا، بجرے کو کھینے والے ساحل پر کھڑے ہادی کا انتظار کررہے تھے۔ بجرا گھوڑے کی شکل کا تھا۔ ہادی کنیز کو لے کر بجرے پر چڑھ گیا۔ اس کے پیچھے ابراہیم اور دونوں کھینے والے سوار ہوگئے۔ بجرے کو نہایت قیمتی کپڑوں اور موتیوں سے سجایا گیا تھا۔ رنگ برنگے شجر اور مصور پردے کسی پرکیف خواب گاہ کا تصور پیدا کررہے تھے۔ بجرے پر دو خوب صورت، چھوٹے چھوٹے کمرے سے بنے ہوئے تھے۔ ایک درمیان میں، دوسرا انتہائی سرے پر گھوڑے کی دم کے پاس۔ اگلے حصے میں کھینے والوں کی جگہ تھی۔ ہادی کنیز کو لے کر بجرے کے آخری حصے کے کمرے میں چلا گیا اور ابراہیم کو ہدایت کی کہ وہ بیچ کے کمرے میں موجود رہے اور ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کرے۔

بجرے پر جگہ جگہ چراغ جھلملا رہے تھے۔ ہادی کے حصے میں زرتار پردے ہوا سے لہرا رہے تھے۔ ان پردوں کو خوشبویات میں بسادیا گیا تھا۔ جس کی بھینی بھینی خوشبو ہادی کے سینے میں ہلچل مچارہی تھی۔ کنیز نے سرخ لباس پر گہرے نیلے رنگ کا رومال سر پر باندھ رکھا تھا۔ اس نے اپنی کمر کو نیلی پٹی سے کس لیا تھا، جس سے اس کا شباب قیامت کا نمونہ بن گیا تھا۔ نوجوان ہادی اس کے شباب کی پستی و بلندی میں کھو گیا۔ چراغوں کی روشنی میں عریفہ کی خوابیدہ اور بڑی بڑی آنکھیں ہادی کو پرشوق انداز میں دیکھ رہی تھیں۔ ہادی نے عریفہ کے اشتیاق کو محسوس کرلیا۔ وہ آتش شوق کو اور زیادہ بھڑکانا چاہتا تھا۔ اس نے عریفہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنے سینے پر رکھتے ہوئے بولا۔" عریفہ! ذرا میرے دل کی دھڑکنیں تو دیکھ، یہ کتنی تیز ہورہی ہیں۔"

عریفہ نے اپنا ہاتھ ہادی کے سینے پر کچھ دیر روکے رکھا۔ وہ اس لذت کو پوری طرح محسوس کررہی تھی جو کسی عورت کو اپنے پسندیدہ مرد کے اتصال سے حاصل ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنا ہاتھ ہادی کے سینے پر سے ہٹانا نہیں چاہتی تھی۔ ہادی نے پھر پوچھا۔" عریفہ! تو نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا؟ کیا تو میرے دل کی دھڑکنیں محسوس نہیں کررہی؟"

عریفہ نے شرمیلے لہجے میں جواب دیا۔" میں تو تیرے دل کی دھڑکنیں، سینے پر ہاتھ رکھے بغیر ہی محسوس کرسکتی ہوں لیکن کیا تو بھی میرے سینے کی دھڑکنیں محسوس کررہا ہے؟"

ہادی نے جواب دیا۔" نہیں، میں ان دھڑکنوں کو نہیں محسوس کررہا ہوں۔"

عریفہ کا دل بجھ سا گیا۔ پژمردہ لہجے میں بولی۔" حالانکہ یہ تیرے دل کی دھڑکنوں سے کہیں زیادہ تیزی سے دھڑک رہا ہے۔"

ہادی نے کہا۔" ہوسکتا ہے۔"

عریفہ کا خیال تھا کہ ہادی اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر

دھڑکنیں محسوس کرنے کی کوشش کرے گا لیکن ہادی بے تعلق سا بنا رہا۔ آخر تھک ہار کے عریفہ نے التجا کی۔ ''میں نے تیرے دل کی دھڑکنیں اچھی طرح محسوس کرلیں، اب تو میرے دل کی دھڑکنوں کو ہاتھ رکھ کر دیکھ اور موازنہ کرکے ایمانداری سے بتا کہ کس کی دھڑکنیں زیادہ تیز ہیں۔''

ہادی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں، بولا۔ ''عریفہ! تو نہیں جانتی آج کل میں کتنا پریشان ہوں۔ میری رات کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور دن کا سکون غارت ہو چکا ہے۔ یہ شام جو ذرا دیر بعد رات میں تبدیل ہو جائے گی مجھے ایسی لگتی ہے گویا ایک وسیع وعریض تاریک قید خانہ ہے جو مجھے بارہ چودہ ساعتوں کے لیے قید کرنے آ گیا ہے۔ واللہ، جوں جوں آفتاب مغرب کی طرف جھکنے لگتا ہے میرے دل کی دھڑکنوں اور وحشتوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔''

عریفہ کا خوشی سے برا حال ہوا جا رہا تھا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ میری شاہی محل سرا میں وہی حیثیت ہو جو تیری ماں خیزران کو حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں تجھے یہ یقین دلا سکتی ہوں کہ مجھ میں تیری ماں جیسی دولت اور حکومت کی ہوس نہیں ہے۔''

ہادی نے پوچھا۔ ''تو کہنا کیا چاہتی ہے؟''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''وہی جو تو مجھ سے کہنا چاہتا ہے۔''

ہادی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، بولا۔ ''عریفہ! تو غلط فہمی کا شکار ہے۔ شاید تو یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ جس بے چینی اور محبت کا تو اظہار کر رہی ہے اس کا میں خود بھی شکار ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ عریفہ! میں اس وقت تک اپنے دل میں محبت کا خیال تک نہیں لا سکتا جب تک میں اپنا مقصد نہ حاصل کرلوں۔ باپ نے میری ولی عہدی کا اعلان کر دیا ہے لیکن ماں مخالفت کر رہی ہے۔ ان حالات میں، میں کسی سے کس طرح محبت کر سکتا ہوں؟''

عریفہ نے کہا۔ ''میں تیری ماں سے بہت قریب ہوں اور وہ جس جس طرح تیری مخالفت کر رہی ہے، میں جانتی ہوں۔ کیا تجھے میری ضرورت نہیں محسوس ہوتی؟ میں قصر خلد میں رہ کر تیرے لیے وہ کام کرسکتی ہوں جو کھلے میدان میں تیرا جاں نثار دوست بھی نہیں انجام دے سکتا۔''

ہادی نے پوچھا۔ ''تو میرا کیا کام کرسکتی ہے؟''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''میں تیرے لیے مخبری کرسکتی ہوں۔ میں ان سازشوں کا پتا چلا سکتی ہوں جو وقتاً فوقتاً تیرے خلاف تیار کی جائیں گی۔''

ہادی کنیز کی پیش کش پر حیران رہ گیا۔ وہ کچھ دیر حیرت سے عریفہ کی صورت دیکھتا رہا، پوچھا۔ ''تو یہ کام میرے لیے کرسکتی ہے؟''

''کیوں نہیں، بالکل کرسکتی ہوں۔ تجھے تعجب کیوں ہو رہا ہے؟''

''تعجب اس لیے ہو رہا ہے کہ تو نے اس کام کے خطرات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا شاید؟''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''میں نے اس کے خطرات کا اس سے زیادہ اندازہ لگالیا ہے، جتنا تو نے لگایا ہوگا۔ میں قتل کی جاسکتی ہوں، میں بدترین مصائب میں مبتلا ہوسکتی ہوں، مجھے ہمیشہ کے لیے قید خانے میں ڈالا جاسکتا ہے، مجھے جسمانی اور روحانی اذیتیں پہنچائی جاسکتی ہیں۔''

ہادی نے پوچھا۔ ''لیکن تو یہ ساری مصیبتیں جھیلنا کیوں پسند کرے گی؟''

عریفہ نے وفورِ شوق میں ہادی کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا، بولی۔ ''تیری خاطر، صرف تیری خاطر۔''

ہادی نے بھی عریفہ کے خوشبو میں بسے ہوئے جسمانی اتصال میں لطف ولذت محسوس کیا۔ اس کا ایک ہاتھ عریفہ کے سر پر چلا گیا۔ اس نے رومال کھول کر ایک طرف گرا دیا اور اس کی معطر سیاہ زلفوں کو نتھنوں سے رگڑنے لگا۔ اس کا دوسرا ہاتھ عریفہ کو کمر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ عریفہ مست و بے خود سمٹتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ہادی کے چوڑے چکلے سینے میں یوں روپوش ہوگئی گویا وہ اپنے وجود کو ہادی کی ذات میں گم کر دینا چاہتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مست وسرشار لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''ہادی! بخدا اس آغوش کے سوا میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتی۔ تو مجھ سے قسم لے لے، میں تیری ماں خیزران کی طرح دولت واقتدار کی حرص نہ کروں گی، اگر مجھے تیری یہ آغوش مستقلاً میسر آجائے تو میں اپنا سب کچھ قربان کرسکتی ہوں۔''

ہادی نے اس کی پشت تھپتھپائی، بولا۔ ''عریفہ! میں قبل از وقت کوئی وعدہ تو نہیں کروں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اگر میں تیری کوششوں سے برسر اقتدار آگیا تو تجھے اتنا نواز دوں گا کہ تیرے وہم وخیال میں بھی نہ ہوگا۔''

ہادی اور عریفہ کے حجرے نما خیمے کے دوسری طرف ابراہیم ان دونوں کی باتیں نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔ اس نے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن نہیں جھانک سکا پھر وہ ہادی کی سخت مزاجی سے واقف تھا۔ ابراہیم دل ہی دل میں عریفہ کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنی فضول باتوں میں ہادی کے ساتھ اس کا بھی وقت خواہ مخواہ برباد کیا۔

بحر اوجلہ کے جنوب میں بہے چلا جارہا تھا۔

کافی دیر بعد ہادی نے ابراہیم کو بھی اپنے پاس بلالیا۔

ابراہیم جھجکتا، رکتا ان دونوں کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ اس وقت ہادی کا چہرہ پسینے سے چمک رہا تھا اور ایسا لگتا تھا گویا پانی کی پھوار نے اس کے چہرے کو نم کردیا ہے۔ لباس پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور عریفہ کی زلفیں الجھی ہوئی دونوں شانوں پر بکھر گئی تھیں۔ چہرے پر آسودگی اور طمانیت نے ایک قسم کی غیر مرئی اور غیر محسوس سی مسکراہٹ طاری کررکھی تھی۔ عریفہ اپنے لباس کی شکنیں دور کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

ہادی اور عریفہ نے ایک ساتھ ابراہیم کی طرف دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

ابراہیم نے نصیحت کی۔ ”ہادی! میں نے سنا ہے کہ آپ کے دادا منصور نے ایک بار کسی خادم کو طنبورہ بجاتے دیکھ لیا تھا۔ جوش غضب میں کسی سے پوچھا تھا کہ یہ کیا بجارہا ہے؟ انہیں جواب دیا گیا تھا کہ طنبورہ۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے دادا منصور، طنبورے اور اس کے کام سے لاعلم تھے۔ جب جواب ...... میں طنبورے کی تعریف کی گئی اور اس کا کام بتایا گیا تو آپ کے دادا منصور نے غصے میں اس طنبورے کو اس غلام کے سر پر تڑوا دیا تھا۔“

ہادی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”لیکن اس طولائی تمہید کا مقصد؟ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ آپ کے عقلمند اور طاقتور دادا نے ہمیشہ لہو ولعب سے بچنے کی کوشش کی اور اتنی شاندار حکومت کرگئے کہ شاید مستقبل میں اس کی کوئی دوسری مثال نہ ملے۔ آپ کو ابھی حکومت بھی نہیں ملی، آپ کو تو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

عریفہ، ابراہیم کا اشارہ سمجھ گئی، بولی۔ ”ہادی! اس کی زبان کو لگام دے۔ تیرا دادا کنجوس تھا۔ یہ مخیر پوتے کا بخیل دادا سے موازنہ کررہا ہے۔ کیسا عجیب انسان ہے یہ۔“

ہادی نے ابراہیم سے کہا۔ ”ابراہیم! تو میرا دوست ہے اور کوشش کر یہ دوستی قائم رہے۔ میں نے عریفہ سے ایک معاہدہ کیا ہے، یا یوں سمجھ لے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک کام کا آغاز کردیا ہے لیکن آگے چل کر اس میں تیری ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔ اس لیے میں نے عریفہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے پیغام اور اطلاعات اگر میرے پاس تک براہِ راست نہ بھیج سکے تو تمہیں پہنچادے اور تو اسے میرے پاس تک پہنچادیا کرے گا۔“

ابراہیم نے کن انکھیوں سے عریفہ کے حسن کا جائزہ لینے کی کوشش کی، بولا۔ ”ہادی! آپ کے دادا فرمایا کرتے تھے کہ کسی عورت پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اپنی اس رائے میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے۔“

عریفہ اور زیادہ چڑ گئی، ہادی سے گرم ہوکر بولی۔ ”میں اس شخص پر کس طرح اعتبار کروں گی جو مجھ پر ابھی سے اعتبار نہیں کررہا۔“

ہادی ہنسنے لگا، بولا۔ ”عریفہ! تو ابراہیم کی طرف سے بےفکر رہ۔ یہ میرا اتنا ہی ہمدرد اور بہی خواہ ہے جتنی تو خود۔“ پھر ابراہیم سے کہا۔ ”کیا میرا دادا تیری نظر میں کوئی مثالی حکمران تھا؟“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے ہمیشہ ایک مثالی حکمران تسلیم کیا ہے۔“

ہادی نے کہا۔ ”اور میرے دادا کی بابت تو یہ بھی جانتا ہوگا کہ وہ بہت جزرس تھا اس نے اپنے پیچھے اتنی دولت چھوڑی تھی کہ اگر میرا باپ مہدی دس سال تک خراج نہ وصول کرتا، اسے تب بھی مالی مشکلات کا کوئی سامنا نہ کرنا پڑتا۔“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں اس بات سے بھی واقف ہوں۔“

ہادی نے کہا۔ ”اگر میں اپنے دادا کے نقش قدم پر چلوں تو پھر مجھے تمہاری یا تم جیسے کسی اور کی بھی ضرورت ہی نہ پیش آئے گی اور میں کسی زاہد خشک کی طرح اپنی زندگی کے حسین ترین ایام یوں ہی بےمقصد گزار دوں گا۔“

ابراہیم لاجواب ہوگیا۔ عریفہ نے آہستہ سے کہا۔ ”بہتر یہ ہے کہ ابراہیم کے بجائے کسی اور کو میرے کام کا شریک بنادیا جائے۔“

ابراہیم نے بہ عجلت کہا۔ ”نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ کام میں انجام دوں گا۔ ہادی کے لیے، اپنے محسن کے لیے۔“

عریفہ نے ابراہیم کو ذرا غور سے دیکھا۔ یہ ہادی سے زیادہ بڑا نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ حسن وصحت میں بھی ہادی سے کم نہیں تھا۔ ہادی کے بے پناہ اعتماد نے عریفہ کے دل میں ابراہیم کی قدر ومنزلت پیدا کردی تھی۔ ابراہیم باتیں بھی مزے دار کرتا تھا۔

اس رات ان تینوں میں دیر تک صلاح مشورے ہوتے رہے اور طے یہ پایا کہ ہادی کی ماں خیزران کی سازشوں کا انہیں ہر طرح مقابلہ کرنا ہے اور اس سلسلے میں اگر انہیں کبھی کوئی انتہائی قدم بھی اٹھانا پڑ جائے تو دریغ یا تامل سے کام نہیں لیا جائے گا۔

☆☆☆

عریفہ سے مل کر ابراہیم کچھ اور ہی سوچنے لگا تھا۔

اسے عریفہ بہت اچھی لگی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ہادی کی محبوبہ تھی اور ہادی اس معاملے میں غیرت مند مشہور تھا۔ دوسری طرف عریفہ نے بھی ابراہیم کی نظریں پہچان لی تھیں اور وہ اپنے دل میں ابراہیم کے لیے جذبۂ ہمدردی تو محسوس کرسکتی تھی لیکن محبت نہیں کرسکتی تھی۔ عریفہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ہادی اپنے ساتھی ابراہیم کو رقیب کی حیثیت سے بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

ابراہیم کی جان عریفہ کی مٹھی میں تھی لیکن وہ اس لائق نوجوان کو قتل نہیں کروانا چاہتی تھی۔ وہ انہی فکروں میں ڈوبی ہوئی جب محل میں داخل ہوئی تو وہاں ہنگامہ برپا دیکھا۔ خلیفہ مہدی اور خیزران میں کسی بات پر تو، تو میں، میں ہورہی تھی، چند کنیزیں کان لگائے یہ تلخ و ترش باتیں سننے میں مشغول تھیں۔ عریفہ نے مسکراتے ہوئے اشاروں میں پوچھا۔ ”اندر کیا ہورہا ہے؟“

کنیز نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر منع کردیا۔

”خاموش، کہیں کوئی سن نہ لے۔“

عریفہ بھی کان لگا کر کھڑی ہوگئی۔ خیزران، مہدی سے کہہ رہی تھی۔ ”میں کئی بار کہہ چکی ہوں کہ ہادی کی جگہ ہارون کو نامزد کردیا جائے لیکن تم ہمیشہ ٹال دیتے ہو، آخر کیوں؟“

مہدی نے جواب دیا۔ ”خیزران! یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا غلطی سے تو نے سمجھ رکھا ہے۔ اس پر نہ تو خود ہادی تیار ہوگا اور نہ ہی خاندان کے دوسرے لوگ۔“

خیزران نے ڈانٹ کر پوچھا۔ ”آخر کون لوگ ہیں وہ، جو ہادی کے بجائے ہارون کو برسرِاقتدار دیکھنا نہیں چاہتے ہیں؟“

مہدی نے جواب دیا۔ ”خیزران! تجھے محل کی..... چاردیواری میں کسی حد تک پابند بن کر رہنا چاہیے۔ میں نے تجھے حکومت کے کاموں میں شریک کرکے سخت غلطی کی ہے۔ اب میں کچھ عرصے سے یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ تیری خواہش حکمرانی میں شب و روز اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔“

خیزران نے رونا شروع کردیا اور اس کی ہچکی بندھ گئی، غصے میں کہنے لگی۔ ”او خاکروب! جب سے میں تیرے پاس آئی ہوں تو نے میرے ساتھ کیا ہی کیا ہے؟“ اس کے بعد خیزران نے مہدی کا لباس نوچ پھاڑ ڈالا۔

مہدی نے غصے میں پوچھا۔ ”میں خاکروب ہوں؟“

خیزران نے جواب دیا۔ ”ہاں، تو خاکروب ہے بلکہ خاکروب سے بھی بدتر۔“

مہدی نے سرگوشی میں کہا۔ ”ظالم عورت! ذرا تو عقل سے کام لے۔ میں نے تجھ سے وعدہ لیا ہے کہ عنقریب ہارون کی ولی عہدی اور ہادی کی ولی عہدی کے انفساخ کا اعلان کردیا جائے گا۔“

خیزران نے کہا۔ ”تب پھر تو بھی یہ سن لے کہ میں اس وقت تک تجھ سے کوئی بات نہ کروں گی جب تک تو اپنا یہ وعدہ پورا نہیں کردے گا۔“

مہدی نے افسوس سے کہا۔ ”لیکن خیزران! میری یہ بات بھی یاد رکھ کہ ہادی میرے اس تازہ اعلان کو قبول نہیں کرے گا اور محل سرا میں ایسی سازشوں کا سلسلہ چل نکلے گا جن پر قابو پانا دشوار ہوجائے گا۔“

خیزران نے کہا۔ ”میں کچھ نہیں جانتی۔ ہارون کی ولی عہدی کا اعلان اور ہادی کی تنسیخ ولی عہدی کے احکام، آج کل یوں ہی کام ہورہا ہے۔ اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔“

مہدی نے جواب دیا۔ ”لیکن خیزران! اس سے جو ہنگامہ ہوگا یا ہوسکتا ہے، اس کا ذمے دار کون ہوگا؟“

خیزران نے کہا۔ ”میں اس کی ذمے داری قبول کرسکتی ہوں مگر تو کیسا خلیفہ ہے کہ جو ایک ولی عہد کو، ولی عہدی سے خارج کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔“

مہدی لاجواب ہوگیا۔ عریفہ کو یقین ہوگیا کہ اصل گفتگو ختم ہوچکی ہے۔ وہ فوراً وہاں سے ہٹ گئی۔ اس بات چیت کو کسی بھی طرح ہادی تک پہنچانا بہت ضروری تھا۔ خلوت میں جاکر وہ دیر تک خبر پہنچانے کے ذریعے پر سوچتی رہی۔

رات کے گہرے سناٹے اور تاریکی میں دجلہ کی طرف سے آنے والی نمیدہ ہوائیں اعصاب پر خوابیدگی طاری کررہی تھیں۔ قصرِ خلافت کے محافظ، خدمت گار ادھر ادھر گشت کرتے پھر رہے تھے۔ ان کے قدموں کی چاپ گہرے سناٹے کو بار بار توڑ دیتی تھی۔ اس سکوت اور سناٹے میں عریفہ نے ہادی کا نام لکھے بغیر اشاروں کنایوں میں خیزران اور مہدی کی گفتگو لکھنا شروع کردی۔

”میں نے ایک خواب دیکھا، ایک ایسا خواب جسے میں رویائے صادقہ کہہ سکتی ہوں۔ میں نے دو مقدس اور سب سے زیادہ قابلِ احترام شخصیتوں کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا۔ ان دونوں نے ایسی باتیں کیں کہ اگر وہ پوری ہوجائیں تو میں ان لذتوں اور نعمتوں سے محروم ہوجاؤں جن کی امید پر میں اپنی زندگی گزار رہی ہوں۔ ان دونوں نے کسی اور کے خلاف کوئی سازش نہیں کی بلکہ میری تباہی اور بربادی کے مشورے کیے ہیں۔ اے وہ شخص!

جس کی ذات سے میری خوشیاں اور کامرانیاں وابستہ ہیں، کیا تو میری باتوں کا مطلب سمجھ رہا ہے؟

”کیا فرشتے سازش کر سکتے ہیں؟ کیا ایک گڈریا اس گڈریے کے خلاف سازش کر سکتا ہے جو اس بزرگ گڈریے کی جگہ لینے والا ہے؟ شاید اس طرح جس طرح خدا اپنے بندوں پر نامہربان ہو جاتا ہے، والدین اپنے بچوں کے خلاف سازشیں کرنے لگتے ہیں۔

خدا کرے میرا خواب، رویائے صادقہ نہ ہو لیکن یہ ایسی ہی خواہش ہے، جیسے کوئی قریب المرگ شخص یہ خواہش کرے کہ خدا کرے وہ قریب المرگ نہ ہو۔ میرے محبوب! ملاقات کا جلد از جلد انتظام کر تا کہ میں تیرے سینے میں دبک کر اپنے خدشات اور توہمات کی اذیت سے نجات پا سکوں۔ میں نے تجھ سے جو وعدے کیے ہیں انہیں یا تو پورا کروں گی یا پھر اس کوشش میں اپنی جان دے دوں گی۔“

عریفہ یہ ابہامی خط لکھ کر سو گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ دن کی روشنی میں وہ خط بھیجنے کی کوئی تدبیر کرے گی۔ اسے نیند ایسی گہری آئی کہ دیر تک سوتی رہ گئی۔ ایک دوسری کنیز نے اسے بیدار کیا اور بتایا کہ اسے خیزران بلا رہی ہے۔

اس نے بیدار ہوتے ہی گھبرا کر تکیے کے نیچے سے رات کا لکھا ہوا خط تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملا۔ اس نے پریشان ہو کر تکیے کو اٹھا لیا، وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ عریفہ گھبرا گئی۔ اس نے شک و شبے کی نظر سے اس کنیز کو دیکھا جو اسے بلانے آئی تھی۔ عریفہ نے پوچھا۔ ”یہاں کوئی اور بھی آیا تھا؟“

کنیز نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں ایک بار پہلے بھی آ چکی ہوں۔“

عریفہ نے پھر پوچھا۔ ”تیرے علاوہ کوئی اور؟“

”نہیں، میرے علاوہ کوئی اور یہاں نہیں آیا۔ کیوں کیا بات ہے؟ کیا کوئی خاص بات ہو گئی؟“

عریفہ نے کہا۔ ”رات میں دیر تک جاگتی رہی، سونے کی کئی بار کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی۔ آخر میں شاعری کرنے لگی۔ میں نے نثر میں شاعری کر ڈالی۔ اب میں اس مضمون کو نظم کرنے کی کوشش کرتی۔“

کنیز نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں بولی۔ ”عریفہ! دیر نہ کر، تو خیزران کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہے۔“

عریفہ کا دل ہول رہا تھا، بولی۔ ”لیکن میرا کاغذ گیا کہاں؟“

اس وقت ایک دوسری کنیز بھی پہنچ گئی، بولی۔ ”عریفہ! ملکہ عالیہ یاد فرما رہی ہیں، تو دیر کیوں کر رہی ہے؟“

عریفہ بدحواس، پریشان خیزران کے پاس چلی گئی۔

اس نے خیزران کی تیوریوں پر بل دیکھے اور پیشانی غصے سے شکن آلود ہو رہی تھی۔ خیزران کے ہاتھ میں وہی کاغذ تھا جس پر عریفہ نے ہادی کو اشاروں کنایوں میں سازش کی اطلاع دی تھی۔ خیزران کے سامنے پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردے کے دوسری طرف وہ کمرا تھا جس میں معزز... کارپردازانِ مملکت آ کر بیٹھا کرتے تھے اور خیزران ان سے سیاسی اور ملکی امور پر باتیں کیا کرتی تھی۔ خیزران عریفہ کو دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھانے لگی۔ پردے کے دوسری طرف موجود شخص سے کہا۔ ”یحییٰ! میں نے مہدی سے جو باتیں کی تھیں، وہ تیرے علم میں لے آئی، تو ہارون کا اتالیق بھی ہے اور غالباً اپنے عہد کا سب سے بڑا سیاس بھی۔ میں یہ پرچہ تیرے حوالے کرتی ہوں۔ ذرا اسے توجہ سے پڑھ کر مجھے یہ تو بتا کہ یہ محض شاعرانہ خیالات ہی ہیں یا ان کے پیچھے کوئی مطلب بھی کارفرما ہے؟“

اس کے بعد ایک کنیز نے عریفہ کا کاغذ یحییٰ برمکی کے حوالے کر دیا۔ یحییٰ برمکی اسے نہایت توجہ سے پڑھتا رہا۔ مضمون پڑھ چکنے کے بعد یحییٰ نے پوچھا۔ ”وہ لڑکی کہاں ہے جس نے یہ مضمون لکھا ہے؟“

خیزران نے جواب دیا۔ ”میرے سامنے موجود ہے، کیا تیرے سامنے حاضر کر دی جائے؟“

یحییٰ برمکی نے کہا۔ ”ہاں، اگر ملکہ عالیہ مناسب سمجھیں تو۔“

خیزران نے کہا۔ ”لیکن شرط یہ ہے کہ اس سے جو کچھ پوچھا جائے، وہ میں بھی سنوں تیرے سوالات اور عریفہ کے جوابات۔“

یحییٰ نے آہستہ سے کہا۔ ”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں لیکن اس گفت و شنید میں ہم تینوں کے علاوہ، چوتھا شخص شامل نہ ہو۔“

خیزران، یحییٰ کا مطلب سمجھ گئی، اس نے عریفہ کے علاوہ ساری کنیزوں کو اپنے پاس سے رخصت کر دیا۔ کنیزوں کی موجودگی میں تو عریفہ کی ہمت بندھی ہوئی تھی لیکن ان کے جاتے ہی اس کا حوصلہ پست ہو گیا۔ اس نے بدقت تمام خود کو سنبھالا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا گویا گناہوں کے بوجھ کے ساتھ پل صراط پار کرنا ہے۔

خیزران نے اسے حکم دیا۔ ”عریفہ! تو پردے کے اس پار یحییٰ کے پاس چلی جا۔ وہ تجھ سے چند سوالات کرے گا۔ خبردار جو تو نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔ اگر تو نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تو میں تجھے مالا مال کر دوں گی اور کسی معزز امیر سے تیری شادی بھی کر دوں گی۔“

عریفہ نے جواب دیا۔ ''ملکہ عالیہ! نہ تو میں مال وزر کی حریص ہوں اور نہ ہی شادی کی خواہش مند۔ اس کے باوجود میں آپ سے یہ وعدہ کرتی ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گی۔ سب کچھ سچ سچ بتادوں گی۔''

خیزران نے کہا۔ ''اچھا اب تو یحییٰ کے پاس جا اور اس کے سوالوں کے جواب دے۔''

عریفہ، یحییٰ کے پاس چلی گئی۔ اب اس کو ایک پچاس سالہ سیاس کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یحییٰ کی تیز اور دل میں اتر جانے والی نظریں عریفہ کے چہرے پر جم گئیں۔ اس نے پوچھا۔ ''تیرا کیا نام ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''عریفہ۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''خوب، عریفہ کا مطلب ہوا جاننے والی۔ تجھے میرے سوالات کے جوابات کا صحیح علم ہوگا۔ کیا یہ درست ہے کہ تو موسیٰ (ہادی) کے ساتھ رات گئے تک بجرے پر سوار دجلہ کی سیر کرتی رہی ہے؟''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''یہ درست ہے۔''

یحییٰ نے پوچھا۔ ''تیری موسیٰ (ہادی) سے کس قسم کی باتیں ہوتی رہیں؟''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''دو نوجوان عورت اور مرد تنہائی میں جس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں ہم دونوں بھی کرتے رہے۔''

یحییٰ نے پوچھا۔ ''بجرے پر تم دونوں کے سوا اور کون تھا؟''

عریفہ نے بے دھڑک جواب دیا۔ ''ابراہیم۔''

پردے کے پیچھے سے خیزران نے کہا۔ ''یحییٰ! ابراہیم آپ کی طرح ہادی کی ذات سے چمٹ گیا ہے اس بدطینت کا علاج بہت ضروری ہے۔''

یحییٰ نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''ملکہ عالیہ! ابراہیم برا آدمی نہیں ہے۔ ہاں طبعاً ذرا پست ہے۔ ہادی کو اس کی صحبت سے حسد نہ کرنا چاہیے۔'' اس کے بعد فوراً عریفہ سے مخاطب ہوا۔ ''تو وہاں ابراہیم بھی موجود تھا لیکن مجھے بجرے کے ملاح نے بتایا ہے کہ وہاں ہادی نے تیرے سپرد قصرِ خلافت کی مخبری کا کام دیا ہے اور تیرا یہ مضمون ایک قسم کا خط ہے جو ہادی کو لکھا گیا ہے۔''

عریفہ نے رونا شروع کر دیا۔ ''برمکی بزرگ! یہ مجھ پر الزام ہے۔ سراسر بہتان ہے۔ بھلا میں قصرِ خلافت کی مخبری کیوں کروں گی۔ کیا مجھے اپنی زندگی عزیز نہیں ہے؟''

یحییٰ نے پوچھا۔ ''اچھا پھر یہ بتا کہ وہ دو بزرگ اور سب سے زیادہ قابلِ احترام شخصیتیں کون سی ہیں جن کو تو نے اپنے خواب میں کسی کے خلاف سازشی باتیں کرتے دیکھا تھا؟''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''اگر ملکہ عالیہ کچھ محسوس نہ فرمائیں اور صاف صاف بات کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں تو میں اصل خواب بیان کر دوں۔''

خیزران نے پردے کے پیچھے سے جواب دیا۔ ''میری طرف سے اجازت ہے لیکن تو جھوٹ نہیں بولے گی۔''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''میں نے خواب میں امیر المومنین مہدی کے باپ ابوجعفر منصور اور ان کی ماں ام موسیٰ کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا یہ دونوں کچھ اس قسم کی باتیں کر رہے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حکومت کسی اور کو منتقل کی جا رہی ہے۔ میں ان دونوں کی باتوں سے اتنی خوف زدہ ہوئی کہ بیدار ہوتے ہی اپنے خواب کو لکھ لیا، اب اسے منظوم کرنے کا ارادہ ہے۔''

یحییٰ نے فوراً ہی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''ملکہ عالیہ! عریفہ سچی ہے اور حضور کی وفادار ہے۔ اس لیے اس سے مزید سوال جواب کی ضرورت نہیں۔ اس کا مضمون والا کاغذ میں اس کے حوالے کرتا ہوں آپ اسے اندر جانے دیں۔''

یحییٰ نے وہ مضمون عریفہ کے حوالے کر دیا۔ خیزران نے ہنستے ہوئے حکم دیا۔ ''اب تو اندر جا اور خبردار جو تو نے پھر کبھی اس قسم کا کوئی مضمون لکھا۔''

عریفہ مضمون والا کاغذ لے کر ایسی رفو چکر ہوئی کہ دور دور تک اس کا سایہ نہ دکھائی دیا۔

یحییٰ نے پوچھا۔ ''ملکہ عالیہ! کیا وہ چلی گئی؟''

خیزران نے جواب دیا۔ ''ہاں چلی گئی۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''ازراہِ احتیاط ذرا یہ اطمینان تو کر لیجیے کہ آپ کے آس پاس کوئی موجود تو نہیں ہے؟''

خیزران اپنی جگہ سے اٹھ کر ادھر ادھر کا چکر لگا کر واپس آ گئی، بولی۔ ''یہاں میرے سوا کوئی بھی نہیں یحییٰ۔''

یحییٰ نے پوچھا۔ ''آپ نے عریفہ کی باتوں میں کیا محسوس کیا؟''

خیزران نے جواب دیا۔ ''یہی بات تو میں پوچھنا چاہتی ہوں۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''عریفہ جھوٹی ہے اور اس نے ابوجعفر منصور اور ام موسیٰ کا غلط نام لیا ہے، ورنہ میں یقین رکھتا ہوں کہ اس مضمون میں عریفہ کا مخاطب ہادی ہی ہے اور خواب کی دو مقدس اور سب سے زیادہ قابلِ احترام شخصیتیں ملکہ عالیہ اور امیر المومنین کی ہیں لیکن افسوس کہ اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔''

خیزران نے تشویش سے کہا۔ ”پھر...... پھر اب کیا ہوگا؟“

یحییٰ نے جواب دیا۔ ”عریفہ کی نگرانی کیجیے۔ وہ یہ مضمون کسی نہ کسی طرح ہادی کو بھیجے گی ضرور، بس اسے پکڑنا شرط ہے۔“

خیزران نے کہا۔ ”ابن خالد! عریفہ کتنی ہی ہوشیار اور چالاک کیوں نہ ہو مجھ سے نہیں بچ سکتی۔“

یحییٰ نے کہا۔ ”میں ہادی کے دوست اور رفیق و غم خوار ابراہیم کا بندوبست کرتا ہوں۔“

خیزران نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”یحییٰ! بخدا میں یہ نہیں برداشت کرسکتی کہ ہارون کے علاوہ کسی اور کو ولی عہد بنایا جائے۔ ہارون کی راہ میں جو بھی حائل ہوگا پیس دیا جائے گا۔“

”اچھا ملکہ عالیہ! میں چلتا ہوں، میں یہاں زیادہ دیر تک نہیں رک سکتا۔ ہادی اور اس کے طرف دار میری نگرانی میں لگے رہتے ہیں۔“

خیزران آگ بگولا ہوگئی، بولی۔ ”میں ان سب سے نمٹ لوں گی یحییٰ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔“

یحییٰ چلا گیا اور خیزران عریفہ کی نگرانی کرنے لگی۔

☆☆☆

یحییٰ نے عریفہ کو جس آسانی سے چھوڑ دیا تھا اس پر فوری طور پر تو عریفہ بہت خوش ہوئی تھی لیکن بعد میں وہ شک و شبہے میں پڑ گئی۔ اس نے ہادی سے ملنے یا خط بھیجنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اس سلسلے میں اس نے ایک نادر طریقہ اختیار کیا۔ اس نے اپنے خط کے مضمون کو منظوم کرکے عام کردیا۔

عریفہ کے خواب کا چرچا قصر خلافت سے نکل کر بغداد کی گلیوں اور بازاروں میں پھیل گیا۔ ہادی اور ابراہیم کو عریفہ کا پیغام جس خوب صورت انداز میں موصول ہوا تھا اس سے دونوں ہی عریفہ کی ذہانت کے معترف ہوگئے۔ ہادی کی آتش شوق بھڑک اٹھی اور وہ اس خوب صورت اور حسین اور ذہین لڑکی سے دوبارہ ملنے کے لیے بے چین نظر آنے لگا۔ دوسری طرف خیزران بھی عریفہ کی ایک ایک حرکت کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ عریفہ کا خواب اشعار کی شکل میں عام ہوگیا ہے تو اسے بہت ہی غصہ آیا۔ اس نے اپنے شوہر مہدی سے اس کی شکایت کردی اور کہا۔ ”مجھے اس کے خواب یا شاعری سے کوئی سروکار نہیں لیکن میں یہ ضرور محسوس کررہی ہوں کہ یہ جو کچھ ہورہا ہے،

خالی از علت نہیں، اس کا کوئی مقصد ضرور ہے۔“

مہدی نے کہا۔ ”اگر تو میری ایک بات مان لے تو ہر بات تیری سمجھ میں آجائے گی اور تیرے شکوک کے پیچھے اگر واقعی کوئی صداقت موجود ہے تو وہ بھی کھل کر سامنے آجائے گی۔“

خیزران نے ناز و ادا سے کہا۔ ”مہدی! میں نے تیری بات کب نہیں مانی ہے؟“

مہدی نے کہا۔ ”تو محلاتی سازشوں سے اچھی طرح واقف ہے۔“

خیزران، مہدی کی شکل دیکھ رہی تھی۔ مہدی کہتا رہا۔ ”اگر عریفہ سچ مچ ہادی کی آلۂ کار ہے اور اس کے لیے مخبری کرتی ہے تو اس کو آزمانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تو عریفہ ہی جیسی ایک دوسری لڑکی بھی تیار رکھ۔ وہ عریفہ سے حسد رکھتی ہو، ذہانت میں بھی اس سے کم نہ ہو، تو اسے اپنے اعتماد میں لے کر ہادی کے پاس بھیج دیا کر۔ عریفہ، ہادی کے پاس جب جائے گی تو اس کے ساتھ ہی اس لڑکی کو بھی بھیج دیا کر پھر دیکھ کہ ان دونوں کے رشک و حسد تیرے حق میں کتنے مفید ثابت ہوتے ہیں۔“

خیزران، مہدی کے مشورے پر حیران رہ گئی، بولی۔ ”پھر بھی مہدی! اگر تو ہارون کی ولی عہدی کا اعلان کردے تو ان محلاتی سازشوں کا ایک دم قلع قمع ہوجائے گا۔“

مہدی نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”خیزران! ابھی میں اس قسم کا اعلان نہیں کرسکتا، میں اس اعلان کے نتائج سے اچھی طرح واقف ہوں اور تو ان سے بالکل بے خبر ہے۔“

مہدی تو مشورہ دے کر چلا گیا لیکن خیزران، عریفہ کی رقیب کنیز کا انتخاب کرنے لگی۔ آخر اس کنیز پر اس کی نظر انتخاب کیوں پڑی؟ یہ وہی کنیز تھی جو علی الصباح عریفہ کو بلانے گئی تھی۔ شکل و صورت، ناز و ادا، گفتگو، ذہانت کسی بات میں بھی عریفہ سے کم نہیں تھی۔ خیزران نے اسے سبز باغ دکھائے اور یقین دلایا کہ اگر اس نے خیزران کے لیے ہادی اور عریفہ کی مخبری کی اور ہادی کو اپنے اعتماد میں لے کر اس کے منصوبوں کو اگلوا لیا تو اسے آزاد کرکے ہارون یا کسی اور شہزادے سے اس کی شادی کردی جائے گی اور مال و زر سے اتنا نواز دیا جائے گا کہ دوسروں کے لیے رشک و حسد کا باعث بن جائے گی۔

ہادی عریفہ کے اشعار کی تفصیلات جاننے کے لیے بے چین تھا۔ ہارون ان دنوں قسطنطنیہ کی مہم پر گیا ہوا تھا اور وہاں سے اس کی کامیابیوں کی شاندار خبریں آرہی تھیں اور مہدی سنجیدگی سے ہادی کی ولی عہدی کی تنسیخ اور ہارون کو

اپنی جانشینی عطا کرنے پر غور کر رہا تھا۔ ہادی اپنے باپ کی تبدیلیٔ فکر کو دوسروں سے کہیں زیادہ محسوس کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ بہت زیادہ فکر مند تھا اور اس کا ساتھی اور رفیق ابراہیم اسے تسلی دلاسے دیتا رہتا لیکن ہادی ان سے ذرا بھی مطمئن نہ ہوتا۔ اس دوران عریفہ اور دوسری کنیز عاتکہ، ہادی سے ملتی رہیں۔ وہ ان دونوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اپنے غم غلط کرتا رہا لیکن وہ عاتکہ کی موجودگی میں عریفہ سے کھل کر بات نہیں کرسکتا تھا۔ عاتکہ اتنی دلکش تھی کہ اسے منع بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ابراہیم الگ موقع کی تاک میں تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ہادی جتنا عریفہ پر ملتفت ہے اتنا ہی عاتکہ پر بھی تو وہ عریفہ کو ورغلانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

ہارون روم کی کامیاب مہم جوئی کے بعد بغداد واپس آرہا تھا۔ مہدی نے اس کے استقبال کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ امرا اور معززین بغداد بھی ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے لیکن ہادی کے بہی خواہ ہارون کی فتح مندی اور شہرت سے کڑھ رہے تھے۔ ہارون اور اس کے فاتح لشکر کے آنے میں کئی دن باقی تھے۔ ہادی، عریفہ اور عاتکہ کو ساتھ لے کر ایک باغ میں چلا گیا۔ یہ شاہی باغ اس کے دادا منصور نے لگوایا تھا اور اس میں رہائش کے لیے ایک چھوٹا سا قصر بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ زیتون، کھجور، سرو اور پام کے مختلف قامت کے درختوں نے باغ کو بہت خوب صورت کردیا۔ سبزے کا وسیع وعریض قطعہ، دور سے مخملیں فرش محسوس ہوتا تھا...... پھول دار درختوں کی روشیں اور پتلی پتلی لہراتی، بل کھاتی راہیں دور سے نہر معلوم ہوتی تھیں۔ اس باغ کو چاروں طرف سے اونچی اونچی دیواروں میں قید کردیا گیا تھا۔ جس میں داخلے کے لیے بس دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ مشرق میں تھا، دوسرا مغرب میں۔ ہادی نے اس باغ میں اپنا غم غلط کرنے کے لیے خاص جشن کا اہتمام کیا۔ مٹکوں اور مرتبانوں میں نبیذ بھری رکھی تھی اور ان کے پاس ہی آلات نبیذ نوشی رکھ دیے گئے تھے۔ اس نے اپنے اس جشن میں اپنے خاص خاص دوستوں اور ہمدردوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ ان میں ابراہیم پیش پیش تھا۔ عریفہ اور عاتکہ کے علاوہ بھی بہت سی کنیزیں بلائی گئیں اور ان کے ذمے جو کام کیے گئے ان میں موسیقی، رقص اور اپنے ہاتھوں سے نبیذ پلانے کی ذمے داریاں شامل تھیں۔ متناسب اعضا، سرخ وسفید رنگت، لمبی لمبی انگلیوں والی یہ کنیزیں ایسی تھیں کہ ان جیسی کمتر ہی اہالیان بغداد کو نصیب ہوں گی۔ عاتکہ اور عریفہ ہادی کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں اور بقیہ کنیزیں ادھر ادھر چلی گئیں۔ ہادی کے ساتھیوں میں شعرا بھی شامل تھے۔

عریفہ باغ کے ساز وسامان اور موسم اور ماحول سے بڑی متاثر تھی۔ ہادی سے کہنے لگی۔ ”ہادی! اگر زمانہ اور جوانی ساتھ دیں تو انسان کو کسی اور جنت کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے یہی جنت ہے۔“

اتنا کہہ کر عریفہ ہنسنے لگی، لوگ بھی ہنس دیے۔ خود ہادی بھی مسکرانے لگا۔ عاتکہ کو تکلیف پہنچی۔ وہ عریفہ سے پیچھے کیوں رہتی، بولی۔ ”زمانے اور جوانی کا ذکر کرکے عریفہ ان دونوں کا اس جنت سے موازنہ کر رہی ہے جسے کسی نے دیکھا ہی نہیں اور کسی دیکھی ہوئی چیز کا ان دیکھی چیز سے فیصلہ کن موازنہ کرنا کم عقلی کی دلیل ہے۔“

عریفہ گرم ہوگئی، بولی۔ ”عاتکہ تو میرے معاملوں میں قطعی دخل نہ دے کیونکہ تو ہادی کی صحبت میں نئی نئی آئی ہے اور میں ایک عرصے سے ہادی کی ہمدردی کر رہی ہوں۔“

عاتکہ نے چمک کر شوخی سے کہا۔ ”تیری ہمدردیوں کا کسے علم نہیں لیکن کیا ہم سب ہادی کے دشمن ہیں؟“

عریفہ نے جواب دیا۔ ”مجھے کیا معلوم۔ تو اپنا دل ٹٹول اور فیصلہ کر کہ ہادی کا کون دوست ہے اور کون دشمن۔“

عاتکہ نے چڑ کر کہا۔ ”میرا دل اندر باہر سے یکساں ہے لیکن جو لوگ اپنی ذات سے دو ہوتے ہیں ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے دل کو ٹٹول کر صحیح راہ اختیار کریں۔“

ہادی نے ناگواری سے کہا۔ ”تم دونوں آپس میں کیوں الجھ رہی ہو۔ میں یہاں اپنے دوستوں اور ندیموں کے ساتھ غم غلط کرنے آیا ہوں اور تم دونوں کچھ ایسی گفتگو کرنے لگی ہو کہ میرا غم کم ہونے کے بجائے اور زیادہ گہرا ہوگیا ہے۔“

اس دن عریفہ نے محسوس کیا کہ ہادی، عاتکہ پر زیادہ توجہ دے رہا ہے اور عریفہ کسی قدر نظرانداز کی جارہی ہے۔ اس احساس سے عریفہ کے سینے میں بھٹی سی روشن ہوگئی۔ انتقام کی بھٹی، اہانت کی آگ زیادہ زور وشور سے سلگنے لگی تھی۔ وہ عاتکہ کی طرف رجوع تھا اور مصاحبین اور ساتھی ہادی کی جا اور بے جا تعریفوں میں لگے ہوئے تھے۔

عاتکہ نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”ہادی! کیا تیری خلافت یقینی ہے؟ میں نے کئی بار یہ محسوس کیا ہے کہ خیزران تیرے باپ مہدی کو جب بھی ورغلانا چاہے بڑی آسانی سے ورغلاسکتی ہے۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے تیرا دادا منصور تیرے باپ امیرالمومنین مہدی کو بطور خاص نصیحت کیا کرتا تھا کہ عورتوں میں زیادہ دلچسپی نہ لے ورنہ بڑا برا حشر ہوگا اور لوگ دیکھ رہے ہیں کہ امیرالمومنین مہدی،

خیزران کی بات ٹالنے کی ہمت نہیں رکھتے۔"

ہادی نے کہا۔"میں نے بھی یہی سنا ہے کہ میرا دادا میرے باپ کو نصیحت کیا کرتا تھا کہ خبردار اپنے معاملات میں عورتوں کو دخل انداز مت ہونے دینا لیکن مجھے اندیشہ ہے... کہ تم ایسا کرو گے لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میرا دادا زاہد خشک تھا۔ یہ بات وہی کہہ سکتا تھا۔ اگر میں خود بھی اپنے دادا کے قول پر عمل کرنا چاہوں تو نہیں کرسکتا کیونکہ میں اس وقت بھی تم عورتوں میں گھرا بیٹھا ہوں اور مجھے تمہی لوگوں سے نہایت اہم اور کام کی باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔"

عاتکہ نے بڑی ادا سے کہا۔"میرے ماں باپ تجھ پر قربان، کیا تو نے عریفہ کے سپرد محل کی مخبری کی تھی؟ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ عریفہ، خیزران اور یحییٰ برمکی کی نظر میں ایک مشتبہ ذات ہے۔"

ہادی نے کہا۔"میں نے اس کے سپرد کوئی ایسی خدمت نہیں کی اور پھر میں اسے اپنا مخبر کیوں بناؤں گا۔ میری ماں خیزران اگر میری مخالفت کرے گی تو اس مخالفت کے خلاف محاذ آرائی کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

دوسری طرف ابراہیم، عریفہ سے کہہ رہا تھا۔

"عریفہ! مہدی اور خیزران میں جو باتیں ہوئی تھیں انہیں تو نے اپنے کانوں سے سنا تھا یا یہ خبریں کسی اور کے ذریعے تجھ تک پہنچیں؟"

عریفہ نے جواب دیا۔"ساری باتیں میں نے خود اپنے کانوں سے سنی تھیں۔"

ابراہیم نے کہا۔"خدا تجھے خوش رکھے۔ میں یہ باتیں ہادی تک پہنچادوں گا۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے ہادی اور عاتکہ کی طرف دیکھا اور نہایت ہوشیاری سے عاتکہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔"عریفہ! یہ لڑکی کون ہے؟"

عریفہ نے بے زاری سے جواب دیا۔"میرے ہی جیسی ایک کنیز ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ خیزران کی مخبر ہے۔ ہادی کو اس سے ہوشیار رہنا چاہیے۔"

ابراہیم نے عریفہ پر ڈورا ڈالنے کی پہلی کوشش کی۔

"لیکن عریفہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ تو، تو بہت بھولی ہے۔ سچ سچ بتا تو نے ہادی سے کس قسم کی توقعات وابستہ کررکھی ہیں؟"

عریفہ نے جواب دیا۔"اگر ہماری کوششوں سے ہادی برسراقتدار آجائے تو میں کوشش کروں گی کہ محل اور مملکت میں خیزران جیسی حیثیت حاصل کرلوں۔"

ابراہیم نے جواب دیا۔"یہ تیری خام خیالی ہے۔ تجھے اس قسم کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔" پھر طنزیہ ہنسا، کہنے لگا۔"اس بزم میں تو بھی موجود ہے مگر ہادی تجھ سے زیادہ عاتکہ پر ملتفت ہے۔ خیزران جیسی حیثیت حاصل کرنے والی بہت کم ہوتی ہیں اگر تو چاہے تو میں اپنے مفہوم کو اور زیادہ واضح لفظوں میں بیان کردوں؟"

عریفہ نے جواب دیا۔"اس وقت تو میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ ہادی مجھ پر زیادہ توجہ نہ دے۔"

ابراہیم نے کہا۔"تو میری بات سمجھ ہی نہیں رہی۔ میں کہہ رہا ہوں کہ تو ایک نکتہ ہمیشہ ذہن نشین رکھ۔ ہادی ولی عہد ہے اور مہدی کے بعد خلافت اس کے قبضے میں آجائے گی جب حکومت ہادی کے قبضے میں ہوگی تو تیری جیسی ہزاروں کنیزیں اس کے حرم میں موجود اس کی ناز برداریاں کررہی ہوں گی۔ اس وقت تیری کیا حیثیت ہوگی؟ کیا یہی، خیزران جیسی؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہادی کو اس وقت کوئی نئی خیزران مل جائے۔"

عریفہ روٹھ گئی، خفا ہوکر بولی۔"ابراہیم! میں آئندہ تجھ سے کوئی بات نہیں کروں گی۔ تو میری ہمت شکنی کررہا ہے۔ تو مجھے معلوم نہیں کیوں ورغلا رہا ہے۔ اب میں تیرے پاس نہیں بیٹھوں گی۔"

ابراہیم گھبرا گیا۔ خوشامدیں کرنے لگا۔"عریفہ! یہ تو کیا کررہی ہے؟ جلدی اور پریشانی میں بنا بنایا کھیل مت بگاڑ۔ میں تیرا ہمدرد ہوں، تیرا بہی خواہ، خیرخواہ تو جانتی ہے کہ سچے دوست کی کیا تعریف کی گئی ہے؟"

عریفہ نے کہا۔"میں نہیں جانتی کہ سچا دوست کیا ہوتا ہے اور اس کی کیا تعریف کی گئی ہے۔"

ابراہیم نے کہا۔"تو مجھ سے سن، سچا دوست اسے کہتے ہیں جو سچی بات کہہ کر رلادے۔"

عریفہ نے کہا۔"پھر ایسا دوست کہاں ملے گا اور نہ میں اس قسم کا دوست چاہتی ہوں۔"

ابراہیم نے جواب دیا۔"تیری مرضی، ورنہ تجھے ایک بات معلوم ہونی چاہیے۔ ہادی کی حکومت میں وزارت میرے سپرد ہوگی اور وزیر اپنے وسیع اختیارات کی وجہ سے خلیفہ سے بڑا آدمی ہوتا ہے۔ اگر تو پسند کرے تو میں یہ یقینی وعدہ کرنے کو تیار ہوں کہ میں تجھے اپنی وزارت میں وہی مرتبہ بخشوں گا جو مہدی نے خیزران کو بخشا ہے۔"

عریفہ چڑ گئی، بولی۔"تو یہ چاہتا ہے تو...... اسی لیے اتنی لمبی چوڑی باتیں کررہا تھا۔"

ابراہیم نے نظریں نیچی کرلیں، بولا۔"اگر میری پیشکش

قبول نہ ہو تو پھر اسے یہیں ختم کر دینا۔ چرچا کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے تیری فلاح کی خاطر یہ پیشکش کی تھی۔"

عریفہ نے جواب دیا۔ "میں اس کا ہادی سے ذکر کروں گی۔"

ابراہیم نے سختی سے کہا۔ "اگر ایسی غلطی کی تو تجھے پچھتانا پڑے گا۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔"

عریفہ نے ہنس کر طنز سے کہا۔ "وہ تو مجھے بھی تیری پیشکش سے اندازہ ہو گیا کہ تو کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔"

نبیذ کا دور چلا، ہلکے ہلکے سرور نے لوگوں کے چہروں پر خوابیدگی جیسی کیفیت پیدا کرنا شروع کر دی۔

عاتکہ اس کوشش میں تھی کہ عریفہ کی بابت کام کی باتیں ہادی سے معلوم ہو جائیں اور ہادی اس فکر میں تھا کہ وہ کسی طرح عاتکہ کی بابت معلوم کرے کہ وہ کیا ہے اور اس کے پاس کیوں آئی ہے؟ لیکن دونوں ہی ناکام رہے۔ بدرجہ مجبوری تھک ہار کر ہادی نے عاتکہ کو اپنے پہلو سے اٹھا دیا اور عریفہ کو لے کر وہ خلوتیے میں چلا گیا۔ جلی بھلسی عاتکہ ابراہیم کے پاس جا بیٹھی۔ نبیذ کا دور چلتا رہا۔

اندر، ایک سجے ہوئے کمرے میں ہادی نے عریفہ کو اپنی آغوش میں لے لیا اور پوچھا۔ "ہاں تو اندر کی کوئی خاص خبر؟"

عریفہ نے جو کچھ ابراہیم کو بتایا تھا، وہی ہادی کے روبرو دہرا دیا۔ ہادی سوچتا رہا خوب خوب سوچتا رہا پھر فکر مند لہجے میں پوچھا۔ "کیا تو بتا سکتی ہے کہ یہ عاتکہ یہاں کیوں آئی ہے تیرے ساتھ؟"

عریفہ نے جواب دیا۔ "شاید یہ معلوم کرنے کہ کہیں میں تیرے لیے جاسوسی تو نہیں کر رہی ہوں۔"

ہادی نے ہنس کر کہا۔ "یہ بات وہ کس طرح جان سکتی ہے۔"

عریفہ نے کہا۔ "وہ بالکل جان سکتی ہے کیونکہ ہم میں ایک ایسا شخص بھی موجود ہے جو بظاہر تو دوست ہے لیکن اندر سے دوست نہیں۔ بددیانت، مطلب پرست، خود غرض اور معلوم نہیں کیا کچھ ہے۔"

ہادی کا نشہ ہرن ہونے لگا، ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "وہ کون ہے؟"

عریفہ نے جواب دیا۔ "میں ابھی نہیں بتاؤں گی۔ پہلے میں ایک بات دیکھ لوں، اس کے بعد اس کے خلاف زبان کھولوں گی۔"

ہادی نے کہا۔ "ابھی بتانے میں کیا حرج ہے؟"

"مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ میں چند گھڑیوں کی لذت کا مزہ نہیں خراب کرنا چاہتی۔"

ہادی نے کہا۔ "خیر جانے دے، پہلے یہ بتا اندر کیا ہو رہا ہے؟ تو نے جس طرح اپنا پیغام بھیجا تھا اس نے مجھے بہت خوش کیا۔ میرے لیے تو بہت مفید ہے اور میں تیرے لیے مفید ثابت ہوں گا۔"

عریفہ نے جواب دیا۔ "اندر کی خبر یہ ہے کہ روم سے ہارون کی فتح مندانہ واپسی کی خبر نے تیری ماں خیزران کو... از خود رفتہ کر رکھا ہے اور تیرے باپ مہدی کے مزاج میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔"

ہادی فکر مند ہو گیا، بولا۔ "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

عریفہ نے جواب دیا۔ "تو اپنے مخلص دوستوں سے مشورہ کر کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ ہاں ابراہیم سے کوئی مشورہ نہ کرنا۔ وہ اس لائق نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جائے۔"

ہادی نے کہا۔ "اپنے دوستوں سے مشورے تو کروں گا لیکن تو ابراہیم کے خلاف کیوں ہو گئی ہے؟"

عریفہ نے جواب دیا۔ "یہ میں وقت آنے پر بتاؤں گی، ابھی نہیں۔"

ہادی نے تشویش سے پوچھا۔ "پھر بھی، آخر ہوا کیا؟ مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

عریفہ نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ یہ میں وقت آنے پر بتاؤں گی۔"

ہادی نے بگڑ کر کہا۔ "آخر وہ وقت آئے گا کب؟"

عریفہ نے جواب دیا۔ "ایک بار قصر خلافت میں جا کر واپس آنے کے بعد۔"

ہادی نے کہا۔ "عجیب بات ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ابراہیم کے سلسلے میں تجھے غلط فہمی ہو سکتی ہے مگر اس کی رفاقت اور ذہانت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

عریفہ نے چڑ کر کہا۔ "ہادی! ابراہیم مطلب پرست ہے، غرض کا بندہ ہے، اپنی خواہش کا غلام۔"

ہادی نے کہا۔ "ہو سکتا ہے لیکن میں ابھی یہ باتیں خود اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا۔"

عریفہ نے ہادی کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنے مستقبل سے ڈر لگتا ہے ہادی۔ مجھے پوری قوت سے چمٹا کر میرے کمزور اور دھڑکتے دل کو تقویت بخش دے ہادی، میں خوف زدہ ہوں۔"

ہادی نے اسے بھینچ لیا اور بالوں کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ "تو مت خوف زدہ ہو عریفہ! میں جو تیرے ساتھ اور تیری پشت پر موجود ہوں۔"

عریفہ نے کہا۔ "ہادی! زمانہ میری دشمنی پر آمادہ

ہے۔ وہ در پے آزار ہے اور ان مصائب کا بدترین پہلو یہ ہے کہ میں تیری قربت سے بھی محروم ہوں۔ اگر تو میرے پاس ہو تو میں موت سے بھی آنکھیں لڑا سکتی ہوں۔"

ہادی نے اسے نہایت گرم جوشی سے چمٹا لیا، بولا۔

"ذرا صبر و تحمل سے کام لو، وہ دن زیادہ دور نہیں ہیں جب میں تجھے اپنے دل کے ساتھ ساتھ اپنے جسم سے بھی قریب رکھ سکوں گا۔"

عریفہ فرطِ خوشی میں سسکیاں لینے لگی۔

☆☆☆

پوری محفل نبیذ کے نشے میں مست و سرشار تھی لیکن ابراہیم کا مزہ کرکرا ہو گیا تھا۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ ہادی عاتکہ کی موجودگی میں عریفہ کو ذرا بھی اہمیت نہیں دے گا لیکن جب ہادی عریفہ کو نہایت شوق اور عزت سے تخلیے میں لے گیا تو ابراہیم کا دل خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ عریفہ اس کی ساری باتیں ہادی سے کہہ دے گی اور ہادی ایک جذباتی نوجوان ہے معلوم نہیں ابراہیم کے خلاف کیسا قدم اٹھا بیٹھے۔ اس نے بھی اپنے بچاؤ کی خاطر ایک خطرناک کھیل کھیلا۔ اس نے عاتکہ سے وہ باتیں کہہ ڈالیں جو کوئی بھی سمجھ دار اور ہوش مند نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے عاتکہ کو بتا دیا کہ عریفہ قصرِ خلافت کی ساری باتیں باہر پہنچا دیتی ہے۔ ابراہیم کا خیال تھا کہ عاتکہ اس انکشاف سے چونک جائے گی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور ابراہیم کی چونکا دینے والی باتیں بے پروائی سے سنیں۔ عاتکہ کی سردمہری اور عدم دلچسپی نے ابراہیم کو کچھ زیادہ ہی پریشان کر دیا۔

ابراہیم نے ذرا زور دے کر پوچھا۔ "عاتکہ! میں نے جو کچھ کہا تو نے سنا یا نہیں سنا؟"

عاتکہ نے جواب دیا۔ "میں نے تیری باتیں سن تو لیں مگر وہ میرے کس کام کی؟ میں محل سرا کی سازش اور سیاست میں نہیں پڑنا چاہتی۔"

ابراہیم نے کہا۔ "اگر تو یہ خبر خیزران تک پہنچا دے تو ان کی نظر میں بڑا اچھا مقام حاصل کر لے گی۔"

عاتکہ نے جواب دیا۔ "مگر میں کوئی اچھا مقام کیوں حاصل کروں؟ کس کے لیے؟ ظاہر ہے میں جو خبر خیزران تک پہنچاؤں گی وہ ہادی کے خلاف ہو گی اور میں کل کے امیرالمومنین کے خلاف کوئی کام کیوں کروں؟"

ابراہیم اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ فرار کی ساری راہیں بند ہو چکی تھیں۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ عریفہ سے معافی مانگ لے گا لیکن پھر یہ سوچتا کہ اگر اس کی باتیں ہادی تک پہنچ چکی ہوں گی تو ان کا کیا جواب دیا جائے گا؟

جب جوش اور سرمستی میں کمی واقع ہوئی اور حالت اعتدال پر آنے لگی تو عریفہ اور عاتکہ ایک بار پھر یکجا ہوئیں ہادی بھی دوستوں میں واپس آ گیا۔ ابراہیم، عریفہ اور ہادی دونوں سے ہی نظریں چرانے لگا۔ وہ عریفہ سے باتیں کرنے کے لیے بے چین تھا لیکن عریفہ اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ عاتکہ، عریفہ سے حسد محسوس کرنے لگی۔ وہ عریفہ سے سرگوشی میں کہنے لگی۔ "عریفہ! میں جانتی ہوں کہ تو نے ہادی کو کس طرح اور کس حربے سے فتح کیا ہے لیکن تجھے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اس کا علم کسی بھی طرح خیزران کو ہو گیا تو تیرا کیا حشر ہو گا۔"

عریفہ نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا، بولی۔ "میں نے کس طرح اور کس حربے سے ہادی کو فتح کیا ہے، ذرا بتا تو سہی؟"

عاتکہ ہنسنے لگی۔ "بھولی نہ بن عریفہ، مجھے ابراہیم نے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

عریفہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا، بولی۔ "تجھے ابراہیم نے کیا بتایا ہے؟"

عاتکہ فاتحانہ شان سے بولی۔ "اس نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، یہ مت پوچھ بلکہ اپنے دل کو ٹٹول اور اس سے یہی سوال کر، تجھے اپنے اس سوال کا صحیح جواب مل جائے گا۔"

عریفہ بے چین ہو گئی اور اس موضوع پر ابراہیم سے اسی وقت بات کرنے کو اٹھنے ہی والی تھی کہ عاتکہ نے اس کا سیدھا شانہ پکڑ لیا۔ روکتے ہوئے بولی۔ "کہاں چلی؟"

عریفہ نے جواب دیا۔ "اس ذلیل انسان سے بات کرنے جس نے تجھ سے میری چغلی کھائی ہے، جھوٹی چغلی۔"

عاتکہ نے کہا۔ "اس سے کچھ حاصل نہیں۔ ابراہیم بڑا شاطر معلوم ہوتا ہے۔ صاف مکر جائے گا اور درمیان میں میری شامت آ جائے گی اس لیے زیادہ بہتر یہی ہے کہ تو آئندہ اس شخص سے محتاط رہ۔"

عاتکہ جس روادارانہ اور مفاہمانہ لب و لہجے میں اس سے بات کر رہی تھی عریفہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، بولی۔ "لیکن عاتکہ! تو اگر یہی باتیں خیزران کے کانوں تک پہنچا دے تو میرا کیا انجام ہو گا؟"

عاتکہ نے جواب دیا۔ "لیکن میں یہ باتیں خیزران تک پہنچانے ہی کیوں لگی؟"

عریفہ کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا، بولی۔ ''میں ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھ، ضرور پوچھ۔''

عریفہ نے سوال کیا۔ ''میری بابت تیری اپنی کیا رائے ہے؟''

عاتکہ مسکرانے لگی۔ ''میری اپنی رائے تیری بابت؟ یہ سوال کیوں کر رہی ہے؟''

''اس لیے کہ ابھی تک میں اسی شبہے میں ہوں کہ تو یہاں خود سے نہیں آئی بلکہ تجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔''

''مجھے یہاں کس نے بھیجا ہوگا بھلا؟''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''شاید خیزران نے یا پھر کسی اور نے جس کا تعلق ہادی کے چھوٹے بھائی ہارون سے ہوگا۔''

عاتکہ نے کہا۔ ''تیرا پہلا شبہ درست ہے، مجھے خیزران نے بھیجا ہے اور اس لیے بھیجا ہے کہ میں ہادی سے خلوص بڑھا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ کہیں تو قصرِ خلافت میں ہادی کی مخبر تو نہیں ہے۔''

عریفہ حیران اور خوف زدہ ہو کر عاتکہ کی صورت دیکھنے لگی، بولی۔ ''پھر تو نے کیا محسوس کیا؟''

''میں نے کیا محسوس کیا یہ تو کوئی سوال ہی نہیں بلکہ اب تو یہ پوچھ کہ مجھے کیا معلوم ہوا؟ مجھے جو کچھ معلوم ہوا اس کا ذکر پہلے ہی کر چکی ہوں، ابراہیم کے حوالے سے۔''

''تو اب تو یہ باتیں خیزران تک پہنچا دے گی؟''

عاتکہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''یہ میری مرضی۔''

عریفہ نے ہادی کے بل بوتے پر ذرا سختی سے سوال کیا۔ ''عاتکہ! یہاں تیری مرضی نہیں چلے گی، یہ ہادی کا دربار ہے اور یہاں میری حکمرانی ہے، میں چاہوں تو تجھے ہمیشہ کے لیے دفعان کروا دوں۔''

عاتکہ نے جواب دیا۔ ''تو کروا دے دفعان، انتظار کس بات کا ہے؟''

عریفہ اس کی دیدہ دلیری پر حیران تھی۔ بولی۔ ''عاتکہ! آخر تو یہاں اکڑ کس کے بل بوتے پر رہی ہے کہیں تو نبیذ کی زیادہ مقدار تو نہیں پی گئی جو بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔''

عاتکہ نے جواب دیا۔ ''میں نے نبیذ پی ضرور ہے لیکن اتنی زیادہ نہیں پی کہ اپنے ہوش و حواس ہی گنوا بیٹھوں۔''

عریفہ چپ ہو کر عاتکہ کی صورت دیکھنے لگی۔

عاتکہ نے شوخی سے کہا۔ ''تو میری شکل کیا دیکھ رہی ہے عریفہ اور تو یہ جان کر اور زیادہ حیرت زدہ رہ جائے گی کہ تیرا خواب والا مضمون کا کاغذ تیرے سرہانے سے میں نے ہی چوری کر کے خیزران تک پہنچایا تھا۔''

عریفہ کا اب بہت برا حال ہو چلا تھا۔ عاتکہ کہتی رہی۔ ''اب تو یہ ساری باتیں ہادی کے گوش گزار کر دے تاکہ مجھے اس دنیا ہی سے دفعان کر دے۔''

عریفہ نے کہا۔ ''اب تو مجھے یہ شبہ ہو رہا ہے کہ کسی وجہ سے تیرا دماغی توازن جاتا رہا ہے جو تو اپنی راز کی باتیں برملا مجھے بتاتی چلی جا رہی ہے اور اپنی جان کی بھی پروا نہیں کر رہی۔''

عاتکہ نے کہا۔ ''عریفہ! میری باتیں ذرا غور سے سن، جب تو پہلے پہل ہادی سے ملی تھی اور قصرِ خلد میں اس کا چرچا ہوا تھا شاید سب سے زیادہ حسد میں نے ہی کیا تھا کیونکہ ہادی پر کمند ڈالنے کا منصوبہ شاید تجھ سے بھی پہلے میں نے تیار کیا تھا۔ میں پیچھے رہ گئی اور تو آگے نکل گئی۔ بس یہی حسد تھا جس نے مجھے تیرے خلاف کر دیا تھا، اسی حسد میں، میں نے تیرا... خط چرایا اور خیزران سے ساز باز کر کے تجھے یحییٰ برمکی کے سامنے ذلیل و خوار کیا اور یہی حسد تھا جو مجھے خیزران کے ایما پر یہاں تک لے آیا لیکن یہاں آکر میں تبدیل ہو گئی۔'' عاتکہ چپ ہو گئی۔

عریفہ مبہوت اور متجسس اس کی شکل دیکھتی رہی۔ عاتکہ کی خاموشی کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکی، بولی۔ ''ہاں پھر، پھر کیا ہوا؟''

عاتکہ کہنے لگی۔ ''یہاں آکر میں نے سوچا کہ اگر میں تجھے گرفتار کروا کے خیزران کے غضب پر قربان کروا دوں تو اس سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟ کچھ بھی نہیں بلکہ تیرے انجام کے بعد میں ہادی کے پاس کبھی نہ آسکوں گی۔ میں نے سوچا، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے رازدار بن جائیں اور تیرے توسط سے میں بھی ہادی سے راہ و رسم بڑھاؤں۔ کیا ہادی کے لیے اکیلی تو ہی کافی ہوگی؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہادی کے مزاج اور دل پر جو چند عورتیں یا لڑکیاں قابض ہوں گی ان میں تیرے ساتھ میں خود بھی شریک رہنا چاہتی ہوں۔''

عریفہ کی جان میں جان آئی، بولی۔ ''عاتکہ! تو کتنی سمجھدار ہے۔''

عاتکہ نے کہا۔ ''میں خیزران کو گھم میں رکھوں گی تاکہ میں ہادی سے بار بار ملتی رہوں اور چونکہ میں اوروں کی... بہ نسبت خیزران سے زیادہ قریب ہوں گی اس لیے اس کی

باتیں بھی میں ہی ہادی تک پہنچا سکوں گی۔ اس طرح ہادی کی نظر میں میرا وجود اور میری ضرورت بھی مقدم ہو جائے گی۔“

عریفہ نے کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ تو بتا، یہ ابراہیم کا کیا بنے گا؟ یہ تو خطرناک دوست ہے؟“

عاتکہ نے جواب دیا۔ ”تو بے فکر رہ، اس کا انتظام تو میں کروں گی۔“

ہادی اور ابراہیم دونوں ہی ان کی باتوں کو اگر سن نہیں سکتے تھے تو شک و شبہے سے دیکھ ضرور رہے تھے۔ ہادی نے ابراہیم سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ یہ دونوں آپس میں کس قسم کی باتیں کر رہی ہوں گی؟“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”جنابِ والا! مجھے تو یہ دونوں ہی مشکوک نظر آتی ہیں، ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“

عاتکہ نے ان دونوں کو باتیں کرتے جو دیکھا تو سمجھ گئی کہ ان دونوں ہی کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی، عریفہ سے بولی۔ ”عریفہ! میں ابھی آئی باتیں کر کے۔ اس ریاکار کا سارا زور توڑ دوں گی۔“

ابراہیم نے عاتکہ کو اٹھتے جو دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ ہادی سے کہنے لگا۔ ”مجھے یہ لڑکی کچھ زیادہ ہی چالاک نظر آتی ہے۔ اس سے ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔“

ہادی بولا کچھ نہیں بس حالات کا جائزہ ہی لیتا رہا۔ عاتکہ، ہادی کے روبرو آن کھڑی ہوئی، بولی۔ ”کیا میں مخل ہو سکتی ہوں؟“

ابراہیم نے تیوریوں پر بل ڈال کر جواب دیا۔ ”ہرگز نہیں۔“

لیکن ہادی نے نرمی سے کہا۔ ”ضرور...... ضرور کیا بات ہے؟“

ابراہیم نے احتجاج کیا۔ ”جناب والا! ہوش و حواس سے کام لیجیے ان پر زیادہ اعتبار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

عاتکہ نے طنزاً کہا۔ ”تو اعتبار کی بات کر رہا ہے۔ تو جو یہاں سب سے زیادہ ناقابل اعتبار ہے۔“

ابراہیم گھبراہٹ میں کھڑتے ہوتے ہوئے بولا۔ ”اچھا جناب! مجھے تو ذرا اجابت محسوس ہو رہی ہے۔ جناب اس سے گفتگو فرمائیں لیکن ذہن سے یہ بات نہ نکالیے گا کہ عورت عیار اور ناقص العقل ہوتی ہے۔“

عاتکہ نے کہا۔ ”ابراہیم! کہاں چلا؟ میں ابھی تیری بدہضمی کا علاج کیے دیتی ہوں۔ ذرا تھوڑی دیر بیٹھ تو سہی۔“

لیکن ابراہیم نہیں رکا۔ عاتکہ نے ہادی سے کہا۔ ”یہ نہیں رکے گا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“

ہادی نے پوچھا۔ ”آخر بات کیا ہے؟“

عاتکہ نے جواب دیا۔ ”ہادی! تیرے مصاحبین اور اصحاب میں سب سے زیادہ ناقابلِ اعتبار یہی شخص ہوگا۔“

اس کے بعد اس نے اپنی، خیزران کی اور عریفہ اور ابراہیم کی پوری روداد سنادی۔ آخر میں بولی۔ ”میں کیا کوئی شخص بھی ولی عہد کے خلاف کسی سازش میں کس طرح کوئی حصہ لے سکتا ہے۔ میری ہمدردیاں بھی تیرے ساتھ ہیں۔ آج میری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو عریفہ کی شمع حیات جھلملا رہی ہوتی اور پھر صبح و شام میں کسی بھی وقت بجھ جاتی۔ ابراہیم نے اپنی دانست میں تو کوئی کسر چھوڑی نہ تھی۔“

ہادی نے تعجب سے کہا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ ابراہیم نے اس قسم کی باتیں کیں اور ان باتوں سے اس کا مقصد کیا تھا؟“

عاتکہ نے جواب دیا۔ ”اس کا مطلب بھی مجھے معلوم ہو چکا ہے، وہ عریفہ کو ورغلا کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

ہادی نے کہا۔ ”خوب...... یہ کیا بات ہے؟“

عاتکہ نے جواب دیا۔ ”ولی عہد کو اب ابراہیم جیسے دوست نما دشمن سے ہر وقت ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔“

ہادی نے کہا۔ ”انسان کا نفس امارہ اس کا بدترین دشمن ہے اور اس سے نجات پانا ناممکن ہے تو ایک ناممکن بات کی خاطر دوستوں اور مخلصوں کو ضائع کر دینا دانشمندی نہیں۔ ہاں میں یہ کوشش ضرور کروں گا کہ کسی بھی شخص کا نفس امارہ خود اس کو نقصان پہنچائے میں اس سے محفوظ رہوں۔“

عریفہ بھی ہادی کے پاس ہی پہنچ گئی۔ ہادی نے دونوں کو مخاطب کیا۔ ”تم سب کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ خلافت میرا حق ہے۔ میں ولی عہد ہوں اور میرے باپ نے مجھے اس لیے ولی عہد نہیں بنایا کہ میں اس کا بڑا بیٹا ہوں بلکہ اس لیے بنایا ہے کہ میں اپنے باپ اور زمانے کی نظر میں اس کا اہل ہوں۔ آج اس پُرآشوب دور میں جو لوگ میرا ساتھ دیں گے گویا وہ ایک ثمردار درخت کا بیج ڈالیں گے، جس کے لذیذ پھل کل کھائیں گے۔“

پھر ہادی نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو اپنے قریب بلایا۔ ان سب کی نظریں ہادی کے چہرے پر لگی تھیں۔ ہادی نے ان سب کو مخاطب کیا۔ ”میرے ساتھیو...! دوستو... ! کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟“

کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ ”ہاں ہم جانتے ہیں کہ تو ولی عہد ہے۔“

ہادی نے کہا۔ ”نہیں، اپنے اس قول میں تم سب سچے نہیں ہو۔ میں تم میں چند منافق بھی دیکھ رہا ہوں۔ جن کی

زبانیں میرے ساتھ ہیں مگر ان کے دل اور دماغ میرے مخالفین کے ساتھ۔ وہ میری مجلسوں میں آتے ہی اس لیے ہیں کہ انہیں یہاں سے جو کچھ معلوم ہو میرے مخالفوں کے گوش گزار کردیں۔ مجھے ان کی کوئی پروا نہیں کیونکہ میں حق پر ہوں اور وہ جھوٹ پر اور فتح آخر کار حق ہی کی ہوتی ہے۔''

کئی پرجوش نوجوان کھڑے ہو گئے۔ بولے۔''ان کی نشان دہی کی جائے ہم انہیں یہیں ٹھکانے لگا دیں گے۔''

ہادی نے کہا۔''نشان دہی میں کیوں کروں۔ تم میں جو میرے وفادار ہیں ذرا سی کوشش اور توجہ سے انہیں پہچاننے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جو میرے وفادار یا جاں نثار نہیں ہیں انہیں پہچاننے کا کام بھی میں تمہارے ہی سپرد کرتا ہوں۔''

ابراہیم ابھی تک غائب تھا لوگوں نے اس کی کمی بری طرح محسوس کی اور انہیں شبہ گزرا کہ شاید اشارہ خاص طور پر ابراہیم کی طرف ہے۔ عریفہ اور عاتکہ نے بھی یہی اندازہ لگایا کہ ہادی نے گو کہ اب تک ابراہیم کی مخالفت نہیں کی ہے لیکن اس کے دل میں ابراہیم کے خلاف گرہ ضرور پڑ گئی ہے۔

☆☆☆

خیزران نے عاتکہ سے ہادی اور عریفہ کی بابت معلوم کیا تو یہ جان کر کسی حد تک مطمئن ہو گئی کہ بہ ظاہر کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔ خیزران نے کہا۔

''لیکن پھر بھی یہ ضروری ہے کہ تو ہادی سے ربط وضوابط قائم رکھ اور لگاتار کوشش میں رہ... اگر ان دونوں میں کوئی خاص معاملہ ہے تو اس کا پتا چل جائے۔''

عاتکہ نے جواب دیا۔''میری کوشش تو یہی رہے گی۔ آگے اللہ کی مرضی۔''

ہارون اپنے فاتح لشکر سمیت باب کوفہ تک پہنچ چکا تھا۔ بغداد میں اس کے استقبال کی شاندار تیاریاں کی جا چکی تھیں۔ ایسا لگتا تھا گویا ہارون کو اس کے کارنامے سے زیادہ سراہنا اور پذیرائی کرنا ہے۔ ہارون نہایت شان وشوکت سے بغداد میں داخل ہوا۔ خیزران نے اس کے داخلے کا نظارہ قصر خلد کے بالائی جھروکوں سے کیا۔ بغداد والوں نے اس پر پھول برسائے، داد وتحسین کے نعرے لگائے۔ ہارون رومی مردوں اور عورتوں کی ایک کثیر تعداد بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ لوگ بغداد میں رضا کارانہ طور پر آئے تھے۔ جزیے اور مال غنیمت کا انبار بھی اس کے ساتھ تھا۔ استقبال کرنے والوں کی تکبیر وتہلیل کی آوازیں پورے بغداد میں گونج رہی تھیں۔ لوگ ہارون کے دیدار کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

ہادی اور اس کے ساتھیوں نے یہ منظر نفرت اور حسد سے دیکھا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر اس میں اتنی خوشی کی کیا بات تھی کہ لوگ پاگل ہوئے جا رہے ہیں لیکن ہادی خوب جانتا تھا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ وہ نظارے بازی سے فرصت پا کر سیدھا اپنے باپ مہدی کے پاس پہنچا اور شکایتاً کہا۔''ابا جان! کیا ہارون نے واقعی کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جو اس کی اتنی شاندار پذیرائی کی جا رہی ہے؟ کیا اس جنگ کی ساری عزت افزائی کا مستحق یزید بن مزید نہیں ہے جو عساکر عباسیہ کا سپہ سالار بھی تھا؟''

مہدی نے تنبیہ کی۔''ہادی! ادب اور ہوش وحواس سے بات کر۔ ہارون تیرا چھوٹا بھائی ہے اس کی شان وشوکت اور عزت افزائی پر دوسروں کے مقابلے میں تجھے زیادہ خوش ہونا چاہیے نہ کہ تو حسد کر رہا ہے۔''

ہادی نے شوخ وشریر بچے کی طرح جواب دیا۔''بابا جان! میں حسد نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس میں اپنے لیے خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں۔ یہ سب کچھ ہارون کی ماں کے اشارے پر ایک خاص مقصد سے ہو رہا ہے۔''

مہدی کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔''ہارون کی ماں؟ کیا مطلب؟ کیا خیزران تیری ماں نہیں ہے؟''

ہادی نے جواب دیا۔''ہوگی لیکن وہ جس طرح ایک بیٹے پر دوسرے کو ترجیح دے رہی ہے اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ ہارون کی ماں تو ضرور ہے لیکن میری ماں ہرگز نہیں۔''

مہدی کے کسی مصاحب نے ہادی کا مذاق اڑایا۔''ہادی تو اپنے ماں باپ کے بارے میں یہ کیسی باتیں کر رہا ہے کیا تو اس بات سے خوف زدہ نہیں ہے کہ امیر المومنین تجھے ولی عہدی سے خارج کر سکتے ہیں اور تیری جگہ ہارون کو شرف ولی عہدی عطا فرما سکتے ہیں؟''

مہدی نے مصاحب کو ڈانٹ دیا۔''فضول بات مت کر کیا تجھے معلوم نہیں کہ ہادی میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو میرے جانشین میں ہونی چاہئیں۔ ہادی بہادر بھی ہے اور ساتھ ہی پیش قدمی کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس کے جسم میں قوت برداشت بھی غیر معمولی ہے۔''مہدی نے پوچھا۔''ہادی تو کیا چاہتا ہے؟''

ہادی نے جواب دیا۔''صرف یقین دہانی کہ ولی عہدی کے بارے میں جو افواہیں گشت کر رہی ہیں، وہ غلط ہیں اور میری ولی عہدی ناقابل تنسیخ ہے۔''

''تو یقین رکھ کہ تیری ولی عہدی ناقابلِ تنسیخ ہے۔''
ہادی نے کہا۔ ''لیکن اس کی تلافی کس طرح ہوگی کہ ہارون نے تو بلاوجہ اتنی شہرت حاصل کرلی اور میں اس کے اس فضول کارنامے کی وجہ سے گمنامی میں چلا گیا۔''

مہدی نے جواب دیا۔ ''مت گھبرا ہادی، مت گھبرا۔ میں تیرے لیے بھی ایک موقع فراہم کردوں گا۔''

ہادی کسی قدر مطمئن ہوگیا۔ مہدی نے ذرا سکوت کے بعد کہا۔ ''تو ابراہیم کو اپنی مصاحبت سے دور کردے۔''

ہادی نے پوچھا۔ ''لیکن ابراہیم کی خطا، اس کی غلطی؟''

مہدی چراغ پا ہوگیا۔ ''تو مجھ سے اس کی خطا پوچھتا ہے، غلطی معلوم کرنا چاہتا ہے۔ مجھ سے، اپنے باپ سے، امیرالمومنین سے۔ یہ اس نالائق کی صحبت ہی کا اثر ہے کہ تو گستاخ ہوگیا ہے۔ بخدا اگر تو نے اسے اپنی صحبت سے دور نہ کیا تو میں اسے قتل کروادوں گا۔'' ہادی کوئی جواب دیے بغیر چلا گیا۔

قصرِ خلد میں خیزران کی طرف سے دباؤ بڑھنے لگا۔ وہ ہارون کی ولی عہدی پر مصر تھی اور مہدی پہلو بچا رہا تھا۔ خیزران نے شکایتاً کہا۔ ''تو نے ہارون کے لیے اب تک کیا ہی کیا ہے۔ بغداد والوں نے اس کا شاندار استقبال کیا لیکن خود تو نے کیا کیا۔ تو نے اس کے اعزاز میں کوئی جشن بھی منعقد نہیں کیا؟ تجھے شاعروں سے ہارون کی شان میں قصیدے لکھوانے تھے اور اس کے اعزاز و اکرام میں کوئی غیر معمولی اعلان کرنا چاہیے تھا۔''

مہدی نے جواب دیا۔ ''اگر تو یہ چاہتی ہے کہ ہارون کو میں خلافت کی طرف سے بڑھاؤں چڑھاؤں تو یہ میرے خیال میں مضر ثابت ہوگا۔ اس طرح ہادی، اس کے خوشامدی مصاحبین اور بغداد کے لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ ہارون کے لیے لوگوں نے جس جوش و خروش اور پذیرائی کا مظاہرہ کیا ہے اس میں ہم دونوں کی ایما اور کوششیں شامل تھیں۔''

ضدی خیزران نے جواب دیا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی میں جو کہتی ہوں تو وہی کرے گا۔ ہارون کے لیے شاندار جشن کا اہتمام و انتظام اور ہادی کے بجائے اس کی ولی عہدی کا اعلان۔''

مہدی نے کہا۔ ''سرکش عورت! تو میرے ذریعے ایک خطرناک کھیل کھیل رہی ہے اور نہیں جانتی کہ اس کے کیا نتائج نکلیں گے۔''

خیزران نے جواب دیا۔ ''حکومت تیرے ہاتھوں میں ہے یا کسی اور کے ہاتھ میں؟ یہاں کون ہے جو تیرے فیصلوں پر ناگواری کا اظہار کرے۔ تیرا فیصلہ قانون ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔''

مہدی بہت دل برداشتہ ہو رہا تھا، بولا۔ ''خیزران! میرے علاوہ ایک طاقت اور ہے جو مجھے اور تجھے نقصان پہنچا سکتی ہے اور اس سے ہمیں ڈرنا چاہیے۔''

خیزران نے حیرت سے پوچھا۔ ''میں بھی تو جانوں کہ تجھ سے بھی بڑی اور کون سی طاقت ہے؟''

مہدی نے جواب دیا۔ ''بغداد اور خلافتِ اسلامیہ کے باشندوں کی، امرا اور وزرا کی، جن کی ہمدردیاں مظلوم ہادی کے حق میں ہوں گی۔''

خیزران نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''میں ان سے نہیں ڈرتی، فوج تیرے حکم کے تابع ہے۔''

آخر خیزران کی خواہش کے آگے مہدی سرنگوں ہوگیا اور قصر خلد میں ایک شاندار جشن منانے کا اعلان کردیا۔ اس جشن میں امرا اور وزرا کے علاوہ فوج کے افسروں اور سالاروں کو خاص طور پر بلایا گیا اور نامی گرامی شعرا کو حکم دیا گیا کہ وہ ہارون کی شان میں قصائد لکھیں۔

اس اعلان نے ہادی کو ایک بار پھر شک و شبے میں مبتلا کردیا۔ اب ہادی کی اپنی سمجھ بوجھ اسے شک و شبے میں مبتلا کررہی تھی۔ جس طرح ہارون کو اتالیق اور معتمد کے طور پر یحییٰ برمکی دیا گیا تھا اسی طرح ہادی کو ابان بن صدقہ ملا تھا۔ ابان بن صدقہ اپنے عہد کا مشہور عیار اور شاطر تھا اور یحییٰ برمکی سے اس کی خاندانی چپقلش چلی آرہی تھی۔ ہادی نے ابان صدقہ سے پوچھا۔ ''ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

ابان بن صدقہ نے جواب دیا۔ ''ہادی! تو کیوں پریشان ہوتا ہے، اپنے معاملات میرے سپرد کر۔ میں یحییٰ اور خیزران بھی کو درست کردوں گا۔''

ہادی نے کہا۔ ''میں برابر یہ محسوس کررہا ہوں کہ امیرالمومنین میری ماں کے اشاروں پر ادھر ادھر بہک رہے ہیں اور کچھ پتا نہیں کہ ان کا واقعی قطعی اور آخری فیصلہ کیا ہوگا؟''

ابان نے جواب دیا۔ ''ان کا آخری اور قطعی فیصلہ یہی ہوگا تو ولی عہد ہے۔ میں تیری ولی عہدی کے قرار اور استحکام کے لیے اپنی جان کی بازی لگادوں گا۔''

ہادی کو ابان کا زبردست سہارا مل گیا۔ ابان نے کہا۔ ''لیکن ہادی! تجھے اس جشن میں شرکت ضرور کرنی چاہیے۔''

ہادی نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں اس جشن میں شریک بھی ہوگیا تو میرا چہرہ اور میری حرکات

وسکنات، میری افسردگی اور حسد کو ظاہر کردیں گی۔"

ابان نے تاکید کی۔ "تو خوش رہنے کی کوشش کرے گا گو کہ یہ منافقت ہے لیکن یہ منافقت کہاں نہیں ہے۔ امیر المومنین، خیزران، ہارون کون ہے جو اس منافقت کا شکار نہیں، کون ہے جو اس دوعملی کا اسیر نہیں؟"

ہادی نے کہا۔ "بہر حال! میں کوشش کروں گا۔"

ابان نے کہا۔ "کوشش کرنا کیا معنی، تجھے یہ منافقت عادت کے طور پر اختیار کرنی ہوگی کیونکہ حکمرانی اور منافقت لازم وملزوم ہیں۔ ایک شاندار حکمران ہی شاندار منافق ہوتا ہے۔"

ہادی، ابان کے پندونصائح گرہ میں باندھ رہا تھا اور یہ فیصلہ کرچکا تھا کہ کچھ بھی ہوا سے ابان کے مشوروں پر عمل کرنا ہی پڑے گا کیونکہ اس کا جن سے مقابلہ تھا وہ سارے ہی منافقت کے حربوں سے لیس تھے۔

☆☆☆

قصر خلد کے ایک حصے میں شاندار جشن منایا جارہا تھا۔ ہارون کو مہدی کے بائیں طرف اور ہادی کو دائیں طرف بٹھایا گیا تھا۔ ان کے سامنے امرا اور وزرا کے ساتھ فوجی افسروں اور سپہ سالاروں کے پرے بیٹھے تھے۔ ایک طرف وہ شعرا تھے جنہیں ہارون کی مدح سرائی کرنی تھی۔ خیزران پردے کے پیچھے سے یہ مسرت افزا نظارہ کررہی تھی۔ اس کے سامنے باریک سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد کنیزوں کا ہجوم تھا اور انہی کنیزوں میں عریقہ اور عاتکہ بھی شامل تھیں۔ ان کی نظریں ہادی پر لگی تھیں۔

ہارون کا اتالیق یحییٰ برمکی اور ہادی کا ابان بن صدقہ آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو رشک وحسد سے دیکھ رہے تھے۔ مہدی نے شعرا کو اشارہ کیا کہ وہ ہارون کی مدح سرائی کریں۔ کئی شعرا کے بعد مشہور شاعر مروان بن حفصہ اٹھا اور قصیدے کے زوردار اشعار سنانا شروع کیے۔

"ہارون! تو نے روم پر دھاوا بولا
اور اس کی دیواروں کو ڈھا دیا
تیری تیر اندازی کے باعث ملوکِ روم جزیہ لے کر حاضر ہوگئے
اور جنگ کے شعلے سرد پڑ گئے۔"

قصیدہ بہت پسند آیا اور مہدی نے مروان بن حفصہ کو مالا مال کردیا۔ اس کے بعد لوگوں نے ہارون کو مبارک بادیں پیش کیں اور مہدی نے ان سب کو انعام واکرام دے کر مالا مال کردیا۔ ہادی کو ایسا لگ رہا تھا گویا وہ ولی عہد کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ خیزران کی آنکھوں سے خوشی میں آنسو رواں ہوگئے۔ عریقہ اور عاتکہ الگ رشک کررہی تھیں۔

ایک شخص نے یحییٰ برمکی کو سرگوشی میں مطلع کیا۔ "ملکہ عالیہ فرمارہی ہیں کہ اگر ہارون کو ولی عہد نہیں قرار دیا جاسکتا تو ولی عہد دوم ہی قرار دے دیا جائے۔"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "ملکہ سے کہہ دے کہ اس کام کے لیے یہ مناسب وقت نہیں ہے۔ وہ بے فکر رہیں، یہ کام ہو ضرور جائے گا۔"

مہدی نے حکم دیا۔ "ہارون روم کی فتح مندی کے عوض جو مال غنیمت لایا ہے اسے فروخت کردیا جائے تاکہ یہ رقم روم کی جنگ میں شرکت کرنے والوں میں بہ حصہ مناسب مساوی تقسیم کردیا جائے۔"

دوسرے دن اس پر عمل کردیا گیا، بازار میں اسلحہ، زرہ بکتروں، گھوڑوں اور غلاموں اور کنیزوں کی بھیڑ لگ گئی۔ چیزوں کی کثرت نے ان کے دام گرادیے۔ بیس بیس تلواریں ایک درہم میں فروخت ہوگئیں۔ مال غنیمت کی فروخت سے جو دولت اکٹھی ہوئی۔ اس کی تقسیم کے لیے ایک بار پھر شاندار جشن منایا گیا۔ رجب ۱۶۶ ھ (۷۸۲ء) کے ایک جمعے کے دن مہدی نے ہارون کے فوجیوں میں مال غنیمت کی رقم تقسیم کی۔ اس اجتماع میں یحییٰ برمکی ایک دم کھڑا ہوگیا اور عرض کیا۔ "امیر المومنین! بہت مناسب ہوگا اگر ایک بار پھر تجدید بیعت ہوجائے اور ہارون کو دوسرا ولی عہد قرار دے دیا جائے۔"

مہدی نے یحییٰ کی تائید کی اور اعلان کردیا کہ "ولی عہد نمبر ایک بدستور ہادی رہے گا اور ولی عہد نمبر دو ہارون کو قرار دیا جارہا ہے اور آج کے بعد سے ہارون محض ہارون نہیں ہوگا بلکہ ہارون رشید کہلائے گا۔"

مہدی نے یہ اعلان کر تو دیا تھا لیکن دل اور دماغ پر اتنا بوجھ محسوس کیا کہ رات کو بستر پر جانے کے بعد وہ دیر تک سو نہیں سکا۔

خیزران نے عاتکہ کو حکم دیا کہ وہ ہادی سے مل کر اس کے تاثرات معلوم کرے۔

دوسرے دن صبح جب عاتکہ ہادی کے پاس جانے والی تھی تو اس نے ایک نئی خبر سنی۔ اس رات مہدی نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا تھا۔ مہدی نے خواب میں دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں دو شاخیں ہیں، اس نے ایک شاخ ہادی کے سامنے اور دوسری ہارون کے سامنے ڈال دی۔ ہادی کی شاخ اوپر سے مرجھا گئی مگر ہارون کی شاخ مکمل طور پر سرسبز وبار آور ہوگئی۔

مہدی نے اپنا یہ خواب خیزران سے بیان کیا۔

خیزران خوشی سے پاگل ہوگئی، بولی۔ ''ولی عہد نمبر ایک تھوڑے عرصے کے لیے خلیفہ بن سکے گا اور ولی عہد نمبر دو ایک لمبے عرصے تک حکومت کرے گا۔''

مہدی نے آہستہ سے کہا۔ ''اگر تیری تعبیر درست ہے تو اس کا کسی اور سے چرچا نہ کرنا ورنہ معاملات خراب ہوجائیں گے۔''

لیکن عاتکہ یہ خبر لے کر ہادی کے پاس پہنچ گئی اور پورا خواب سنا کر بولی۔ ''ہادی! اب تو کیا کہتا ہے؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''یہ سب میرے خلاف سازشیں ہورہی ہیں اور خدا وہ دن نہ لائے جب میں انتہائی سفاکی سے اپنا حق حاصل کروں۔''

عاتکہ نے کہا۔ ''مجھے تیرے پاس اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں ہارون کی ولی عہدی کے بارے میں تیرے تاثرات معلوم کروں۔''

ہادی نے جواب دیا۔ ''تو میری ماں سے جا کر کہہ دے کہ اس نے جس جنگ کا آغاز کیا ہے اس میں کسی ایک کی ہار تو یقینی ہے اور میں ولی عہد نمبر ایک ہوں۔ قصرِ خلد میرے تصرف میں رہے گا۔ عاتکہ تو واپس جا کر عریفہ کو میرے پاس بھیج دے۔ اب میں بھی قصرِ خلافت میں اپنے مداحوں اور حمایتیوں کی جمعیت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ عریفہ اگر پسند کرے تو وہ میری کنیز خاص کی حیثیت سے کھلم کھلا رہ سکتی ہے اور اس کے ساتھ ہی عاتکہ تو بھی۔''

عاتکہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ وہ کون سی روش اختیار کرے، کھلم کھلا ہادی کی حمایتی بن جائے یا بدستور خفیہ نمائندگی کرتی رہے۔ اس موقع پر ابراہیم بھی موجود تھا۔ اس نے ہادی کو مشورہ دیا۔ ''ہادی! تو کسی پر بھی اعتماد کرلے لیکن عریفہ پر اعتبار نہ کرنا۔''

ہادی نے جھنجلا کر پوچھا۔ ''آخر کیوں؟ تو عریفہ کی مخالفت کیوں کرتا رہتا ہے؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ وہ میری رائے میں قابلِ اعتبار نہیں ہے۔''

ہادی نے کہا۔ ''اچھا اس وقت تو، تو کہیں ٹل جا، میں عاتکہ سے باتیں کرلوں۔''

ابراہیم سامنے سے ہٹ گیا۔ ہادی عاتکہ سے پیار و محبت کی باتیں کرنے لگا، بولا۔ ''عاتکہ! ان مشکل حالات میں جو بھی میرا ساتھ دے گا، آنے والے دنوں میں اچھی فصل کاٹ سکے گا۔''

عاتکہ نے شرما کر جواب دیا۔ ''میں تو ولی عہد کی ادنیٰ کنیز ہوں۔ جو کام عریفہ نہ کرسکے میں انجام دینے کو تیار ہوں۔''

ہادی نے کہا۔ ''سردست تو، تو میری ماں کو میری طرف سے بدگمان نہ ہونے دے، اس کے بعد کچھ اور بتاؤں گا۔''

عاتکہ نے کہا۔ ''میں راتوں کو تہجد پڑھتی ہوں اور تیری خلافت اور حکومت کے لیے گڑگڑاتی رہتی ہوں۔ اگر تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو مجھے اس کا کیا صلہ ملے گا؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''عریفہ کے بعد تیرا ہی مرتبہ ہوگا۔''

عاتکہ نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''کیا خاک مرتبہ ہوگا عریفہ کے بعد کا۔ اس دن عریفہ تیری مجلس سے شاد کام گئی تھی جبکہ مجھے تو نے یونہی چلتا کردیا تھا۔''

ہادی ہنس دیا، عاتکہ کے گال پر ہلکی سی چپت رسید کردی۔ ''آہوئے ختن! کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں کتنا پریشان ہوں۔ آج تو عریفہ کی قائم مقام ہے۔ میں تیری آغوش میں دنیا کے سارے غم اور خدشے بھلادوں گا۔''

عاتکہ، ہادی کی آغوش میں گر گئی۔ ہادی نے اسے آسودگی بخشنے کی کوشش میں بڑا وقت ضائع کیا لیکن عاتکہ نے اس وقت ایک دوسری ہی کیفیت محسوس کی۔ اسے ہادی کی آغوش میں ہارون یاد آتا رہا۔ وہ ہارون جو قسطنطنیہ کی مہم سے واپس آکے اپنی تعریف و توصیف کے خزائن وصول کرچکا تھا۔ عاتکہ کو یہی محسوس ہوا کہ ہادی محض عورتوں کا دلدادہ ہے اور ولی عہد بھی ہے مگر اس کے مقابلے میں شاید ہارون زیادہ شاندار ہے، اس کا مستقبل بھی درخشاں نظر آتا ہے۔

ہادی نے اسے فکرمند جو دیکھا تو پوچھا۔ ''اس کیف و لذت کی ساعتوں میں یہ فکرمندی کیسی؟''

عاتکہ نے جواب دیا۔ ''میں تیری قسمت پر غور کررہی تھی کہ خدا نے تجھے ولی عہد پیدا کیا ہے لیکن زمانہ تیرے آڑے آنے کی کوشش کررہا ہے۔''

ہادی نے پوچھا۔ ''اور کچھ یا بس اسی قدر سوچ رہی تھی؟''

عاتکہ نے جواب دیا۔ ''اور میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اس دنیا میں لوگوں کی قسمتیں کام کرتی ہیں۔ تو بھی بہت سی قسمتوں کو اپنے ساتھ کرلے شاید ان میں کی کوئی ایک قسمت تیرے حق میں مفید اور کارگر ثابت ہوجائے۔''

ہادی نے عاتکہ کی آنکھوں میں اپنی صورت دیکھنے کی

کوشش کی، بولا۔ ''کسی کی قسمت پر مجھ پر اثر انداز ہو یا نہ ہو لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ میری صورت تیری آنکھوں پر ضرور اثر انداز ہو رہی ہے۔''

عاتکہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

ہادی کو بدلتے ہوئے حالات پر یقین نہیں رہا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ کل کیا ہوگا، اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ حظ اٹھانے پر مائل تھا۔ وہ معلوم نہیں کتنی دیر تک عاتکہ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ آخر اس مزے کو عریفہ نے کرکرا کر دیا۔ وہ اچانک آگئی تھی اور اس نے ہادی کے ساتھ عاتکہ کو جو دیکھا تو حسد و رقابت سے جل بھن گئی۔ ہادی اسے دیکھ کر شرمایا نہیں، مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''عریفہ! کوئی خاص خبر؟''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''خاص خبر یہ ہے کہ میں نے خیزران کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہادی کے حمایتیوں سے قصر خلد کو پاک کر دیا جائے، اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ میں قصر خلافت میں کب تک رہ سکوں گی۔''

ہادی نے جواب دیا۔ ''تو زندگی بھر وہیں رہے گی کیونکہ خیزران کی حکومت اسی وقت تک قصر میں رہے گی جب تک ہم میں امیرالمومنین موجود ہیں۔ جب میں برسر اقتدار آجاؤں گا، اس دن میری ماں کی حکومت ختم ہو جائے گی۔''

اسی وقت ابراہیم نے دستک دینی شروع کر دی، بولا۔ ''ہادی! میرے آقا! ذرا باہر تو آ، دیکھ یہاں تیرا کون انتظار کر رہا ہے۔''

ہادی نے ناک بھوں سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا مصیبت ہے، تم لوگ گھڑی دو گھڑی مجھے غم بھی غلط نہیں کرنے دیتے۔''

ہادی باہر نکلا تو دروازے پر اپنے اتالیق اور وزیر ابان بن صدقہ کو کھڑے دیکھا۔ ابان نے کہا۔ ''میں یہاں دروازے پر کھڑے ہو کر باتیں نہیں کروں گا۔ مجھے اندر بٹھا تا کہ تجھے ایک خوش خبری سناؤں۔''

ہادی، ابان کو اندر لے گیا۔ وہاں اس نے عریفہ اور عاتکہ کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھا پھر پوچھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''قصر خلد میں میری ہمدرد اور مددگار، میری ماں کی شرانگیزیوں کی ساری خبریں مجھے یہی دونوں پہنچاتی ہیں۔ اس لیے میں ان دونوں پر بہت مہربان ہوں۔''

ابان نے بے زاری سے کہا۔ ''انہیں یہاں سے ہٹا دے۔''

ہادی نے ان دونوں سے درخواست کی کہ وہ دونوں ذرا سی دیر کے لیے دوسرے کمرے میں چلی جائیں۔

تنہائی میں ابان نے بتایا۔ ''ہادی! تیری آزمائش اور امتحان کا موقع بھی آگیا ہے، تو جانے کی تیاری کر۔ جرجان میں بغاوت ہو گئی ہے اور میں امیرالمومنین سے کہہ سن کر تجھی کو اس مہم پر روانہ کرواؤں گا تاکہ تیرا بھی ہارون ہی کی طرح استقبال ہو اور لوگ تیرے حضور میں کھڑے ہو کر تیری ہی رطب لسانی کریں اور لوگوں پر تیری ہی ہیبت اور شخصیت کی دھاک بیٹھ جائے۔''

ہادی نے بے دلی سے کہا۔ ''لیکن ہارون کے لشکر کی سپہ سالاری تو یزید بن مزید شیبانی کر رہا تھا، جو جنگ و حرب کا پرانا ماہر اور نامور فوجی ہے۔ اس کی فتح و نصرت کو ہارون نے اپنی ذات سے وابستہ کر لیا۔''

ابان کا چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا، بولا۔ ''خوش ہو کہ وہی یزید بن مزید شیبانی تیرے لشکر کی بھی قیادت کرے گا کیونکہ میں نے اسے ورغلا کر توڑ لیا ہے۔''

ہادی کا چہرہ واقعی دمکنے لگا، ابان واپس جاتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت مجھے تجھ سے زیادہ باتیں نہیں کرنا ہیں پھر کر لوں گا۔ اب میں واپس جاؤں گا کیونکہ جانے سے پہلے مجھے یہاں کا نظم و نسق درست کرنا ہے تاکہ ہماری عدم موجودگی میں ہمارے مخالف کوئی بڑا قدم نہ اٹھا سکیں۔''

ہادی نے جواب دیا۔ ''میرے سارے ہی ساتھی ...... دل و جان سے وفادار ہیں۔''

ابان نے پوچھا۔ ''کیا یہ دونوں لڑکیاں بھی؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں؟ مجھے ان دونوں پر بڑا اعتماد ہے۔''

ابان نے کہا۔ ''پھر ان دونوں سے بھی مجھے ایک کام لینا پڑے گا۔''

ہادی نے پوچھا۔ ''وہ کیا؟''

ابان نے جواب دیا۔ ''وہ میں ان دونوں کو ہی بتاؤں گا۔''

ہادی نے ابان سے کہا۔ ''میں کام کی نوعیت تو سمجھ لوں، اس کے بعد بتاؤں گا کہ اسے ان دونوں میں سے کون انجام دے سکے گا۔'' پھر اس نے دونوں کو بلا لیا۔

ابان نے ادھر ادھر دیکھ کر عریفہ سے پوچھا۔ ''کیا تو خود میں اتنی ہمت پاتی ہے کہ ہادی کے لیے ہر کام کر گزرے؟''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''ہاں مگر کام تو معلوم ہو۔''

ابان نے عاتکہ سے پوچھا۔ ''اور تو کیا کہتی ہے اس سلسلے میں؟''

''میں کوشش کروں گی کہ عریفہ سے پیچھے نہ رہوں۔''

ابان نے کہا۔ ''تب پھر تم دونوں اس وقت کا انتظار کرو، جو دبے پاؤں چلتا سرکتا مہدی کے قریب پہنچ چکا ہے اور جو ولی عہدی اور جانشینی کا قطعی فیصلہ ہادی کے حق میں کردے گا اور اس وقت کو ہم سب کے سامنے لا کھڑا کرنے کا کام تم دونوں کو انجام دینا ہوگا۔''

عریفہ نے پوچھا۔ ''وہ کام کیا ہوگا؟''

عاتکہ بولی۔ ''اگر یہ ابھی سے معلوم ہوجائے تو اس کی منصوبہ بندی میں پریشانی نہیں اٹھانا پڑے گی۔''

ہادی ان تینوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ اس نے ابان سے پوچھا۔ ''ابنِ صدقہ! میں تیرا مطلب نہیں سمجھ سکا۔''

ابان نے جواب دیا۔ ''قبل از وقت مطلب سمجھنا آسان بھی نہیں۔'' اس کے بعد اس نے دونوں لڑکیوں سے کہا۔ ''میں ہادی کے ساتھ جرجان کی بغاوت کچلنے بغداد سے چلا جاؤں گا، تم دونوں محل سرا میں موجود میری ہدایات کا انتظار کروگی پھر جب میری ہدایات وصول ہوجائیں تو تم دونوں اپنی ذہانت اور قوتِ عمل سے کام لیتے ہوئے ان پر عمل کرگزرو۔''

ابان نے ہادی کو آنکھ کے اشارے سے ہدایت کی کہ عریفہ اور عاتکہ کو رخصت کردیا جائے۔

ہادی نے ابان کی ہدایت پر ان دونوں کو رخصت کردیا۔ ان کے جاتے ہی ابان نے ہادی کے کان میں کہا۔ ''ہادی! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جرجان میں قیام کے دوران ہی اس کھیل کو انجام تک پہنچادوں۔''

''وہ کس طرح؟'' ہادی بہت پریشان تھا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

ابان نے جواب دیا۔ ''اپنی تجویز یا منصوبہ میں اسی وقت بتا سکتا ہوں کہ جب تو بھی حلف اٹھا کر یہ وعدہ کرلے کہ تو اس کا اظہار قبل از وقت کسی اور کے سامنے نہیں کرے گا۔''

ہادی نے کہا۔ ''میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں۔''

ہادی نے قرآن پاک کو شاہد بنایا کہ وہ ابان کی تجویز یا منصوبے کا اس وقت تک کسی اور کے سامنے ذکر نہیں کرے گا۔ تب کہیں جاکر ابان نے سرگوشی میں اپنے منصوبے کا اظہار کیا۔ اس نے کہا۔ ''ہادی! اب حالات اور واقعات اس موڑ تک آچکے ہیں کہ جہاں مہدی کو تیرے خلاف کوئی خطرناک فیصلہ کرنا پڑے گا۔ تو جرجان جارہا ہے اور تیرے ساتھ تیرے تمام رفیقوں اور ہمدردوں کو بھی جرجان روانہ کردیا جائے گا۔ بغداد کا میدان خالی ہوگا، یہاں خیزران ہوگی، یحییٰ ہوگا، ہارون ہوگا اور ہارون کے ہمدرد اور حمایتی ہوں گے اور تیرے خلاف منصوبے بنیں گے، سازشیں ہوں گی اور غالباً ایسی صورت حال پیدا کردی جائے گی کہ تیرا ذرا سا اشتعال یا غلط فیصلہ تجھے ولی عہدی سے معزول کروادے، تجھے معتوب قرار دے دے۔ میری نظریں مستقبل کے دبیز سینے کو چیر کر یہ سب دیکھ رہی ہیں اور ان کے سدباب کی صورتیں دیکھ رہی ہیں۔ ان حالات میں جرجان میں بیٹھ کر میں تیرے دشمنوں کا مقابلہ کس طرح کروں گا؟ کچھ جانتا ہے یا نہیں؟''

ہادی نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''کس طرح؟ میری تو کچھ سمجھ میں آتا نہیں؟''

ابان نے کہا۔ ''اس وقت میں عریفہ اور عاتکہ سے کام لوں گا، ان حالات میں وہ کسی وقت بھی زہر کے ذریعے امیر المومنین مہدی کا کام تمام کردیں گی۔''

ہادی لرز گیا۔ ''یعنی میرے باپ کو قتل کردیا جائے گا؟''

''ہاں۔'' ابان نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ''حصولِ مقصد کے لیے سب کچھ کرگزرنا چاہیے۔''

ہادی نے بھی یہی سوچا کہ ان ناانصافیوں اور زیادتیوں کا اس سے بہتر کوئی جواب نہیں ہوسکتا کہ ان کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا جائے۔ اس نے ابان سے پوچھا۔ ''لیکن عاتکہ یا عریفہ سے یہ کام... کس طرح لیا جائے گا؟''

ابان نے جواب دیا۔ ''یہ فیصلہ بھی میں ہی کروں گا۔''

ہادی نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ''ابان! میرا مستقبل تیرے ہاتھ میں ہے، میں تجھے اس کا پورا اختیار دیتا ہوں کہ اس سلسلے میں جو مناسب سمجھ، کرگزر۔''

ابان نے کہا۔ ''جرجان روانگی سے قبل عریفہ اور عاتکہ سے تیری موجودگی میں، میں ایک تفصیلی ملاقات کروں گا اور ان دونوں سے ایک حلف لوں گا۔ میرا خیال ہے میں اپنے منصوبے میں ناکام نہیں رہوں گا۔''

اس گفتگو کے بعد دونوں جدا ہوگئے۔

☆☆☆

جرجان میں بغاوت کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا تھا۔ اب وہ طبرستان تک پھیل گیا تھا۔ ان کی سرکوبی کے لیے ایک بڑا لشکر ترتیب دیا گیا۔ لشکر کی کمان یزید بن مزید شیبانی کے

سپرد کی گئی۔ یہ وہی جرنیل تھا جس نے ہارون کو بام شہرت تک پہنچایا تھا۔ لشکر کی امارت ہادی کو عطا کی گئی کیونکہ اس علاقے کی گورنری ہادی ہی کے ذمے تھی۔ ہادی کے نامی گرامی حمایتی بھی اس کے ساتھ کردیے گئے۔

ہادی نے ابان کی موجودگی میں عریفہ اور عاتکہ کو چوری سے بلوایا۔ قصر کے جس حصے میں یہ چاروں جمع ہوئے تھے وہ قصر کا انتہائی مشرقی حصہ تھا اور یہاں سے خیزران کی رہائش گاہ کافی دور تھی۔ لکڑی کی رحل پر قرآن پاک رکھا تھا عشا کا وقت گزر چکا تھا۔ مومی اور کافوری شمعوں سے کمرا جھلملا رہا تھا۔ ابان اور ہادی کے چہروں پر گہری سنجیدگی طاری تھی اور اس سنجیدگی میں فکر اور تشویش کا عنصر غالب نظر آتا تھا۔

عریفہ اور عاتکہ بھی بہت ملول اور فکر مند تھیں۔

عریفہ نے رقت زدہ آواز میں کہا۔ ''میں خوب جانتی ہوں کہ تجھے جرجان کیوں بھیجا جارہا ہے؟ خیزران اور یحییٰ کا خیال ہے کہ تو اس بغاوت کی آگ میں بھسم ہوجائے گا اور اس طرح وہ آسانی سے اپنے چہیتے بیٹے ہارون کو تختِ خلافت پر بٹھا سکے گی۔''

ہادی نے جواب دیا۔ ''ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے عریفہ۔''

اب عاتکہ بھی خاموش نہ رہ سکی، بولی۔ ''ہادی تو اس مہم پر اپنے بجائے کسی اور کو کیوں نہیں روانہ کردیتا۔''

ابان نے ہادی کی طرف سے جواب دیا۔ ''تو یہ کیسی بات کررہی ہے لڑکی؟ جس علاقے میں بغاوت ہورہی ہے وہ ہادی کی حکومت میں ہے، وہاں کا گورنر ہادی ہے۔ اب اگر وہاں ہادی نہیں جائے گا تو کون جائے گا؟''

عریفہ نے کہا۔ ''پھر اس خالی بغداد میں خیزران اور یحییٰ کی سازشوں کا جواب کون دے گا؟''

ابان نے جواب دیا۔ ''ان سازشوں کا جواب تم دونوں دوگی کیونکہ میرے خیال میں ہادی کی عدم موجودگی میں ہادی کا تم دونوں سے زیادہ کوئی اور ہمدرد نہیں ہے۔''

عریفہ اور عاتکہ خاموش رہیں۔ وہ دونوں ہی آنسو بہارہی تھیں۔ عریفہ نے بہ مشکل آواز پر قابو پاکر سوال کیا۔ ''لیکن ہم دونوں ان خطرناک سازشوں کا کس طرح مقابلہ کریں گی؟ جو خیزران اور یحییٰ جیسے چالاک اشتراک سے روبۂ عمل آئیں گی؟''

ابان نے جواب دیا۔ ''اس سلسلے میں، میں تم دونوں کی راہنمائی کروں گا اور تم خود محسوس کرنے لگو گی کہ اس سے آسان کوئی اور کام ہو ہی نہیں سکتا۔''

عریفہ نے کہا۔ ''میں ہادی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''

عاتکہ نے کہا۔ ''اور میں بھی۔''

ابان نے ہادی سے پوچھا۔ ''ہادی! ان دونوں کے لیے تیرے کیا جذبات ہیں؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''اگر ان دونوں نے میرے لیے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیا تو یہ میرا وعدہ ہے کہ انہیں وہی حیثیت دوں گا جو میرے باپ نے میری ماں خیزران کو دے رکھی ہے۔''

ابان نے کہا۔ ''پھر اس بات کا ان دونوں سے عہد لے لیا جائے۔ یہ سامنے قرآن پاک رکھا ہے تم دونوں اس پر اپنے ہاتھ رکھ کر یہ قسم کھاؤ گی کہ ہادی کے لیے تم ہر وہ کام کرگزرو گی جو ہادی کے لیے مفید اور سود مند ہوگا اور اس سلسلے میں خواہ تمہیں اپنی جان ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑیں۔''

ان دونوں نے ابان کی مرضی کے مطابق قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھائیں اور عہد کیا کہ ہادی کے لیے وہ اپنی جانیں تک دے دیں گے۔ ابان نے اس مرحلے پر ایک خاص نکتے کی وضاحت کردی، بولا۔ ''اگر تم دونوں میں سے کوئی ایک ہی ہادی کے لیے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دے سکتی ہے تو وہ بھی خیزران جیسی حیثیت حاصل کرلینے کی مستحق قرار پائے گی۔''

لیکن ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ہادی سے بھی اس قسم کا، اسی طرح یہ عہد لیتی کہ وہ کام نکل جانے کے بعد اپنے عہد سے پھر نہیں جائے گا۔

یہ عہد لے کر ابان تو چلا گیا، ہادی ان دونوں کے ساتھ تنہا رہ گیا کہ جدائی سے پہلے کے ان لمحات کو وہ غنیمت تصور کرکے زیادہ سے زیادہ حظ اٹھانے کی کوشش کررہا تھا۔ ان دونوں نے یکساں غموں میں مبتلا ہوکر آپس میں مفاہمت کرلی تھی۔ رات کے پچھلے پہر تک ہادی ان دونوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جب آخر شب انہیں رخصت کیا گیا تو دونوں کے دل اپنے قابو میں نہیں تھے۔ ان کے دل امنڈ رہے تھے اور ان میں ایک ایسی آگ سلگ رہی تھی جس میں سکون، قرار اور ماحول کی دلکشیاں جل کر بھسم ہوجایا کرتی ہیں۔

ان دونوں کے چلے جانے کے بعد ابراہیم نے ہادی سے کچھ عجیب باتیں کیں۔ اس نے پوچھا۔ ''ہادی! ہم لوگ جرجان کتنے دنوں کے لیے جارہے ہیں؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''کچھ پتا نہیں ابراہیم مہینوں

بھی لگ سکتے ہیں اور سالوں بھی۔

ابراہیم نے پوچھا۔ ”مجھے بھی ساتھ چلنا ہے؟“

”ہاں، تجھے بھی ساتھ چلنا ہے لیکن اگر تو چاہے تو یہیں بغداد میں رہ جا۔“

ابراہیم نے پوچھا۔ ”کیا عریفہ بھی ساتھ جائے گی؟“

ہادی نے غم و غصے سے ابراہیم کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ”کیوں؟ تو یہ سوال کیوں کر رہا ہے؟“

ابراہیم نے کہا۔ ”ہادی! تو خلافت کی کچھار کا شیر ہے اور ہم سب تیرے پس خوردہ کھانے والے۔ میرا خیال ہے عریفہ بھی تیری آغوش میں ان لڑکیوں کی طرح آئی ہوگی جن کی شکلیں تو بھول گیا ہوگا۔“

ہادی نے کہا۔ ”لیکن تیرا ان باتوں سے مطلب کیا ہے؟ بات صاف صاف کر۔“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”میں صاف صاف بات اسی وقت کروں گا جب تو مجھے یہ یقین دلا دے گا کہ اگر میری بات سے تجھے کسی قسم کی تکلیف پہنچے گی تو، تو مجھے معاف کر دے گا۔“

ہادی نے کہا۔ ”وعدہ! اب کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟“

ابراہیم نے سر جھکا کر عرض کیا۔ ”ہادی! عریفہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو جرجان جائے تو میں یہیں بغداد میں رہ جاؤں اور عریفہ کی آغوش کے مزے لوٹوں۔“

ہادی کا مارے غصے کے چہرہ سرخ ہوگیا، بولا۔ ”ابراہیم! تو میرے ساتھ جرجان جائے گا کیونکہ اگر تو یہیں رہ گیا تو میرا باپ مہدی تجھے قتل کروا دے گا۔ وہ تیرا بدترین اور طاقتور ترین دشمن ہے، وہ میری وجہ سے خاموش ہے لیکن میری عدم موجودگی میں تو اس کے عتاب کا نشانہ بن جائے گا۔“

ابراہیم ڈر سے کانپنے لگا، بولا۔ ”تب پھر میں تیرے ساتھ ہی چلوں گا۔“

ہادی نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ابراہیم! میں نے یہ سوچا تھا کہ جب میں برسر اقتدار آجاؤں گا تو وزارت کا منصب تجھے دوں گا لیکن اب مجھے سوچنا پڑے گا۔ میں عریفہ کو پسند کرتا ہوں، اس سے محبت کرتا ہوں، تجھے اس کے بارے میں مجھ سے ایسی درخواست نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

ابراہیم نے ندامت سے جواب دیا۔ ”میں نے لفظ پس خوردہ استعمال کیا تھا۔ خدانخواستہ میری یہ منشا ہرگز نہیں تھی۔ میں اپنی درخواست پر نادم ہوں اور تیرے ساتھ جرجان چلنے پر آمادہ ہوں۔“

ہادی اپنے ساتھیوں اور لشکر کے ساتھ باب موصل سے نکلا تو بغداد والوں نے اس کا ایک منزل تک ساتھ دیا۔ ان کی روانگی کا منظر خیزران بھی دیکھ رہی تھی، یحییٰ ان لوگوں میں شامل تھا جو ہادی کو رخصت کر رہے تھے، مہدی نے ہادی کو گلے لگا کر رخصت کیا اور اسے فتح و کامرانی سے واپسی کی دعائیں دیں۔

جب یہ لشکر خیزران کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تو عریفہ اور عاتکہ کا دل بھر آیا۔ خیزران نے انہیں دیکھے بغیر خوشی سے کہا۔ ”وہ مارا، میدان صاف ہوگیا۔“ لیکن مہدی کو افسوس ہو رہا تھا۔ اسے ہادی سے محبت بھی تھی اور ہمدردی بھی۔ وہ واقعی اس کی فتح و کامرانی اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

☆☆☆

ہادی کے چلے جانے کے بعد عریفہ اور عاتکہ نے اپنے حق میں خطرے کی بو محسوس کی اور ان دونوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ انہیں خوشامد اور چاپلوسی کے ذریعے ہادی کے باپ مہدی کا تقرب حاصل کرنا چاہیے کیونکہ مہدی ہادی کو چاہتا تھا، خیزران بھی خوش ہوئی کہ چلو یہ دونوں اس سے دور رہ کر اس کی سازشوں سے لاعلم رہیں گی حالانکہ... بہ ظاہر وہ یہی جانتی تھی کہ عاتکہ اس کی اعتماد کی لڑکی ہے اور عریفہ ہادی کے اعتماد کی۔

ادھر خیزران اور یحییٰ برمکی اپنی سازشوں میں لگے ہوئے تھے۔

جرجان سے جو خبریں آرہی تھیں وہ خاصی تشویش ناک تھیں۔ باغیوں نے خاصا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اس پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔ خیزران اور یحییٰ برمکی خوش تھے کہ ہادی اور اس کے حمایتی برے پھنسے۔ خیزران، یحییٰ پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ موقع محل دیکھ کر مہدی پر دباؤ ڈالے کہ وہ ہادی کے بجائے ہارون کو ولی عہد نمبر ایک اور ہادی کو نمبر دو قرار دے دے لیکن یحییٰ یہ کام خود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اپنی رائے میں خیزران ہی مہدی کو اس ناخوشگوار کام پر آمادہ کر سکتی تھی۔

خیزران موقع کی تاک میں رہی، ہادی کو جرجان میں جتنی دیر ہو رہی تھی، خیزران، مہدی پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس مہم پر اگر ہارون کو روانہ کیا جاتا تو وہ کب کا واپس آچکا ہوتا۔ ہادی، ہارون کے مقابلے میں نااہل ہے۔ مہدی سب کچھ سن کر بھی تجاہل سے کام لیتا۔ ادھر ہادی نے یہ قاعدہ اختیار کیا تھا کہ بغاوت اور اپنی لشکر

کشی کی ذرا ذرا سی خبر اپنے باپ کو مستعدی سے بھیج رہا تھا۔ مہدی اسی قاصد کے ذریعے اپنی نصیحتیں اور ہدایتیں روانہ کر دیتا۔

مہدی، خیزران کے پاس بیٹھا جرجان کی مہم پر بات کر رہا تھا کہ پردے کے دوسری طرف یحییٰ بھی موجود تھا اور کنیزیں مہدی اور خیزران کے احکام کی بجا آوری کے لیے دست بستہ آس پاس موجود تھیں۔ مہدی نے کہا۔ ''میں پریشان ہوں کہ ہادی کو وہاں بہت زیادہ رک جانا پڑا۔''

خیزران نے جواب دیا۔ ''تو ہادی اور ہارون کا باپ ہے اور میں ان دونوں کی ماں ہوں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تو ہادی کو آخر سمجھتا کیا ہے؟ اس سے تو طبرستان کی ذرا سی بغاوت قابو میں نہیں آتی حالانکہ اس کی جگہ اگر ہارون ہوتا تو یہ مہم کب کی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہوتی۔ میں ان دونوں کی ماں ہوں اور ان کے مزاجوں اور صلاحیتوں کو تجھ سے زیادہ سمجھتی ہوں۔''

یحییٰ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی، بولا۔ ''میں ہارون کا اتالیق ہوں، اس لیے اس کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ایسا لگتا ہے گویا خدا نے ہارون کو حکومت کرنے ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔''

مہدی نے جواب دیا۔ ''میں ہادی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس میں بھی حکمرانی کے اعلیٰ اوصاف موجود ہیں۔''

خیزران نے چڑ کر کہا۔ ''یہ تیری خوش فہمی ہے۔ میں کہتی ہوں تو اب کیا سوچ رہا ہے۔ تو ہارون کو پہلا ولی عہد قرار دے دے اور ہادی کو دوسرا کیونکہ میں کسی کی حق تلفی نہیں چاہتی۔''

یحییٰ نے پھر ہاں میں ہاں ملائی، بولا۔ ''ہم لوگ خود بھی نہیں چاہتے کہ کسی کی وجہ سے کسی کی حق تلفی کی جائے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ حضور کا جانشین کمتر درجے کا ہو۔''

مہدی نے جواب دیا۔ ''بے شک میں بھی تم دونوں کی رائے سے متفق ہوں لیکن اب تم لوگ مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

خیزران نے کہا۔ ''ہارون کو ولی عہد اول اور ہادی کو دوم قرار دے دے۔''

مہدی نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''یہ ہادی کی حق تلفی ہے اور وہ اس پر کس طرح آمادہ ہو جائے گا؟''

خیزران نے کہا۔ ''تو اپنے اس فیصلے کا اعلان کر۔ میں دیکھتی ہوں کون تیری مخالفت کرتا ہے؟''

مہدی نے جز بز ہو کر جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں یہ نہیں کر سکتا۔''

خیزران نے اس کا مذاق اڑایا۔ ''پھر تو کر کیا سکتا ہے؟''

یحییٰ نے کہا۔ ''اگر امیر المومنین اس پر فوراً نہیں تیار ہو رہے ہیں تو اس میں فکر کی کوئی بات نہیں، ملکہ عالیہ امیر المومنین کو سوچنے کا کچھ موقع مرحمت فرمائیں پھر مجھے یقین ہے کہ ہارون ہی ولی عہد اول قرار پا جائے گا کیونکہ ہارون ایک غیر معمولی نوجوان ہے۔''

مہدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ مجھے گمراہ کرنا چاہتے ہو لیکن میں گمراہ نہیں ہونے کا۔''

خیزران چڑچڑے انداز میں بولی۔ ''مہدی! واللہ میں ایک مدت سے دیکھ رہی ہوں کہ تو وہ کام نہیں کرتا جو میں کہتی ہوں حالانکہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر میں نہ کہوں تو، تو لاعلمی میں وہی کام کر گزرے گا۔''

مہدی نے جواب دیا۔ ''خیزران! تو بڑی ناشکری ہے، میں تیری ہر خواہش کا احترام کرتا ہوں لیکن تو نے یہ دستور بنا رکھا ہے کہ میں جب بھی تیری کوئی بات نہ مانوں تو، تو فوراً ناشکرے پن کا اظہار کر دے۔''

خیزران نے مہدی کا گریبان پکڑ لیا، بولی۔ ''اچھا تو سچ سچ بتا...... ہارون میں وہ کون سی کمی ہے جسے تو نے تو محسوس کر لیا ہے لیکن میں نہیں جانتی؟''

مہدی نے گریبان چھڑانے کی کوشش کی بولا۔ ''یہ کیا کر رہی ہے خیزران! میرا گریبان چھوڑ دے، میں جانتا ہوں کہ ہارون میں ایک ایسی کمی پائی جاتی ہے جو ہادی میں نہیں ہے۔''

یحییٰ اور خیزران کے ہوش وحواس ہی جاتے رہے۔

یحییٰ نے عرض کیا۔ ''ہارون میں جو کمی پائی جاتی ہے امیر المومنین اس کی نشاندہی فرما دیں کہ میں آئندہ اس کی کوئی سفارش ہی نہ کروں۔''

خیزران نے چیخ کر کہا۔ ''کیسی خامی؟ کیسی کمی؟ اے مہدی تو اپنے ہوش وحواس میں تو ہے؟''

مہدی نے جواب دیا۔ ''میں بالکل اپنے ہوش و حواس میں ہوں، ہوش وحواس تو تیرے چھن گئے ہیں۔''

یحییٰ نے پھر کہا۔ ''حضور والا! ہارون میں جو کمی پائی جاتی ہے اس کی وضاحت ضرور فرما دیں۔''

مہدی نے جواب دیا۔ ''ہارون ہادی سے چھوٹا ہے

اور یہ ایسی کمی ہے جس کا کوئی علاج یا اصلاح ممکن نہیں۔"
خیزران بے ساختہ ہنسنے لگی۔"کیا کمی بتائی ہے۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔"
مہدی وہاں مزید نہیں رکا چلا گیا اور خیزران بڑبڑاتی رہی۔
جو قاصد جرجان سے جنگ کی تفصیلات مہدی کے نام لایا تھا، وہی قاصد چوری چھپے عاتکہ سے بھی مل لیا۔ ہادی نے عریفہ کے نام ایک خط بھیجا تھا اور پوچھا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں سازشوں کا کیا حال ہے؟
عاتکہ نے یہ خط پڑھا اور عریفہ کے حوالے کردیا۔ یہ خط عریفہ کو ہی لکھا گیا تھا لیکن غلطی سے وہ عاتکہ کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ عاتکہ نے جب یہ خط عریفہ کو دیا تو مارے خوشی اور حسد کے اس کے حواس ہی جاتے رہے۔
اس نے عاتکہ سے کہا۔"میں ہادی کو ایک خط لکھوں گی۔ تو کوئی الگ خط لکھے گی یا میں اپنے خط میں ہی تیرا ذکر کردوں؟"
عاتکہ نے جواب دیا۔"نہیں، میں الگ لکھوں گی۔"
عریفہ نے لکھ دیا۔"تو جو مجھ سے بہت دور چلا گیا ہے۔ بغداد تیرے حامیوں سے خالی اور قصر خلد تیرے ساتھیوں سے محروم ہے۔ خیزران تیری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانے پر تلی ہوئی ہے کسی طرح جلدی آجا ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔
"کیا تو نے جرجان میں چاند نکلتے دیکھا ہے؟ بغداد کی راتیں تاریک اور سونی ہوگئی ہیں کیونکہ جب سے تو گیا ہے، بغداد کی رونق رخصت ہوگئی ہے۔ موسموں نے اپنی کیفیت کھودی ہے اور شب وروز دلکشی سے محروم ہوگئے ہیں۔ رات میں نے تیری مفارقت میں ایک شعر کہا ہے تو بھی پڑھ لے۔
اے وہ شخص جو یہاں سے بہت دور دراز مقام پر فروکش ہے
اب کیا تو ہمیشہ جرجان ہی میں رہے گا
کیا اس شعر میں، میں اپنی مفارقت اور جدائی کے غم کو بیان کرنے میں کامیاب ہوگئی ہوں؟ میں تیرے یا تیرے وزیر ابان کی اس ہدایت کی منتظر ہوں جس کا مجھ سے عہد لیا گیا تھا۔"
عاتکہ نے اپنے خط میں لکھا۔"ہادی! میں نے عریفہ سے یہ سمجھوتا کرلیا تھا کہ میں اس سے حسد نہیں کروں گی لیکن آج جب تیرا خط اس کے نام دیکھا تو میں عریفہ سے جلنے لگی۔ تو نے یہ خط میرے نام کیوں نہیں لکھا؟ اب تو میں یہ سوچنے لگی ہوں کہ ایک نیام میں دو تلواریں کس طرح رہیں گی؟ ایک دل پر دو بتوں کی خدائی کس طرح ہوگی؟ اور ایک ملک پر دو بادشاہ کس طرح حکومت کریں گے۔ خدا کے لیے وہ ہدایت جلد از جلد بھیج جس کا تو نے ہم دونوں سے عہد لیا تھا۔ میں چاہتی ہوں اس ہدایت پر میں پہلے عمل کرکے تجھے اپنے لیے حاصل کرلوں۔"
ان دونوں نے اپنے خط قاصد کو دے دیے۔ مہدی فوراً کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ بڑی مصیبت میں تھا۔ خیزران اور یحییٰ نے اس کا دماغ خراب کردیا تھا۔ اس نے ہادی کو سرسری جواب لکھ دیا لیکن ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ"اس خط کے چند دن بعد میرے چند امرا تیرے پاس پہنچیں گے اور وہ تجھ سے ایک خاص مسئلے پر بات کریں گے۔ تجھ پر واجب کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر تو فرماں بردار بیٹے کی طرح عمل کرکے میری دل شکنی نہیں کرے گا۔"
قاصد کے چلے جانے کے کئی دن بعد خیزران نے مہدی کو بری طرح گھیر لیا، بولی۔"اگر تو ہارون کو ولی عہدی میں تقدیم نہیں دے گا تو میں بھی دجلہ میں چھلانگ لگا کر ڈوب مروں گی۔"
مہدی نے بڑی بے بسی سے جواب دیا۔"خیزران! تو ان کیفیات کو نہیں سمجھ سکے گی جو میرے اس نئے فیصلے اور اعلان کے بعد ہادی پر بیت جائے گی۔ آج میں تجھے اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ تو جانتی ہے کہ میرا ایک بھائی جعفر اصغر بھی تھا۔ یہ مجھ سے چھوٹا تھا۔ مجھے ایک بار لوگوں نے مطلع کیا کہ میرا باپ منصور میری جگہ جعفر اصغر کو اپنا ولی عہد بنا رہا ہے۔ اس افواہ نے مجھے اتنا مشتعل کردیا کہ میں نے فوراً ہی اپنے باپ کو لکھ دیا کہ خدا کی قسم اگر آپ نے ایسا کیا تو میں جعفر اصغر کو قتل کردوں گا۔ اس پر میرے باپ نے مجھے جواب دیا..."مہدی! تجھے غلط خبر ملی ہے۔ ہم جعفر سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ اسے تیرا نشانہ نہیں بننے دیں گے۔" پھر خیزران کو بطور خاص مخاطب کیا۔"اب تو خود ہی فیصلہ کرلے کہ ہارون کو ولی عہد اول بنانے سے دونوں بھائیوں میں کیسی رنجشیں پیدا ہوجائیں گی۔"
لیکن خیزران ایک ہی بات جانتی تھی۔"مہدی! میں کچھ نہیں جانتی۔ تجھے میرا یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔"
آخر مہدی مجبور ہوگیا اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ خیزران کی خواہش پوری کردے گا اور ہارون کو ہادی کی جگہ خلافت میں تقدیم عطا کردے گا۔

☆☆☆

جرجان کے قصر شاہی میں ہادی شاہانہ انداز میں بیٹھا بغداد کی سیر کررہا تھا۔ اس کے چشم تصور میں قصر خلد، مہدی، یحییٰ اور خیزران ایک ساتھ آجارہے تھے۔ وہ بغداد کی

سازشوں سے خوفزدہ تھا اور جب قاصد نے عریفہ اور عاتکہ کے خطوط اسے دیے تو وہ بہت خوش ہوا اور جب خطوط پڑھے تو اتنا مزہ آیا کہ جرجان کی بغداد سے دوری کی کوفت ختم ہو گئی لیکن جب اس نے اپنے باپ کا معنی خیز خط پڑھا تو پریشان ہو گیا اور خطرے کی بو سونگھنے میں کامیاب رہا۔

اب اس کا جنگوں میں دل نہیں لگ رہا تھا کیونکہ اس کے ساتھ ناانصافیاں اور زیادتیاں ہوتی چلی آ رہی تھیں۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ باغیوں سے اپنی بادشاہت کے نام پر سمجھوتا کر لے اور خلافت عباسیہ کے تاجداروں کی صف میں وہ بھی کھڑا ہو۔ اس نے اپنے باپ کا خط پڑھا تو فکرمند ہو گیا۔ باپ کی نیت درست نہیں تھی اور باپ ہی پر کیا موقوف تھا۔ خیزران، یحییٰ اور اس جیسے کئی اور تھے۔ ان میں سے کسی کی نیت درست نہیں تھی۔

ابھی یہ کوفت دور نہ ہوئی تھی کہ مہدی کی طرف سے امرا کا ایک وفد ہادی کی خدمت میں پہنچ گیا۔ ہادی نے اس کا بڑی سرد مہری سے استقبال کیا۔ وفد نے پہلا سوال یہ کیا۔ ”کیا امیر المومنین نے کوئی خط لکھا تھا؟“

ہادی نے جواب دیا۔ ”ہاں مجھے مذکورہ خط مل چکا ہے۔“

وفد کے ایک رکن نے پوچھا۔ ”پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“

ہادی نے دلیری سے جواب دیا۔ ”میں اپنے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔“

وفد کے سربراہ نے کہا۔ ”ظاہر ہے آپ اپنا یہ فیصلہ لکھ کر بھی روانہ کر سکتے تھے لیکن ہم اس لیے آئے ہیں کہ آپ کو آپ کے فیصلے کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دیں۔“

ہادی کے پاس ہی ابان بن صدقہ اور ابراہیم بھی موجود تھے۔ ابان نے ہادی کی طرف سے جواب دیا۔ ”تم لوگ ہادی کے فیصلے کے نشیب و فراز کیا سمجھاؤ گے کیونکہ نشیب و فراز سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی مخلص ہو اور کسی کے زیر اثر نہ ہو۔“

وفد کے سربراہ نے ابان کو روکا۔ ”ابان تو اس لیے خاموش رہ کہ یہ باپ بیٹے کا معاملہ ہے۔“

ابان نے جواب دیا۔ ”میں ہادی کا مشیر اور وزیر ہوں اور اس لیے اس کے ساتھ کیا گیا ہوں کہ ہادی کو صحیح مشورے دوں۔“

وفد کے ایک رکن نے کہا۔ ”گویا اس طرح تو امیر المومنین کی ناراضی اور عتاب مول لے گا۔“

ابان نے جواب دیا۔ ”میں یحییٰ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ فیصلہ امیر المومنین کا نہیں ہو سکتا بلکہ یحییٰ کی سازش ہے اور میرا یہ فرض ہے کہ میں اس سازش سے امیر المومنین اور ہادی کو محفوظ رکھوں۔“

ابراہیم نے ذرا زیادہ پرجوش اور واشگاف لفظوں میں اپنے ولی نعمت کی وکالت کی۔ ”میں تو صاف صاف کہوں گا کہ یہ سارا فتنہ دو انسانوں کا کھڑا کیا ہوا ہے ان میں سے ایک تو ہادی کی ماں خیزران ہے دوسرا ہارون کا اتالیق یحییٰ ہے۔“

وفد کے سربراہ نے ہادی سے پوچھا۔ ”ہم اپنے سوالوں کا جواب ابان یا ابراہیم سے نہیں چاہتے، ہادی! آپ سے مانگ رہے ہیں آپ کیا کہتے ہیں؟“

ہادی نے جواب دیا۔ ”میں اپنی ولی عہدی سے کسی قیمت پر بھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔ یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔“

وفد نے دھمکی آمیز زبان استعمال کی۔ ”امیر المومنین آپ کے اس فیصلے پر کوئی خطرناک فیصلہ کر سکتے ہیں جو بالکل ممکن ہے کہ آپ کو تباہی اور بربادی کے کھڈ میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دے۔“

ہادی نے جواب دیا۔ ”میں حق پر ہوں اور حق پر قائم رہنے کا یہ احساس مجھ میں اتنی ہمت ضرور پیدا کر دے گا کہ میں اپنی اور تمہاری بربادی کو صبر و سکون سے جھیل جاؤں۔“

وفد بڑی دیر تک ہادی کو سمجھاتا رہا لیکن ہادی نہیں مانا اور آخر میں کہہ دیا کہ۔ ”تم لوگ واپس جا کر امیر المومنین کو مطلع کر دو کہ وہ اگر چاہیں تو مجھے قتل کروا کے ہارون کو ولی عہد قرار دے دیں لیکن میں جیتے جی ان کا یہ غلط فیصلہ نہیں مانوں گا۔“

وفد واپس چلا گیا اور اس کے جواب نے بغداد میں بے چینی کی فضا پیدا کر دی۔ خیزران تلملا گئی، یحییٰ سوچ میں پڑ گیا اور مہدی نے بڑے ٹھنڈے دل سے یہ فیصلہ کیا کہ ہادی حق بجانب ہے۔ عریفہ اور عاتکہ خوش تھیں کہ ہادی کوئی معمولی انسان نہیں ہے۔

مہدی نے اپنے مشیروں سے مشورہ طلب کیا۔ ”ان حالات میں اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

یحییٰ نے جواب دیا۔ ”اگر امیر المومنین اس معاملے میں براہ راست خود دخل دیں تو مجھے یقین ہے کہ ہادی سرتابی کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ آپ ہادی کو یہیں طلب فرمالیں اور اس پر آپ خود دباؤ ڈالیں، میں سمجھتا ہوں کوئی وجہ نہیں کہ وہ آپ کا حکم نہ مانے۔“

مہدی کو ابان اور ابراہیم پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ ابان پر کم ابراہیم پر زیادہ۔ کافی دیر کے صلاح مشورے کے بعد

یہی بات طے پائی کہ مہدی... خط لکھ کر ہادی کو بغداد طلب کرلے گا، ہادی کے حمایتی اور مشیر جرجان ہی میں رہیں گے مگر ابراہیم کو ہادی کے ساتھ ہی آنا پڑے گا تاکہ وہ خیزران کی اہانت کی سزا بھگت سکے۔

مہدی نے خط لکھ کر ایک شخص کو جرجان روانہ کردیا۔ اس خط میں مہدی نے اپنے بیٹے کو حکم دیا تھا کہ وہ جس حال میں بھی ہو خط پاتے ہی بغداد واپس آجائے اور اپنے ساتھ ہی ابراہیم کو بھی لیتا آئے۔

خیزران، مہدی کو مشتعل کرتی رہی۔ ''ہادی کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ سرکشی اختیار کرچکا ہے، اس کے لیے اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اس سے ولی عہدی چھین لی جائے، چاہے یہ وقتی طور پر ہی چھینی جائے۔''

مہدی نے عاجز آکر جواب دیا۔ ''خیزران! اگر تو کہے تو اقتدار تیرے حوالے کردوں اور میں گوشۂ عزلت اختیار کرلوں، آخر تو ہادی کی اتنی مخالفت کیوں کررہی ہے؟ آخر وہ بھی تو تیرا ہی بیٹا ہے؟''

خیزران نے غصے میں کہا۔ ''اگر حکومت کرنا تیرے بس کی بات نہیں تو چھوڑ دے اور ہارون کے حوالے کردے، میں خود سنبھال لوں گی۔ میں گستاخی برداشت نہیں کرسکتی۔''

مہدی نے خیزران کو برہم دیکھ کر اسی میں عافیت جانی کہ سامنے سے ہٹ جائے۔

☆☆☆

ہادی بڑی بے چینی سے مہدی کے ردِعمل کا منتظر تھا۔ اسی دوران عریفہ کو ہادی کا ایک پراسرار خط ملا اس میں بس چند سطریں کسی اور کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ ''ہدایت کا انتظار کرو اور امیرالمومنین کے ساتھ رہنے کی کوشش کرو۔''

اس بار عریفہ نے ہادی کے خط کا عاتکہ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ ہاں، ہادی کو چند سطری جواب دے دیا۔ ''میں تیری ہدایت کا بڑی بے چینی سے انتظار کررہی ہوں۔''

مہدی کا قاصد اس کا تہدیدی خط لے کر جرجان پہنچا تو ہادی نے ابان، ابراہیم اور اپنے دوسرے ساتھیوں اور حمایتیوں کے سامنے مہدی کا خط پڑھا۔ وہ خط پڑھتا جاتا تھا اور غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہوتا جاتا تھا۔ خط پڑھ چکنے کے بعد اس نے اسے پھاڑ کر اپنی پشت کی طرف پھینک دیا۔ ہوا میں اس کے پرزے ادھر ادھر اڑنے لگے۔ نہایت غصے میں کہا۔ ''مہدی سے کہہ دینا، تیرے خط کا اس سے بہتر کوئی جواب نہیں ہوسکتا تھا۔''

قاصد نے کہا۔ ''شہزادے! امیرالمومنین کے خط کو پھاڑ کر اچھا نہیں کیا۔''

ہادی نے قاصد کے منہ پر تھپڑ رسید کردیا۔ ''ادب سے بات کر او ذلیل انسان، اس وقت تو اپنے آقا، امیرالمومنین سے مخاطب ہے۔ میں مہدی کے حکم کو اس لیے نہیں مانوں گا کہ میں خود بھی حکمران ہوں، آزاد، خودمختار حکمراں!''

قاصد کے منہ سے خون جاری ہوگیا۔ اس نے بڑے صبروتحمل کا ثبوت دیا، بولا۔ ''میں آپ سے امیرالمومنین کے خط کا باضابطہ جواب چاہتا ہوں۔''

ہادی نے اشتعال میں اس کی پٹائی شروع کردی۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کروانے کی نیت تو کی لیکن ہمت نہیں کرسکے۔

قاصد نے پٹتے پٹتے کہا۔ ''امیرالمومنین نے ابراہیم کو طلب کیا ہے؟''

ہادی نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا۔ ''اس ذلیل کو جوتے لگا کر دربار سے نکال دو، ابراہیم بغداد نہیں جائے گا اور میں ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔''

ہادی کے خدمت گاروں میں سے ایک نے قاصد کو بالوں سے پکڑلیا اور دوسرے نے جوتے لگانا شروع کردیے۔ قاصد لہولہان ہوگیا اور ضربات کی تاب نہ لاکر..... بے ہوش ہوگیا۔ اسے دربار کے باہر سبزے پر پھینک دیا گیا۔

ہادی دیر تک قاصد، یحییٰ، خیزران، مہدی اور دوسرے سازشی لوگوں کو برا بھلا کہتا رہا۔ جب غصہ کم ہوا تو اس نے ابان سے مشورہ کیا۔ ''ابان! مجھے مشورہ دے کہ میں کیا کروں؟ امیرالمومنین کو کیا جواب دوں؟''

ابان نے جواب دیا۔ ''ہادی! غصے میں جو کچھ تو نے کیا اچھا نہیں کیا۔ یہ مشورہ تجھے پہلے کرنا چاہیے تھا۔''

ہادی نے کہا۔ ''ابان! میرا دماغ خراب ہورہا ہے کیا میں قاصد کو قتل کروادوں؟''

ابان نے جواب دیا۔ ''قاصد کا قتل تیری بدترین اور ناقابلِ تلافی غلطی ہوگی۔''

''پھر میں کیا کروں، مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

ابان نے جواب دیا۔ ''وقت کا انتظار، امیرالمومنین کے ردعمل کا انتظار۔''

ہادی سر پکڑ کر بیٹھ گیا، ابان نے دربار برخاست کردیا کیونکہ ہادی کو تخلیے اور سکون کی ضرورت تھی۔

زخمی قاصد جب بغداد پہنچا تو ہادی کے طرزِعمل نے ایک کہرام برپا کردیا۔ خیزران غصے سے پاگل ہوگئی۔ مہدی بھی

کا تحمل اور بردباری دونوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ہادی کے مخالفین نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور مہدی کو ہادی کی تادیب اور تہدید پر مجبور کرنے لگے۔

خیزران نے مہدی سے کہا۔ ”تو انتظار ہی انتظار میں پانی کو سر سے گزار دے گا۔ تیرے امرا، سردار اپنے دل سے تیری عزت و وقعت نکال کر ہادی کا دم بھرنے لگیں گے اور تو یہ بازی ہار جائے گا۔“

مہدی نے کہا۔ ”ہادی بذاتِ خود برا نہیں ہے۔ یہ ابراہیم وغیرہ کی صحبت کا اثر ہے۔ میں ایک بار پھر کوشش کرتا ہوں کہ اگر ہادی نہیں آتا تو نہ آئے لیکن ابراہیم کو بغداد ضرور روانہ کر دے۔“

خیزران نے طنزیہ جواب دیا۔ ”تیری جو سمجھ میں آئے کرتا رہ لیکن میں خوب جانتی ہوں کہ اس کا کیا انجام ہوگا۔“

مہدی نے کہا۔ ”میں ذرا سا تحمل اور اختیار کروں گا۔ ہادی کے نام میرا آخری تنبیہی خط، اور اس کے خلاف بھرپور جوابی کارروائی۔ یہ ہے میرا منصوبہ، جس کا میں پہلی بار تیرے روبرو اظہار کر رہا ہوں۔“

خیزران نے مایوسی سے کہا۔ ”تیری جو سمجھ میں آئے کرتا رہ لیکن میں جانتی ہوں کہ خلافتِ عباسیہ تیرے ہاتھوں جتنی ذلیل و خوار ہو رہی ہے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔“

اس کے بعد مہدی نے نہایت نرم لہجے میں ہادی کو لکھا۔ ”ابراہیم کو بغداد بھیج دیا جائے۔“

باپ کی نرم روش نے ہادی کو مغالطے میں ڈال دیا۔ ابان نے بھی ہادی کو یہی مشورہ دیا کہ ابراہیم کو نہ روکا جائے اور بغداد روانہ کر دیا جائے لیکن جب ابراہیم کو ہادی کے فیصلے کا علم ہوا تو اس نے بڑا شور و غل کیا۔ اس نے کہا۔ ”امیر المومنین مجھے قتل کروا دیں گے۔“

ہادی نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ ”تجھے بغداد جانا پڑے گا اور میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تجھے قتل نہیں کیا جائے گا۔“

ابراہیم نے ہادی اور ابان کے تیوروں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر اس نے ہادی کا حکم نہیں مانا تو وہ ابراہیم کی مشکیں کسوا کر بغداد بھجوا دے گا۔ بدرجہ مجبوری تیار ہو گیا لیکن درخواست کی ”میں بغداد چلا تو جاؤں گا مگر اس سلسلے میں اپنی زندگی کی ضمانت ضرور چاہوں گا۔“

ابان نے ہادی کی طرف سے جواب دیا۔ ”میں ہادی کی طرف سے تجھے دو خط دوں گا جنہیں تو نہایت ہوشیاری سے عریفہ اور عاتکہ تک پہنچا دے گا اور ان دونوں کو دونوں خط اس طرح پہنچائے جائیں گے کہ ایک کو دوسرے کے خط کا کوئی علم نہ ہوگا۔“

ابراہیم نے کہا۔ ”مجھے اپنی زندگی عزیز ہے، اس نوع کے دو کیا، میں دس خط پہنچا سکتا ہوں۔“

اس کے بعد ابان نے ابراہیم کو وہاں سے ہٹا دیا۔ ہادی، ابراہیم کے بارے میں واقعی بہت فکرمند تھا۔ اس نے کہا۔ ”ابان! میں تیرے کہنے سے ابراہیم کو بغداد بھیج تو رہا ہوں لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ امیر المومنین اسے معاف کر دیں گے وہ اسے یقیناً قتل کروا دیں گے۔“

ابان نے متبسم لہجے میں جواب دیا۔ ”ایسا کرنا امیر المومنین کے لیے ناممکن بنا دوں گا کیونکہ اب وہ وقت آ چکا ہے کہ عریفہ اور عاتکہ کی رقابتوں سے کوئی شاندار فائدہ اٹھا سکوں۔“

ہادی نے پوچھا۔ ”لیکن کس طرح؟ میں بھی تو کچھ سمجھوں؟“

ابان نے جواب دیا۔ ”میں عریفہ اور عاتکہ کے نام تیری طرف سے دو خط روانہ کروں گا پھر دیکھنا وہ خط کیا انقلاب لاتے ہیں۔ میں تو قصرِ خلافت کے غاصبوں کو خاک میں ملانے کا منصوبہ بنا چکا ہوں۔“

ہادی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ابان نے اسی وقت عاتکہ اور عریفہ کے نام دو الگ الگ خط لکھے۔

”عاتکہ! حاملِ ہذا سے خط وصول کرتے ہی امیر المومنین کی کڑی نگرانی شروع کر دو۔ اگر وہ ابراہیم کو قتل کروا دینا چاہتے ہوں اور میرے لیے ان کی نیت میں فتور پیدا ہو چکا ہو تو تیری انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ تو کسی بھی طرح اس پہاڑی پتھر کو چاہِ ہلاکت میں پھنکوا دے۔ خبردار جو اس خط کا ذکر عریفہ سے کیا۔ اگر تو یہ کام انجام نہ دے سکی تو میں عریفہ کے سپرد کر دوں گا لیکن میری ذاتی خواہش یہی تھی کہ میری ملکہ تو بنے، میرے دل کا جھکاؤ تیری طرف ہے، محض تیری طرف۔“

نیچے ہادی کا نام لکھا تھا لیکن خود ہادی کے ہاتھ سے نہیں کسی اور سے لکھوا دیا تھا۔

دوسرا خط عریفہ کے نام لکھا گیا۔

”عریفہ! میری عزیز از جان! حالات نے وہ رخ اختیار کر لیا ہے کہ اب نئے کو پرانے کی جگہ سنبھال لینی چاہیے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تجھ کو اپنی دلہن بنا لوں۔ اب یہ تیرا کام ہے کہ میری اور اپنی راہ کے سب سے بڑے

پتھر کو کنویں کی گہرائی میں دفن کر دے، اس سے پہلے کہ وہ میرے خلاف کوئی بڑا قدم اٹھائے۔ تجھے انتہائی اور ناگوار قدم اٹھا دینا ہے۔ اگر کسی طرح تو یہ کام نہ کر سکی تو میں یہ خدمت عاتکہ کے سپرد کر دوں گا اور خبردار جو اس خط کی خبر عاتکہ کو پہنچی۔“

چلتے چلتے ابراہیم کو ہادی نے نصیحت کی۔ ”دیکھ، یہ دونوں خط دونوں کو ایک دوسرے کی لاعلمی میں دینا ہیں۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں اور بغداد کی تفصیلی خبریں تجھے جلد از جلد روانہ کرنی ہیں۔“

ابراہیم بادل ناخواستہ بغداد روانہ ہو گیا لیکن اسے اپنی زندگی کا ذرا سا بھی اعتبار نہیں رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ابراہیم عین اس وقت بغداد میں داخل ہوا جب مہدی اپنے شاندار لشکر کو لے کر ہادی کی سرکوبی کو روانہ ہونے والا تھا۔ ابراہیم نے بڑی کوشش اور چالاکی سے دونوں خط، دونوں کو بجھوا دیے۔ پہلے تو مہدی نے اس سے کسی نفرت کا اظہار نہیں کیا لیکن بعد میں اسے خیزران کے قریب لے جایا گیا اور مہدی نے اپنے آدمیوں کو یہ حکم دیا۔ ”اس کا قتل بہت ضروری ہے کیونکہ ہادی کے دماغ کی خرابی میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔“

ابراہیم نے گڑگڑاتے ہوئے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! میں بالکل بے گناہ ہوں مجھے معاف کر دیجیے۔“

خیزران نے پردے کے پیچھے سے کہا۔ ”تو نے بارہا میری اہانت کی ہے پھر معافی کس بات کی؟“

مہدی نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”اسے اس وقت تک قید میں رکھا جائے جب تک میں جرجان سے واپس نہ آجاؤں، اسے تو اگر اللہ نے چاہا تو میں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔“

ابراہیم نے روتے ہوئے درخواست کی۔ ”امیر المومنین رحم۔“

مہدی نے جواب دیا۔ ”لیکن اس وقت تک کہ جب تک میں جرجان سے واپس نہ آجاؤں۔“

اس کے بعد ابراہیم کو قید خانے میں داخل کر دیا گیا۔

عریفہ اور عاتکہ مہدی کے لشکریوں میں شامل تھیں، وہ دونوں اپنی جگہ سازشیں کرنے میں مشغول تھیں۔

خیزران اور یحییٰ، مہدی کو شہر کے باہر تک چھوڑنے کو نکلے تھے۔ اس دن خیزران بہت خوش تھی اور بات بات پر ہنستی اور قہقہے لگاتی تھی۔ اس سفر میں عریفہ اور عاتکہ بھی اس

کے ساتھ تھیں۔ مہدی کا خیال تھا کہ وہ عریفہ کے ذریعے آخری بار ہادی کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کرے گا۔ ادھر عریفہ اور عاتکہ اپنی اپنی کوششوں میں تھیں۔ عریفہ اس فکر میں تھی کہ اسے اپنا کام جلد از جلد ختم کر دینا ہے اور عاتکہ یہ سوچ رہی تھی کہ پہلے وہ عریفہ کو اپنی راہ سے ہٹا دے اس کے بعد کچھ اور کرے۔

بغداد سے نکل کر مہدی نے ماسبذان میں پہلی منزل کی۔ شاداب اور سرسبز باغ کے پہلو میں مہدی کے لشکر نے ڈیرے ڈال دیے۔ مہدی نے دن کا زیادہ حصہ سیر و شکار میں گزارا اور سہ پہر کو تھکا ہارا باغ کے اندر ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سستانے لگا۔ اس وقت وہ بھوکا تھا۔ اس کے شکار کے ساتھی اپنے خیموں میں جا چکے تھے۔ مہدی اس وقت بھی ہادی کی بابت سوچ رہا تھا۔ وہ ایک تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

دفعتاً مہدی کے سامنے سے ایک شخص خوان میں کچھ لیے ہوئے گزرا۔ مہدی کی بھوک میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے خوان والے کو اشارے سے اپنے قریب بلایا، وہ چلا گیا۔ مہدی نے خوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

آدمی نے جواب دیا۔ ''حضور والا کھانا۔''

''کس کے لیے، لیے جا رہا ہے؟''

''حضور والا! بی بی عریفہ کے لیے۔''

''ادھر لا، میں بھی تو دیکھوں، کھانا کیسا ہے اور یہ بھیجا کس نے ہے؟''

آدمی نے جواب دیا۔ ''عاتکہ بی بی نے۔''

مہدی نے کہا۔ ''مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ یہ کھانا مجھے دے دے، عاتکہ سے کہہ عریفہ کے لیے دوسرا کھانا بھیج دے۔''

خوان پوش ہٹانے سے جو کھانا سامنے آیا اس کی خوشبو اور لذت کے احساس نے مہدی کو از خود رفتہ کر دیا۔ مہدی نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور عریفہ کی دل جوئی کی خاطر کہا۔ ''تو عریفہ کے لیے دوسرا کھانا لے آ۔''

لیکن مہدی نے محسوس کیا کہ اس کی زبان اینٹھ رہی ہے۔ جسم میں سنسناہٹ دوڑ رہی ہے۔ نظر کے سامنے جو کچھ تھا حرکت میں تھا، ہر چیز گھوم رہی تھی۔

مہدی نے اپنا سر درخت کے تنے سے لگا دیا خادم سے کہا۔ ''اب میں بچوں گا نہیں۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔ مجھے کھانے میں زہر دیا گیا ہے۔ ذرا ہارون کو میرے پاس بلا لا۔''

غلام بھاگا ہوا ہارون کے پاس پہنچا، بولا۔ ''حضور والا! امیر المومنین کی جان پر بنی ہوئی ہے انہیں خدا کے لیے چل کر بچا لیجیے۔''

ہارون خبر سنتے ہی افتاں و خیزاں مہدی کے پاس پہنچ گیا۔ باپ کے قدموں میں سر رکھ کر سوال کیا۔ ''باوا جان! آپ کو یہ کیا ہو گیا ہے؟ یہ کس ذلیل نے آپ کو راہ سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ کچھ تو بتایئے، کچھ تو اشارہ کیجیے۔''

مہدی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں بہت دھیرے سے کہا۔ ''عاتکہ کے کھانے میں زہر تھا۔ میں نہیں جانتا اس بد بخت نے ایسا کیوں کیا؟''

ہارون نے اسی وقت عاتکہ کو حراست میں لے لینے کا حکم دے دیا۔ عاتکہ گرفتار کر لی گئی۔ مہدی کچھ کہہ رہا تھا لیکن آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہارون نے اپنا ایک کان مہدی کے منہ سے بھڑا دیا۔ ''باوا جان آپ کے پیچھے کیا ہو گا؟''

مہدی نے کان میں اٹک اٹک کر جواب دیا۔ ''ہادی میرا جانشین ہو گا اور اگر تو اس سے لڑا جھگڑا نہیں تو میرے خیال میں تو نقصان میں نہیں رہے گا۔ ہادی کا ادب کرنا۔'' مہدی سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی قوت گویائی جواب دے چکی تھی۔ مہدی کے امرا اور سرداران لشکر بھی دم توڑتے ہوئے خلیفہ کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ مہدی کے چہرے پر ہلکی سی سیاہی دوڑ گئی تھی اور آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ہارون نے بڑی کوشش کی کہ وہ باپ سے کچھ اور پوچھ لے لیکن ناکام رہا۔ ذرا دیر بعد مہدی نے آخری ہچکی لی۔

مہدی مر چکا تھا۔ پورے لشکر میں کہرام برپا ہو گیا۔ اب اس لشکر کا سربراہ ہارون تھا۔ امرا کے مشورے سے اس نے ماسبذان ہی میں باپ کی تجہیز و تکفین کی نماز جنازہ خود پڑھائی اور تدفین سے فراغت پاتے ہی بغداد واپس گیا۔

مہدی کی موت نے یحییٰ برمکی اور خیزران کو سب سے زیادہ پریشان کیا۔ یحییٰ نے ایک عظیم سیاس اور بے مثل مدبر کی طرح ہارون کو مشورہ دیا۔ ''ہارون! تیرا آئندہ اقدام کیا ہو گا... کچھ جانتا ہے؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''میں بہت پریشان ہوں آپ جو حکم دیں گے اس پر عمل کروں گا۔''

یحییٰ نے مشورہ دیا۔ ''برمکہ کے خلاف کوئی انتقامی یا

تعزیری کارروائی نہ کی جائے اپنی ماں کو مطلع کیے بغیر خاموشی سے خلافت کی دو نشانیاں عصا اور انگشتری اپنے بھائی ہادی کو روانہ کردے اور اسے مطلع کردے کہ خلافت آپ کی منتظر ہے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنے بھائی موسیٰ ہادی کے حق میں بیعت لینے کا کام شروع کردے بقیہ مشورے بعد میں دوں گا۔"

ہارون نے یحییٰ برمکی کے مشوروں پر آنکھیں بند کرکے عمل شروع کردیا۔

خیزران نے یحییٰ کو اپنے محل میں طلب کیا کہ وہ پوچھے کہ ہارون کو یہ الٹے سیدھے مشورے کیوں دے رہا ہے لیکن یحییٰ اندر نہیں گیا اور کہلا دیا۔ "میں جو کچھ کررہا ہوں ہارون کے حق میں یہی بہتر ہے۔ اب تو حالات سے مفاہمت کرلینا یوں ضروری ہے کہ ماں اور دونوں بھائیوں کے اختلاف سے کہیں کوئی تیسرا فائدہ نہ اٹھالے۔"

خیزران تلملا کر رہ گئی۔ وہ مہدی کی موت کی سازش سے واقف ہوچکی تھی۔ وقت اس کے خلاف تھا۔ زمانہ گریزاں اور قسمت متنفر اور برگشتہ، غم اور انتقام کی آگ اس کی رگ و پے میں جاری تھی لیکن کچھ کر گزرنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ اس نے عاتکہ کو اپنے روبرو طلب کیا، اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا بولی۔ "اے کمینی لڑکی یہ تونے کیا، کیا؟"

عاتکہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے عریفہ کو راہ سے ہٹانے کی کوشش کی تھی اور اس کا شکار امیرالمومنین ہوگئے۔ خدا کی قسم میں نے امیرالمومنین کو نقصان پہنچانے کی نیت سے یہ کام نہیں کیا تھا۔"

خیزران نے تھپڑوں کی بارش شروع کردی لیکن شوروغل سن کر ہارون بھی وہیں پہنچ گیا اور ماں سے پوچھا۔ "یہ آپ کیا کررہی ہیں؟"

خیزران نے جواب دیا۔ "اس نے میرے شوہر کو ہلاک کیا ہے اسے میں ہلاک کردوں گی۔"

ہارون، ماں کو ایک طرف لے گیا، سمجھاتے ہوئے بولا۔ "بھائی ہادی جرجان سے چل چکے ہیں۔ دو چار دن میں بار خلافت سنبھال لیں گے۔ آپ کو اس سازش کی جڑ کا کوئی علم نہیں، ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم یہ مقدمہ بھائی ہادی کے سپرد کردیں وہ جو سزا مناسب سمجھیں دیں۔"

خیزران کی سمجھ میں ہارون کی بات آگئی، سوگوار آواز میں بولی۔ "میں نے بدبختی کا کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا لیکن آج اپنی زبان سے اپنی بدقسمتی کا ذکر کرنے میں بڑی شرم اور ندامت محسوس کررہی ہوں۔ میں نے تیرے مشیر اور اتالیق یحییٰ کو بلایا تھا وہ بھی نہیں آیا۔ کیا میں اسے بھی اپنی بدقسمتی سمجھوں......؟"

خیزران چپ ہوگئی اور روتی بسورتی عاتکہ کو حکم دیا۔ "تو میری نظروں سے دور ہوجا اور خبردار جو آئندہ کبھی میرے سامنے آئی۔"

عاتکہ بھاگ کر معلوم نہیں کہاں چلی گئی گویا وہاں تھی ہی نہیں۔

☆☆☆

ہادی، اپنے باپ کی موت کے اٹھارویں دن بغداد میں داخل ہوگیا۔ کسی ہنگامے کے بغیر وہ خلیفہ بن گیا۔ اس نے بغداد میں داخل ہونے اور بار خلافت سنبھالنے کے فوراً بعد جو کام کیا وہ عریفہ سے ملاقات تھی۔ عریفہ بہت مایوس ہورہی تھی، اس کا خیال تھا کہ ہادی کے وعدے تو وقتی اور کام نکالنے کے لیے تھے لیکن جب مہدی کا انتقال ہوگیا اور یہ بات سرگوشیوں میں کہی جانے لگی کہ مہدی کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے تو عریفہ اس کشمکش و پیچ میں پڑگئی کہ یہ زہر کس نے دیا۔ نام عاتکہ کا لیا جارہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہادی نے شاید دہرا منصوبہ بنا کر عاتکہ اور عریفہ دونوں سے کام لینے کی کوشش کی اور دونوں کو اس سے لاعلم رکھ کر کام لے لیا۔ اس کا یہ خیال بھی تھا کہ عاتکہ کامیاب ہوچکی ہے اس لیے ہادی بھی اس کے حصے میں چلا جائے گا۔ وہ بہت بددل ہورہی تھی۔ ہادی کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کا دل بھر آیا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور گلا رندھ گیا۔ منہ کھل کر رہ گیا۔ "یہ آپ......!"

ہادی نے بے اختیار اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور بوسوں کی بارش کردی، بولا۔ "ہاں، یہ میں ہوں۔ ہادی، مہدی کا بیٹا۔ مسلمانوں کا امیرالمومنین مگر تیرا عاشق، تیرا محبوب۔"

عریفہ نے اس کی آغوش میں چھپ جانے کی کوشش کی، بولی۔ "لیکن میں تو بالکل مایوس ہوگئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اب تم مجھے بھول چکے ہوگے کیونکہ تمہارا کام تو عاتکہ نے انجام دیا ہے۔"

ہادی نے کہا۔ "عریفہ! جرجان میں تیرے لیے بہت بے چین تھا اور پھر جب میں نے تیرے خط میں تیرا یہ شعر پڑھا کہ اے وہ شخص! جو بغداد سے بہت دور دراز مقام پر فروکش ہے اب کیا تو ہمیشہ جرجان ہی میں رہے گا۔ تو میں اور زیادہ بے چین ہوگیا پھر جب میں خلافت کی طرف سے بالکل مایوس ہورہا تھا تو میں نے انتہائی یاس میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں تجھے لے کر کہیں گمنامی میں زندگی بسر کرلوں گا میں

تجھے چھوڑنے یا بھولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''
عریفہ نے جواب دیا۔''اب میں بالکل مطمئن ہوں اور تیری محبت اور عظمت کی اپنے دل کی گہرائیوں سے معترف ہوگئی ہوں......''
ہادی آج وارفتہ و شیدا تھا کہ عریفہ کے عضو عضو کو بوسے دینے لگا۔ کہتا جاتا تھا۔''عریفہ! تیرے بغیر میں کسی خوشی کا خیال تک نہیں لا سکتا تو میری زندگی ہے۔''
عریفہ نے پوچھا۔''کیا اب میں خیزران جیسی حیثیت حاصل کر سکوں گی؟''
''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔'' ہادی دیوانہ ہو رہا تھا۔
عریفہ نے کہا۔''گو میں یہ نہیں چاہتی کہ تم مجھ سے دور ہو جاؤ لیکن حالات کی نزاکت کا تقاضا یہ ہے کہ تم امورِ خلافت پر توجہ دو اور چند دن مجھ سے دور رہو۔''
ہادی نے سرمستی میں جواب دیا۔''اب بقیہ زندگی امورِ خلافت کی انجام دہی میں ہی گزاروں گا، تو فکر مند مت ہو۔''
ہادی ایک دن اور ایک رات عریفہ کی آغوش ہی میں پڑا رہا۔ اب اسے گویا کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ خیزران، یحییٰ اور دوسرے امرا اس جستجو میں تھے کہ ہادی امورِ خلافت میں دلچسپی لے تو اس کی ذہانت اور صلاحیت کا اندازہ بھی ہو اور اس اعتبار سے کوئی سازش تیار کی جائے لیکن ہادی کو اب کسی بات کی بھی پروانہ تھی۔
عاتکہ، ہادی کی بے رخی اور عریفہ پر مرمٹنے کی خبریں سن سن کر آگ بگولا ہوئی جارہی تھی۔ اس نے ہادی سے کئی بار ملنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ قصرِ خلد کا جو حصہ خلیفہ کی رہائش کا تھا، وہاں سے خیزران کی رہائش قریب تھی۔ عاتکہ، خیزران کی نگرانی میں گزر بسر کر رہی تھی۔
عریفہ کے پاس سے فراغت حاصل کرتے ہی ہادی اپنے قصر میں واپس آگیا۔ خیزران اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی، وہ رات کو تخلیے میں ہادی کے پاس پہنچ گئی اور اسے مبارک باد... دیتی ہوئی بولی۔''تجھے خلافت مبارک ہو۔''
ہادی نے ترش لہجے میں جواب دیا۔''میں ایسی مبارک باد نہیں قبول کروں گا جس میں خلوص کی جگہ مصلحت اندیشی شامل ہو۔''
خیزران نے بھی تلخی سے کہا۔''میں خود بھی تجھ سے دور دور اور لاتعلق رہنا چاہتی ہوں۔ تو نے جس طرح خلافت حاصل کی ہے اس پر میرے سینے میں انتقام کی آگ سلگ اٹھی ہے۔''
ہادی نے کن انکھیوں سے ماں کی طرف دیکھا، بولا۔
''اچھا تو یہ بات ہے، خوب ماں! میں نہیں چاہتا کہ تمہارے معاملات میں دخل دوں لیکن میں خلیفہ ہوں اس لیے امکان ہے کہ میں بھی تم سب سے ماضی کی کارروائیوں پر پوچھ گچھ کروں اور جو سزاؤں کے مستحق ہوں انہیں عبرت ناک سزائیں دوں۔''
خیزران نے جواب دیا۔''تو جسے بھی سزا کا مستحق سمجھ اسے قطعی معاف نہ کر مگر میں یہ درخواست بھی کروں گی کہ تو عاتکہ کو ہرگز معاف نہ کر۔ اس نے مجھے بیوہ اور ہارون اور تجھے یتیم کر دیا ہے، کیا اسے کوئی سزا نہیں ملے گی؟''
ہادی نے کہا۔''ملے گی کیوں نہیں، ضرور ملے گی لیکن جب تک کوئی سزا ملے میں اس وقت تک انہیں اس کا موقع دوں گا کہ وہ خود کو وفادار اور بدلا ہوا انسان ثابت کرنے کی کوشش کریں۔''
خیزران خاموش ہوگئی۔ وہ اس قسم کے سوالوں اور جوابوں سے یہ جاننے کی کوشش بھی کر رہی تھی کہ ہادی کے خود اس کے، ہارون اور یحییٰ کے بارے میں کیا ارادے ہیں۔
ہادی نے ماں کو خاموش جو دیکھا تو تنبیہہ آمیز لب و لہجے میں کہا۔''ماں! ایک بات کا تمہیں بھی خیال رکھنا ہوگا، اب میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ خلافت اور حکومت تو میں کروں اور بھیڑ بھاڑ تمہارے در پر ہو۔''
خیزران نے جواب دیا۔''اب بھی میرے دروازے پر جو بھیڑ ہوگی، وہ اتنی ہی ہوگی جتنی تیرے باپ کے دورِ حکومت میں ہوا کرتی تھی۔''
ہادی نے دوٹوک کہا۔''تب پھر تم بھی سن لو، میں یہ نہیں برداشت کروں گا۔''
خیزران نے پوچھا۔''آخر کیوں نہیں برداشت کرے گا؟''
ہادی نے جواب دیا۔''اس لیے کہ حکومت تو میں کروں اور حکم تمہارا چلے۔''
خیزران خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔
ہادی نے اس بات چیت کے کئی دن بعد خیزران کے دروازے پر بڑی بھیڑ بھاڑ دیکھی۔ خیزران حسبِ سابق حکومت کر رہی تھی اور اس کے در سے داد و دہش اور حکومت کا سلسلہ جاری تھا۔ ہادی اس منظر کو دیکھتا رہا آخر کار برداشت نہ کر سکا۔ اس نے یحییٰ برمکی کو طلب کیا اور کہا۔
''یحییٰ! تجھے میرے باپ نے ہارون کا اتالیق اور وزیر مقرر کیا تھا پہلے میرا یہ خیال تھا کہ تو ہارون کی وجہ سے خیزران کی حمایت اور مدد کرے گا لیکن جب میں نے یہ سنا کہ ہارون

کوتو نے میری بیعت پر مجبور کیا اور خلافت کی دو نشانیاں انگشتری اور عصا تیری ہدایت پر خاموشی سے مجھے روانہ کر دی گئیں اور پھر اس کا بھی انکشاف ہوا کہ میری عدم موجودگی میں میری ماں نے صلاح ومشورے کے لیے جب تجھے بلوایا تو، تو نہیں گیا۔ تو میرے دل میں تیرے لیے عزت واحترام پیدا ہو گیا۔ تو جس منصب پر ہے، میری طرف سے بھی اس پر قائم رہ مگر خبردار جو تو نے میری ماں سے ساز باز کی۔“

یحییٰ برمکی نے جواب دیا۔”امیر المومنین! میں نے کبھی بھی آپ کے خلاف کوئی کام نہیں کیا پھر اب کیوں کروں گا۔“

یحییٰ کے جواب نے ہادی کو مطمئن کر دیا۔ ہادی نے کہا۔”اب تو میری ماں کو بھی سمجھا دے کہ وہ کاروبارِ حکومت میں دخل نہ دے۔“

یحییٰ نے کہا۔”امیر المومنین! آپ کی ماں ایک عرصے سے معاملاتِ حکومت میں دخیل چلی آ رہی ہیں ان کی یہ عادت ایک دم نہیں چھوٹے گی، رفتہ رفتہ جائے گی۔“

ہادی نے تیز نظروں سے یحییٰ کو گھورا، کہا۔”میں محسوس کر رہا ہوں کہ تو نے میری ماں کی مخالفت نہیں کی بلکہ اپنے لفظوں سے تو اس کی حکومت اور معاملاتِ حکومت میں مداخلت کی تائید کر رہا ہے۔“

یحییٰ نے جواب دیا۔”امیر المومنین! میں مادر امیر المومنین کی کس طرح مخالفت کر سکتا ہوں؟ میں ان کی تائید بھی نہیں کر رہا بلکہ ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ امیر المومنین کی ماں حکومت کرنے اور معاملاتِ حکومت میں دخل دینے کی عادی ہو گئی ہیں اور عادتوں کو ایک دم چھڑوا دینا کبھی بھی ممکن نہیں رہا۔“

ہادی لاجواب ہو کر چپ ہو رہا۔

☆☆☆

ہادی نے ربیع بن یونس کو اپنا وزیر بنا لیا۔ ابراہیم کا خیال تھا کہ اسے وزیر بنایا جائے گا لیکن جب ربیع کو وزارت مل گئی تو ابراہیم نے شکایتاً کہا۔”امیر المومنین! آپ کے لیے قدم قدم پر جاں نثاریاں تو میں نے دکھائیں۔ یہاں تک کہ آخری دنوں میں، میں قتل ہوتے ہوتے بچا۔ میرا خیال تھا امیر المومنین اپنے دل میں ان باتوں کا حساب کتاب کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا اور وزارت اس شخص کو عطا کر دی گئی جس کی بابت میں نے یہ سنا ہے کہ امیر المومنین کی عدم موجودگی میں مادرِ امیر المومنین کو یحییٰ کی طرح غلط سلط مشورے دیا کرتا تھا۔“

ہادی نے جواب دیا۔”میں وزارت کا منصب تجھی کو دیتا لیکن تو نے عریفہ سے جس قسم کی باتیں کی تھیں اس سے میری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ تجھے وزیر بنا دوں۔“

ابراہیم نے عرض کیا۔”امیر المومنین کو یاد نہیں رہا غالباً، ورنہ غلام نے یہ عرض کیا تھا کہ جس طرح شیر کا پس خوردہ دوسرے جانوروں کو مل جایا کرتا ہے۔ اسی طرح کبھی خلافت کے شیر کا پس خوردہ کھانے میں یہ ناچیز بھی فخر محسوس کرے گا۔“

ہادی نے ابھی جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کسی اطلاع کے بغیر عاتکہ آ گئی، اس کا چہرہ اترا ہوا اور منہ سوجا ہوا تھا۔ ابراہیم پر رعب خلافت طاری تھا عاتکہ کو دیکھتے ہی پوچھا۔”امیر المومنین! کیا میں چلا جاؤں؟“

ہادی نے کہا۔”نہیں ٹھہرو، ابھی تجھ سے چند باتیں کرنا ہیں۔“ پھر عاتکہ سے تیوریاں بدل کر پوچھا۔”ہاں عاتکہ! تو کیسے آ گئی؟“

عاتکہ نے جواب دیا۔”امیر المومنین کو خلافت مبارک ہو۔“

ہادی نے کہا۔”یہ بات تو پرانی ہو گئی۔“

عاتکہ نے کہا۔”میرا خیال تھا امیر المومنین اس ناچیز کو خود ہی طلب فرمائیں گے لیکن آقا اپنے کثیر خدمت گزاروں میں سے اکثر کو بھول جایا کرتے ہیں۔ میں یہی محسوس کر کے حاضر ہو گئی ہوں کہ شاید اس طرح میں امیر المومنین کو یاد آ جاؤں۔“

ہادی نے پوچھا۔”وہ خط کہاں ہے جس میں، میں نے تجھے آخری ہدایت دی تھی؟“

عاتکہ نے جواب دیا۔”اسے میں ساتھ نہیں لائی۔“

ہادی نے کہا۔”میرا خیال تھا تو اس خطرناک تحریر کو ضائع کر چکی ہو گی لیکن تعجب ہے کہ وہ ابھی تک تیرے پاس محفوظ ہے۔“

عاتکہ نے جواب دیا۔”میں امیر المومنین کی تحریر کس طرح ضائع کر سکتی تھی؟“

ہادی نے ہنس کر کہا۔”احمق لڑکی! وہ میری تحریر نہیں ہے۔“ پھر ابراہیم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔”کیوں ابراہیم! کیا خیال ہے؟ وہ کس کی تحریر ہے؟“

ابراہیم نے کن انکھیوں سے عاتکہ کی طرف دیکھا، جواب دیا۔”اگر وہ تحریر قبل از وقت امیر المومنین کے والدین میں سے کسی ایک کے ہاتھ لگ جاتی تو آج یہ ناچیز اس دنیا سے ناپید ہو چکا ہوتا۔“

ہادی نے کہا۔ ’’تب پھر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ جس کی تحریر ہے، تجھے بھی اس کے حوالے کر دیا جائے۔‘‘ پھر ابراہیم سے کہا۔ ’’ابھی ابھی میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تو کئی بار مجھ سے یہ خواہش کر چکا ہے کہ تجھے شیر کے پس خوردہ کھانے کی بڑی آرزو ہے۔ تیری تحریر میں نے عاتکہ کو دی تھی اور عاتکہ کو تجھے بخشتا ہوں اور اس خوشی میں یہ مزید اعزاز دیتا ہوں کہ ربیع بن یونس کی وزارت ختم، آج سے تو وزارت کا منصب سنبھالے گا۔‘‘ پھر عاتکہ سے کہا۔ ’’میرا خیال ہے تیرے لیے یہ بھی ایک بہت بڑا اعزاز ہے جو میں دے رہا ہوں۔‘‘

عاتکہ اور زیادہ مرجھا گئی، آہستہ سے کہا۔ ’’امیر المومنین! نے اس ناچیز سے جو وعدہ کر رکھا ہے اگر وہ پورا نہیں ہو سکتا تو میں کسی اور اعزاز کی حصول یابی پر مسرور نہیں ہوں گی۔ مجھے گوشۂ عزلت میں زندگی بسر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔‘‘

ہادی نے کہا۔ ’’تیری مرضی، اب تو جا سکتی ہے۔‘‘

عاتکہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ہادی کی طرف دیکھا۔ ابراہیم نے عاتکہ سے کہا۔ ’’عاتکہ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھے خوش و خرم رکھوں گا۔‘‘

عاتکہ نے جواب دیا۔ ’’میں خوش و خرم رہنا نہیں چاہتی۔‘‘

ہادی نے بڑی سنگدلی سے کہا۔ ’’ابراہیم اسے جانے دے۔‘‘ پھر عاتکہ سے کہا۔ ’’اب تو جا سکتی ہے۔‘‘ عاتکہ روتی ہوئی چلی گئی۔

قصر خلد میں ہادی کی اپنی ماں سے جھڑپ ہو گئی۔ خیزران نے ہادی سے کہا۔ ’’ہادی! میں تجھ سے ایک ایسے شخص کا کام لینا چاہتی ہوں جو تیری محافظ جماعت کا سردار ہے۔ عبداللہ بن مالک تیرے محافظ دستے کا سردار آج میرے پاس آیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں تجھ سے......‘‘

ہادی نے اس کی بات کاٹ دی، درشت لب و لہجے میں بولا۔ ’’میں تیرا یہ کام نہیں کروں گا، کام کی تفصیل بتانے کی کوئی ضرورت نہیں، میں اسے نہیں سننا چاہتا۔‘‘

خیزران نے اصرار کیا۔ ’’ہادی! تجھے یہ کام کرنا پڑے گا۔‘‘

ہادی نے اسی طرح غیر لچکیلے لہجے میں جواب دیا۔ ’’ہرگز نہیں۔‘‘

خیزران نے کہا۔ ’’میں عبداللہ بن مالک سے وعدہ کر چکی ہوں کہ......‘‘

ہادی نے بات کاٹ دی۔ ’’خدا عبداللہ بن مالک سے سمجھے، خدا کی قسم! میں اس کا یہ کام تیری سفارش پر ہرگز نہ کروں گا۔‘‘

خیزران غصے میں تھر تھر کانپنے لگی، بولی۔ ’’اگر تو نے میرا یہ کام نہ کیا تو میں زندگی بھر تجھ سے کوئی اور کام بھی نہ لوں گی۔‘‘

ہادی نے جواب دیا۔ ’’کوئی پروا نہیں، میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ تو مجھ سے کوئی کام نہ لے۔‘‘

خیزران نے کہا۔ ’’ہادی! میں زندگی بھر تجھ سے بات بھی نہ کروں گی۔‘‘

ہادی نے کہا۔ ’’کوئی پروا نہیں، اب ایک بات میری بھی سن لے۔ میں نہیں چاہتا کہ تیرے در پر لوگوں کا ہجوم نظر آئے۔ میں آج یہ فرمان جاری کر دوں گا کہ آج کے بعد اگر میں نے کسی کو بھی تیرے در پر کھڑے دیکھا، اسے قتل کروا دوں گا اور اس کے اثاثے ضبط کر لوں گا۔ تو قرآن پاک کی تلاوت کر، سوت کات اور گوشہ نشینی اختیار کر، میں کاروبار سلطنت میں تیری یا کسی بھی عورت کی مداخلت نہیں برداشت کر سکتا۔‘‘

خیزران کا غصے سے بہت برا حال تھا، اس کا جسم ... تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ایک دم مڑی اور ہادی کو مخاطب کیا۔ ’’ہادی! میں زندگی میں آخری بار تجھ سے مخاطب ہوں، اب تو بھی مجھ سے بات نہ کر سکے گا۔‘‘

خیزران، ہادی کے سامنے سے یوں گئی کہ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ ہادی غصے سے اسے گھورتا رہا۔

اس جھڑپ اور بدمزگی کے بعد ہادی نے قصر خلد سے علیحدگی اختیار کر لی اور بغداد کے رصافہ نامی حصے میں منتقل ہو گیا پھر رصافہ سے ملحق عیسیٰ باذ نامی جگہ پر قصر ابیض (سفید محل) تعمیر کروا کے اس میں منتقل ہو گیا۔ دلوں میں دوری تو پہلے ہی سے موجود تھی اب مکانی فاصلہ بھی حائل ہو گیا تھا۔

خیزران کا در سونا ہو چکا تھا کیونکہ ہادی نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ اب اگر کوئی امیر یا سردار خیزران کے در پر دکھائی دیا تو وہ اسے قتل کروا کے اس کا اثاثہ ضبط کر لے گا۔ لوگ سہم گئے اور خیزران ایک دم تنہا ہو گئی۔ ایک ایسی عورت، جو اپنے حکمران شوہر کے زمانے سے حکومت کرتی چلی آرہی ہو اسے ایک دم حاجت مندوں اور خوشامدیوں سے محروم کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔ خیزران کے لیے یہ اذیت موت سے بھی زیادہ تھی۔ وہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح تلملاتی، بل کھاتی رہی۔

ہارون اپنی ماں کے حشر سے سہم گیا تھا۔ اس نے یحییٰ سے کہا۔ ''ہادی مجھے قتل کروا دے گا۔''

یحییٰ نے تسلی دی، جواب دیا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا، جب تک میں زندہ ہوں تو بھی زندہ رہے گا۔''

ہارون نے کہا۔ ''ہادی مجھے ولی عہدی سے ہٹا کر اپنے بیٹے جعفر کو اس پر ولی عہد بنانا چاہتا ہے۔''

یحییٰ نے حقارت سے جواب دیا۔ ''ہارون! اپنے سارے معاملات اور مسائل میرے ذمے رہنے دے۔ وہ آٹھ سالہ جعفر، جو یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کے اپنے دانت دودھ کے ہیں یا اناج کے۔ وہ کاروبارِ خلافت کیا انجام دے گا۔ ہارون! تو اس طفلِ نومولود سے ڈرتا ہے۔ میرا مشورہ مان، تو ولی عہد ہے اور جب تک تجھے خلافت نہ ملے، عیش کر۔ کنیزیں، بیوی، سیر و شکار، خورونوش، مصروفیات کے لیے سیکڑوں چیزیں تیرے آس پاس موجود ہیں۔ تو ان میں دل لگا تیری مصیبتیں جھیلنے کے لیے بوڑھا یحییٰ زندہ ہے۔''

مایوس اور دل شکستہ ہارون کی ہمت بندھی۔ یحییٰ کو یہ سن گن مل چکی تھی کہ عاتکہ کے ساتھ ہادی نے بڑی زیادتی کی ہے۔ کیا اور کس قسم کی زیادتی کی ہے اس تفصیل سے وہ لاعلم تھا۔ وہ اس تفصیل کو جاننا چاہتا تھا پہلے ہادی بھی قصرِ خلد ہی میں رہتا تھا اس لیے عاتکہ کے مسئلے کو کریدا نہیں جا سکتا تھا لیکن ہادی کے قصرِ ابیض چلے جانے کے بعد میدان صاف ہو چکا تھا۔ اس نے خیزران سے خواہش کی کہ کسی طرح اسے عاتکہ سے ملا دیا جائے۔

خیزران کے چہرے پر مایوسی اور نفرت نے مستقلاً قبضہ جما رکھا تھا۔ اس نے بے زاری سے پوچھا۔ ''عاتکہ سے ملاقات کرنے کا فائدہ؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''فائدہ ہے تبھی تو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

خیزران نے کہا۔ ''میں عاتکہ کو تجھ سے ملا دوں گی لیکن میں اس پر نہ تو خود اعتبار کرتی ہوں اور نہ ہی تجھے مشورہ دوں گی کہ تو اعتبار کرے۔ وہ بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''ملکہ عالیہ آپ کے مشورے کا شکریہ۔ میں مخالفین پر ان ہی کے ہتھیاروں سے حملہ آور ہونا چاہتا ہوں۔''

خیزران پردے کے پیچھے سے یحییٰ کے چہرے پر نظریں جمائے معلوم نہیں کیا دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، ذرا تامل سے بولی۔ ''تو اس سے نہایت محتاط انداز اور لفظوں میں باتیں کرے گا کیونکہ وہ ایک بار اپنا اعتماد کھو چکی ہے۔''

''مخدومہ! آپ بالکل مطمئن رہیں۔''

خیزران نے ہارون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تو ہارون کو یہاں سے ہٹا دے۔''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''ہارون ولی عہد ہے میں اسے کس طرح ہٹا سکتا ہوں۔''

ہارون خود ہی ہٹ گیا، جاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔''

اور وہ چلا گیا۔ خیزران نے کہا۔ ''مہدی کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں عاتکہ کا ہاتھ ہے، میں یہ سمجھتی تھی کہ ہادی اسے سزا دے گا لیکن ہادی نے شاید اسے معاف کر دیا ہے کیونکہ عاتکہ نے جو کام کیا ہے وہ دراصل ہادی ہی کا کام ہے۔''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ میرے آئندہ اقدام عاتکہ کی ملاقات کے بعد ہوں گے۔''

خیزران اندر چلی گئی۔ یحییٰ تنہا بیٹھ کر معلوم نہیں کیا کچھ سوچتا رہا۔ کبھی کبھی تو آپ ہی آپ مسکرانے لگتا اور کسی کسی لمحے اداس اور مایوس نظر آنے لگتا۔

کچھ دیر بعد عاتکہ آ گئی۔ یحییٰ نے اس کی شاندار پذیرائی کی۔ اس نے عاتکہ کے غمزدہ چہرے پر نظر ڈالتے ہی معلوم نہیں کیا کچھ دیکھ لیا تھا۔ عاتکہ، یحییٰ کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

پہلے تو یحییٰ اسے سر سے پیر تک دیکھتا رہا پھر کہا۔ ''تیرا چہرہ اور چہرے کی اداسی مجھے یہ بتاتی ہے کہ تیرے ساتھ بڑی ناانصافیاں ہوئی ہیں، روح فرسا وعدہ خلافیاں ہوئی ہیں۔''

عاتکہ تو جیسے بھری بیٹھی تھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یحییٰ نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلی دیتا رہا، بولا۔ ''مت رو میری بچی مت رو۔ مجھے تو یہ بتا کہ تجھے کس سے اور کیا تکلیف پہنچی ہے؟''

عاتکہ نے سسکیوں میں جواب دیا۔ ''مجھے جس شخص نے تکلیف پہنچائی ہے، وہ اتنا بڑا ہے کہ قانون کا ہاتھ اس کی گردن تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی ہم لوگ کہیں تخلیے میں ہی اس کے خلاف کوئی بات سوچ یا کہہ سکتے ہیں۔'' عاتکہ نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔ ''اگر میں تجھے اور ملکہ عالیہ کو ان اہم باتوں سے آگاہ کر دوں تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''ردعمل کا عمل میرے ذمے کر۔ پھر میں دیکھوں گا کہ کون ہے جو میرے مقابلے پر آئے گا۔''

عاتکہ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''حالانکہ ہم دونوں میں یہ عہد ہوا تھا کہ جو ہادی کا ساتھ دے کر اس کی

خطرناک ہدایت پر عمل کرے گی وہ اس کی بیوی بننے کا شرف حاصل کرے گی۔ میں نے اس کے لیے کام کردیا اور جب اس سے اس کے انعام کی طالب ہوئی تو وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا اور ایک دن تو اس نے اور زیادہ غضب کردیا۔ وہ مجھے شیر کا پس خوردہ کہہ کر اپنے وزیر ابراہیم کے حوالے کردینا چاہتا تھا۔ وہ تو میں نے خود اسے ٹھکرادیا۔"

یحییٰ نے پوچھا۔ "مہدی کی موت کی ہدایت تجھے کس طرح دی گئی تھی؟"

"ایک خط کے ذریعے۔"

"وہ خط کہاں ہے؟"

"میرے پاس، میں نے اسے جان سے زیادہ محفوظ کر رکھا ہے۔"

"خوب، کیا وہ خط تو مجھے بھی دکھا سکتی ہے؟"

"نہیں، اب میں کسی اور کی آلۂ کار نہیں بننا چاہتی۔" عاتکہ نے جواب دیا۔

یحییٰ نے کہا۔ "تو مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔ اس دورِ تاریکی اور ایامِ مظالم میں، میں ہر اس شخص کا ہمدرد اور مددگار ہوں جس پر امیر المومنین مہدی مرحوم کے مخالفین نے ظلم ڈھایا ہو، ان میں سے ایک تو بھی ہے۔ کیا تو نہیں چاہتی کہ جس نے تجھ پر ظلم کیا ہے تو اس سے ظلم کا بدلہ لے۔"

عاتکہ نے کہا۔ "مجھ پر عریفہ نے ظلم کیا ہے اور میں بدلہ بھی اسی سے لینا چاہتی ہوں۔"

"بے وقوف لڑکی! تو کہاں بھٹک رہی ہے۔ عریفہ تیری دشمن کیوں ہونے لگی، پہلے تو اپنے دشمن کو پہچان، عریفہ بے گناہ ہے۔"

عاتکہ نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "افسوس کہ میں اپنے دشمن کا کھلم کھلا نام بھی تو نہیں لے سکتی۔"

"نام نہیں لے سکتی تو نہ لے، بدلہ تو لے سکتی ہے۔"

"ہاں شاید، یا شاید نہیں۔"

"عاتکہ!" یحییٰ نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "اس جنگ میں تو میرا ساتھ دے۔ میں تجھے کس طرح یہ یقین دلاؤں کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب اس معرکے میں عریفہ بھی تیرے ساتھ ہی کھڑی ہو۔"

عاتکہ بے یقینی سے یحییٰ کی صورت دیکھنے لگی۔ "ناممکن، ایسا ناممکن ہے۔ عریفہ بہت جلد دوسری خیزران بننے والی ہے۔"

"غلط، شبہ، وسوسہ۔" یحییٰ نے کہا۔ "مہدی اور ہادی میں فرق ہے۔ زمین آسمان کا فرق۔ خیزران، مہدی کی آغوش سے ابھر کر ہادی کی آغوش میں غروب ہوجاتی ہے۔ جس طرح آفتاب مشرقی افق سے طلوع ہوکر مغربی افق میں روپوش ہوجاتا ہے۔ مہدی، خیزران کا مشرقی افق ہے اور ہادی اس کا مغربی افق۔"

اس بوڑھے کی باتوں نے عاتکہ کو لاجواب اور حد درجہ متاثر کیا تھا۔ سحر زدہ سی آواز میں کہا۔ "آپ کے لیے میں کیا کرسکتی ہوں؟ جلد بتایئے۔"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "بہت کچھ، اور اس بہت کچھ کو میں وقت آنے پر ہی بتاؤں گا۔ ابھی قبل از وقت ہرگز نہیں۔"

عاتکہ نے کہا۔ "میں آپ کی مدد کو ہر طرح تیار ہوں۔"

یحییٰ نے کہا۔ "پہلے وہ خط مجھے دکھادے، میں اسے دیکھ کر فوراً ہی واپس کردوں گا۔"

عاتکہ نے یحییٰ کے ہاتھوں کو ادب و احترام سے بوسہ دیا اور وہاں سے اس طرح الٹے قدموں واپس گئی جس طرح درباری خلیفہ کے سامنے سے جایا کرتے ہیں۔

☆☆☆

ہادی کی بدقسمتی کہ اس کا اتالیق اور مشیر ابان بن صدقہ انتقال کرچکا تھا۔ اس کے بعد اس کا پہلا وزیر ربیع بن یونس بھی چل بسا۔ اب جو لوگ اس کے آس پاس تھے، ان میں کے بیشتر خوشامدی اور ڈرپوک تھے اور یحییٰ برمکی اور خیزران سے خوف زدہ رہتے تھے۔ ان کی دن رات یہی کوشش تھی کہ کسی طرح یحییٰ کو قتل کرواکے اس سب سے بڑے خطرے سے نجات حاصل کرلی جائے لیکن یحییٰ ان خطرناک حالات کا جس جرأت، عقل اور ہوش مندی سے مقابلہ کررہا تھا اس کے دوست اور دشمن بھی معترف تھے۔ ہادی کے خوشامدیوں نے ہادی کو یہ یقین دلا رکھا تھا کہ ہارون، خیزران کی سرکشی یا مخالفت محض یحییٰ کے بھڑکانے سکھانے کی وجہ سے ہے حالانکہ اس نام نہاد سرکشی یا مخالفت کا بہ ظاہر کہیں نام و نشان تک نہ تھا لیکن پھر بھی بہت زیادہ سکھانے پڑھانے سے ہادی نے یحییٰ کو طلب کرلیا۔ اس وقت ہادی ظہر کے بعد ذرا آرام کرنے جارہا تھا۔ حسین و جمیل کنیزیں اپنی سفلہ خواہشات کی تکمیل کے لیے ہادی کا انتظار کررہی تھیں۔ ان کی انگڑائیاں ہادی کے دل و دماغ میں ہنگامے برپا کیے ہوئے تھیں۔ ایسے میں یحییٰ کا پہنچنا ہادی کو بڑا ناگوار گزرا۔ ہادی، کنیزوں کے جھرمٹ سے نکل کر یحییٰ کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "یحییٰ! کیا بات ہے؟ میں سنتا ہوں تو میری ماں خیزران اور بھائی ہارون کو میرے خلاف ہر وقت اکساتا، بھڑکاتا رہتا ہے؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔"سنی ہوئی باتیں اکثر غلط ہوتی ہیں، امیر المومنین کو ان پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔"

ہادی ایک دم چراغ پا ہوگیا۔"تو اپنی چرب زبانی بند کر، اب میں تیرے وجود کو زیادہ دنوں تک نہیں برداشت کرسکتا۔ تیرے سامنے میں دو تجویزیں رکھتا ہوں ان میں سے جو تجھے پسند آجائے اسے اختیار کرلے۔"

یحییٰ نے ہادی کو ایک لمحے غور سے دیکھ کر پوچھا۔

"بتایئے وہ دو تجویزیں کون کون سی ہیں؟"

ہادی نے جواب دیا۔"پہلی تجویز تو یہ ہے کہ تو ہارون کو اس پر آمادہ کرلے کہ وہ میرے آٹھ سالہ بیٹے جعفر کے حق میں ولی عہدی سے دستبردار ہوجائے اور دوسری تجویز یہ ہے کہ ہارون کی دستبرداری کے بغیر ہی جعفر کی ولی عہدی کا اعلان کردے۔"

یحییٰ نے کسی تذبذب کے بغیر کہا۔"امیر المومنین! آپ کی دونوں تجویزیں فضول اور بے معنی ہیں اور ان پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔"

ہادی نے بگڑ کر پوچھا۔"آخر کیوں؟ یہ کیوں فضول اور بے معنی ہیں؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔"امیر المومنین! اگر مہدی، ہارون کو دوسرا ولی عہد نہ مقرر فرماجاتے تو آج آپ سے یہ درخواست کرتا کہ آپ اپنے آٹھ سالہ بیٹے جعفر کی جگہ اپنے بھائی ہارون کو اپنا ولی عہد مقرر کردیجیے۔"

ہادی نے طنزاً کہا۔"تو ہوش میں تو ہے؟ یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔"یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میری نظریں آپ کے خاندان کے چند ایسے آدمیوں پر جمی ہوئی ہیں جو آپ کی ان کمزوریوں اور اختلافات سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں ہیں۔ کیا آپ کی عدم موجودگی میں وہ آپ کے آٹھ سالہ بیٹے کو برسراقتدار رہنے دیں گے؟ واللہ کبھی نہیں پھر ان حالات میں ہارون کو ولی عہد کیوں نہیں رہنے دیتے؟ ہاں یہ میں وعدہ کرسکتا ہوں کہ ہارون اپنے بعد آپ کے بیٹے جعفر کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوجائے۔"

یحییٰ کی باتیں ہادی کے دل میں اترتی چلی گئیں اس نے کہا۔"یحییٰ! تو بہت عقل مند انسان ہے، میں تیری عقل مندی کی قدر کرتا ہوں بشرطیکہ میرے اس اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ لگے۔"

یحییٰ نے کہا۔"میں ہمیشہ اس خاندان کا وفادار رہا ہوں اور اب بھی رہوں گا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے مخالفین مجھے اس بات کا طعنہ دیں کہ میں اتالیق اور مشیر تو ہوں ہارون کا اور کام کررہا ہوں جعفر کے لیے۔ میری وفاداریاں ہارون کے لیے ہیں۔ آپ کے لیے آپ کے خاندان کے لیے اور اس ترتیب سے ہیں جس ترتیب سے میں نے بیان کیں۔"

ہادی، یحییٰ کی باتوں سے بہت متاثر ہوا، بولا۔"جا، میں تجھ پر اعتبار کرتا ہوں۔ بے خوف وخطر رہ، میری طرف سے تجھے کوئی خطرہ نہیں۔"

یحییٰ، ہادی کے پاس سے مطمئن اور خوش نہیں اٹھا، کیونکہ وہ جانتا تھا ہادی کے وعدے وعید ۔۔۔ پر وہ اعتبار نہیں کرسکتا تھا کیونکہ ہادی کے مشیر اور درباری، ہادی کو کسی وقت بھی مشتعل اور جذباتی کرسکتے تھے۔ جب وہ ہادی کے پاس سے نکل کر جارہا تھا تو ہادی کے درباریوں نے یحییٰ کے چہرے اور چال ڈھال سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کے ساتھ اندر کیا سلوک کیا گیا ہوگا۔ انہوں نے یحییٰ کے چہرے پر فکرمندی اور تشویش کے آثار دیکھے۔ وہ خوش ہوگئے کہ ہادی، یحییٰ سے خوش نہیں ہے اور آج یقیناً یحییٰ کو ڈانٹا گیا ہوگا۔ اس سے یحییٰ کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس کے حاسدوں اور مخالفوں نے اس کے بعد ہادی سے یحییٰ کی شکایتیں نہیں کیں، کیونکہ جو خود ہی مررہا ہو اسے کیا مارا جائے۔

یحییٰ جب اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس نے وہاں کئی آدمیوں کو اپنا منتظر پایا۔ ان میں عاتکہ تھی اور ایک نجومی بھی شامل تھے۔ یہ پریشان حال نجومی یحییٰ کی سخاوت کا حال سن کر اپنے دردِ معاش کے علاج کی فکر میں آیا تھا۔ یحییٰ کو اس وقت عاتکہ سے خاص گفتگو کرنا تھی لیکن اس کی اچانک نظر خلیفہ کے محافظ دستے کے سردار عبداللہ بن مالک پر پڑگئی۔ یحییٰ کو خوب معلوم تھا کہ خیزران اس شخص کی سفارش کرکے خوار ہوئی تھی۔ یحییٰ نے سب سے پہلے عبداللہ بن مالک سے گفتگو کی کیونکہ وہ جس طریقۂ جنگ کا نقشہ بنارہا تھا، اس میں عبداللہ بن مالک، عاتکہ، عریفہ اور چند کنیزوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

یحییٰ، عبداللہ بن مالک کو تخلیے میں لے گیا، پوچھا۔

"ہاں، تیرا آنا کیونکر ہوا؟ خیریت تو ہے؟"

عبداللہ بن مالک نے جواب دیا۔"یحییٰ! خدا نے تجھے دماغ دیا ہے۔ آج مملکتِ اسلامیہ میں اس کا کوئی حریف نہیں۔ تو جانتا ہے کہ میں نے خیزران سے ایک سفارش کروائی تھی اور امیر المومنین نے خیزران کی سفارش قبول کرنے سے صاف انکار کردیا تھا اور اس کے بعد خیزران کے اختیارات اور معمولات پر بھی پابندی عائد

کر دی گئی۔“

یحییٰ نے کہا۔ ”خدا امیر المومنین پر رحم فرمائے۔ اس نوزائیدہ خلیفے کو دوڑ کر نہیں چلنا چاہیے۔ ابھی تو اس کے گھٹنوں کے بل چلنے کا زمانہ ہے۔“

عبداللہ بن مالک نے کہا۔ ”اب تو مشورہ دے کہ میں یہ کام کس سے کرواؤں؟“

یحییٰ نے کہا۔ ”میرے بھائی! اس وقت بس ایک ہی شخصیت ایسی ہے جو تیرا کام کر سکتی ہے۔“

عبداللہ بن مالک نے پوچھا۔ ”وہ کون؟“

یحییٰ نے کہا۔ ”لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے اور قباحت بھی، تجھے اپنا کام نہایت ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔“

عبداللہ بن مالک نے کہا۔ ”میں ہر خطرے اور ہر قباحت کو برداشت کرنے کو تیار ہوں۔“

یحییٰ نے کہا۔ ”تو نے خیزران کو سمجھنے پہچاننے میں غلطی کی ہے۔ جس خیزران سے تو نے سفارش کروائی تھی وہ دورِ مہدی کی خیزران تھی۔ لیکن اس عہد کی خیزران عریفہ ہے۔ تجھے اپنا کام عریفہ سے لینا چاہیے۔ جا عریفہ سے مل اور کوشش کر کہ وہ تیری سفارش کر دے۔“

عبداللہ بن مالک نے تشویش سے کہا۔ ”لیکن میں عریفہ تک پہنچوں گا کس طرح؟“

یحییٰ نے جواب دیا۔ ”یہ ترکیب بھی میں ہی بتاؤں گا لیکن تجھے یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ یہ ساری باتیں راز میں رہیں گی اور یہ کہ ہم دونوں کی اس ملاقات کا علم بھی دوسروں کو نہیں ہونا چاہیے۔“

عبداللہ بن مالک نے کہا۔ ”میں اس کا وعدہ کرتا ہوں۔“

یحییٰ نے کہا۔ ”تو تھوڑی دیر یہیں رکا رہ، میں تیرے لیے ایک ایسا ذریعہ فراہم کرتا ہوں جو تیری سفارش عریفہ تک پہنچا دے گا۔“

عبداللہ بن مالک کو وہیں چھوڑ کر یحییٰ نجومی سے بات کرنے لگا۔

یحییٰ نے نجومی سے پوچھا۔ ”اب بتا تو مجھ سے کیوں ملنے آیا ہے؟“

نجومی نے جواب دیا۔ ”چند دن پہلے میں علم نجوم سے خلافت عباسیہ کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو مجھے چند عجیب باتیں معلوم ہوئیں افسوس کہ اگر میں ان نتائج کا اعلان کر دوں جن کا زائچے میں صدور ہوا ہے تو میں ہلاک کر دیا جاؤں گا۔“

یحییٰ نے اسے ذرا شک و شبہے کی نظر سے دیکھا، پوچھا۔ ”اگر زائچے سے کوئی ایسی ہی بات معلوم ہوئی تھی تو اس کا اظہار تجھے امیر المومنین کے سامنے کرنا تھا تاکہ وہ تجھے انعام و اکرام سے نوازتے، مجھ سے تجھے کیا ملے گا؟“

نجومی نے جواب دیا۔ ”جناب والا! اگر میں یہ خبر امیر المومنین کو پہنچا دوں تو وہ مجھے قید کر دیں گے۔“

یحییٰ نے کہا۔ ”اچھا بتا تو مجھے کیا بتانا چاہتا ہے؟“

نجومی نے سرگوشی میں کہا۔ ”آپ اپنے موقف سے ذرا بھی نہ ہٹیے گا۔ قسمت اور وقت آپ کے ساتھ ہیں بہت جلد وہ گھڑی آنے والی ہے جب ایک خلیفہ انتقال کرے گا اور دوسرا خلیفہ بارِ خلافت سنبھالے گا، تیسرا خلیفہ پیدا ہوگا......“

یحییٰ نے نجومی کو کچھ انعام دیا اور کہا۔ ”تو اس وقت یہاں سے چلا جا خبردار جو یہ خبر کسی اور کو دی اگر تیری پیش گوئی سچی نکلی تو تجھے مجھ سے ایک بار اور ملنا پڑے گا۔“

نجومی چلا گیا۔ اب یحییٰ کے پاس صرف دو آدمی تھے۔ عاتکہ اور عبداللہ بن مالک، یہ دونوں الگ الگ کمروں میں یحییٰ کا انتظار کر رہے تھے۔ یحییٰ سیدھا عاتکہ کے پاس پہنچا۔ عاتکہ انتظار کرتے کرتے تنگ آ چکی تھی۔ یحییٰ نے کہا۔ ”میری بیٹی عاتکہ! میں نادم ہوں کہ تجھے میرے انتظار میں بڑا وقت ضائع کرنا پڑا۔“

عاتکہ نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی کنیز ہوں محترم بزرگ آپ عاجزی سے پیش آ کر مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔“

یحییٰ نے کہا۔ ”میری بچی! ایک بات تو بتا، کیا زبیدہ، ہارون کی بیوی امید سے ہے؟“

عاتکہ نے جواب۔ ”ہاں صبح شام ہی بچے کی ولادت ہونے والی ہے۔“

یحییٰ نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ ”تب پھر تو خوش ہو جا کہ ہادی کا وقت پورا ہو چکا لیکن پھر بھی ہم جو کرنا چاہتے ہیں اس میں تیری حیثیت سب سے اہم ہے۔“

عاتکہ نے جواب دیا۔ ”میں اپنے حصے کا کام ہر وقت انجام دینے کو تیار ہوں۔“

یحییٰ نے کہا۔ ”اس دوسرے کمرے میں خلیفہ کے محافظ دستے کا سردار عبداللہ بن مالک بیٹھا ہوا ہے تو اس کی سفارش کسی طرح عریفہ تک پہنچا دے وہ ہادی سے کہے گی اور ہادی انکار کر دے گا۔ اس طرح ہادی کے خلاف جنگ میں عریفہ بھی شامل ہو جائے گی۔ بقیہ کام میں یا خیزران دونوں میں سے کوئی ایک انجام دے لے گا۔“

اس نے عاتکہ کو چند باتیں اور سمجھائیں اور عبداللہ بن مالک سے کہا۔ ”تو اپنا کام عاتکہ کو بتا دے۔ یہ عریفہ

سے کہہ کر کروادے گی......"

عبداللہ نے اسے بتادیا اور عاتکہ اسی دن ہادی کی عدم موجودگی میں عریفہ کے پاس پہنچ گئی اور دوران گفتگو ہر طرح عریفہ کو یہ باور کروانے لگی کہ ہادی ابن الوقت، موقع پرست اور زمانہ ساز ہے وہ کسی کے کام نہیں آسکتا۔

لیکن عریفہ کو ان باتوں کے ماننے میں تامل تھا۔ عاتکہ نے جب یہ محسوس کرلیا کہ عریفہ اس کی بات ماننے کو تیار نہیں ہے تو اس نے کہا۔

"اچھا عریفہ! ہم دونوں میں کون صحیح رائے رکھتا ہے اور کون غلط، اس کا ابھی امتحان ہوا جاتا ہے......"

عریفہ نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

عاتکہ نے اسے عبداللہ بن مالک کا نام بتایا اور کہا۔ "اگر ہادی واقعی تجھے چاہتا ہے تو تیرے کہنے سے کردے گا ورنہ جس طرح اپنی ماں خیزران کو منع کردیا ہے اسی طرح تجھ سے بھی انکار کردے گا۔"

عریفہ نے خوداعتمادی سے جواب دیا۔ "عاتکہ! میں خیزران نہیں ہوں، عبداللہ کا یہ کام یوں کروادوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے چٹکی بجائی۔

عاتکہ نے کہا۔ "میں تیرے پاس کل پھر آؤں گی۔ یہ معلوم کرنے کہ عبداللہ کا کام ہوا یا نہیں؟"

عاتکہ چلی آئی اور عریفہ واقعی سوچ میں پڑگئی کہ کہیں ہادی انکار نہ کردے کیونکہ وہ ہادی میں ذرا سے عرصے میں غیر معمولی تبدیلیاں محسوس کرچکی تھی۔

☆☆☆

ہادی کا عجیب حال تھا وہ یحییٰ سے ملتا تو اس کی باتوں سے مطمئن ہوکر اس پر پورا پورا اعتماد کرنے لگتا اور جب یحییٰ کے حاسد اور مخالف امرا ہادی کو یحییٰ کے خلاف ورغلاتے اور یہ بتاتے کہ یحییٰ کو اگر زیادہ ڈھیل دی گئی تو وہ ہارون کو خلیفہ بنوادے گا اور ہادی کو معزول کروادے گا۔ ان لوگوں نے ہادی کو یہ باور کروادیا کہ ہارون تو ہادی کے بیٹے جعفر کے حق میں ولی عہدی سے دستبردار ہونے کو تیار ہے لیکن ہارون کو یحییٰ روکے رکھتا ہے اور خلافت کی آس دلائے رکھتا ہے۔

ان دنوں ہادی، یحییٰ کے اشارے پر بغداد سے دور سیر وشکار کو نکل گیا تھا۔ ہارون کے دشمنوں نے یہ بات بھی ہادی کے دل میں بٹھادی کہ ہارون، یحییٰ کے اشارے پر قصداً بغداد سے دور چلا گیا ہے اور اس سے ان دونوں کا معلوم نہیں کیا مقصد ہے؟ اسے نجومی والی بات بھی معلوم ہوگئی۔ ہادی کا غصے میں برا حال ہورہا تھا۔ خیزران اس سے

ناراض تھی اور اس نے جو کچھ کہا تھا اس پر بڑے استقلال سے عمل پیرا تھی۔ وہ ہادی سے بات تک نہ کرتی تھی۔ وہ خوش تھا کہ جو کام اس کا باپ مہدی نہیں کروا سکا تھا' ہادی نے کروا دیا تھا۔ خیزران اس سے اتنی دور اور لاتعلق رہ رہی تھی کہ ہادی کو اب اس کی کوئی پروا نہ تھی۔

ہادی نے ہارون کو جبراً واپس بلالیا اور اسے حکم دیا۔ ''ہارون! میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو اپنے بھتیجے جعفر کے حق میں ولی عہدی سے دستبردار ہو جا۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتا......''

ہادی نے پوچھا۔ ''تجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ تو میرا حکم ماننے سے انکار کر رہا ہے۔ ضرور اس میں بھی یحییٰ کی شہ شامل ہوگی' دیکھنا میں تم دونوں کو کس طرح صحیح کرتا ہوں......''

ہارون نے جواب دیا۔ ''میری ماں خیزران نے مجھے کئی بار یہی مشورہ دیا کہ میں تیرا کہنا مان لوں اور خلافت کا حق تیرے بیٹے جعفر کو دے دوں لیکن میں نے اپنی ماں کا حکم نہیں مانا۔ صرف اس لیے کہ میں اپنا حق نہیں چھوڑ سکتا۔''

ہادی نے تالی بجائی، دو حبشی غلام اندر داخل ہوئے۔ اس نے حکم دیا۔ ''ہارون کو قید کر دیا جائے۔''

ہارون کو دونوں غلاموں نے جکڑ لیا، دوبارہ حکم دیا۔ ''اس کے ساتھی یحییٰ کو بھی اور ان دونوں کے بارے میں دوسرے حکم کا انتظار کیا جائے۔''

ہادی کے حکم کی فوراً ہی تعمیل کر دی گئی۔ یحییٰ اور ہارون کو الگ الگ قید خانوں میں بند کر دیا گیا۔ خیزران تلملا گئی اس کی آنکھیں بھر آئیں' اس نے جیلر کو رشوت دے کر عاتکہ کو یحییٰ کے پاس بھیجا، عاتکہ نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا اور روتے ہوئے بولی۔ ''بزرگوار! میری سیدہ خیزران نے آپ کو سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ خدا کے لیے میرے بچے ہارون پر رحم کرو، اور اسے ہادی کے بیٹے جعفر کے حق میں ولی عہدی سے دستبردار ہو جانے دو۔''

یحییٰ نے مسکراتے ہوئے عاتکہ کی طرف دیکھا پھر جواب دیا۔ ''عاتکہ میری بچی! یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ اپنی سیدہ سے کہہ دے کہ ہارون اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک میں خود زندہ ہوں۔ ہارون آہستہ آہستہ تخت خلافت کی طرف کھسکتا جا رہا ہے، میں اس کے قدموں کی چاپ سن رہا ہوں لیکن افسوس کہ یہ آہٹ اور یہ آواز تیری سیدہ نہیں سن رہی ہے ورنہ وہ ایسی بات نہ کہتی۔'' پھر پوچھا۔ ''عاتکہ! میری بچی کیا تو بھی ہمت ہار چکی ہے؟''

عاتکہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، ہرگز نہیں۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''ظالموں کے خلاف تمام مظلوم اتحاد کر کے شاندار جنگ لڑ سکتے ہیں اور اس میں جیت مظلوموں کی ہوگی کیا تو نے پلاؤ پکوا کے خیزران کے پاس بھیجا تھا؟''

عاتکہ نے جواب دیا۔ ''ابھی نہیں، کیا اس منصوبے پر عمل کر گزروں؟''

یحییٰ نے کہا۔ ''بالکل کیونکہ اب اس پر عمل کرنے کا وقت آچکا ہے اور عاتکہ یاد رکھ اس میں فیصلہ کن کردار تیری سیدہ خیزران ہی کو ادا کرنا ہوگا۔ بس جس دن بھی ہم سیدہ خیزران کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے اسی دن کامیابی و کامرانی ہمارے قدم چومے گی۔''

عاتکہ چپ چاپ واپس چلی گئی۔ اب اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا، اس کے ساتھ جو زیادتی اور ناانصافی ہوئی تھی اب وقت آچکا تھا کہ اس کا نہایت خوفناک انتقام لے لیا جائے۔

یحییٰ اور ہارون کی گرفتاری کے بعد ہادی بہت چوکنا رہنے لگا تھا۔ اس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں تھے۔ اشتعال اور جوش نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ اس فکر اور تشویش کے ساتھ جب وہ اندر عریفہ کے سامنے پہنچا تو یہ دیکھ کر اور بھی پریشان ہو گیا کہ عریفہ بھی بہت فکر مند ہے۔ ہادی نے پوچھا۔ ''عریفہ! آخر تو کیوں فکر مند ہے؟''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے مزاج میں زیادہ رسوخ اور اثر رکھتی ہوں حالانکہ میں نے ہمیشہ اس کی تردید کی ہے کہ ایسی باتیں ہیں میں اس غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار نہیں ہو سکتی۔''

ہادی نے کہا۔ ''عریفہ! کیا یہ غلط ہے کہ میں تجھے بے اندازہ چاہتا ہوں۔ تو اسے اپنی غلط فہمی یا خوش فہمی کہہ رہی ہے جو مجھ پر، میری محبت پر اور چاہت پر ایک قسم کا ظلم ہے۔''

عریفہ نے خوش ہو کر ہادی کی پیشانی چومنی چاہی لیکن وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا، بولا۔ ''بات کیا ہے؟ آج تو اس وارفتگی کا مظاہرہ کرنے پر کیوں تل گئی ہے؟''

عریفہ نے موقع غنیمت دیکھا فوراً ہی عبداللہ بن مالک کی سفارش کر دی، بولی۔ ''میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کا یہ کام ضرور کروا دوں گی اور یہ وعدہ بھی اسی وجہ سے کر لیا ہے کہ میں جانتی ہوں آپ مجھے بے حد چاہتے ہیں۔''

ہادی کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا، وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ کچھ دیر تک عریفہ کی صورت دیکھتا رہا پھر ذرا

کرخت اور درشت لہجے میں کہا۔ ''بدقسمت عریفہ افسوس کہ میں تیرا یہ کام نہیں کرسکتا۔''

عریفہ کو بالکل ایسا لگا گویا ہادی نے اس کے منہ پر ایک زنانے کا تھپڑ رسید کردیا ہے۔ وہ چکرا گئی۔ ہادی کہتا رہا۔ ''میری ماں خیزران بھی اس شخص کی سفارش کرچکی ہے اور زندگی بھر کے لیے خوار ہوکر رہ گئی ہے۔ عریفہ! تو جانتی ہے کہ میں اپنے دادا کے اس قول پر کاربند ہوں جس میں انہوں نے یہ ہدایت کی تھی کہ عورتوں پر قطعی بھروسا نہ کیا جائے اور امورِ سلطنت میں ان کی مداخلت کو طاقت کے ذریعے روک دیا جائے۔ میں دادا کے اس قول پر پابندی سے عمل کررہا ہوں اور افسوس کہ عبداللہ بن مالک کا یہ کام نہیں کرسکتا۔''

عریفہ نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! مجھے چکر آرہے ہیں۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔''

ہادی نے بڑے افسوس سے کہا۔ ''میری پوری بات تو سن لے۔ میں نے اس دن جب میرا اپنی ماں خیزران سے جھگڑا ہوا تھا ایک قسم کھائی تھی۔ افسوس کہ اس قسم کا پہلے کبھی تجھ سے ذکر نہیں کرسکا لیکن اب کررہا ہوں۔'' عریفہ بڑی محویت سے ہادی کی شکل دیکھ رہی تھی۔ ہادی نے کہا۔ ''میں نے قسم یہ کھائی تھی کہ میری ماں خیزران کی طرح جس دن بھی تو نے کوئی اس نوع کی مجھ سے سفارش کی میں تجھے طلاق دے دوں گا۔'' پھر سر جھکا کر کہنے لگا۔ ''اور تو یہ بھی جانتی ہے کہ میں اپنے عہد کا کتنا سچا اور پکا انسان ہوں۔ افسوس کہ میں اپنے اس عہد کو نبانے پر مجبور ہوں۔''

عریفہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ جو کچھ سن رہی ہے، ہادی ہی کہہ رہا ہے یا کوئی اور؟ اس کا خیال تھا، ہادی یہ سب مذاق میں کہہ رہا ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن امیرالمومنین! میری حیثیت تو ایک کنیز جیسی ہے جس کا نکاح نہیں ہوتا پھر آپ مجھے طلاق کیونکر دیں گے؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''میں طلاق کا نام لے کر طلاق کے نتیجے کا ذکر کررہا ہوں، تیری طلاق یہ ہوگی کہ تو فوراً ہی مجھ سے علیحدگی اختیار کرلے۔ افسوس کہ اب تو رہے گی تو اسی قصر میں لیکن مجھ سے الگ تھلگ۔ ایک دوسرے حصے میں جہاں میں نہ پہنچ سکوں۔''

عریفہ چکرا گئی، اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے؟

ہادی نے حکم دیا۔ ''عریفہ! میں تجھے حکم دے رہا ہوں کہ تو اسی وقت میری نظروں سے دور ہوجا۔''

عریفہ نے التجا کی۔ ''امیرالمومنین! میں عریفہ ہوں جسے آپ سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔''

ہادی نے جواب دیا۔ ''ہاں لیکن میں اپنا عہد پورا کرنے کا پابند ہوں، تو اسی وقت یہاں سے چلی جا۔''

عریفہ نے بدرجۂ مجبوری اپنا ضروری سامان سمیٹا اور اسی وقت وہاں سے چلی گئی۔ اس نے جس طرح اچانک عروج حاصل کیا تھا آج اچانک اسی طرح زوال کی طرف چلی گئی تھی۔

☆☆☆

ایک کنیز پلاؤ لیے ہوئے خیزران کی خدمت میں پہنچی اور ادب سے عرض کیا۔ ''امیرالمومنین نے یہ پلاؤ آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ بہت لذیذ ہے۔ آپ ضرور نوش فرمائیے۔''

خیزران نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ عہد کررکھا ہے کہ نہ تو میں ہادی سے ملوں گی اور نہ ہی اس سے بات کروں گی پھر میں اس کا بھیجا ہوا پلاؤ کیوں کھاؤں؟''

کنیز نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ''امیرالمومنین نے یہ پلاؤ بڑی محبت سے بھیجا ہے۔''

خیزران کا دل پگھلنے لگا۔ ہادی...... اس کے بیٹے کو آخر ماں کا خیال آگیا تھا۔ اس نے پلاؤ لے لیا اور ابھی کھانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ایک طرف سے عاتکہ بھاگی ہوئی آئی اور پلاؤ کا برتن خیزران کے ہاتھ سے لے لیا۔ بولی۔ ''سیدہ! اسے آپ اس وقت تک نہیں کھائیں گی جب تک کہ اس کا ایک آدھ نوالہ کتا یا کوئی اور جانور نہ کھالے۔ مجھے ان چالوں سے مکروفریب کی بو محسوس ہورہی ہے۔''

خیزران کے حکم سے اسی وقت ایک کتا منگوایا گیا پھر اسے باندھ کر پلاؤ کے چند لقمے کھلا دیے گئے۔ کتا کھانے کے تھوڑی دیر بعد ہی جھومنے لگا۔ یہاں تک کہ لیٹ گیا اور ایسا لیٹا کہ پھر نہیں اٹھا۔ مرگیا۔ عاتکہ نے کہا۔ ''سیدہ! آپ نے کچھ ملاحظہ فرمایا؟''

خیزران ایک بار پھر غصے سے کپکپانے لگی۔ ہادی ایسی حرکت بھی کرسکتا ہے۔ اس نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا۔ وہ گھنٹوں غصے اور نفرت کی آگ میں جلتی بھنتی رہی پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر آہستہ سے بولی۔ ''ہادی! اب تک جو کام میں نہیں کرنا چاہتی تھی، کرگزروں گی۔ تو نے مجھے مجبور کردیا ہے کہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھاؤں۔''

دوسرے ہی دن خیزران قصرِ ابیض پہنچ گئی۔ یہاں وہ ہادی سے فیصلہ کن بات کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت ہادی

اپنے جرنیل ہرثمہ سے کچھ خاص باتیں کر رہا تھا۔ خیزران ان دونوں کے قریب ہی پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر ان دونوں کی باتیں سننے لگی۔ ہادی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خیزران اس کے قریب ہی پردے کے پیچھے موجود ہے۔ وہ بدستور آزادی سے باتیں کرتا رہا۔ وہ ہرثمہ کو حکم دے رہا تھا۔ ''ہرثمہ! میں تجھے حکم دے رہا ہوں کہ تو آج رات کے پچھلے پہر سے پہلے پہلے یحییٰ اور ہارون کو قتل کر دے کیونکہ میں ان دونوں سے عاجز آچکا ہوں۔''

ہرثمہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، پوچھا۔ ''کس کو قتل کر دوں یا امیر المومنین؟''

ہادی نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''یحییٰ بن خالد برمکی کو اور میرے بھائی ہارون بن مہدی کو، میں ان دونوں کو کل صبح زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔''

ہرثمہ نے ایک بار پھر پوچھا۔ ''یا امیر المومنین کیا واقعی؟''

ہادی نے غصے میں جواب دیا۔ ''ہاں واقعی، سچ سچ، اس سلسلے میں، میں تیرا کوئی عذر نہیں سنوں گا اور اگر میں نے ان دونوں کو کل صبح تک زندہ پایا تو پھر ہرثمہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔''

ہرثمہ لرز گیا اور اس کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس حکم کی وہ کس طرح تعمیل کرے، کچھ نہیں سمجھ میں آرہا تھا۔

وہ جیسے ہی باہر نکلا، خیزران اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ہادی نے ماں کو دیکھا مگر سلام تک نہیں کیا نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ خیزران نے کہا۔ ''ہادی! یہ تو نے ہرثمہ کو کیا حکم دیا ہے؟''

ہادی نے رعونت سے جواب دیا۔ ''میں نے جو حکم دیا ہے، آپ نے اچھی طرح سن لیا ہے۔ اس لیے آپ کا یہ سوال فضول ہے اور میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔''

خیزران نے حکم دیا۔ ''اپنا یہ حکم واپس لے لے۔''

ہادی نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔''

خیزران نے کہا۔ ''میں اپنے ہارون کو بچاؤں گی ہر قیمت پر بچاؤں گی، تو اسے نہیں قتل کرے گا۔''

ہادی نے غصے میں کہا۔ ''پھر وہی مداخلت، واللہ میں کاروبارِ مملکت میں کسی عورت کی دخل اندازی ہرگز گوارا نہ کروں گا۔ میں آپ کو امیر المومنین کی حیثیت سے حکم دیتا ہوں کہ آپ خاموش رہیں اور میرے احکامات کو روکنے یا تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہ کریں۔''

خیزران نے ہادی کو بڑی بے بسی اور مجبوری سے دیکھا، بولی۔ ''ہادی! میں تجھے خدا اور رسولؐ کا واسطہ دیتی ہوں کہ تو اتنا ظلم نہ کر، ہارون کو معاف کر دے۔ میں اس کی ولی عہدی تیرے بیٹے جعفر کے نام منتقل کروا دوں گی۔''

''نہیں، وقت گزر چکا۔'' ہادی اکڑا ہوا تھا۔

خیزران نے ادھر ادھر دیکھا، وہاں ہادی اور خیزران کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ خیزران دوزانو ہو گئی اور جھک کر ہادی کے دونوں گھٹنے پکڑ لیے، روتے ہوئے بولی۔ ''ہادی! خدا اور اس کے رسولؐ کے لیے میرے ہارون کو معاف کر دے۔''

ہادی نے دونوں پیر کھینچ لیے، خیزران لڑکھڑا گئی، ہادی نے کہا۔ ''ماں! میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ قصرِ ابیض سے اسی وقت چلی جائیں ورنہ ممکن ہے میں آپ کو بھی قتل کر دوں۔''

خیزران نے سینہ تان دیا، بولی۔ ''اپنی زندگی میں تو میں ہارون کو نہیں قتل ہونے دوں گی۔''

ہادی نے قہقہہ لگایا۔ ''ایں خیال است و محال است و جنوں۔''

خیزران نے بڑے کرب سے ہادی کی طرف دیکھا، بولی۔ ''یہ تیرا آخری اور قطعی فیصلہ ہے؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ میرا آخری اور قطعی فیصلہ ہے۔''

خیزران کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ ہادی جانے لگا۔ خیزران نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا، بولی۔ ''ہادی!'' اس کی آواز کپکپا رہی تھی اور اس میں بڑا درد تھا۔ ''تو جانتا ہے کہ میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ اب میں زندگی بھر تجھ سے کوئی بات نہ کروں گی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقدیرِ الٰہی تیرے ساتھ ہے، اس نے تجھے ہر موقع پر سرخرو اور سربلند کیا ہے اور میں شرمندہ اور خوار ہوتی رہی ہوں......''

ہادی نے بات کاٹ دی، بولا۔ ''بات مختصر کیجیے، آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

خیزران نے جواب دیا۔ ''میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ میں اپنی بازی بری طرح ہار چکی ہوں اور تو جیت چکا ہے۔ تو فاتح ہے میں مفتوح لیکن یہ بھی یاد رکھ کہ جس طرح میں نے تجھے اپنے پیٹ میں رکھا ہے، ہارون بھی رہا ہے۔ اب میں تجھ سے بس ایک آخری خواہش کروں گی۔ میرا خیال ہے کہ میری یہ خواہش ایسی نہیں ہے، جسے تو نہ مان سکے۔ بڑی آسان اور معمولی خواہش ہے۔''

ہادی نے کہا۔ ''جلدی کیجیے، میرا وقت نہ ضائع کیجیے۔''

خیزران نے کہا۔ ''اب میں قصرِ خلد میں نہیں رہوں گی۔ میں یہیں تیرے پاس قصرِ ابیض ہی میں رہنا چاہتی ہوں، جب میرا ایک بیٹا قتل کیا جائے تو میں چاہتی ہوں کہ میرا دوسرا بیٹا میرے قریب ہی موجود رہے، ورنہ شدت

کرب سے میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔"
ہادی کچھ دیر تک اس درخواست پر غور کرتا رہا پھر جواب دیا۔ "کوئی مضائقہ نہیں، آپ آج کی رات یہیں رہ سکتی ہیں۔"
خیزران نے کہا۔ "ہادی! صرف آج ہی کی رات نہیں بلکہ میں مستقلاً یہاں رہوں گی کیونکہ میں قصرِ خلد میں رہ کر ماضی کی یاد کے نشتر نہیں برداشت کرسکوں گی۔"
ہادی نے پوچھا۔ "کیا وہ محبت جو آپ کو ہارون سے ہے، مجھے مل سکے گی؟"
خیزران نے بے بسی سے جواب دیا۔ "ہادی! میں تجھ سے بھی اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی ہارون سے لیکن تو اس محبت کا آج تک کوئی اندازہ نہیں لگاسکا۔"
ہادی نے اپنی کنیزوں کو حکم دیا۔ "میری ماں اور تمہاری سیدہ اب یہیں اس محل میں رہیں گی۔ تم سب ان کا حکم اسی طرح مانو گی جس طرح میرا مانتی ہو۔"
ہادی اپنے خاص کمرے میں چلا گیا اور خیزران کنیزوں سے باتیں کرنے لگی۔
اس رات یحییٰ اپنے قید خانے میں، بڑے بیٹے فضل کو بلا کر ہدایت دے رہا تھا۔ "فضل! تو گھر جا کر آرام نہیں کرے گا۔ آج کی رات بڑی انقلابی اور اہم رات ہے۔ تو اپنے اعتماد کے کاتبوں کو بلا کر ان سے مراسلے تیار کروا، یہ مراسلے ان عالموں اور حکمرانوں کو بھیجے جائیں گے جو خلافت کی طرف سے مختلف ملکوں اور حصوں پر حکمرانی کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ تو ان مراسلوں میں ہارون الرشید خلیفۃ المسلمین کی طرف سے یہ حکم دے گا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں امن قائم رکھیں، نیا خلیفہ انہیں ان کی جگہوں سے ہٹانا پسند نہیں کرتا۔"
فضل اپنے باپ کی باتیں بے یقینی سے سنتا رہا، باپ نے پوچھا۔ "کیا تجھے میری باتوں پر یقین نہیں آرہا؟"
فضل نے جواب دیا۔ "اگر آپ کی ان باتوں کا امیر المومنین ہادی کو علم ہوگیا تو وہ ہم سب کو فی الفور قتل کروادیں گے۔"
یحییٰ ہنسا اور بولا۔ "مت ڈر میرے بیٹے، مت ڈر۔" پھر کسی سے پوچھا۔ "کیا سیدہ خیزران قصر ابیض پہنچ چکی ہیں؟"
کسی خدمت گار نے جواب دیا۔ "ہاں وہ قصر ابیض پہنچ چکی ہیں۔"
یحییٰ نے پھر سوال کیا۔ "وہ نجومی کہاں ہے؟ کیا وہ یہیں کہیں موجود ہے؟"
کسی نے جواب دیا۔ "ہاں نجومی بھی یہیں موجود ہے۔"
یحییٰ نے پھر سوال کیا۔ "قصرِ خلد میں ہارون کی بیوی زبیدہ کا کیا حال ہے؟ بچے کی ولادت میں کتنی دیر ہے؟"
کسی نے جواب دیا۔ "معلوم ہوا ہے بچے کی ولادت بس ہونے ہی والی ہے۔"
یحییٰ نے فضل سے کہا۔ "تو ابھی اسی وقت یہاں سے بھاگ جا اور میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کر۔"
فضل اپنے گھر چلا گیا اور باپ نے جو ہدایت کی تھی اس پر عمل کرنا شروع کردیا۔
یحییٰ نے نجومی سے پوچھا۔ "تیرا کیا خیال ہے، وہ گھڑی یا وہ ساعت جس کی تو پیش گوئی کرچکا ہے، اس کے آنے میں کتنی دیر رہ گئی ہے؟"
نجومی نے جواب دیا۔ "جناب! میں اس ساعت کا صحیح صحیح وقت تو نہیں بتاسکتا لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ ان گھڑیوں اور ان ساعتوں کا نزول شروع ہوچکا ہے۔"
یحییٰ نے کہا۔ "تو درست کہہ رہا ہے۔ میرے کان اس آہٹ کو بخوبی سن رہے ہیں جو خلافت کی منتقلی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ ہارون کا اقبال رات کی تاریکیوں کو چیرتا پھاڑتا اس کے قید خانے میں داخل ہوچکا ہے اور انہی آہٹوں میں، میں ایک اور آہٹ بھی سن رہا ہوں۔ بھیانک، خوف ناک المیہ اور یاس انگیز۔"
نجومی، یحییٰ کی صورت دیکھ رہا تھا۔ یکایک وہ بہت زیادہ گھبرا گیا، یحییٰ نے پوچھا۔ "تو اچانک پریشان کیوں ہوگیا؟"
نجومی نے اپنی پشت پر کھڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ یہ اس قید خانے کا نگراں سلامہ ابرش تھا جو یحییٰ کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ یحییٰ نے سلامہ ابرش سے کہا۔ "سلامہ! تو مت گھبرا تیری مہربانیوں اور رعایتوں کا شاندار صلہ دیا جائے گا کیونکہ میرے کان موت کی اس آہٹ کو بھی سن رہے ہیں جو ہادی کی طرف موت کے قدم بڑھانے سے پیدا ہورہی ہے۔"
سلامہ اور نجومی کا خیال تھا کہ شاید یحییٰ کا دماغی توازن جاتا رہا ہے۔

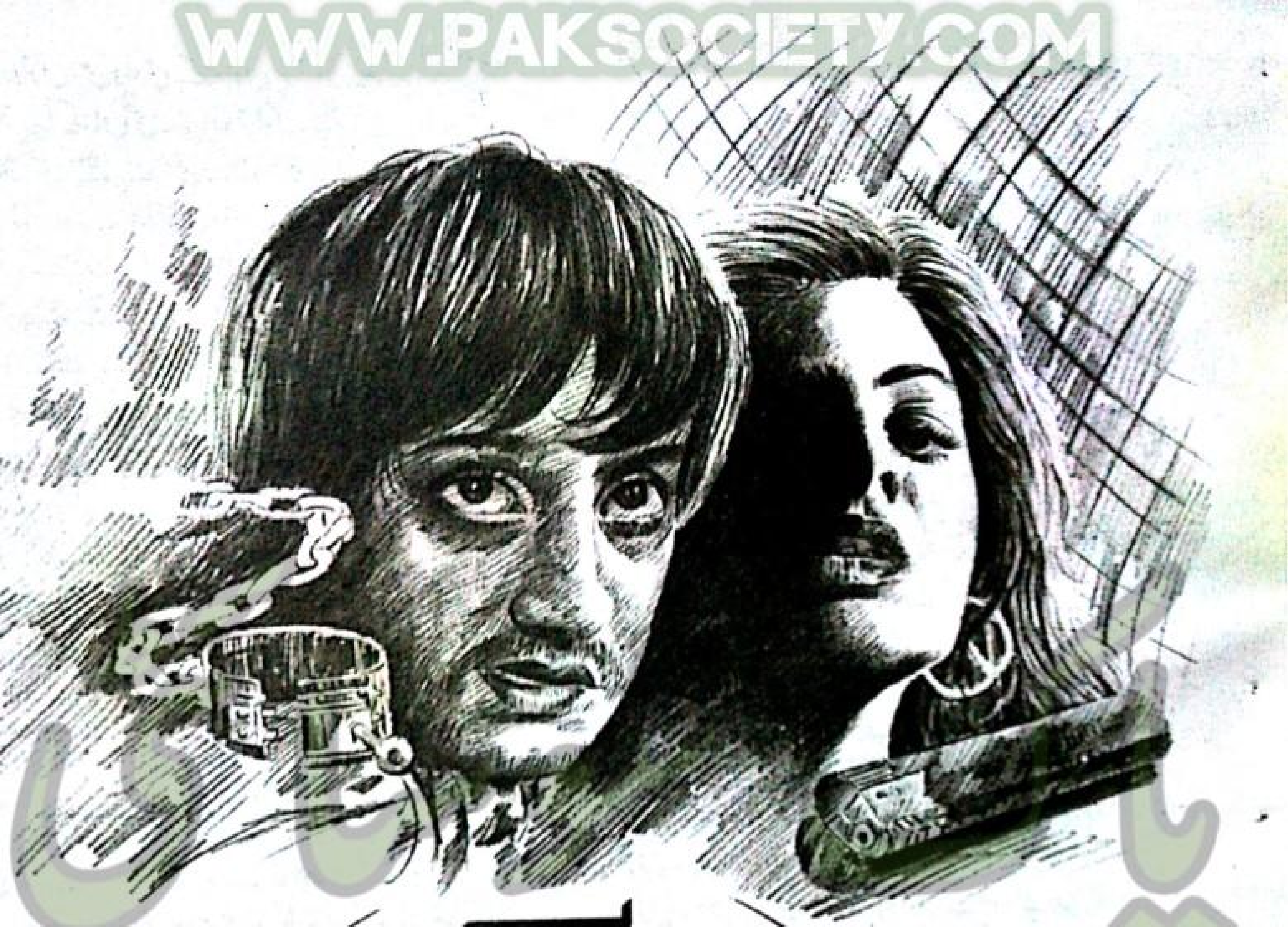
☆☆☆

ہادی اپنے کمرے میں گیا اور بستر پر دراز ہوگیا۔ اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا گویا طبیعت بھاری بھاری ہے۔ کچھ دیر بعد خیزران اس کی مزاج پرسی کو گئی، پوچھا۔

''ہادی! تیری طبیعت کیسی ہے؟''
ہادی نے چڑچڑے انداز میں جواب دیا۔''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں مر نہیں رہا، ابھی زندہ ہوں۔''
خیزران نے کہا۔''بیٹے! اب تجھے سو جانا چاہیے۔''
ہادی نے جواب دیا۔''ہاں، اب میں نے سونے کی تیاریاں کرلی ہیں۔ اجازت دیجیے، میں سونا چاہتا ہوں۔''
ہادی اپنے کمرے میں سونے کی تیاریاں کرنے لگا۔
ہادی کی ماں خیزران کنیزوں کے جھرمٹ میں وہیں موجود رہی۔ وہ چند کنیزوں سے آہستہ آہستہ چپکے چپکے معلوم نہیں کیا باتیں کررہی تھی۔ انہی میں عاتکہ اور عریفہ بھی شامل تھیں جو ہادی کو خونخوار اور منتقمانہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔
خیزران نے ایک کنیز کو حکم دیا۔''ذرا تو ہادی کے کمرے میں خاموشی سے چلی تو جا، باقی کام میں خود انجام دے لوں گی۔''
کنیز ڈرتے ڈرتے اندر گئی اور یہ مختصر سا جواب لے کر واپس آگئی۔''سیدہ! امیر المومنین آرام فرمارہے ہیں۔''
خیزران نے پوچھا۔''اچٹتی یا گہری نیند؟''
کنیز نے جواب دیا۔''بہت گہری۔''
خیزران نے چند طاقتور کنیزوں کو ساتھ لیا اور ہادی کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ ہادی نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ خیزران اس کے سرہانے کھڑی ہوگئی۔ کنیزیں ہادی کے دونوں طرف کھڑی تھیں۔ خیزران نے جب پوری طرح یہ محسوس کرلیا کہ اب حالات اس کے قابو میں ہیں تو اس نے چند طاقتور کنیزوں کو ہادی کے اوپر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ایک کنیز نے ہادی کے منہ پر ایک دبیز کپڑا ڈال دیا اور دو بھاری بھرکم کنیزیں ایک ساتھ اس کے گلے اور منہ پر بیٹھ گئیں۔ بقیہ چار کنیزوں نے ہادی کے پیٹ، سینے اور پیروں پر بیٹھ کر ہادی کو بالکل بے بس کردیا۔ خیزران یہ کام اپنی نگرانی میں پورا کروا رہی تھی۔ ہادی کا دم گھٹ رہا تھا لیکن جن طاقتور کنیزوں نے ہادی کے منہ، گلے اور بعض دوسرے اعضا کو دبا رکھا تھا، ہادی ان کو ہلا تک نہیں سکتا تھا۔ ہادی کا جسم کانپتا تھرتھراتا رہا لیکن کنیزوں نے اسے نہیں چھوڑا۔ خیزران، ان سب کے ساتھ وہیں موجود رہی اور یہ کام اپنی نگرانی میں پورا کیا۔ کچھ دیر بعد ہادی کا جسم پھڑکتے سے رک گیا اور ساکت ہوگیا۔
خیزران نے کنیزوں کو حکم دیا۔''اب تم لوگ غسل کرواسکتی ہو ہادی کی میت کا۔''
عاتکہ اور عریفہ ہادی کی لاش پر آنسو بہانے لگیں۔
کچھ دیر بعد یحییٰ اور ہارون بھی قصر ابیض ہی میں پہنچ گئے۔ نجومی بھی یحییٰ کے ساتھ ساتھ تھا۔ یحییٰ نے پردے کی آڑ سے خیزران سے پوچھا۔''سارا کام بخیر و خوبی انجام پاگیا؟''
''ہاں۔'' خیزران نے جواب دیا۔''لیکن یہ کام جتنا خطرناک تھا اتنا ہی دشوار بھی۔''
یحییٰ نے جواب دیا۔''ہر بڑا کام جتنا خطرناک ہوتا ہے اتنا ہی دشوار بھی۔''
چند گھڑسوار قصر ابیض کے بڑے پھاٹک سے اندر داخل ہوگئے اور خیزران کو مطلع کیا۔''سیدہ کو پوتا مبارک ہو۔''
خیزران نے پوچھا۔''کیا زبیدہ کے ہاں لڑکے کی ولادت ہوئی ہے؟''
خبررساں نے جواب دیا۔''نہیں بلکہ ہارون کی دوسری بیوی مراجل کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے۔''
ہارون، خیزران، یحییٰ اور نجومی بھی ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ اس ہجوم میں اچانک یحییٰ کی نظر عاتکہ پر پڑگئی وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ یحییٰ نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالیا، بولا۔''میری بچی! تو کیوں رو رہی ہے؟ اس ظالم نے تیرے ساتھ بڑا ظلم کیا تھا۔''
پھر اچانک اس کی نظر عریفہ پر پڑگئی، وہ بھی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ یحییٰ نے پوچھا۔''عاتکہ یہ کون ہے؟''
عاتکہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔''عریفہ! جسے ہادی نے دو روز پہلے خود سے جدا کردیا تھا۔''
یحییٰ نے کہا۔''کمال ہے اور یہ اس کے غم میں پھر بھی رو رہی ہے۔''
اور یہی وہ رات تھی جس کی نجومی نے پیش گوئی کی تھی۔ اس رات ایک خلیفہ ہادی اس دنیا سے رخصت ہوا، دوسرے خلیفہ ہارون الرشید نے خلافتِ عباسیہ کا اقتدار سنبھالا اور تیسرا خلیفہ مراجل کے بطن سے پیدا ہوا جو تاریخ میں مامون الرشید کے نام سے مشہور ہوا۔

کہانی کے تاریخی ماخذ

تاریخ بغداد	تمدن عرب	تاریخ ایران	المامون	معجم البلدان	تاریخ اسلام	طبقات ناصری
خطیب بغدادی	ڈاکٹر گستاؤلی بان	مقبول بیگ بدخشانی	شبلی نعمانی	یاقوت حموی	معین الدین احمد ندوی	منہاج سراج



بے ساختہ

کاشف زبیر

عادی مجرم ہر کام مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ کرتا ہے مگر کبھی کبھی کسی معصوم انسان کے ہاتھوں بھی جرم سرزد ہو جاتا ہے اور ایسے میں محض اپنے بچاؤ کی خاطر وہ عادی مجرم سے زیادہ خطرناک جرائم کا ارتکاب کرتا چلا جاتا ہے۔ اسے ہی مقدر کا کھیل کہتے ہیں۔ جو شاطر ہوتے ہیں وہ وقت کے لبادے میں خود کو ڈھانپ لیتے ہیں جب کہ اناڑی اپنی سادگی میں بے ساختہ کوئی نہ کوئی ایسا تماشا کر جاتے ہیں جس سے ان کی بے وقوفی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسے بھی ایک ذرا سی دل لگی بڑی مہنگی پڑی تھی۔

چوروں کو پڑ گئے مور کے تناظر میں ایک

دلچسپ تحریر

جون ڈیک گھوڑے پر سوار اسے بگٹٹ دوڑا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے پیچھے موت لگی ہوئی ہے اور یہ غلط بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے پیچھے ایڈگر اور شارلی تھے۔ ویسے تو ایڈگر اور شارلی آپس میں دشمن تھے۔ آئے دن ان کے گروہوں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ دونوں جرائم پیشہ تھے اور ٹیکساس کی اس چھوٹی سی وادی پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے آپس میں برسرپیکار رہتے تھے۔ وادی میں دو قصبے تھے۔ ایک پپ ولی اور دوسرا اس

ٹاؤن۔ دونوں اس وادی کے سروں پر آباد تھے۔ دونوں کی آبادی تقریباً یکساں تھی۔ زیادہ تر لوگ جانور چرانے یا اس سے متعلقہ کسی پیشے سے تعلق رکھتے تھے۔ باقی لوگوں کا روزگار اس شاہراہ سے چلتا تھا جو وادی کے پاس سے گزرتی تھی اور یہاں سے مشرق و مغرب کو آنے جانے والے قافلے اور مسافر گزرتے تھے۔

اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی بات پر متفق ہوئے ہوں۔ اگر ایک مشرق کی بات کرتا تو دوسرا لازمی مغرب کی بات چھیڑتا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر مرنے کے بعد ان میں سے کسی کو جنت بھیجا گیا تو دوسرا لازمی جہنم جانے پر اصرار کرے گا۔ انہوں نے قصبوں کو آپس میں بانٹ لیا تھا۔ ایڈگر پپ ولی کا غیر اعلانیہ حکمران تھا اور شارلی راس ٹاؤن پر حکومت کرتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی حدود میں قدم رکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کے آدمی بھی ایسا نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی غلطی سے ایسا کر جاتا تو اسے اعلان جنگ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جون کا معاملہ ایسا تھا کہ وہ آپس میں متفق ہو گئے تھے۔ یہ اتفاق جون کے قتل پر تھا۔ جون جو ایک عام سا کاؤ بوائے تھا اور ان قصبوں کے سب سے دولت مند آدمی سام بوائڈ کا عام سا ملازم تھا۔ اکیلا آدمی تھا، دور پرے کے چند رشتے دار تھے۔ پرامن اور لڑائی جھگڑے سے گریز کرنے والا آدمی تھا۔ جس کی خواہش تھی کہ اس کی زندگی میں کوئی ہنگامہ نہ آئے۔ ایک دن پہلے تک اس کی یہ خواہش پوری ہوتی آئی تھی۔

اس سارے قصے کا آغاز ویک اینڈ نائٹ سے ہوا۔ جون کو تنخواہ ملی تھی اور اس کا عیاشی کا موڈ ہو رہا تھا۔ اس نے پپ ولی کے بار مری کا رخ کیا اور وہاں اس نے ایک بوتل وہسکی لی۔ یہ کسی بھی عورت کو متوجہ کرنے کا آسان طریقہ تھا اور اس کی توقع پوری ہوئی مگر آنے والی روز...... پیشہ ور نہیں تھی۔ وہ اسی قصبے کے ایک بڑھئی کی بیٹی تھی اور بلاشبہ نہایت حسین تھی۔ وہ یوں جون کے پاس آئی کہ اسے اس کے عزائم بھانپنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور کچھ دیر بعد وہ دونوں بار کے اوپر ایک کمرے میں تھے جو ان ہی مقاصد کے لیے مخصوص تھا اور عین اس وقت جب جون مدہوشی کی بلندیوں پر تھا اچانک دھڑام سے دروازہ کھلا اور رینارڈ اندر آیا۔ رینارڈ کا شمار ایڈگر کے نزدیک ترین آدمیوں میں ہوتا تھا۔ روز نے چیخ ماری اور خود کو چادر میں چھپالیا۔ جون بوکھلایا ہوا تھا مگر رینارڈ نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر غرا کر روز سے کہا۔

''کتیا! تو کیا سمجھتی ہے مجھے تیری سرگرمیوں کا علم نہیں ہے۔''

''تو خود کتا ہے۔'' روز نے جوابی غراہٹ کے ساتھ کہا۔ جون کے اوسان خطا ہو گئے۔ اسے ذرا بھی بھنک ہوتی کہ روز اصل میں رینارڈ کی محبوبہ ہے تو وہ کبھی اس کی طرف نہ بڑھتا۔ اس نے وضاحت کرنی چاہی مگر رینارڈ وضاحت سننے نہیں آیا تھا۔ اس نے ریوالور نکالا اور روز کے سینے میں دو گولیاں اتار دیں۔ جون سمجھا کہ گولیاں اس پر چلائی جا رہی ہیں اور وہ ریوالور کی جھلک دیکھتے ہی بستر سے نیچے گر گیا اور کانپتے ہاتھوں سے نیچے پڑی اپنی پتلون کے ساتھ موجود ہولسٹر سے اپنا ریوالور نکالا اور ہاتھ اوپر کر کے رینارڈ کی طرف اندھادھند چند گولیاں چلائیں۔ اس نے سر بھی اوپر نہیں کیا تھا اور بیڈ کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔ رینارڈ چند لمحے کھڑا رہا اور پھر دھڑام سے نیچے گرا۔ وہ یوں گرا تھا کہ اس کا چہرہ جون کی طرف تھا۔ اس کی کھلی آنکھوں سے مرنے کے بعد بھی تعجب جھلک رہا تھا۔ تعجب خود جون کو بھی تھا کہ اس نے آج تک کسی انسان پر گولی نہیں چلائی تھی اور آج اس نے رینارڈ جیسے خوفناک آدمی کو قتل کر دیا تھا جو خود درجنوں انسانوں کا قاتل تھا۔

جون کو احساس ہوا کہ وہ کتنی خوفناک صورت حال میں گھر گیا ہے اور اب موت اس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ سیدھا ہوا تو بستر پر پڑی روز کو دیکھ کر چونکا۔ وہ مر چکی تھی۔ جون نے عجلت میں کپڑے پہنے اور سیڑھیوں سے نیچے جانے کے بجائے ... کھڑکی سے باہر آیا اور کھپریل کی ترچھی چھت سے ہوتا ہوا عین اس جگہ کودا جہاں اس کا گھوڑا کھڑا ہوا تھا۔ بار میں ایڈگر کے اور بھی آدمی موجود تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اس سے پہلے کہ کوئی بار سے باہر آتا، وہ گھوڑے کو ایڑھ لگا چکا تھا۔ قصبے سے باہر نکل کر اس نے سوچا کہ کہاں جائے تو ایڈگر کے آدمیوں سے بچنے کے لیے واحد پناہ گاہ راس ٹاؤن نظر آئی۔ وہاں ایڈگر اور اس کے آدمی پھٹک نہیں سکتے تھے۔ سام کا فارم، گھر اور اس کے ملازمین کی رہائش دونوں قصبوں کے درمیان میں تھی لیکن وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

گھوڑا دوڑاتے ہوئے جون بار بار پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ابھی کچھ گھڑسوار اس کے تعاقب میں آئیں گے۔ مگر جب وہ راس ٹاؤن میں داخل ہوا تو اس کے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ رات کسی قدر گہری ہو چلی تھی اور عام لوگ اپنے گھروں میں نیند کی آغوش میں جا چکے تھے۔ البتہ قصبے کی کچھ جگہیں تھیں جو ابھی تک جاگ رہی تھیں اور ایٹ کا

بار ان میں سے ایک جگہ تھی۔ جون ایک بار پہلے بھی یہاں آچکا تھا چونکہ وہ کسی قصبے کا رہنے والا نہیں تھا اس لیے اسے دونوں مقامات پر خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ ایبٹ کے بار میں اس وقت بھی خاصی رونق تھی۔ وہ کسی پر توجہ دیے بغیر کاؤنٹر پر آیا اور اپنے لیے شاٹ طلب کیا۔ وہ حواس باختہ تھا اور اس وقت اسے تیز شراب کی ضرورت تھی۔ بارٹینڈر نے ایک چھوٹا شاٹ اس کے سامنے رکھا اور اس نے ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ پھر دوسرا شاٹ طلب کیا۔

''ایزی بوائے۔'' اس کے برابر میں بیٹھے آدمی نے جون کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس نے بھڑک کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اس کے ساتھ ہی بار میں سنسنی پھیل گئی۔ اس وقت تک جون نے نہیں دیکھا تھا کہ برابر میں کون ہے۔ اب اس نے دیکھا تو اپنی قسمت کا ماتم کرنے کو دل چاہا۔ وہ ولیم کولین تھا۔ شارلی کا دست راست اور بہت خوفناک لڑاکا۔ جون نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا اور ولیم کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس توہین پر کیا سوچ رہا تھا؟ جون نے دونوں ہاتھ اوپر کیے۔

''پلیز! میں نے دیکھا نہیں تھا۔''

مگر ولیم کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور اس کا ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اس سے پہلے وہ اپنا ریوالور نکالتا' جون نے اپنے لیے طلب کیا ہوا دوسرا شاٹ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھونک دیا۔ تیز شراب نے ولیم کو دھاڑنے پر مجبور کردیا اور اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں کی طرف گیا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر جون نے ریوالور نکالا اور اس کی باقی گولیاں ولیم کولین کے سینے میں اتار دیں۔ وہ نیچے گرا اور مر گیا۔ بار میں شور مچ گیا تھا اور وہاں موجود لوگ اندھا دھند بھاگنے لگے۔ بارٹینڈر اور ویٹریس کا خوف سے برا حال تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ بار میں ولیم کولین کا قتل ان کے لیے کیا قیامت لائے گا۔ جون کی خوش قسمتی تھی کہ وہاں شارلی کا مزید کوئی آدمی نہیں تھا ورنہ وہ زندہ سلامت وہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ باہر نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔

ملازمین کی رہائش گاہ میں اس کے چند جوڑوں اور معمولی اشیا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے اپنی ساری جمع پونجی سونے کی شکل میں وادی کے ایک حصے میں چھپا رکھی تھی۔ ایبٹ کے بار سے نکلتے ہی اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر اسے زندہ رہنا ہے تو یہاں سے بہت دور جانا ہوگا۔ اتنی دور جہاں ایڈگر اور شارلی کی سوچ بھی نہ جاسکے۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے وہاں کا رخ کیا جہاں اس نے سونا چھپایا تھا۔ سونا زمین میں تھا اور اسے چاقو کی مدد سے کھدائی کرنا پڑی تب کہیں وہ ٹاٹ میں... سونے کے بار کو نکال سکا تھا۔ اسے لے کر وہ وادی سے باہر آیا۔ اب اسے فیصلہ کرنا تھا کہ اسے کس طرف جانا تھا۔ نزدیک ترین قصبہ تو ...... پامپا تھا۔ یہ ٹیکساس کا شمالی حصہ تھا۔ جون نے شمال مغربی ٹیکساس کی طرف جانے کا فیصلہ کیا جو زیادہ بے آباد تھا۔

وہ صبح اس وقت تک گھوڑا دوڑاتا رہا جب تک اس نے تھک کر مزید آگے بڑھنے سے انکار نہیں کردیا۔ سورج صبح سے انگارے برسانے لگا تھا مگر شمال کی طرف سے چلتی تیز ہوا گرمی کا اثر زائل بھی کر رہی تھی۔ گیارہ بجے وہ ایک چھوٹے سے قصبے تک پہنچا جہاں دو درجن گھر تھے اور صرف ایک دکان تھی۔ وہاں سے اسے مطلب کی تمام چیزیں مل گئیں۔ ریوالور کے لیے گولیاں، اپنے اور گھوڑے کے لیے خوراک اور شراب۔ پانی کے لیے اس نے ایک مشکیزہ لے لیا اور کنویں سے اس میں تازہ پانی بھرلیا۔ شام تک وہ ایک درخت تلے آرام کرتا رہا اور جیسے ہی سورج مغرب کی طرف ڈھلا، وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اس وسیع و عریض چراگاہ کی سمت روانہ ہوگیا جہاں ٹیکساس اور نیومیکسیکو والے مشترکہ طور پر اپنے مویشی چرانے لاتے تھے۔ کاؤبوائے ہونے کے ناتے جون ٹیکساس، ایریزونا اور نیومیکسیکو کی تمام چراگاہوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

اسے امید تھی کہ وہ رات بھر سفر کر کے اس چراگاہ تک پہنچ جائے گا اور وہاں چند دن چھپ کر حالات کا جائزہ لے سکے گا۔ اس کا گھوڑا بہت مضبوط تھا اور آرام سے تازہ دم بھی ہوگیا تھا۔ وہ صبح کے قریب چراگاہ میں داخل ہوا۔ جگہ جگہ موجود مویشیوں کا گوبر بتا رہا تھا کہ ان دنوں چراگاہ میں بہت رونق تھی۔ یہ رونق اس کے لیے خطرناک ہوسکتی تھی کیونکہ اسے بہت سے لوگ جانتے تھے اور کوئی بھی پیچھے آنے والوں کو اس کے بارے میں بتا سکتا تھا۔ ایڈگر اور شارلی کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ لازمی اس کے پیچھے آئیں گے۔ وہ کینہ پرور تھے اور کسی کو معاف کرنا ان کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ جون احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ چراگاہ کے نیومیکسیکو کے ساتھ لگنے والے حصے میں ایک پہاڑی خطے سے واقف تھا جہاں چھپنے کی بے شمار جگہیں تھیں مگر وہ جگہ یہاں سے خاصے فاصلے پر تھی اور اسے آج کا دن بھر چھپ کر گزارنا تھا۔ اس نے جھاڑیوں سے گھری ایک چٹان منتخب کی اور اس کے اندر گھس کر گھوڑا باندھ

دیا۔ اس نے گھوڑے کو خشک چارا ڈالا اور خود بھی چنے حلق سے اتارنے لگا۔

شام کے وقت گھوڑے کی ہنہناہٹ نے اسے خبردار کیا اور جون نے چٹان پر چڑھ کر دیکھا تو دور مشرق سے کوئی ایک درجن گھڑسوار چراگاہ میں داخل ہو رہے تھے۔ اتنی دور سے پہچان مشکل تھی مگر اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ وہ ایڈگر یا شارلی یا پھر دونوں کے آدمی تھے مگر جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ مشترک نہیں تھے کیونکہ اتنا ہی بڑا ایک گروہ اور ذرا فاصلے سے چراگاہ میں داخل ہوا تھا۔ جون خوفزدہ ہو گیا۔ اس کا خدشہ بدترین صورت میں سچ بن کر سامنے آرہا تھا۔ ایڈگر اور شارلی پوری قوت سے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ اب یہاں ٹھہرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ جون نے اپنا سامان سمیٹ کر گھوڑے پر بار کیا اور فوری طور پر وہاں سے آگے روانہ ہو گیا۔ اس نے جھاڑیوں سے نکلنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ اس میں راستہ تلاش کرنا دشوار کام تھا مگر یہاں وہ آنے والوں کی نظروں سے محفوظ تھا اور سستی سے سہی مگر آگے بڑھ رہا تھا۔

تاریکی چھا جانے تک وہ جھاڑیوں سے نکل آیا تھا اور اب کھلی چراگاہ میں تیز رفتاری سے سفر کر رہا تھا۔ عقب میں فی الحال دشمنوں کا نام و نشان نہیں تھا مگر اسے علم تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ ان کے عزائم سے لگ رہا تھا کہ وہ امریکا کے آخری کونے تک اس کا پیچھا کریں گے۔ جون ساری رات سفر کرتا رہا اور صبح سے پہلے وہ اس پہاڑی علاقے میں داخل ہو گیا تھا۔ جہاں اونچے درختوں والے جنگل تھے اور باقی جگہیں پتھریلی اور خشک تھیں۔ چھوٹے پودے اور گھاس وہاں تھی جہاں پانی تھا۔ جون کا پانی ختم ہو رہا تھا اور اسے راستے میں کوئی چشمہ بھی نہیں ملا تھا۔ اس لیے اب اسے پناہ کے ساتھ ساتھ پانی کی تلاش بھی تھی۔ جلد اسے ایک چھوٹا چشمہ مل گیا۔ اس نے گھوڑے کو کنارے پر چھوڑا اور خود پانی میں اتر گیا۔ پانی ٹھنڈا اور شفاف تھا۔ جی بھر کر پینے کے بعد اس نے اپنا مشکیزہ بھرا اور پھر کپڑے اتار کر جسم پر جمی گرد اور میل کی تہیں صاف کرنے لگا۔

اسے لگ رہا تھا کہ دشمن کچھ پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس لیے وہ موقع سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ یہاں چند چھوٹے قصبے بھی تھے جو چرواہوں کی وجہ سے پر رونق ہوتے تھے مگر جون نے ان کا رخ کرنے سے گریز کیا۔ اسے معلوم تھا کہ پہلے اسے ان ہی جگہوں پر تلاش کیا جائے گا۔ جب وہ نہا کر کپڑے پہن رہا تھا تو اسے لگا کہ آس پاس سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ اسے اپنا وہم سمجھا اور دوبارہ گھوڑے کو لے کر آگے بڑھا۔ ان پہاڑوں میں غار بھی تھے اور ایسی گھاٹیاں بھی جہاں چھپنے کے لیے بے شمار جگہیں تھیں۔ اس نے ایک گھاٹی کا انتخاب کیا۔ یہاں دو طرف سے راستے نکلتے تھے۔ اگر ایک طرف سے دشمن آ بھی جاتا تو دوسری طرف فرار کی گنجائش رہتی۔ رات کو جب وہ کہیں رکتا تو پہلے اپنا سونا چھپاتا تھا۔ یہاں ڈاکو عام پھرتے تھے اور سوتے میں وہ کسی ڈاکو کے ہتھے چڑھ جاتا تو اپنی جمع پونجی سے محروم ہو جاتا۔ اسے کہیں جا کر سیٹ ہونے کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔

یہاں بھی اس نے سب سے پہلے یہی کیا۔ بلند علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں گرمی نہیں تھی اور سائے میں خوشگوار خنکی تھی۔ وہ لیٹا تو اسے پتا ہی نہیں چلا۔ اچانک اسے لگا کہ کوئی اسے ہلا رہا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا کہ چہرے کے عین سامنے رائفل کی نال دیکھ کر ساکت ہو گیا۔ پہلا خیال اسے یہی آیا کہ دشمن اس تک پہنچ گئے ہیں مگر جب اس نے رائفل کے پیچھے موجود چہرہ دیکھا تو چونک گیا۔ وہ عورت تھی اور چہرے سے ہسپانوی نژاد لگ رہی تھی۔ خاکی رنگ کی شرٹ کے ساتھ اس نے اسی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی اور سر پر سرخ رنگ کا رومال لپیٹ رکھا تھا۔ آنکھیں سیاہ اور رنگ سانولا تھا مگر وہ دلکش عورت تھی۔ اس کی عمر جون جتنی تھی یعنی چوبیس پچیس کے آس پاس۔ جون حیران تھا کہ اس علاقے میں ہسپانوی نژاد عورت اور وہ بھی اس حلیے میں۔ عورت نے اسے رائفل سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''کون ہو تم؟''

''تمہاری موت۔'' عورت نے سرد لہجے میں کہا۔ اس کی انگریزی اچھی تھی۔ تب جون نے دیکھا کہ عورت اکیلی نہیں تھی' اس کے ساتھ نصف درجن مسلح ہسپانوی بھی تھے۔ وہ پچھتایا کہ اس نے اپنی چھٹی حس کے اشارے پر توجہ کیوں نہیں دی جبکہ اس کے خراب حالات چل رہے تھے۔

''لیکن میں تم کو نہیں جانتا۔''

''جلد تم جان جاؤ گے، پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کیوں آئے ہو؟''

''میں کاؤ بوائے ہوں۔'' جون نے سچ کہا مگر انہوں نے یقین نہیں کیا۔ عورت نے اپنے ساتھیوں کو کچھ کہا اور جواب پر ایک پستہ قد ہسپانوی نے اپنی زبان میں عورت

سے کچھ کہا۔عورت نے نظر جما کر جون کو دیکھا۔

''میرا ساتھی کہہ رہا ہے کہ تمہاری دونوں ٹانگوں میں رسی باندھ کر دو الگ گھوڑوں سے باندھ کر انہیں ہنکا دیا جائے تب تم سچ بولو گے۔''

اتنی خوفناک تجویز سن کر جون کی روح تک کانپ اٹھی۔اس نے گڑگڑا کر کہا۔''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں کاؤ بوائے ہوں اور میں ٹیکساس سے آیا ہوں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' عورت نے کہتے ہوئے اچانک اس کے سر پر رائفل کی نال ماری تو وہ چکرا کر نیچے گر پڑا... زمین و آسمان اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے تھے اور پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ اسے ہوش آیا تو وہ ہاتھوں اور پیروں سے بندھا ہوا ایک چٹان کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔عورت اور اس کے ساتھی سامنے ہی آگ جلا کر اس پر خشک گوشت بھون کر کھا رہے تھے اور ہوا میں گوشت بھننے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جون نے صبح سونے سے پہلے کچھ چنے کھائے تھے اور اس وقت اس کا پیٹ خالی تھا۔خوشبو سے اس کے منہ میں پانی آرہا تھا۔وہ کوشش کر کے چٹان کے ساتھ بیٹھا تو عورت نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھی آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے مگر وہ خاموش تھی۔ کچھ دیر بعد وہ خنجر کی نوک میں پرویا ہوا گوشت کا ایک ٹکڑا لے کر اس کی طرف آئی اور نزدیک بیٹھ گئی۔

''تمہاری یادداشت بہتر ہوئی؟''

جون نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور بولا۔''دیکھو میں نہیں جانتا کہ تم مجھے کیا سمجھ رہی ہو لیکن میں سچ بتا رہا ہوں۔ میرا تعلق ٹیکساس کی ایک چھوٹی سی وادی سے ہے اور میں کاؤبوائے ہوں۔زندگی میں پہلی بار مجھ سے دو قتل ہوئے اور مارے جانے والے دونوں افراد نامی گرامی بدمعاش تھے۔''

عورت نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔''اور تم نے انہیں مار دیا جو صرف ایک کاؤبوائے ہے۔''

''بالکل اتفاق سے۔'' جون نے کہا اور پھر اسے بتانے لگا کہ دونوں قتل کیسے ہوئے تھے۔اس کے بعد سے وہ ان سے بچنے کے لیے بھاگا بھاگا پھر رہا ہے اور وہ موت کے فرشتے کی طرح اس کے پیچھے لگے ہیں۔''ایڈگر اور شارلی کے آدمی...... اور ممکن ہے وہ خود بھی اس وقت یہاں موجود ہوں۔جب تک وہ زندہ ہیں میرا پیچھا کرتے رہیں گے۔''

عورت سنجیدہ ہوگئی۔''اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو تم بہت بڑی مشکل میں پڑ گئے ہو۔''

''یقین کرو یہ سب تقدیر کا چکر ہے۔اس میں میرا قصور کم ہے۔''

''تم بزدل ہو ورنہ اتنا نہ گھبراتے۔''

''میں بزدل نہیں ہوں۔'' جون نے احتجاج کیا۔''لیکن مجھے لڑائی مول لینے کا شوق بھی نہیں ہے۔''

عورت کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر اس نے خنجر کی نوک میں پرویا ہوا گوشت اس کی طرف بڑھایا۔ جون نے دانتوں سے اسے خنجر کی نوک سے اتار لیا اور منہ میں بھر کر چبانے کی کوشش کرنے لگا۔ٹکڑا خاصا بڑا تھا اور ادھ بھنا تھا اس لیے بڑی مشکل سے اس کے حلق سے اترا۔ جون نے پانی مانگا تو عورت نے اپنے ایک ساتھی کو آواز دے کر پانی منگوایا اور مگ اس کے منہ سے لگا دیا۔ جون نے بے تابی سے پانی پیا اور مگ خالی کر کے اس کا شکریہ ادا کیا۔''تم بہت اچھی خاتون ہو۔''

''میں جتنی اچھی ہوں اتنی ہی سفاک بھی ہوں۔'' اس نے کہا۔''اگر مجھے معلوم ہوگیا کہ تم سائمن کے ساتھی ہو یا اسے جانتے ہو تو میں اپنے ہاتھوں سے تمہارا سر اتار دوں گی۔''

''سائمن کون ہے؟''

''میرے شوہر ماریو کا قاتل۔'' عورت نے کہا۔''وہ انگریز ہے۔اس نے کیلی فورنیا میں میرے شوہر کو قتل کیا اور بھاگ کر یہاں آگیا۔ میں کئی مہینے سے اس کا پیچھا کر رہی ہوں... اور اب مجھے پتا چلا ہے کہ وہ یہاں ہے۔''

جون نے ہچکچا کر کہا۔''میرا مشورہ ہے کہ تم واپس چلی جاؤ۔تم ہسپانوی ہو اور یہاں سب انگریز نسل کے لوگ ہیں۔کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا اور سائمن کا ساتھ سب دیں گے۔''

''میں جانتی ہوں اس کے باوجود میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔'' عورت نے کہا اور اٹھ کر واپس اپنے ساتھیوں کے پاس چلی گئی۔ جون نے محسوس کیا کہ وہ ان چھ ہسپانوی مردوں سے برتر تھی اور وہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔اس نے غالباً انہیں جون کے بارے میں بتایا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔شاید وہ بھی اسے بزدل سمجھ رہے تھے۔ جون کو ان پر غصہ آنے لگا مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔وہ چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ شام قریب تھی۔ جون نہیں سمجھ سکا کہ وہ کس وقت کا کھانا کھا رہے تھے۔شاید وہ بھی موقع نہیں نکال سکے تھے کھانے کا اور اب موقع ملا تو اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔کھانے کے بعد وہ سب جس کو جہاں جگہ ملی لیٹ گئے اور ان میں

سے ایک بلند چٹان پر چڑھ گیا۔ شاید وہ وہاں سے آس پاس کی نگرانی کرتا کہ کوئی خطرہ تو پاس نہیں آرہا ہے۔

جون سوچ رہا تھا کہ مصیبتیں ایک کے بعد ایک کرکے نازل ہورہی تھیں۔ عورت الاؤ کے پاس بیٹھی تھی اور اس کی تپش سے اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ جیسے ہی شام ڈھلی اور سورج غروب ہوا، اس نے الاؤ بجھادیا اور اٹھ کر جون کے پاس چلی آئی۔ اس نے جون سے کہا۔ ''مجھے تمہاری بات پر یقین آگیا ہے۔''

''اچھا۔'' وہ خوش ہوگیا۔ ''تب مجھے رہا کردو۔''

''نہیں اگر تم رہائی چاہتے ہو تو تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔''

''کیسا کام؟'' جون کی خوشی ماند پڑگئی۔ ''اگر تم یہ کہو کہ میں اس سائمن کا خاتمہ کردوں جس نے تمہارے شوہر کو قتل کیا تھا تو میں یہ نہیں کرسکتا۔''

عورت نے بدمزگی سے اسے دیکھا۔ ''میں تم سے صرف وہی کام لوں گی جو تم کرسکتے ہو۔''

''میں کیا کرسکتا ہوں؟''

''تم میرے شوہر بن کر میرے ساتھ چلو گے اور ہم سائمن کو تلاش کریں گے۔ میں خود اس کا خاتمہ کردوں گی۔''

جون فکرمند ہوگیا۔ ''کہاں چلنا ہے؟''

''پہلے ہم ڈال ہارٹ جائیں گے اور اگر سائمن وہاں نہیں ہوا تو ڈوماس......''

''اور اگر وہ وہاں بھی نہیں ہوا؟''

عورت مسکرائی۔ ''تب میں تمہیں آزاد کردوں گی۔''

''تم آزاد کردو گی لیکن میری جان کے دشمن جو پیچھے لگے ہیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی ماردیں گے۔ وہ لازمی ان دونوں میں سے کسی ایک جگہ پر ہوں گے۔''

''تم اتنے ہی کمزور ہو کیا؟'' وہ چڑ کر بولی۔ ''تم مسلسل بزدلی کی باتیں کیے جارہے ہو۔ ہمارے ہاں ایسے مرد کو گولی ماردیتے ہیں۔''

''وہ دو درجن ہیں۔'' جون نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''کیا تمہارے ہاں دو درجن خونخوار لوگوں سے لڑنے والوں کو مرد کہا جاتا ہے؟''

''لڑنے کو کون کہہ رہا ہے، میں ڈرنے کی بات کررہی ہوں۔'' وہ بولی۔ جون نے اس کی بات پر غور کیا۔

''او کے میں نہیں ڈرتا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ سب مجھے اچھی طرح پہچانتے ہیں اور جیسے ہی مجھے دیکھیں گے تو جھگڑا شروع ہوجائے گا۔ اس صورت میں تمہارے کام کا کیا ہوگا؟''

''تم فکر مت کرو، کوئی تمہیں یا مجھے نہیں پہچانے گا۔''

جون کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بھلا اسے کیوں نہیں پہچانا جائے گا۔ عورت نے پہلے ایک تیز روشنی والی لالٹین جلائی۔ پھر ایک بڑا سا دھاتی ٹرنک لے آئی اور اسے کھول کر اس نے اندر سے کچھ کپڑے نکالے۔ یہ انگریز عورتوں جیسے کپڑے تھے۔ اس نے ایک لباس منتخب کیا اور اپنا لباس اتارنے لگی۔ پھر اس نے گھور کر جون کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ جون نے گڑبڑا کا منہ پھیرلیا۔ کچھ دیر بعد عورت نے کہا۔ ''دیکھو، میں کیسی لگ رہی ہوں۔''

جون نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اس نے نہ صرف کپڑے بدل لیے تھے بلکہ سر پر سنہری بالوں کی وگ لگالی تھی اور اس حلیے میں بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ جون نے نشان دہی کی...... ''اپنے چہرے اور ہاتھوں کا رنگ کیسے چھپاؤ گی؟''

عورت نے اسے دستانے اور نقاب والا ہیٹ نکال کر دکھایا۔ ''اس سے۔''

''ٹھیک ہے تم نے اپنا بندوبست کرلیا ہے لیکن میرا کیا ہوگا؟''

وہ جون کے پاس آئی۔ اس کی مونچھوں کو چھوا۔ ''انہیں اڑا دیا جائے اور تمہارے سر پر استرا پھیر کر سرمئی بالوں کی وگ لگادی جائے تو کیسا رہے گا؟''

''اس سے میرے خدوخال تو تبدیل نہیں ہوں گے۔''

''کیوں نہیں ہوں گے؟'' اس نے کہا اور اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا ڈبا نکال کر اس میں سے چمڑے کے بنے دو ٹکڑے نکالے اور جون کے منہ میں دانتوں اور گالوں کے درمیان دائیں بائیں رکھے اور پھر اسے آئینہ دکھایا۔ جون کے گال پتلے تھے مگر اب وہ بھر گئے تھے۔ پھر عورت نے نوچ کر اس کی گھنی بھویں کم کیں۔ اب اس کی صورت بالکل ہی بدل گئی تھی۔

''واقعی میں خاصا مختلف دکھائی دے رہا ہوں۔''

''تب کیا خیال ہے؟'' عورت نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میرے شوہر بنو گے؟''

جون مسکرانے لگا۔ ''کیوں نہیں، تمہاری جیسی حسین عورت کا شوہر بننا تو خوش نصیبی ہوگی۔''

''لیکن یہ مت بھولنا کہ اس خوش نصیبی کے آس پاس کہیں موت بھی ہوگی۔'' عورت نے کہا اور دوبارہ لباس اتارنے لگی لیکن اس بار اس نے جون سے منہ پھیرنے کو نہیں کہا۔

☆☆☆

ڈال ہارٹ ایک چھوٹا سا خوب صورت پہاڑی قصبہ



تھا۔ اس کے چاروں طرف اونچے پہاڑ تھے جن پر اونچے درختوں والے جنگل تھے۔ بلندی اور چاروں طرف پہاڑوں کی وجہ سے یہاں گرمیوں میں بھی موسم خوشگوار رہتا تھا۔ قصبہ ایک بڑی سطح مرتفع پر تھا اور اس کی آبادی کوئی دو ہزار تھی مگر موسم گرما میں چاروں طرف سے آنے والے تاجروں اور تجارتی قافلوں کی وجہ سے اس کی آبادی بڑھ کر دگنی ہو جاتی تھی۔ یہاں ایک درجن سے زیادہ چھوٹے بڑے ہوٹل، سات شراب خانے، دو قحبہ خانے اور ایک درجن اصطبل تھے۔ یہاں آنے والے زیادہ تر مویشیوں کے تاجر ہوتے تھے جو بڑے پیمانے پر جانوروں کا سودا کرتے تھے اور پیشگی سودا کر کے جاتے تھے۔ گھوڑوں پر سوار جون اور شیبا (عورت نے اپنا یہی نام بتایا تھا) قصبے میں داخل ہوئے۔ دونوں کا حلیہ پہلے سے طے شدہ اور بدلا ہوا تھا۔ سرمئی بالوں کی وگ اور پھولے گالوں کے ساتھ جون مختلف اور اپنی عمر سے بڑا لگ رہا تھا۔

شیبا نے سرخ اور سنہری رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو نیچے سے گھیر والا اور اوپر سے اس کے حسین وجود پر یوں چسپاں تھا کہ ہر نظر اس پر آکر چپک رہی تھی۔ اس نے سیاہ ہیٹ پہنا ہوا تھا جس کے آگے سیاہ جالی والا نقاب تھا۔ ہاتھوں میں دستانے تھے۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ اس حلیے میں وہ انگریز عورت لگے گی۔ جون نے اپنے تھری پیس سوٹ کے نیچے مزید کپڑے پہن رکھے تھے اس لیے اس کا وزن بھی زیادہ لگ رہا تھا اور اسے خاصی مشکل ہو رہی تھی مگر اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس حلیے میں اس کی جان کے دشمن اسے پہچان نہیں پاتے۔ ان کا لباس اور سامان اعلیٰ درجے کا تھا اس لیے ان کا رخ بھی ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کی طرف تھا۔ جون یہاں کی ایک ایک گلی اور جگہ سے واقف تھا کیونکہ ہر سال گرمیوں میں اس کا خاصا وقت یہیں گزرتا تھا۔ جون سمجھنے سے قاصر تھا کہ اگر دشمن تک جانا تھا تو اتنی دھوم دھام سے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کام خاموشی سے کرتا زیادہ آسان ہوتا۔

شیبا کے چھ ساتھی اسی پہاڑی گھاٹی میں مقیم تھے۔ روانگی کے وقت شیبا نے اسے خبردار کیا کہ اگر اس نے فرار کی کوشش کی تو اس کا پیچھا کرنے والوں میں شیبا اور اس کے ساتھیوں کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔ اس نے شیبا کو یقین دلایا کہ وہ پہلے ہی خاصی مشکل میں ہے اس کا ارادہ اس میں اضافے کا نہیں ہے مگر ڈال ہارٹ کی طرف آتے ہوئے اس کا اندر سے برا حال تھا۔ لیکن اوپر سے وہ پرسکون نظر آرہا

تھا۔ قصبے میں داخل ہوتے ہوئے اس کی نظریں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ مگر فی الحال اسے ایڈگر اور شارلی یا ان کے ساتھیوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ ہوٹل تک آئے۔ اندر سے ایک بیل بوائے نمودار ہوا، اس نے ان کے گھوڑے ہوٹل کے سامنے اسٹینڈ پر باندھے اور ان کا سامان اٹھا کر اندر لے آیا۔ منہ میں رکھے پیڈز کی وجہ سے جون کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی، اس نے ڈیسک کلرک سے کہا۔

''ہمیں ایک بہترین ڈبل بیڈروم چاہیے۔''

''کیوں نہیں سر......'' اس نے اپنا رجسٹر کھولتے ہوئے ادب سے کہا۔

''مسٹر اینڈ مسز ایڈرک جائل۔'' جون نے تعارف کرایا۔

بیل بوائے نے انہیں کمرے تک پہنچایا اور یہ سچ مچ خاصا عالی شان قسم کا ڈبل بیڈروم تھا۔ بیل بوائے کے جاتے ہی جون نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کیے تھے کہ شیبا نے اسے روک دیا۔ جون نے احتجاج کیا۔ ''اتنے کپڑوں میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

''کچھ دیر میں شام ہو جائے گی اور ہمیں باہر جانا ہے۔ کیا تم پھر سے اتنے کپڑے پہنو گے؟''

جون نے سوچا اور ارادہ ملتوی کر دیا۔ واقعی اتنے کپڑے اتار کر پہننا اس کے لیے معرکہ سر کرنے سے کم نہیں تھا۔ شیبا نے اسے تسلی دی۔ ''تم فکر مت کرو، ہم جلدی واپس آجائیں گے۔''

سورج ڈھلتے ہی وہ باہر آئے۔ ہوٹل کے ساتھ ہی ایک بہترین بار اور ہوٹل تھا۔ انہوں نے اس کا انتخاب کیا۔ بار میں زیادہ تر اوپری طبقے کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر تاجر تھے۔ ان کا دل بہلانے کے لیے مقامی پیشہ ور عورتیں بھی موجود تھیں مگر بیگمات کی تعداد بہت کم تھی۔ شیبا نے اندر آ کر جائزہ لیا اور پھر جون کے ساتھ ایک میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''سائمن...... کاؤنٹر سے ذرا آگے میز پر...... سرخ کوٹ والا......''

جون نے سرسری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ تقریباً پچاس برس کا چھوٹے قد اور کسی قدر بھاری جسم والا دولت مند شخص تھا۔ دولت اس کے لباس اور انداز سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ اس کے آگے قیمتی سرخ شراب کی بوتل تھی۔ جون نے میز پر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''لگ تو نہیں رہا کہ یہ کسی کا قاتل ہو سکتا ہے؟''

''براہِ راست نہیں ہے لیکن ماریو کو اسی نے قتل کروایا ہے۔''

سائمن کہیں سے بھی گینگسٹر نظر نہیں آ رہا تھا۔ حد یہ کہ اس کے پاس ہولسٹر تک نہیں تھا۔ اگر اس نے کوٹ میں کوئی چھوٹا ہتھیار رکھا ہو تو یہ الگ بات تھی۔ وہ اطمینان سے گھونٹ گھونٹ کر کے اپنا گلاس خالی کر رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا اور شاید کسی کا منتظر تھا۔ جون نے اپنے اور شیبا کے لیے ڈرنک کا آرڈر دیا اور شیبا سے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ اسے تلاش کرنا ہے...... یہ مل گیا ہے، میرا کام ختم۔''

''اتنی جلدی نہیں۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔ ''تم اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرو گے۔ یہ کہاں رکا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اور کون کون ہے۔ جب میں مطمئن ہو جاؤں گی کہ اس سے نمٹ سکتی ہوں تب تمہیں جانے کی اجازت مل جائے گی۔''

''یعنی میری اتنی آسانی سے جان نہیں چھوٹے گی۔''

''تم کسی مصیبت میں نہیں ہو جو یوں رو رہے ہو۔'' شیبا نے اسے لتاڑا۔ ''ایک خوب صورت عورت کے شوہر بن کر بہترین ہوٹل میں رہ رہے ہو اور بہترین شرابیں پی رہے ہو۔''

''یہ تو ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''بیوی نہ سہی، کم سے کم ہوٹل اور شرابیں اصلی ہیں۔''

اس کی بات پر شیبا اسے گھور کر رہ گئی۔ ویٹریس ان کا آرڈر لے آئی تھی ورنہ جون کو مزید سننا پڑتی۔ ابھی اس نے وہسکی کا پہلا گھونٹ لیا تھا کہ اس کا گلاس چھلکتے چھلکتے بچا کیونکہ بار میں ایڈگر داخل ہوا تھا۔ اس نے عقابی نظروں سے وہاں موجود تمام افراد کا جائزہ لیا اور چند لمحے کے لیے اس کی نظر آ کر شیبا اور جون پر رکی تھی۔ پھر وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اکیلا آیا تھا مگر اس کے گرگے یقیناً آس پاس موجود تھے۔ شیبا اس کی صورت سے تاڑ گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کون ہے یہ...... شارلی؟''

''نہیں ایڈگر۔''

''خطرناک آدمی لگتا ہے۔''

''لگتا نہیں ہے...... سچ مچ بھی ہے۔'' جون نے کہا اور جلدی سے اپنا گلاس حلق میں انڈیل لیا۔

''آرام سے۔'' شیبا بولی۔ ''تم ایڈرک جائل ہو۔''

جون خود پر قابو پا رہا تھا مگر ابھی اس کی حالت بہتر نہیں ہوئی تھی کہ بار کا دروازہ پھر کھلا اور اس بار شارلی اندر آیا۔ اس نے دوسروں کو دیکھا مگر صاف ظاہر تھا کہ اسے ایڈگر کی تلاش تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے برابر والے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

ایڈگر نے اسے دیکھ کر منہ بنایا مگر پھر اس سے گفتگو میں لگ گیا۔ جون نے یقین سے کہا۔ ''یہ دونوں میرے بارے میں بات کر رہے ہیں۔''

''دوسرا شارلی ہے؟''

''بالکل۔''

شیبا غور سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ''تمہارا معاملہ الگ ہے لیکن کیا ان کی آپس میں دشمنی ختم ہوگئی ہے؟''

''بالکل بھی نہیں، یہ اس وقت صرف میری وجہ سے اتنے آرام سے ساتھ بیٹھے ہیں ورنہ اب تک ان میں سے ایک مر چکا ہوتا۔''

''اگر یہ آپس میں لڑ جائیں تو......''

''تب شاید میری جان چھوٹ جائے۔''

سائمن شراب سے دل بہلانے کے بعد اب ڈنر کر رہا تھا۔ انہوں نے بھی کھانا منگوا لیا کیونکہ جیسے ہی سائمن اٹھتا جون کو اس کے پیچھے جانا تھا مگر سائمن کھانا ختم کر کے بھی وہیں بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ ایک شخص اندر آیا۔ چھوٹے قد کے اس آدمی نے چست اور قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں پر نظر کی عینک تھی۔ ہاتھ میں ہاتھی دانت کے دستے والی چھڑی تھی۔ وہ سیدھا سائمن کے پاس گیا اور کچھ دیر بعد دونوں کھڑے ہو کر بار سے جانے لگے۔ سائمن نے اٹھتے ہوئے چند بڑے نوٹ میز پر رکھے۔ شیبا سرگوشی میں بولی۔ ''تم اس کے پیچھے جاؤ، میں بل ادا کر کے ہوٹل جاؤں گی۔ تم سیدھے وہیں آنا۔''

جون سر ہلاتا ہوا ان کے پیچھے بار سے باہر آیا۔ اس نے باہر آ کر یوں سگریٹ سلگایا جیسے اندر اس کا دم گھٹ رہا ہو اور وہ تازہ ہوا کے لیے باہر آیا ہو۔ سائمن اور چھوٹے قد کا شخص ایک طرف جا رہے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ بار کے باہر ایڈگر اور شارلی کے آدمی موجود تھے اور بہ ظاہر وہ ایک دوسرے کی موجودگی سے بے نیاز بنے ہوئے تھے مگر جون جانتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے محتاط تھے اور اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھے۔ جون چند لمحے کھڑا رہا پھر سائمن کے پیچھے چل پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی ہوٹل میں جائے گا مگر خلافِ توقع سائمن ایک چھوٹے سے کیبن تک پہنچا اور اس نے چابی سے اس کا دروازہ کھولا۔ کیبن مختصر سا اور چاروں طرف سے کھلا ہوا تھا۔ سامنے مختصر سا برآمدہ تھا۔ جون کیبن کے عقب میں آیا۔ اس طرف کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں تھا۔ اس نے ایک جگہ لکڑی کے تختوں کے درمیان رخنہ دیکھ کر اس سے کان لگایا۔ اندر موجود افراد بھی گفتگو تھے۔ مختصر آدمی کہہ رہا تھا۔

''یہ وہ چیز نہیں ہے جس کے لیے میں آیا ہوں۔''

''یہ صرف نمونہ ہے۔'' سائمن بولا۔

''یہ اچھا نمونہ نہیں ہے۔'' چھوٹے قد والے نے حقارت سے کہا۔ ''تم نے میرا وقت برباد کیا ہے۔''

''ناراض کیوں ہوتے ہو؟'' سائمن نے شاید اسے کچھ اور دکھایا۔ ''اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

دوسرے آدمی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''ہاں، یہ کسی قدر بہتر ہے۔''

''بہترین ہیں۔'' سائمن نے اصرار کیا۔ ''یہ کولمبیا سے ملنے والے بہترین زمرد ہیں۔ شمال میں ان کی قیمت دو گنا ہو جائے گی۔''

''زمرد کی اتنی قیمت نہیں ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تمہاری قیمت زیادہ ہے۔''

''دس ہزار ڈالرز زیادہ ہیں؟'' سائمن نے حیرت سے کہا۔ ''شمال میں یہ کم سے کم پچیس ہزار ڈالرز میں فروخت ہوں گے۔''

''تب تم انہیں شمال میں لے جا کر فروخت کر دو۔'' چھوٹے قد والے نے مشورہ دیا تو سائمن نے سرد لہجے میں کہا

''اب میں یہی کروں گا، تم جا سکتے ہو۔''

''میری آخری آفر پندرہ ہزار کی ہے اگر تمہیں منظور ہو تو میرے ہوٹل آ جانا۔''

چھوٹے قد والے کے جانے کے کچھ دیر بعد سائمن کیبن سے نکلا اور واپس بار کی طرف روانہ ہو گیا۔ جون کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اسے حیرت ہوئی جب اس نے سائمن کو اسی ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا جس میں وہ مقیم تھے۔ بار کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے کھڑکی سے دیکھا تو اسے اپنی والی میز خالی دکھائی دی اس کا مطلب تھا کہ شیبا ہوٹل جا چکی تھی۔ وہ کچھ دیر بعد ہوٹل میں داخل ہوا اور اس نے ڈیسک کلرک کے پاس سے گزرتے ہوئے رک کر دریافت کیا۔ ''کیا مسٹر سائمن آ گئے ہیں؟''

ڈیسک کلرک نے حیرت سے پوچھا۔ ''کون مسٹر سائمن؟''

''وہ ابھی تو اندر آئے تھے۔''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر جائل...... وہ مسٹر سائمن نہیں جارج بلیک ووڈ ہیں۔ کیلی فورنیا کے ایک تاجر۔''

''سوری، مجھے واقعی غلط فہمی ہوئی۔'' جون نے جلدی سے معذرت کی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ معاملہ وہ نہیں تھا جو شیبا نے اسے بتایا تھا۔ یہ کوئی اور ہی

چکر تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شیبا کو وہ سب بتائے یا نہ بتائے جو اس نے دیکھا اور سنا تھا پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے کیبن والی ملاقات کا احوال بتا دے گا، آگے اس کی بلا سے۔ ہو سکتا ہے اس بہانے اس کی جلد جان چھوٹ جائے۔ وہ اندر آیا تو شیبا منتظر اور مضطرب تھی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟...... وہ کہاں گئے تھے؟...... ان کے درمیان کوئی ڈیل ہوئی؟''

جون اطمینان سے کپڑے اتارنے لگا اور اس سے بھی زیادہ اطمینان سے بولا۔ ''کچھ نہیں، وہ دونوں ٹہلتے ہوئے اس گلی کے سرے پر واقع ایک کیبن تک گئے اور پھر وہ آدمی وہیں سے آگے چلا گیا اور سائمن واپس اسی ہوٹل میں آیا۔ وہ یہیں مقیم ہے۔''

''میں جانتی ہوں، وہ یہاں جارج بلیک ووڈ کے نام سے ٹھہرا ہوا ہے۔''

''واقعی؟'' جون نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ اس نے شیبا کو بتایا کہ ان دونوں کے درمیان کیبن میں کیا بات ہوئی تھی۔

شیبا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ''یہ میرے پتھر ہیں، اس نے ماریو کو ان ہی پتھروں کے لیے قتل کیا تھا۔''

''مگر فی الحال وہ اس کے قبضے میں ہیں۔'' جون بستر پر دراز ہو گیا اور شیبا کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم اسی حلیے میں رہو گی؟''

شیبا نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔ وہ ٹہلتی رہی اور سوچتی رہی۔ جون کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ اس کی پریشانی کی وجہ کیا تھی۔ جون کی آنکھ لگ گئی اور پھر اس کی آنکھ کھلی تو شیبا اس کے پاس تھی اور اس انداز میں تھی کہ اس کے ہوش اڑ گئے۔ اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں اکیلا تھا اور شیبا کہیں گئی ہوئی تھی۔ جون جلدی سے اٹھا اور پھر اس کا سامان دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ اطمینان سے تیار ہوا اور پھر نیچے آیا، اس نے ناشتا کیا اور ناشتا لانے والے ویٹر سے شیبا کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ دو گھنٹے پہلے ناشتا کر کے جا چکی ہے لیکن وہ کہاں ہے، یہ ویٹر بھی نہیں جانتا تھا۔ شیبا کہیں باہر گئی تھی مگر خود جون کا باہر جانے کا موڈ نہیں تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ یہاں گلیوں میں ایڈگر اور شارلی کے آدمی تھے اور اگر ان میں سے کوئی اسے پہچان جاتا تو اس کا یہاں سے زندہ نکلنا ناممکن ہو جاتا۔

ناشتا کر کے وہ واپس اپنے کمرے میں آیا اور اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ سامنے ایک گروسری اسٹور کے ساتھ ہی شارلی کے دو آدمی موجود تھے۔ ایڈگر کے آدمی بھی آس پاس ہو سکتے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے جون کو شیبا کی بات یاد آئی کہ اگر ان دونوں کا آپس میں جھگڑا ہو جائے تو اس کی جان چھوٹ سکتی ہے۔ جیسے جیسے وہ اس بات پر غور کرتا رہا، اس کے ذہن میں کئی کھڑکیاں سی کھلتی چلی گئیں اور اسے لگا کہ شیبا اسے ٹھیک ہی بزدل قرار دے رہی تھی۔ جب دشمن پیچھے ہو تو فرار ہی واحد حل نہیں ہوتا اس کے علاوہ بھی کئی حل ہو سکتے ہیں۔ جون کے پاس اس کا ریوالور تھا۔ شیبا جو ٹرنک ساتھ لائی تھی، اس میں خاصا اسلحہ تھا جس میں چھوٹی نال والی دو رائفلیں بھی شامل تھیں۔ دو عدد ریوالور جو شیبا اپنے اسکرٹ کے نیچے ران سے بندھے ہولسٹرز میں لگاتی تھی اور ایک بڑی نال والا ریوالور جو ٹرنک میں تھا۔ شیبا کے دونوں چھوٹے ریوالور اس کے پاس تھے البتہ رائفلیں اور بڑی نال والا ریوالور ٹرنک میں ہی تھا۔

جون باہر آیا اور ٹہلنے کے انداز میں قصبے کی مرکزی سڑک سے گزرنے لگا۔ بہ ظاہر وہ ٹہل رہا تھا، اصل میں اسے اسلحے کی دکان کی تلاش تھی بالآخر اسے ایک چھوٹی سی دکان نظر آگئی مگر جب وہ اندر آیا تو یہ خاصی بڑی اور مختلف اقسام کے جدید اسلحے سے بھری ہوئی نظر آئی۔ شوکیس میں جدید ریوالور سجے ہوئے تھے۔ جون نے ہچکچاتے ہوئے سیلز مین سے ایک نسبتاً چھوٹا لیکن موٹے چیمبر والا ریوالور دکھانے کو کہا۔ اس نے شوکیس سے نکال کر جون کے سامنے رکھا۔ ''بہترین ہے، پی اینڈ جی کا نیا ماڈل ہے۔ اس میں دس گولیاں ڈالی جا سکتی ہیں۔ دس میٹر دور نشانے پر ایک ملی میٹر کا فرق بھی نہیں آتا ہے۔''

جون نے اٹھا کر دیکھا، اس کی گرفت اچھی تھی اور ہاتھ میں اچھا لگ رہا تھا۔ اسے پسند آیا۔ اس نے قیمت پوچھی۔ سیلز مین نے قیمت بتائی۔ اس نے ادائیگی کی تو سیلز مین نے اسے گولیوں کا ایک ڈبا فری میں دیا۔ ایک ڈبا ریوالور کے ساتھ ملا تھا۔ پھر اس نے اپنے پرانے ریوالور کے لیے گولیاں لیں۔ نئے ریوالور کے ساتھ بغلی ہولسٹر بھی تھا جو آسانی سے اس کے کوٹ تلے آ جاتا مگر وہ یہاں پہننا نہیں چاہتا تھا اس لیے ساتھ لے لیا۔ پھر وہ ایک کپڑوں کے اسٹور میں آیا اور یہاں اس نے کچھ خریداری کی۔ وہ واپس آیا تو شیبا کمرے میں موجود تھی۔ ''تم کہاں گئی تھیں؟''

''گھومنے پھرنے۔'' وہ سرسری انداز میں بولی۔ ''اور تم؟''

''میں ذرا خریداری کرنے گیا تھا۔'' جون نے جواب

دیا اور اسے چیزیں دکھائیں۔ وہ کپڑے دیکھ کر چونکی۔

''یہ کس لیے؟''

''میں نے تمہاری بات پر غور کیا کہ فرار ہی مسئلے کا حل نہیں ہے۔''

''تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''ابھی سوچا نہیں ہے۔ صورتِ حال کا جائزہ لوں گا اس کے بعد کچھ کر گزروں گا۔'' جون نے جواب دیا۔ ''تم نے کیا سوچا ہے، سائمن عرف جارج بلیک ووڈ تمہارے سامنے ہے اور اس نے ابھی پتھر فروخت بھی نہیں کیے ہیں۔''

''میں مکمل معلومات حاصل کر لوں پھر اپنے آدمیوں کو بلاؤں گی۔''

''تم واپس جاؤ گی؟''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' شیبا نے جواب دیا۔ ''میں یہیں سے ان کو پیغام دے دوں گی۔''

جون کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یہیں سے پیغام کیسے دے گی۔ شام کے قریب اس نے حلیہ بدلا۔ جینز کی بدرنگ پتلون، پاؤں میں لیدر شوز اور شرٹ کے اوپر کھلا ہوا سویٹر پہنا۔ اس کے نیچے اس کے دونوں ریوالور تھے۔ سر پر فلیٹ ہیٹ پہن کر وہ تیار ہوا تو شیبا نے ہنس کر کہا۔ ''اب تم صحیح معنوں میں کاؤبوائے لگ رہے ہو۔''

''میں کاؤبوائے ہی ہوں۔'' جون نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے میں واپس نہ آؤں لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ میں فرار ہو گیا ہوں۔''

شیبا جو بستر پر نیم دراز تھی، اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ ''کیا مطلب؟''

''میں تمہارا خیال غلط ثابت کرنے جا رہا ہوں کہ میں بزدل ہوں۔''

شیبا کے تاثرات مضطرب ہو گئے۔ ''جون! تم کوئی حماقت نہیں کرو گے۔''

''اب تم اسے حماقت کہہ رہی ہو۔'' وہ ہنسا۔ ''ویسے تم فکر مت کرو۔ میں خودکشی کرنے والا آدمی نہیں ہوں، جو کروں گا ہاتھ پاؤں بچا کر کروں گا۔''

شیبا شاید اسے منع کرنے جا رہی تھی مگر پھر رک گئی۔ البتہ اس نے اچک کر جون کو پیار کیا۔ ''میں تمہارا انتظار کروں گی اور واپسی پر اگر تم مجھے سامان سمیت غائب پاؤ تو تم بھی نکل جانا۔''

جون نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس کا مطلب ہے تمہارا کام بھی شاید آج ہی ہو جائے؟''

شیبا نے سر ہلایا۔ ''اس صورت میں، میں ایک منٹ کے لیے بھی یہاں نہیں رکوں گی۔''

جون باہر آیا۔ اس نے ہیٹ چہرے پر اس حد تک جھکا لیا کہ اس کے خدوخال نظر نہ آئیں۔ اگرچہ اس کا چہرہ بدستور بدلی ہوئی حالت میں تھا مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ ایڈرک جائل کو اس حلیے میں دیکھیں۔ وہ خود کو ایک عام اور غریب چرواہا بنا کر پیش کر رہا تھا جو تفریح کے لیے ڈال ہارٹ آیا ہو۔ اپنے حلیے کی مناسبت سے اس نے ایک چھوٹے بار کا رخ کیا اور وہاں کھڑکی کے ساتھ والی میز پر بیٹھ کر اپنے لیے معمولی شراب طلب کی..... یہاں سے اس کا ہوٹل اور آس پاس کا علاقہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن ابھی تک اسے ایڈگر یا شارلی کا کوئی آدمی نظر نہیں آیا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ ان کے بارے میں کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ چند منٹ بعد ویٹر آیا تو جون نے ایک سکہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

☆☆☆

ایڈگر نے بے یقینی سے شارلی کو دیکھا۔ ''جون...... وہ موٹا سا شخص جو اس لیڈی کے ساتھ تھا۔''

شارلی نے سر ہلایا۔ ''میرے آدمی نے قسم کھا کر یقین سے کہا ہے کہ وہ جون ہی ہے۔''

''اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' ایڈگر نے حقارت سے کہا۔ ''وہ دو ٹکے کا کاؤبوائے اور اس حلیے میں......؟ ناممکن ہے۔''

''وہ دو ٹکے کا کاؤبوائے ایک ہی رات میں تمہارے اور میرے اہم ترین آدمیوں کو قتل کر کے فرار ہونے میں بھی کامیاب رہا تھا۔'' شارلی نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ممکن ہے اسے یہ عورت مل گئی ہو اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہو۔''

ایڈگر سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے پرخیال انداز میں شارلی کی طرف دیکھا۔ ''اگر تمہیں اپنے آدمی پر یقین ہے تو تم کارروائی کر کے دیکھ لو۔''

''میں اپنے علاقے میں نہیں ہوں۔ یہاں کا شیرف بہت سخت اور مضبوط آدمی ہے۔'' شارلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دوسرے ہم دونوں ساتھ آئے ہیں اور جو کرنا ہے ساتھ ہی کریں گے۔''

''تمہارے آدمی ان کی نگرانی کر رہے ہیں؟''

''بالکل۔'' شارلی نے جواب دیا۔

ایڈگر نے سوچ کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہیں بتاتا ہوں۔''

شارلی اٹھ کر چلا گیا۔ وہ دونوں اس ہوٹل کے لاؤنج میں تھے جہاں ایڈگر مقیم تھا۔ شارلی اس کے سامنے والے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ شارلی کے جاتے ہی ایڈگر کا نائب جم اس کے پاس آیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ”باس! مجھے لگ رہا ہے کہ یہ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ ایڈگر نے سامنے رکھا ہوا گلاس اٹھا لیا۔

”وہ ہمیں پھنسا رہا ہے۔ اگر ہم اس آدمی کے خلاف کچھ کرتے ہیں تو مقامی قانون ہمارے خلاف حرکت میں آجائے گا۔“

”تبھی میں نے اسے ٹال دیا ہے مگر اس کی تصدیق کرنی ہے۔“ ایڈگر نے جم کی طرف دیکھا۔ ”اپنے آدمی ان کی نگرانی پر لگا دو۔“

جم نے سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔

☆☆☆

شیبا جون کے جاتے ہی حرکت میں آئی تھی۔ اس نے لباس بدلا اور اپنے چھوٹے ریوالور ران سے بندھے ہولسٹرز میں رکھ لیے۔ پھر اس نے ٹرنک کھولا اور اس میں سے ایک لمبا سا لکڑی کا بکس نکالا۔ وہ اسے لباس میں چھپا کر ہوٹل سے باہر آئی۔ اس وقت تک تاریکی چھا چکی تھی اور مغربی افق پر معمولی سی سرخی باقی رہ گئی تھی۔ شیبا بہ ظاہر ٹہلنے کے انداز میں مرکزی سڑک سے ہٹ کر گلی میں آئی اور اسی وجہ سے وہ دو آدمی اس کی نظر میں آگئے جو اس کے پیچھے تھے۔ شبہ اسے پہلے ہی تھا۔ وہ فکر مند ہوگئی۔ چند گلیوں کے بعد وہ تیزی سے ایک چھوٹی گلی میں آئی۔ یہ دو مکانوں کے درمیان تھی۔ اس نے آس پاس دیکھا اور پھر دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی۔ یہ کام اس نے اتنی مہارت سے کیا کہ بھاری گھیر والے لباس کے باوجود اسے ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی۔ مکان کا احاطہ خالی تھا اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے بعد دونوں پیچھا کرنے والے بھی وہاں آگئے۔

”وہ یہیں آئی ہے، میں نے خود دیکھا ہے۔“ ایک نے دوسرے سے کہا۔

”تب کہاں گئی؟“

”شاید آگے نکل گئی۔“ پہلے نے جواب دیا تو وہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد شیبا نے لباس سے بکس نکال کر اسے کھولا تو اس میں ایک عدد آتش بازی والا راکٹ تھا۔ اس کی لمبائی ایک فٹ تھی۔ شیبا نے اس کی اسٹک لگا کر اسٹک کو زمین میں گاڑ دیا اور پھر اس کے فیتے کو آگ دکھائی۔ آگ دکھا کر وہ تیزی سے پیچھے ہٹی، بعض اوقات اس قسم کا آتش گیر مادہ فوراً پھٹ جاتا تھا مگر جیسے ہی اس کا جلتا ہوا فیتا راکٹ تک پہنچا، وہ شوں کی آواز کے ساتھ فضا میں بلند ہوا اور اتنی بلندی پر پہنچا کہ پھٹنے سے پہلے شیبا کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کے بعد وہ پھٹا تو آسمان پر بے شمار تیز رنگ اور لکیریں بکھر گئی تھیں۔ یہ روشنی ایسی تھی کہ پندرہ بیس میل کی دوری سے بھی صاف نظر آتی۔ شیبا مسکرائی اور اس بار وہ دیوار سے کودنے کے بجائے آرام سے چلتی ہوئی دروازے تک آئی اور اسے کھول کر باہر نکل گئی۔ اس نے گلی کے سرے سے جھانک کر دیکھا تو تعاقب کرنے والے دونوں افراد غائب تھے۔ شاید وہ کسی اور سڑک پر نکل گئے تھے۔ شیبا نے موقع غنیمت جانا اور تیزی سے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

کوئی پندرہ میل دور شیبا کے ساتھیوں میں سے ایک بلند چٹان پر بیٹھا ہوا مشرق کی سمت نگران تھا۔ سورج غروب ہوگیا تھا اور تاریکی چھا چکی تھی۔ اس کے باقی ساتھی نیچے الاؤ کے پاس بیٹھے کافی سے شغل کر رہے تھے۔ اچانک دور مشرق میں آسمان رنگین ہوگیا۔ اس نے غور سے دیکھا اور چیخ کر اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ پھر وہ خود چٹان سے اتر کر نیچے آیا۔ انہوں نے الاؤ بجھا دیا۔ چند منٹ بعد وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو کر ڈال ہارٹ کی طرف جا رہے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے کاؤ بوائے طرز کے لباس پہن رکھے تھے اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔ اس حلیے میں انہیں ہسپانوی سمجھنا دشوار تھا۔ پوری رفتار سے سفر کرتے ہوئے وہ ایک گھنٹے میں ڈال ہارٹ پہنچ سکتے تھے۔

☆☆☆

جون نے شیبا کو ہوٹل سے نکلتے دیکھا۔ پھر وہ چونکا کیونکہ جیسے ہی شیبا آگے بڑھی تھی، دو آدمی اس کے پیچھے لگ گئے اور جون انہیں جانتا تھا۔ یہ شارلی کے آدمی تھے۔ وہ فکرمند ... ہوگیا کہ کیا شارلی کو ان پر شک ہوگیا تھا ورنہ ان کی نگرانی کا کیا جواز بنتا تھا۔ جون حلیہ بدل کر آیا تھا اس لیے وہ اس کے پیچھے نہیں آئے مگر شیبا اپنے مخصوص حلیے میں تھی۔ جون اٹھا اور چند سکے کاؤنٹر پر ڈال کر باہر نکل آیا۔ اس کا رخ ان تینوں کی طرف تھا۔ شیبا مرکزی سڑک سے ہٹ گئی تھی اور گلیوں کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے متوازی گلیوں میں تھے اور جون شیبا سے آگے متوازی چل رہا تھا۔ اس طرح وہ بیک وقت دونوں کو نظروں میں رکھے

ہوئے تھا۔ مگر شیبا ان دونوں کی طرح اسے بھی چکما دے گئی۔ جون اس گلی تک پہنچا تو وہ دونوں آگے نکل گئے اور وہ ان کے پیچھے آیا تو اس نے بھی شیبا کو غائب پایا۔

اچانک اس نے شوں کی آواز سنی اور آس پاس دیکھا کہ آسمان روشن ہو گیا تھا۔ یہ کوئی آتش بازی تھی جو بلندی پر پھٹی تھی اور اس کی روشنی نہ صرف پورے ڈال ہارٹ سے بلکہ آس پاس سے بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ جون کو شیبا کی بات یاد آئی کہ وہ یہاں رک کر بھی اپنے ساتھیوں کو اشارہ دے سکتی تھی۔ وہ مسکرایا۔ شیبا نے اشارہ دے دیا تھا اور اس کے ساتھی ڈال ہارٹ کے لیے چل پڑے ہوں گے۔ اب اسے شیبا کے بجائے ان دونوں سے دلچسپی تھی۔ وہ شیبا کی تلاش میں گلیوں میں بھٹک رہے تھے اور جون کے خیال میں وہ اپنا کام کر کے جا چکی تھی۔ اسے تلاش کرنے کے لیے وہ دونوں الگ ہو گئے اور ان میں سے ایک جون کی طرف آیا۔ جون پیچھے ہٹا۔۔۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شارلی کا یہ گرگا اسے نزدیک سے دیکھے۔ وہ تیزی سے ایک گلی میں آیا مگر اس سے پہلے کہ وہ گلی کراس کر کے سڑک پر نکلتا سامنے سے اچانک ہی شارلی کا گرگا نمودار ہوا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسی کے لیے آیا تھا۔ جون ٹھٹک گیا۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''تم ہماری نگرانی کر رہے ہو، وہ عورت کہاں ہے؟''

''کون عورت...... میں کسی عورت کو نہیں جانتا۔'' جون بے پروائی سے کہتا ہوا آگے بڑھا اور جیسے ہی وہ گرگے کے پاس پہنچا، اس نے جون کے پیٹ میں مکا مارنے کی کوشش کی مگر وہ ہوشیار تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے مکا روکا اور دوسرے ہاتھ سے جوابی مکا مارا۔ گرگا لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور پھر اس نے ریوالور نکالنا چاہا مگر جون پہلے ہی ریوالور نکال چکا تھا۔ اس نے گرگے سے پہلے گولی چلا دی اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے گرا۔ گولی نے اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر سوراخ کیا تھا اور وہ چند لمحے ہاتھ پاؤں پٹخنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ یہ تیسرا قتل تھا جو جون نے اپنی جان بچانے کے لیے کیا تھا۔ جون خطرے کا احساس کرتے ہوئے تیزی سے وہاں سے روانہ ہوا۔ اس نے سامنے سے جانے کی حماقت نہیں کی بلکہ ایک لمبا چکر کاٹ کر وہ اسی شراب خانے میں پہنچا جہاں وہ پہلے بیٹھا تھا۔ اتفاق سے وہ میز خالی تھی اور اس نے وہی کرسی سنبھال کر ویٹر کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور بیئر طلب کی۔ وہ پہلے ہی دو گلاس پی چکا تھا اور ابھی اپنے حواس میں رہنا چاہتا تھا۔

فائر کی آواز دور تک سنی گئی ہو گی مگر دور رہنے والوں کو صورت حال کا اندازہ نہیں تھا۔ البتہ کچھ دیر بعد سڑک پر لوگ نظر آنے لگے۔ یقیناً شارلی اور ایڈگر تک اطلاع پہنچ گئی تھی کہ ان کا ایک آدمی مارا گیا ہے اور وہ شیبا کے پیچھے تھا۔ اچانک جون کو احساس ہوا کہ شیبا خطرے میں تھی۔ شارلی کے آدمی اس کے پیچھے تھے اور ان میں سے ایک مارا گیا تھا تو لازمی شک شیبا پر جاتا۔ شارلی اس کے خلاف کچھ بھی کر سکتا تھا۔ جون نے عجلت میں بیئر کا گلاس خالی کیا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر جب وہ وہاں پہنچا تو ہوٹل میں افراتفری نظر آئی۔ لوگ سہمے ہوئے اور پریشان تھے۔ ڈیسک کلرک غائب تھا۔ جون نے آس پاس دیکھا اور بیل بوائے کی طرف بڑھا۔ اس نے اس کا شانہ پکڑا تو وہ اسے دیکھ کر چونکا۔ ''مسٹر جائل آپ......؟''

''یہاں کیا ہوا ہے؟''

''وہ میڈم کو لے گئے ہیں۔'' بیل بوائے نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''کون؟''

''ہم نہیں جانتے۔ وہ اچانک ہوٹل میں آئے اور میڈم کو کمرے سے لے گئے۔''

''زبردستی؟''

''پتا نہیں۔'' وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچایا۔ ''مگر میڈم خوش نہیں لگ رہی تھیں۔''

اتنا تو جون سمجھ گیا تھا کہ شیبا کو لے جانے والے کون تھے۔ اس کی جان ہی نہیں عزت بھی خطرے میں تھی کیونکہ شارلی اور اس کے آدمی عورت کے معاملے میں درندے تھے۔ جون سوچ رہا تھا کہ اس صورتِ حال سے کس طرح عہدہ برآں ہو کہ اس کی جان بھی بچی رہے اور شیبا کو بھی کچھ نہ ہو۔ مگر فی الحال کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا۔ شیبا کے آدمی یہاں پہنچنے والے تھے۔ اس نے بیل بوائے سے کہا۔ ''فکر کی بات نہیں ہے، میڈم خیریت سے ہیں اور اس کا کسی سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

بیل بوائے نے سکون کا سانس لیا۔ ''بالکل سمجھ گیا جناب، میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔''

''ڈیسک کلرک آئے تو اسے بھی سمجھا دینا۔'' جون نے کہا اور اوپر کا رخ کیا۔ اس نے کمرے سے ٹرنک لیا اور نیچے آ کر اس نے بیل بوائے سے اپنے اور شیبا کے گھوڑے ہوٹل کے پیچھے منگوائے۔ اسے امید تھی کہ وہاں نگرانی کرنے

والا کوئی نہیں ہوگا۔ گھوڑے آئے تو اس نے ایک پر ٹرنک باندھا اور دوسرے پر خود سوار ہو کر قصبے سے باہر کا رخ کیا۔

☆☆☆

شیبا ہوٹل کے پاس تھی جب اس نے فائر کی آواز سنی۔ بہ ظاہر ایک فائر کی آواز کوئی تشویشناک بات نہیں تھی مگر اس کی چھٹی حس نے اشارہ کیا کہ شاید گڑبڑ ہے۔ اس نے سوچا کہ پہلے اہم کام نمٹا لے۔ وہ دوسرے فلور پر آئی۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ اپنے کمرے میں آئی۔ اب اسے قصبے سے باہر جانا تھا جہاں اس کے ساتھی آنے والے تھے اور وہ یہاں سے نکل جاتی۔ کمرے میں آ کر اس نے سامان سمیٹ کر ٹرنک میں ڈالنا شروع کیا اور ساتھ ہی بیل بوائے کو بلانے والی ڈوری کھینچی۔ نیچے گھنٹی بجتی تو بیل بوائے اس کے کمرے میں آ جاتا۔ چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی تو وہ سب ٹرنک میں ڈال چکی تھی۔ اس نے یہ سمجھتے ہوئے دروازہ کھول دیا کہ بیل بوائے ہوگا۔ مگر اس کی جگہ بدمعاش اندر گھس آئے۔ ایک نے اسے دبوچا اور دوسرے نے دروازہ بند کر دیا۔ اسے دبوچنے والے نے اس کا منہ دباتے ہوئے اسے بستر پر گرایا۔ شیبا اپنی فراک کا گھیر اوپر کرنے کی کوشش کر رہی تھی جس کے نیچے ریوالور تھے۔ مگر دروازہ بند کرنے والے نے آ کر اسے زحمت سے بچایا۔ اس نے جھٹکے سے شیبا کی فراک کا گھیر اوپر کیا اور اس کی رانوں سے بندھے دونوں ریوالور نکال لیے۔ اب وہ نہتی اور بے بس ہو گئی تھی۔ اسے دبوچنے والے کے انداز میں اوباشی نمایاں تھی مگر وہ یہاں اپنی من مانی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بادل ناخواستہ اسے آزاد کیا اور بولا۔

''شرافت سے ہمارے ساتھ چلو ورنہ ماری جاؤ گی۔''

''کیوں چلوں؟'' شیبا نے سرکشی سے کہا۔ ''میں تمہیں نہیں جانتی۔''

''جان جاؤ گی سویٹی۔'' دوسرے نے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ ''اگر زندہ رہیں تو۔''

شیبا جانتی تھی کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوگا مگر ہتھیاروں سے محروم ہو کر وہ بے بس ہو گئی تھی۔ مجبوراً ان کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ اسے بہ ظاہر نارمل انداز میں لیکن درحقیقت گن پوائنٹ پر ساتھ لے گئے تھے۔ وہ اسے پیدل اس ہوٹل تک لائے جہاں شارلی مقیم تھا۔ وہ صرف مقیم نہیں تھا بلکہ ہوٹل میں صرف وہ اور اس کے آدمی تھے۔ انہوں نے پورے ہوٹل پر قبضہ کر رکھا تھا۔ دوسرے مسافران کا انداز دیکھ کر ایک ایک کر کے ہوٹل سے کھسک لیے تھے۔ شیبا کو ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں لایا گیا۔ وہاں شارلی ایک میز پر براجمان تھا۔ اس نے شیبا کو دیکھا اور زیرِ لب بولا۔ ''اسپینش بیوٹی۔''

''تمہارے آدمی مجھے کیوں لائے ہیں؟'' شیبا بے خوفی سے بولی۔

شارلی عیاری سے مسکرایا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ ٹاؤن میں ایک حسین اسپینش خاتون آئی ہے۔ میں نے سوچا اسے قریب سے دیکھا جائے۔''

''تمہارا نام شاید شارلی ہے۔''

''میری قسمت کہ تم پہلے سے واقف ہو۔''

شیبا اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور مسکرا کر بولی۔ ''کیونکہ میں اپنے آس پاس سے باخبر رہنا پسند کرتی ہوں۔''

''اتفاق سے یہی شوق میرا بھی ہے۔'' شارلی نے سرد لہجے میں کہا اور پھر آگے جھکا۔ ''تمہارا نام نہاد شوہر کہاں ہے؟''

''ایڈ۔'' شیبا نے انجان بن کر کہا۔ ''پتا نہیں، وہ ہوٹل سے نکلا تھا اور واپس نہیں آیا۔''

''ایڈرک جائل۔'' شارلی نے اپنے سامنے رکھا جام اٹھا لیا۔ ''اچھا نام ہے لیکن یہ اس کا اصل نام نہیں ہے۔''

''میں اسے اسی نام سے جانتی ہوں۔'' شیبا مضبوط لہجے میں بولی۔

''سوچ لو۔'' شارلی کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ ''وقت گزرنے کے بعد تم نے اقرار کیا تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر کوئی نقصان ہوا تو اس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔''

شیبا مسکراتی رہی لیکن اندر سے وہ فکر مند ہو گئی تھی۔

☆☆☆

جون گھوڑے دوڑاتا ہوا مغرب کی طرف سے آنے والے راستے پر ایک جگہ پہنچا اور اس نے دونوں گھوڑے ایک چٹان کے پیچھے باندھ دیے اور خود ایک ایسی جگہ چھپ گیا جہاں سے وہ راستے پر دونوں طرف نظر رکھ سکتا تھا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مغرب کی طرف سے چند گھڑسوار نمودار ہوئے اور تیزی سے اس کی طرف آنے لگے۔ نیم تاریکی میں ان کے ہیولے نمایاں تھے مگر یہ واضح نہیں تھا کہ آنے والے کون تھے۔ جون اپنی جگہ سے نکلا نہیں اور جب وہ اس کے پاس سے گزرے تو اس نے پہچان لیا۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے چیخ کر انہیں آواز دی تو انہوں نے گھوڑے روکتے ہوئے اپنے ہتھیار نکال لیے۔ جون فوراً دوبارہ آڑ میں ہو گیا اور اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''یہ میں ہوں جون...... شیبا کے ساتھ تھا۔''

قرآن کریم کی پیش گوئی

ایک سمندر جنوبی افریقا میں کیپ ٹاؤن کے قریب ہے اس کا ذکر چودہ سو سال پہلے قرآن میں ہو چکا ہے۔ جبکہ اس کی دریافت بیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی اس کی خصوصیات یہ ہیں کہ ایک طرف میٹھا پانی اور دوسری طرف کڑوا پانی ہے اور یہ آپس میں مکس نہیں ہوتا۔

قرآن کے اس سائنسی بیان کی تصدیق امریکی یونیورسٹی آف کولوروڈو کے بحری سائنسدان ڈاکٹر ولیم جے نے بھی کی ہے۔

''اس نے دو سمندر ملا دیے جو باہم ملتے ہیں ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے، رکاوٹ ہے اور وہ اس حد سے تجاوز نہیں کر سکتے۔''

مرسلہ: ساجدہ راجا، ہنڈواں سرگودھا

''باہر آؤ۔'' ان میں سے ایک بگڑی ہوئی انگریزی میں بولا۔ جون دونوں ہاتھ اوپر کر کے باہر آیا۔ انہوں نے اسے گھیر لیا۔ اس سے پوچھنے والا پستہ قد ہسپانوی تھا۔ ''شیبا کہاں ہے؟''

''وہ مشکل میں پڑ گئی ہے۔'' جون نے کہا۔ ''میرے دشمن شارلی کے آدمی اسے لے گئے۔''

پستہ قد مشتعل ہو گیا۔ ''اور تم اسے وہاں چھوڑ کر بھاگ آئے بزدل۔''

''میں بزدل نہیں ہوں مگر اتنے آدمیوں کا مقابلہ کیسے کرتا اور میں مارا جاتا تو تمہیں کون بتاتا کہ شیبا کہاں ہے۔ اس کی جان خطرے میں ہے۔''

''چلو فوراً۔'' پستہ قد نے اسے حکم دیا۔ جون اپنا گھوڑا نکال لایا اور ٹرنک والا گھوڑا اس نے وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے پاس رائفل تھی، اگرچہ اس کا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا۔ جون کے آتے ہی وہ آندھی طوفان کی طرح ڈال ہارٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں جون نے پستہ قد کو بتایا کہ شیبا کیسے پکڑی گئی۔ ہسپانوی نے غرا کر کہا۔ ''اگر اسے کچھ ہوا تو ہم کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے اور مرنے والوں میں تم بھی شامل ہو گے۔''

جب سے یہ چکر شروع ہوا تھا جون کو لگ رہا تھا کہ موت اس کے آس پاس ہی منڈلا رہی ہے۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی اور گھوڑے کو ہر ممکن تیزی سے دوڑانے لگا۔ جتنی دیر ہوتی شیبا کی زندگی کا امکان اتنا ہی کم ہوتا جاتا۔

☆☆☆

جیسے ہی ایڈگر کو شارلی کے آدمی کے مارے جانے کی اطلاع ملی، اس نے فوراً اپنے تمام آدمیوں کو ہوٹل میں بلا لیا۔ پہلے اس نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ ان کا کام ہے؟ مگر اس کے آدمیوں نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ انہوں نے شارلی کے آدمی کو نہیں مارا۔ یہ کسی اور کا کام ہے۔ ایڈگر کو یقین آ گیا کہ اس کے آدمی اس سے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے انہیں ہوشیار رہنے کا حکم دیا کہ شارلی اس قتل کو ان کے کھاتے میں ڈال کر کوئی کارروائی کر سکتا ہے۔ ایڈگر کے آدمیوں نے ہوٹل کے اندر اور باہر مورچے سنبھال لیے تھے۔ ان کی طرف سے سرگرمی ہوئی تو شارلی کے آدمی بھی چوکنا ہو گئے اور انہوں نے بھی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ قصبے والوں نے صورتِ حال دیکھی تو مرکزی شاہراہ چند منٹ میں سنسان ہو گئی۔ صورتِ حال اچانک بہت کشیدہ ہو گئی تھی۔

اندر شیبا لکڑی کے ایک ستون سے اس طرح بندھی ہوئی تھی کہ اس کے جسم پر نہ ہونے کے برابر لباس تھا۔ شارلی ایک عدد خنجر لیے اس کے پاس موجود تھا اور خنجر کی نوک اس کے بدن کے عریاں حصوں پر اس طرح پھیر رہا تھا کہ اسے کٹ نہ لگے۔ شیبا پُرسکون تھی۔ اس نے شارلی سے کہا۔ ''تم مجھے یوں خوفزدہ نہیں کر سکتے۔''

''ہاں۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''لیکن میں وہ سب کروں گا جو میں کرنا چاہتا ہوں۔''

''ایڈرک جائل یا وہ جو بھی ہے میں اس سے صرف دو دن پہلے ملی اور میں نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔''

''بے بی! تم مجھے اتنی آسانی سے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔ اس کا حلیہ کس نے بدلا۔''

''حلیہ اس نے خود بدلا ہے۔ میں نے تو اسے اسی حلیے میں دیکھا ہے۔''

شارلی اسے پُرہوس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''میں نے اتنا حسین جسم بہت کم عورتوں کا دیکھا ہے۔ تم حوصلہ مند بھی ہو۔ اچھی بات ہے، جلد نہیں روگی اور مجھے بھی جلدی نہیں ہے۔''

اسی لمحے شارلی کا ایک گرگا اندر آیا اور اس نے کہا۔ ''باس، سامنے والے پوزیشن لے رہے ہیں۔ ہمارے آدمیوں نے بھی پوزیشن لے لی ہے۔''

شارلی چونکا تھا۔ ''کیا تم لوگوں نے کچھ کیا تھا؟''

''نہیں باس! انہوں نے آغاز کیا تو ہمیں بھی پوزیشن

لینا پڑی۔"

شارلی اس کے ساتھ ایک کھڑکی تک آیا اور اس نے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا اور فکر مند نظر آنے لگا۔ وہ واپس پلٹا تو شیبا اشتعال انگیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس نے جسم کو بل دے کر کہا۔ "کیا بات ہے کاؤبوائے، اب تم کچھ فکر مند نظر آرہے ہو؟"

جواب میں شارلی نے اسے تھپڑ مارا۔ شیبا کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون کی لکیر بہہ نکلی مگر اس کی اشتعال انگیز مسکراہٹ کم نہیں ہوئی۔ شارلی نے کہا۔ "کتیا' ان لوگوں سے نمٹ لوں پھر دیکھنا تیری موت کتنی خوفناک ہوتی ہے۔"

☆☆☆

جون، گارنر کے ساتھ کھڑا تھا اور وہ دوربین آنکھوں سے لگائے دیکھ رہا تھا۔ پستہ قد کا نام گارنر تھا۔ وہ سیدھے چلے آرہے تھے مگر گارنر نے انہیں روکا۔ شیبا کے ساتھیوں میں وہ واحد آدمی تھا جو کسی حد تک انگریزی سے واقف تھا۔ وہی شیبا کا نائب بھی تھا اس نے انہیں روکا۔ "منہ اٹھا کر جانا مناسب نہیں ہے۔"

وہ قصبے کے باہر رکے ہوئے تھے اور کسی قدر بلندی پر تھے۔ یہاں سے انہیں قصبے کا مرکزی حصہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ گارنر گھوڑے سے اتر کر جون کے ساتھ ایسی جگہ آیا جہاں سے وہ دوربین استعمال کرسکتا تھا۔ اس نے دیکھا اور جون سے پوچھا۔ "اب مجھے بتاؤ کون کون کہاں ہے؟"

جون اسے بتانے لگا کہ دشمن کہاں کہاں تھے اور گارنر دوربین سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے تشویش سے کہا۔ "یہ تعداد میں خاصے ہیں۔"

"یہی تو میں تم سے کہہ رہا تھا۔" جون خفگی سے بولا۔ "نہ جانے تم لوگ مجھے بزدل کیوں سمجھتے ہو۔ اگر میں بزدل ہوتا تو اس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر بہت دور جاچکا ہوتا۔ مگر مجھے شیبا کا خیال ہے۔"

"معاف کرنا دوست، تم نے واقعی بہادری کا ثبوت دیا ہے۔" گارنر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ بتاؤ کیا تم ہمارا ساتھ دو گے؟"

"اگرچہ میں لڑاکا نہیں ہوں اور میرا نشانہ بھی اتنا اچھا نہیں ہے مگر میں تم لوگوں کا ساتھ دوں گا۔"

گارنر خوش ہوگیا۔ اس نے سیٹی بجا کر اپنے ساتھیوں کو بلایا اور ان سے کہا۔ "ہمیں گھوڑے ساتھ لے کر جانے ہیں مگر ہم سامنے والے راستے سے اندر نہیں جائیں گے۔"

"میں راستہ جانتا ہوں۔" جون نے کہا۔ "میں تم لوگوں کو اندر لے جاؤں گا مگر گھوڑے چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ کسی بھی صورتِ حال میں ہمیں فوری طور پر وہاں سے نکلنے کے لیے ان کی ضرورت ہوگی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" گارنر نے کہا اور وہ پہاڑی سے اتر کر ڈال ہارٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ جون انہیں ایک چھوٹی سی گھاٹی سے اندر لے گیا۔ اس کے سرے پر مکان بنے ہوئے تھے اور نیچے شاید کچرا پھینکا جاتا تھا۔ وہاں شدید بدبو اور گندگی تھی مگر اسی وجہ سے وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر قصبے میں داخل ہونے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے اپنے گھوڑے مرکزی سڑک سے تین گلی پیچھے چھوڑے اور گارنر نے اپنا ایک آدمی وہیں چھوڑ دیا کہ وہ گھوڑوں کی نگرانی کرے اور جیسے ہی اسے اشارہ ملے وہ گھوڑے لے کر آجائے۔ وہ اس ہوٹل کے پیچھے تھے جس میں شارلی اپنے آدمیوں سمیت تھا۔ جون نے گارنر سے کہا۔

"شیبا لازمی یہیں ہوگی۔"

ہوٹل کے عقب سے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ حد یہ کہ نیچے والے حصے میں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی۔ گارنر اور جون گلی کے سرے سے دیکھ رہے تھے۔ گارنر نے کہا۔ "ہمیں کسی ایسی جگہ پہنچنا ہوگا جہاں سے ہم اوپر سے سامنے والا حصہ دیکھ سکیں۔"

جون کے ذہن میں اپنے ہوٹل کا خیال آیا جہاں وہ رکے ہوئے تھے۔ اس نے گارنر کو بتایا۔ "لیکن اس کے لیے ہمیں چکر کاٹ کر جانا ہوگا۔ وہ سڑک کے پار ہے۔"

گارنر نے اپنے آدمیوں کو بلا کر انہیں کچھ ہدایت دی کہ کس صورت میں انہیں کیا کرنا تھا پھر وہ جون کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ انہیں لمبا چکر کاٹنا پڑا تھا۔ وہ ہوٹل کے عقب میں پہنچے۔ یہاں اندر جانے کا راستہ تھا۔ دستک کے جواب میں باورچی نے دروازہ کھولا اور گارنر کا چہرہ دیکھ کر ہی جلدی سے ایک طرف ہوگیا۔ اسے حیرت تھی کہ اس علاقے میں کوئی اسپینش کہاں سے آگیا۔ اسے خاموش رہنے کا حکم دے کر وہ اندر آئے اور پھر سیڑھیوں سے اوپر پہنچے۔ ہوٹل کا باقی عملہ بھی غائب ہوگیا تھا۔ دوسری منزل سے وہ چھت پر اترے اور پھر آتش دان کے پائپ کی مدد سے اوپر چڑھے۔ تیسری منزل سے انہیں پوری سڑک اور خاص طور سے سامنے والا ہوٹل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے برآمدے میں شارلی کے کم سے کم نصف درجن مسلح گرگے تھے۔ گارنر نے کہا۔ "تم اتنی دور سے ان میں سے کسی کا نشانہ لے سکتے ہو؟"

''نہیں۔'' جون نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ ''رائفل سے میرا نشانہ بالکل اچھا نہیں ہے، میں صرف ریوالور سے بہتر نشانہ لے سکتا ہوں۔''

''ریوالور اتنی دور سے کام نہیں کرے گا۔'' گارنر نے کہا۔ وہ دونوں ایک آڑ میں تھے اور صرف ان کے سر نکلے ہوئے تھے۔

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''اگر میں شارلی کے آدمیوں میں سے کسی کو نشانہ بناؤں تو کیا وہ یہ نہیں سمجھیں گے کہ فائر ایڈگر کے آدمیوں نے کیا ہے؟''

''وہ سمجھ سکتے ہیں، اس صورت میں سمجھ لو ہمارا کام ہو جائے گا لیکن اگر انہوں نے جان لیا کہ فائر یہاں سے ہوا ہے تو ہمارے لیے نکلنا بھی مشکل ہو جائے گا۔''

گارنر نے سوچا اور اس نے فیصلہ کر لیا۔ رائفل سیدھی کر کے اس نے مخالف سمت میں لکڑی کے ستون سے ٹیک لگائے آدمی کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے نشانہ لینے سے پہلے کہا۔ ''سر فوراً نیچے کر لینا تاکہ ہم نظر نہ آئیں۔''

فائر کے ساتھ ہی شارلی کا آدمی لہرایا اور پلٹ کر پیچھے جا گرا۔ جون اور گارنر نے بیک وقت سر نیچے کیے۔ شارلی کے آدمی بے وقوف نہیں تھے جو فائر کی سمت کا اندازہ نہ کر سکتے مگر یہ اندازہ صرف نزدیک والے کر سکتے تھے اور دور والے یہی سمجھتے کہ فائر ایڈگر کے آدمیوں نے کیا ہے۔ ابھی ان کے سر نیچے تھے کہ فضا گولیوں کے شور سے گونج اٹھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ دونوں طرف سے ایک دوسرے پر فائرنگ شروع کر دی گئی تھی۔ گارنر نے چند لمحے بعد سر اوپر کیا اور بولا۔ ''سامنے والے اندر چلے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے اس طرف بھی یہی صورتِ حال ہوگی۔''

جون نے سر اٹھایا تو اسے برآمدے میں ایک اضافی لاش نظر آئی۔ شارلی کا ایک آدمی اور نشانہ بنا تھا۔ ہوٹل کی اوپری کھڑکیوں سے شارلی کے آدمی جواب دے رہے تھے اور جس طرح ان کی طرف گولیاں آ رہی تھیں، صاف لگ رہا تھا کہ ایڈگر کے آدمی بھی کوئی کمی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ گارنر نے جون سے کہا۔ ''اب ہمیں اپنے اصل پلان پر عمل کرنا چاہیے۔''

''کیسا پلان؟''

''شیبا کو چھڑانے کا۔'' گارنر نے کہا اور وہ نیچے اترنے لگے۔ جب تک وہ نیچے آئے فائرنگ میں شدت آ گئی تھی اور دونوں طرف سے دھواں دھار فائرنگ ہو رہی تھی۔ درمیان میں کچھ چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں جو یقیناً مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تھیں۔ انہوں نے لمبا چکر لگا کر سڑک کراس کی اور دوسری طرف آئے۔ ہوٹل کے نزدیک پہنچ کر گارنر نے ہلکے سے سیٹی بجائی اور فوراً ہی اس کے دو آدمی ایک طرف سے نکل آئے۔ گارنر نے ان سے کچھ کہا اور وہ ہوٹل کی عقبی دیوار کے ساتھ کوئی چیز لگانے لگے جب انہوں نے اسے آگ دکھائی اور بھاگے تب جون سمجھا کہ انہوں نے ڈائنامیٹ لگایا تھا۔ وہ ہوٹل کے نزدیک ہی مگر محفوظ جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ چند لمحے بعد زوردار دھماکا ہوا اور ہوٹل کی عقبی دیوار میں خاصا بڑا سوراخ ہو گیا۔ گارنر نے جون سے کہا۔ ''میرے ساتھ رہو۔''

وہ دونوں آڑ سے نکل کر بھاگے اور سوراخ میں گھس گئے۔ گارنر کے دو آدمی ان کے پیچھے تھے۔ یہ ہوٹل کا گودام تھا اور یہاں آگ لگ گئی تھی جو تیزی سے پھیل رہی تھی۔ وہ کچن میں داخل ہوئے تو ایک ملازم پہلے ہی ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ وہ اسے نظرانداز کر کے آگے آئے تو ایک مسلح شخص نمودار ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا جون نے اسے شوٹ کر دیا۔ گارنر نے اس کی تعریف کی۔ ''اچھا نشانہ ہے۔''

اس آدمی کی چیخ نے شارلی کے آدمیوں کو بتا دیا کہ دشمن عقب سے بھی گھس آیا ہے۔ اس کے کچھ آدمی اس طرف بھی آئے۔ ان میں سے ایک اوپر سیڑھیوں سے نمودار ہوا اور گارنر نے اسے سیڑھیوں کے نیچے سے رائفل سے نشانہ بنایا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شارلی کی نفری تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ عقب میں آنے والے گارنر کے آدمی نے اس سے کچھ کہا۔ گارنر نے جون کو بتایا۔ ''پیچھے آگ تیزی سے پھیل رہی ہے، کہیں واپسی کا راستہ نہ بند ہو جائے۔''

''میرا خیال ہے شارلی اور شیبا دونوں آگے والے حصے میں ہوں گے۔'' جون نے کہا اور وہ دونوں اس طرف بڑھے۔ شارلی ان کا منتظر تھا کیونکہ اس نے ان کی جھلک دیکھتے ہی فائر کیا تھا۔ وہ بال بال بچے تھے۔ جون پیچھے ہوا اور گارنر نے جوابی فائر کیا تو شارلی پناہ کے لیے پیچھے ہٹا اور جون کو اندر جانے کا موقع مل گیا۔ وہ بار کاؤنٹر کے عقب میں گھس گیا۔ شارلی نے اس پر عجلت میں فائر کیا جو ضائع گیا۔ یہ جگہ اندر ہونے کی وجہ سے محفوظ تھی۔ لاؤنج میں شارلی کے بچے ہوئے آدمی ایڈگر کے آدمیوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ گارنر پوزیشن بدل رہا تھا، بالآخر اسے ایک جگہ سے شارلی نظر آیا اور اس نے تاک کر گولی چلائی۔ شارلی زخمی ہو کر گرا اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کی مدد کو آتا جون

نے کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر اس پر لگاتار دو فائر کیے اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

شیا نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک طرف ستون سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کا متورم چہرہ بتا رہا تھا کہ شارلی نے اس پر تشدد کیا ہے۔ گارنر نے چاقو سے اس کی رسیاں کاٹیں اور اسے اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ وہ پیچھے جانے لگا اور جون اسے کور دے رہا تھا مگر اچانک ہی کھڑکیوں سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی گارنر تو نکل گیا مگر جون ایک ستون کی آڑ میں رکنے پر مجبور ہو گیا۔ گولیاں اتنے تواتر سے آ رہی تھیں کہ اسے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اصل میں یہ ایڈگر کے آدمی تھے جنہوں نے شارلی کے آدمیوں کو ختم کر دیا تھا اور ہوٹل میں گھس آئے تھے۔ جون کچھ دیر ان سے مقابلہ کرتا رہا مگر پھر زخمی ہوا اور پکڑا گیا۔ کچھ دیر بعد اسے ایڈگر کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ شارلی کے خاتمے پر مسرور تھا اور جون کو دیکھ کر اس کی مسرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس جنگ میں اس کے پانچ ساتھی مارے گئے تھے مگر اسے پروا نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے سب سے بڑے حریف کا اس کے ساتھیوں سمیت خاتمہ کر چکا تھا۔ جون کے بارے میں اس نے فیصلہ کیا۔ ''میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور سام کے فارم کے سامنے خود تمہیں اپنے ہاتھ سے شوٹ کروں گا۔'' ایڈگر نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ''روانگی کی تیاری کرو۔ ہمیں اسی وقت نکلنا ہے۔''

ان کے پاس یہی وقت تھا، اس سے پہلے کہ قانون حرکت میں آ جاتا۔

☆☆☆

شیا کو ہوش آیا تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈال ہارٹ کے باہر تھی۔ گارنر اس کے منہ میں پانی ڈال رہا تھا۔ اس نے ہوش میں آتے ہی جون کے بارے میں پوچھا۔ گارنر کا سر جھک گیا۔ ''وہ پیچھے رہ گیا، پتا نہیں زندہ ہے کہ مارا گیا۔''

شیا غصے سے اٹھ بیٹھی۔ ''تم لوگ اسے چھوڑ کر بھاگ آئے ہو؟''

''ہم مجبور تھے تمہاری وجہ سے وہاں سے نکلنا پڑا۔''

شیا کا لباس وہیں رہ گیا تھا مگر ٹرنک میں اس کے اور کپڑے تھے۔ اس نے پتلون اور شرٹ پہنی اور کچھ دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ ڈال ہارٹ کا رخ کر رہی تھی۔

☆☆☆

جون کی حالت بری تھی اور وہ بہ مشکل گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ ایڈگر کے آدمیوں نے اس پر تشدد کیا تھا۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار تھے اور جون کے دونوں ہاتھ آگے گھوڑے کی زین سے بندھے ہوئے تھے۔ ایڈگر کے بچنے والے چھ ساتھیوں میں سے دو زخمی تھے۔ اس طرح اس کے پاس اب کل پانچ آدمی بچے تھے۔ اسی وجہ سے اس نے عجلت میں روانگی کا فیصلہ کیا۔ اگر مقامی شیرف آ جاتا تو اتنے آدمیوں کے ساتھ وہ اس کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ قانون کا مقابلہ کرنے کے بجائے یہاں سے نکل جائے۔ قصبے سے نکلتے ہی انہوں نے مشرق کا رخ کیا۔ جون خود کو بہ مشکل گھوڑے پر برقرار رکھے ہوئے تھا۔ ایک چھوٹے درے سے گزرتے ہوئے اچانک دونوں طرف سے فائرنگ ہوئی تو اس کا گھوڑا بدک کر بھاگا۔ کچھ دور جا کر اس نے جون کو نیچے گرا دیا۔ جون کا پہلے سے زخمی سر زمین سے ٹکرایا تو اسے ہوش نہیں رہا۔ پھر اسے لگا کہ کوئی اس کے گال تھپتھپا رہا ہے۔ اس کا منہ نم تھا۔ اسے ہوش آیا تو وہ شیا کی گود میں سر رکھے ہوئے تھا اور وہ پانی کے ساتھ اپنے آنسوؤں سے بھی اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''شکر ہے تم ہوش میں آ گئے۔''

اگرچہ شیا کی آغوش میں اسے کسی کی فکر نہیں ہونی چاہیے تھی مگر اسے اس وقت بھی ایڈگر کا خیال آیا۔ ''ایڈگر......''

''وہ اور اس کے ساتھی جہنم رسید ہو چکے ہیں۔'' شیا نے کہا تو جون نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ گارنر اور اس کے ساتھی وہاں موجود تھے۔ شیا جون پر جھک گئی اور کچھ دیر جھکی رہی تو گارنر نے کھنکار کر اس سے کہا۔

''ہمیں جانا ہوگا، اگر شیرف ان کے پیچھے آیا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

شیا نے جون کو دیکھا۔ ''ہمیں جانا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟''

''ہاں میں چلوں گا۔ اب میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔'' جون نے کہا اور اٹھ بیٹھا۔ ''مگر سائمن اور اس کے پاس تمہارے پتھر......''

شیا مسکرائی۔ ''وہ میں پہلے ہی حاصل کر چکی ہوں اور سائمن کی لاش ہوٹل میں اس کے کمرے میں موجود ہے۔ پتھر ٹرنک میں تھے جو تم ساتھ لے آئے۔''

کچھ دیر بعد وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو کر مغرب کی طرف جا رہے تھے۔

ختم

سودائے جنوں

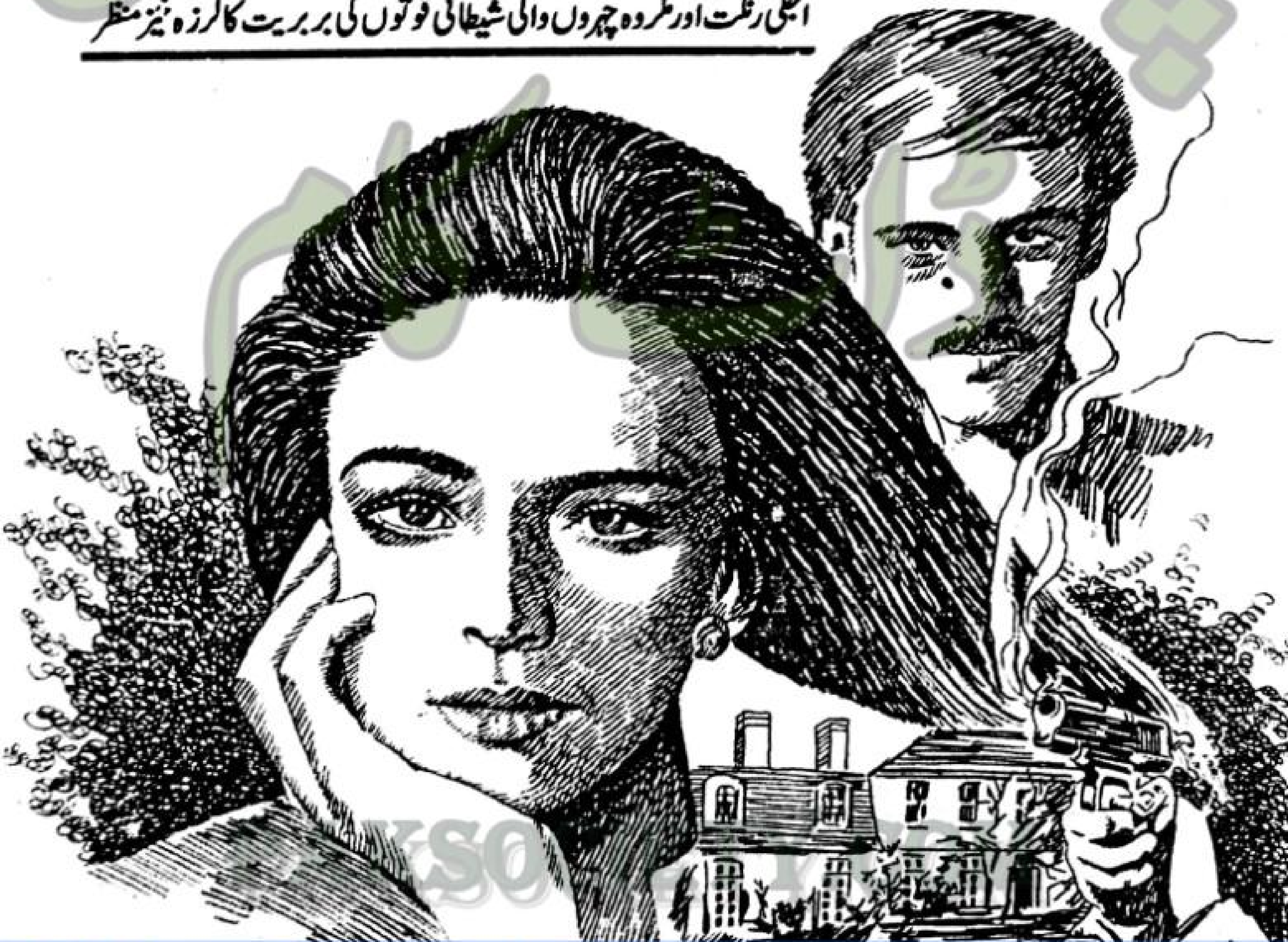
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

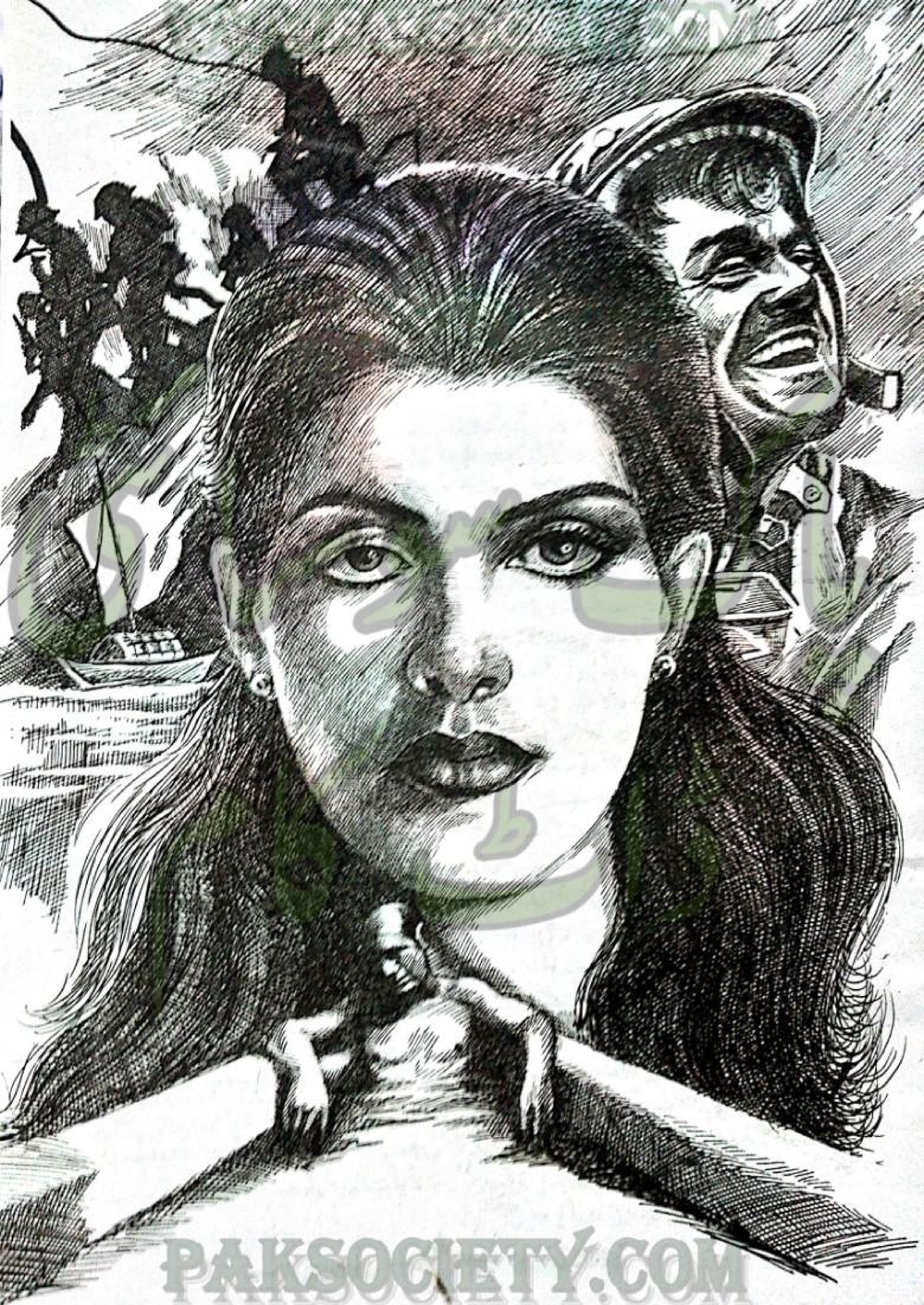
آٹھواں حصہ

عرصۂ دراز سے صیہونی قوتیں امتِ مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس ربِّ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظرنامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالمِ اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارضِ مقدس میں صیہونی یلغار ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کرکے ہیکلِ سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی ہولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں...

اب اس بازی کا انجام...

اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر





علی کی اس قربانی پر لیلیٰ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

وہ پیراشوٹ کے ذریعے بہ حفاظت زمین پر اتر گئی تھی اور اس وقت صحرائے نجف کی وسعتوں کے دامن میں کھڑی تھی۔ اس کے سارے ساتھی اس اہم مشن میں کام آچکے تھے۔ مشن کی کامیابی پر اسے جہاں خوشی تھی وہاں دکھ بھی تھا کہ...... اس کے کام آئے ساتھیوں میں باقر کا نام بھی شامل تھا...... لیلیٰ دل مجبور اور فرط غم سے رو پڑی...... اور اسی طرح سسکتے ہوئے نڈھال سی ہو کر ریت پر بیٹھ گئی...... اس کی آنکھوں کے سامنے ڈیوڈ اسٹار کی تباہی، جنرل آئزک فرناش جیسے یہودی شیطان کی عبرت ناک موت جیسے مناظر گھومنے لگے، جو اسے تسکین دیتے محسوس ہو رہے تھے۔ دوسری طرف اپنے ساتھی عبداللہ اور علی ارسلان کی شہادت، پھر اپنے محبوب ساتھی باقر کی فرناش کے ہاتھوں شہادت نے لیلیٰ کو رنجور بھی کر دیا تھا۔

باقر کے ہمیشہ کے لیے بچھڑنے پر...... لیلیٰ کو یہ صحرا بھی ہرجائی سا محسوس ہونے لگا۔ یہ وہی صحرا تو تھا، جس کی خاموش اور ویران فضاؤں میں ان دونوں نے خاموشی سے، بھرپور جذبۂ دل کے ساتھ عہد و پیماں کیے تھے۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ وہ دونوں دیوانے فرزانے، کن راہوں کے راہی تھے...... یہ حق کی وہ راہیں تھیں، جن میں اپنا کچھ نہیں ہوتا، جو ہوتا ہے وہ مستعار ہوتا ہے۔ عہد وفا کی راہ، چاہے محبوب سے منسوب ہو یا پھر مادرِ گیتی سے جڑی ہو، دونوں کی راہِ پر خار قربانی و ایثار کی کٹھنائیوں سے ہی عبارت ہوتی ہے۔ محبوب سے وابستہ عشق، عشقِ مجازی کہلاتا ہے، جبکہ حب وطن کی محبت، عشقِ حقیقی کا درجہ رکھتی ہے، تبھی تو وہ راہِ حق کے شہید کہلاتے ہیں۔

وقت گزرتا رہا...... اور پھر لیلیٰ نے اپنے آنسو پونچھ کر آگے کا قصد کیا۔ اس کا رخ بیتِ صفانہ کی طرف تھا...... وہاں پہنچی تو سارے مجاہد ساتھیوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا...... بانو بھی اسے زندہ سلامت دیکھ کر خوش ہوئی مگر اسے دیگر ساتھیوں کے بچھڑنے کا بھی افسوس ہوا، بالخصوص باقر کا...... وہ گروپ کے بہادر اور جری سپاہی کے طور پر مشہور تھا۔ کون جانتا تھا کہ کسی کے دل میں اس کی اس ''شہرت'' کا اور بھی مقام تھا...... اب تو یہ راز، شاید ہمیشہ کے لیے راز ہی رہ گیا تھا۔

لیلیٰ نے وہ سارا دن آرام کیا۔ اگلے روز اس نے بانو سے اس کے شوہر محسن کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا۔

''ابھی چند دن پہلے جناب یاسر العربی کا قاصد آیا تھا...... محسن کو کسی اہم مشن پر بلایا تھا انہوں نے۔''

لیلیٰ اس کی بات پر چونکی...... اس نے یوں بھی یاسر العربی کو اپنے اہم تیونائی مشن کی کامیابی کے بارے میں بھی آگاہ کرنا تھا...... نیز اسے کھد بد بھی تھی کہ آخر محسن کو کون سے مشن پر اور کہاں بھیجا گیا تھا؟

اس نے فوراً یاسر العربی سے رابطہ کیا۔ سب سے پہلے اسے تیونائی مشن کی کامیابی اور جنرل آئزک فرناش کے جہنم واصل ہونے کی خوش خبری سنائی، جسے سن کر یاسر العربی نے نہایت مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''عزیزی لیلیٰ! میں تمہیں اس فقید المثال کامیابی پر بے حد مبارک باد پیش کرتا ہوں...... آئزک فرناش جیسے سفاک اور چنگیزی فطرت کے شیطان کو ہلاک کر کے تم نے ان لاکھوں فلسطینیوں پر احسانِ عظیم کیا ہے جو اس درندے کی بربریت کا شکار رہتے تھے۔ تم جانتی ہو کہ غزہ پر وحشیانہ بمباری کرنے والا یہی سنگدل انسان تھا اور ڈیوڈ اسٹار کا قیام ہی دراصل اسی لیے عمل میں لایا گیا تھا کہ فلسطینیوں کی نسل کشی کرتے ہوئے اور انہیں بے گھر اور ہجرت پر مجبور کر کے ان کی املاک پر قبضہ کیا جائے اور ان کی جگہ...... یہودیوں کو آباد کیا جائے۔ تم نے آج صیہونیوں کی اس دیرینہ سازش کو ناکام بنا دیا ہے۔ یہ تمہارا بلاشبہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔''

لیلیٰ نے پورے جوش کے ساتھ اپنے اس طرح کے عزائم کا آئندہ بھی اظہار کیا اور آخر میں بولی۔ ''محترم! میرے خون کا ایک ایک قطرہ اپنے وطن اور فلسطینی عوام کے لیے وقف ہو چکا ہے۔ یہودی غاصبوں کو اپنی سرزمین سے دھکیلنے کے لیے ابھی میرے جسم و جاں میں اتنی قوت باقی ہے کہ میں مرتے دم تک اپنے اس مشن کو جاری رکھوں......''

''ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے آپ کے ان پُرجوش عزمِ صمیم کا...... اسی لیے ہم نے آپ کے لیے ایک نئے مشن کا انتخاب کر رکھا ہے......'' یاسر العربی نے ستائشی لہجے میں کہا تو لیلیٰ کی جیسے دلی مراد بر آئی، وہ بولی۔

''محترم! میں گوش بر آواز ہوں...... اور خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ مجھے جلد سے جلد نیا مشن سونپا جائے......''

دونوں کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو...... چونکہ لاسلکی رابطے کے ذریعے ہو رہی تھی اسی لیے یاسر العربی نے مشن کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا البتہ لیلیٰ سے اتنا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا کہ وہ اس کے پیغام کا انتظار کرے۔ جو

بہت جلد ان کا ایک قاصد تل کرم سے اس کے پاس بیت صفافہ لے کر پہنچے گا۔

لیلیٰ کو اب اس قاصد کا بے چینی سے انتظار تھا۔۔۔

تو نائی آپریشن کی شاندار کامیابی کے بعد لیلیٰ کا عزم و حوصلہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور بلند ہو گیا تھا۔

وہ زخمی تھی اور بانو ہی اس کی ایک نرس کی حیثیت سے خدمت کر رہی تھی۔ دونوں ہی عورتوں کے چہرے مغموم سے نظر آتے تھے اور دل بوجھل بھی تھے...... بانو اپنے شوہر محسن کی یادوں میں تڑپ رہی تھی اور لیلیٰ کو باقر کی دائمی جدائی بے کل کیے دے رہی تھی، جس کا حل اس نے یہی نکالا تھا کہ وہ آرام سے بیٹھنے کے بجائے کسی نہ کسی مشن میں معروف رہے۔

دو تین روز خیریت سے گزر گئے...... انہی دنوں ملکی و غیر ملکی خبر رساں اداروں کی طرف سے یہ خبریں بھی گردش کرنے لگیں۔۔۔ کہ ڈیوڈ اسٹار کی تباہی اور جنرل آئزک فرناش کی موت کے بعد اسرائیل کو دوسرا بڑا دھچکا...... ان کی ایک بڑی ایٹمی آبدوز کے خاتمے کی صورت میں لگا ہے جس نے یہودیوں اور اسرائیل کو ہلا کر رکھ دیا ہے...... بلکہ فلسطینی مجاہد گروپوں کو تو یہاں تک بھی اطلاع مل چکی تھی کہ یہ کارنامہ عابد کشمیری اور نائمہ نے انجام دیا ہے، مگر اب وہ دونوں لاپتا تھے۔ کسی غیر ملکی مگر مسلم بھائیوں کے ان کے کاز میں بلا واسطہ و بالواسطہ شمولیت فلسطینی مجاہدوں کے حوصلے بڑھانے کا سبب بنی تھی۔ یہی نہیں اب تو بعض غیر ملکی اور مغربی مبصرین بھی اسرائیل کی جارحیت کے خلاف آواز بلند کرتے نظر آتے تھے۔

لیلیٰ کی اچھی دیکھ بھال اور مناسب علاج کے بعد وہ صحت یاب ہو گئی تھی۔ اسی روز تل کرم سے یاسر العربی کے قاصد کی آمد ہوئی۔ وہ رکا نہیں اور نہ ہی اسے لیلیٰ کی طرف سے کوئی جوابی پیغام لینا تھا، وہ آیا اور پیغام تھما کر چل دیا۔ مشن کی ساری تفصیل پیغام کی صورت میں اس میں موجود تھی۔

لیلیٰ بہ غور اس مشن کی تفصیل پڑھنے لگی۔

مقبوضہ مغربی کنارے میں اسرائیل کا ایک یہودی نوآبادیاتی توسیعی منصوبہ سامنے آیا تھا۔

ریجنل کونسل کے سربراہ ڈیوڈ الہایانی کے مطابق، گھروں کے لیے انفرااسٹرکچر پر کام شروع کرنے کے لیے اسرائیلی اخبارات میں ٹینڈر بھی شائع کیے جا رہے تھے اور شمال مغربی کنارے پر یہودی بستیوں کے لیے مقامات کا معائنہ بھی کیا جا رہا تھا۔ الہایانی نے بتایا کہ اسرائیل کی وزارتِ دفاع نے اس پراجیکٹ کی منظوری دی تھی۔

اسرائیل کا ہر منصوبہ فلسطینی علاقوں کو ہڑپ کرنے اور فلسطینیوں کو ان کے گھر اور املاک سے محروم کر دینے کی سازش کی طرف جاتا تھا۔ یہی نہیں، نسل پرستی کی بنیاد پر تعمیر کی جانے والی اسرائیلی دیوار بھی دو لاکھ شہریوں کو ان کے گھروں اور زمینوں سے بے دخل کرنے کے منصوبے کا آغاز تھی۔

نسلی دیوار کی تکمیل کے بعد فلسطینیوں کے لیے مجموعی طور پر صرف 2700 مربع کلومیٹر باقی رہ جاتا، جو کہ فلسطین کے کل رقبے کا دس فیصد بنتا۔ اس دیوار کا آغاز شیرون کے دور میں 2008ء میں ہوا۔ اس کی تعمیر کا ''بہانہ'' فدائی حملوں کی روک تھام تھا۔

اسرائیلی نسلی دیوار اور یہودی بستیوں کے مغربی مقبوضہ کنارے میں تعمیری منصوبے کو حتمی شکل دے دی گئی تھی اور ایک امریکی نجی تعمیراتی کمپنی کا ٹینڈر بھی منظور کیا جا چکا تھا۔

''بلڈ اَپ گروپ'' نامی۔۔۔ امریکی تعمیراتی کمپنی اپنے ورکرز اور انجینئرز سمیت کسی بھی وقت تل ابیب پہنچنے والی تھی اور ان کی رہائش کے لیے باقاعدہ ایک پوری کالونی کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس امریکی تعمیراتی کمپنی کے مالک کا نام مائیکل مچل تھا اور وہ خود بھی آ رہا تھا، جبکہ یہاں تل ابیب میں ان کے کام کی نگرانی کے لیے شابک احرنوت نامی ایک یہودی کو سرکاری طور پر متعین کیا گیا تھا۔

اسرائیل کے اس نئے غاصبانہ منصوبے پر پی ایل او اور غضبِ خدا نے عالمی برادری میں صدائے احتجاج بھی بلند کی اور اقوام متحدہ کی سلامتی اور امن کونسل میں بھی اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا، مگر وہاں بھی کچھ شنوائی نہیں ہوئی۔ یو این او میں بھی فلسطینی اور اسلامی ممالک کے مخالفوں کی کمی نہیں تھی۔ لہٰذا بالآخر ہمیشہ کی طرح خود ہی اپنے طور پر اسرائیل کے اس مذموم منصوبے کو سبوتاژ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا......

لیلیٰ پر جب اس نئے مشن کی افادیت کا راز آشکار ہوا تو اس کے دل و دماغ میں جوش کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ابتدا میں وہ اس مشن کو اتنی اہمیت نہیں دے رہی تھی اور اسے مایوسی ہوئی تھی کہ...... محترم یاسر العربی نے ایک معمولی مشن کے لیے، اس کے شایانِ شان انتخاب نہیں کیا، مگر اب جو اس نے مشن کے محرکات کا تفصیلی جائزہ لیا تو اسے اپنا یہ خیال رد کرنا پڑا۔ وہ ابھی سے اس مشن کی تکمیل کے لیے کمر بستہ ہو گئی تھی۔ اس مشن میں ساتھیوں کا انتخاب بھی اسی کے اختیار میں دے دیا گیا تھا۔ تاہم یاسر العربی نے اتنا ضرور

کہہ دیا تھا کہ اگر اسے ان کے گروپ کے ساتھیوں کی بھی ضرورت پڑے تو وہ بتا سکتی ہے۔

لیلیٰ نے ٹیلی فونک رابطے کے ذریعے یاسر العربی کو اپنے مثبت جواب سے آگاہ کر دیا۔

وہ سارا دن لیلیٰ نے، اسرائیلیوں کی اس نئی غاصبانہ سازش کو سبوتاژ کرنے کے لیے حکمت عملی میں گزارا۔ اپنے اس مشن کو اس نے مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

پہلے حصے میں اس نے خود تن تنہا اپنی آنکھوں سے اس کا جائزہ لینے کا لائحہ عمل تیار کیا۔

وہ اس سازش کے تانے بانے کے اصل محرکات اور اس پر کام کرنے والے سربرآوردہ افراد کی ایک فہرست مرتب کرنا چاہتی تھی۔ جو اس ناپاک منصوبے میں اہم اور کلیدی کردار ادا کر رہے تھے......

نیز اس نے سب سے پہلے انٹرنیٹ پر اس امریکی تعمیراتی کمپنی ''بلڈاپ گروپ'' کے مالک امریکی شہری مائیکل چل کے بارے میں معلومات حاصل کیں پھر اس منصوبے کے نگراں ایک اسرائیلی سرکاری افسر شابک احرنوت کے بارے میں جانکاری حاصل کی، جو ایک اسرائیلی گورنمنٹ کانٹریکٹر کے محکمے میں سیکریٹری کی سطح کا اعلیٰ افسر تھا۔

اس قدر معلومات حاصل کر چکنے کے بعد لیلیٰ نے اگلے دن اللہ کا نام لیا اور ایک مرد کا بھیس بدل کر وہ مقبوضہ مغربی کنارے کی طرف روانہ ہو گئی......

جس جگہ یہ کام ہونے والا تھا، وہاں پہنچ کر لیلیٰ کا خون کھول اٹھا۔ وہاں باقاعدہ اس منصوبے کی حدود و قیود اور درجہ بندی عمل میں لائی جا چکی تھی...... یہاں ورکروں اور مزدوروں کے لیے چھولداریاں قائم کی جا چکی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ چند روز میں یہاں تعمیراتی کام شروع کیا جانے والا ہے۔

لیلیٰ نے یہاں سے ہٹنے کے بعد اس کالونی کا رخ کیا، جدھر مذکورہ تعمیراتی کمپنی کی پوری ٹیم کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وہاں سخت پہرا تھا، وہ اندر تو نہیں جا سکی تھی تاہم اس کے گرد و پیش گھوم کر اس نے اس کالونی کے قرب و جوار کا جائزہ ضرور لیا تھا۔

کمپنی کی ٹیم آ چکی تھی اور ان کے استقبال کے لیے اسرائیلی حکومت کے چند اہم اہلکار وہاں موجود تھے۔ ان میں شابک احرنوت بھی شامل تھا۔

لیلیٰ کے مشن کے اس پہلے مرحلے کی مدت اتنی ہی تھی۔ وہ ان سب باتوں کی تسلی کرنے کے بعد واپس اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئی اور ایک بار پھر اپنے منصوبے کے اگلے دو اہم مرحلوں پر غور و خوض کرنے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے مشن کے ضروری نکات ایک بڑے سے کاغذ پر اتار رکھے تھے۔ بانو اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ گاہے بگاہے چھوٹے موٹے مشورے اس سے بھی لے لیا کرتی تھی۔

لیلیٰ اپنے مشن کے دوسرے مرحلے پر عمل کرنے کے لیے غور کر رہی تھی جس کے مطابق اس نے ایک اشتہار کا پروف تیار کر رکھا تھا۔ یہ چھوٹے پمفلٹ کا اشتہار تھا جس میں ورکرز اور مزدوروں کو دھمکایا گیا تھا کہ وہ اس غیر قانونی اور غاصبانہ تعمیری منصوبے کا حصہ نہ بنیں ...... ورنہ اپنی بربادی کے ذمے دار وہ خود ہوں گے جو صرف موت کی صورت ہوگی۔

یہ اشتہار لیلیٰ نے نہ صرف کالونی میں بلکہ سائٹ پر واقع عارضی چھولداریوں میں بھی تقسیم کرنا تھے اور بذریعہ نیٹ اس نے یہ اشتہار بلڈاپ گروپ کے مالک مائیکل چل کو بھی روانہ کرنا تھا۔

یہ لیلیٰ کے منصوبے کا دوسرا مرحلہ تھا اور اس کے بعد تیسرا اہم اور آخری مرحلہ ہوتا ...... یعنی اس تعمیری منصوبے میں جن اہم شخصیات کی کلیدی شمولیت تھی ان کو ''ہٹ'' کرنا......

مشن کا تیسرا اور آخری مرحلہ نسبتاً مشکل اور جان جوکھم میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اس لیے کہ یہ ''فریضہ'' کسی دور دراز جنگلوں، صحراؤں یا پہاڑی علاقوں میں نہیں بلکہ...... تل ابیب جیسے بھرے پرے شہر کے بیچوں بیچ انجام دینا تھا۔ جہاں پوری اسرائیلی سیکیورٹی ہائی الرٹ ہوتی تھی بلکہ کسی ذرا سی گڑبڑ کی بھنک پڑتے ہی ...... فوراً آس پاس کے علاقوں کی ناکا بندی کر دی جاتی تھی ...... اور حملہ آور کے لیے وہ علاقہ پل کے پل میں چوہے دان بنا دیا جاتا تھا۔

''میرا خیال ہے لیلیٰ بہن! منصوبے کے دوسرے مرحلے کو سرے سے نکال ہی دینا چاہیے۔ اس پر عمل نہ کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔'' جھکی جھکی پتھریلی چھت والے ایک چھوٹے سے حجرے میں، لیلیٰ کے ساتھ بیٹھی بانو نے کہا تو لیلیٰ نے اس کی بات پر مسکرا کے دیکھا اور پرخیال لہجے میں بولی۔

''منصوبے کے اس دوسرے مرحلے پر میں بہت غور کر چکی ہوں مگر میں تمہیں اس کا جواب بعد میں دوں گی۔ پہلے تم مجھے اس کے منفی پہلو کے بارے میں بتاؤ۔ ایسی

کیا منفی بات تمہارے ذہن میں آئی ہے؟''
وہاں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ بانو سنجیدگی سے بولی۔
''اس اشتہاری دھمکی کے پھیلنے سے اسرائیلی سیکیورٹی زیادہ متحرک، محتاط اور سخت ہو جائے گی جس کے اثرات منصوبے کے تیسرے مرحلے پر کچھ زیادہ اچھے مرتب نہیں ہوں گے۔''
''میری پیاری بہن، بلکہ بھابی بانو! تم نے بلاشبہ ایک اچھے نکتے کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے...... اور اس پر میں خود بھی کافی غور کر چکی ہوں...... اب میں تمہیں اس کے مابعد مثبت اثرات کے بارے میں صراحت سے بتاتی ہوں۔'' لیلیٰ نے محبت سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا...... پھر تھوڑے توقف کے بعد آگے بولی۔
''دشمن کو للکارنے کے بعد کامیاب حملہ ان کے مورال کو گراتا ہے...... دشمن پر دہشت بیٹھتی ہے، وہ نفسیاتی دباؤ کا شکار رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی دوسری کوئی سازش اسی دباؤ کا شکار رہنے کے باعث مفید نہیں رہتی، نیز اس کا دشمنوں کے حلیف گروہ اور بالخصوص وہ لوگ، جو ان کے کسی مشترکہ منصوبے کا حصہ بنتے ہیں، ان پر بھی منفی اثر پڑتا ہے۔'' لیلیٰ کی بات پر بانو اس کی ذہنی فراست کی قائل نظر آنے لگی اور ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

☆☆☆

خطرہ، فوری اور عارضی طور پر ٹل چکا تھا مگر اس کی مہلت بہت قلیل تھی۔ یہ حقیقت زبیدہ بھی جانتی تھی کہ اسے جو کرنا تھا اسی تھوڑی مدت میں کرنا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ اپنی بہترین اداکاری اور حاضر دماغی کے بل بوتے پر دشمن کو ڈاج دینے میں کامیاب ہو چکی تھی اور وہ اسے ایک خطرناک تربیت یافتہ فلسطینی کمانڈو کے بجائے ایک عام سا روایتی ''طالع آزما'' سمجھے ہوئے تھے۔ ویسے اس میں شک بھی نہ تھا کہ اٹلی اور سسلی کے قرب و جوار میں ایسی روایتی داستانیں گردش کرتی رہتی تھیں کہ بحیرۂ روم کی گمنام تہوں میں باربرین دور کا شاہی خزانہ کئی سو سال سے ان سر پھرے طالع آزماؤں کے انتظار میں تھا۔
لالچ...... حرص و طمع، ابتدا ہی سے انسان کی فطرت بلکہ اس کی کمزوری رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جس نے اسرائیلی ریئر ایڈمرل اروودت یعود کو بھی اس میں مبتلا کر دیا تھا۔ ممکن تھا وہ ابھی زبیدہ کی باتوں سے پوری طرح مطمئن نہ ہوا ہو مگر اتنا تو ضرور ہوا تھا کہ اس نے فوری طور پر زبیدہ کی موت کا پروانہ جاری نہیں کیا تھا...... وہ بہرحال ایک کھٹک میں مبتلا ضرور ہو گیا تھا۔ تاہم ممکن تھا کہ وہ ابھی زبیدہ کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے اور اس کی طرف سے مکمل تسلی کے بعد ہی خزانے کے بارے میں اس سے تفصیلی بات چیت کا ارادہ رکھتا تھا، جبکہ زبیدہ کا خیال تھا کہ ایسی کوئی نوبت ہی شاید نہ آئے کیونکہ وہ لوگ، مختلف انداز میں اس کا فوٹو سیشن لے چکے تھے اور یقیناً اس سلسلے میں اپنے مختلف فعال ذرائع سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی جستجو میں مصروف ہوں گے۔ اسی لیے زبیدہ کو اس بات کا پورا خدشہ تھا کہ کسی وقت بھی اس کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا، لہٰذا وہ اسی موقع کو غنیمت جان کر یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے، اپنے مفر کی کوئی راہ ڈھونڈتی اور وہ یہی کر رہی تھی۔
ٹارچر سیل کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ یہ کمرا بہت بہتر تھا۔ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ ہونے کے ناتے اس کے ذہن میں یہ بات بھی تھی، یہاں لگے کسی خفیہ کیمرے کے ذریعے اس کی حرکات و سکنات، حتیٰ کہ چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا جا رہا ہوگا اسی لیے اس نے خود کو نارمل ہی رکھا تھا...... تاہم وہ عمومی انداز میں سہی، کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے بالوں میں ہیئر پن لگا ہوا تھا۔ ابھی وہ اسے استعمال کرنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔
کمرے میں دو کرسیاں اور ایک بیڈ تھا اور باتھ روم بھی۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے پہلے اپنے انداز میں کمرے کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد جب تنقیدی جائزہ لیا تو اسے اس بات کی بالآخر پوری تسلی ہو گئی کہ کمرا نہ ''بگڈ'' تھا اور نہ ہی یہاں کسی خفیہ مقام پر کوئی ایسا کیمرا نصب تھا۔
وہ کھڑکی کی طرف بڑھی جو بند تھی۔ اسے کھولے بغیر اس نے باریک متوازی جھری سے باہر جھانکا۔ اسے ایک طویل سی نیم تاریک راہداری کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ کہیں دور کسی کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی...... جو حسب توقع باہر سے بند تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ تھوڑی سی زور آزمائی سے یہ بہ آسانی کھل سکتا تھا۔ اس کا ذہن اس وقت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے اس بات کا بھی پوری طرح احساس تھا کہ وہ اس وقت ایک انتہائی حساس جگہ پر تھی۔ اسرائیلی بحریہ کے ریئر ایڈمرل کی یہاں موجودگی نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ اسپائی اسٹیشن کے اندر ہی

کسی گوشے میں موجود تھی۔

زبیدہ کے دل و دماغ منتشر تھے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اس وقت خونخوار دشمنوں کے بھٹ میں تھی اور بے یار و مددگار بھی، جہاں دن اور رات کی کوئی تمیز نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی اس نے اپنی ''کارروائی'' کرنے کے لیے کچھ مزید وقت گزرنے کا انتظار کیا اور بیڈ پر واپس آ کر نیم دراز سی ہو گئی۔ اس ڈر سے کہ اسے نیند نہ آ جائے، وہ اپنے منصوبے پر غور کرتی رہی...... تھکی ہوئی بھی تھی اور نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل بھی ہو رہی تھیں...... ذہن خدشات سے پُر تھا اور...... پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ ہی گئی۔

ایک زوردار دھماکے سے دروازہ کھلا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی...... اس کے سامنے ایڈمرل یعود کھڑا اس کی جانب شعلہ بار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لمبی نال والا سیاہ پستول تھا اور ہمراہ تین عدد مسلح آدمی۔

''تمہاری حقیقت کھل چکی ہے زبیدہ قیصری! اب تم زندہ نہیں بچ سکتیں......'' ایڈمرل اورودت یعود نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا اور پھر زبیدہ کو کچھ کرنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ یعود نے اپنے مہیب پستول کا ٹریگر دبا دیا۔ دھماکا ہوا اور گولی زبیدہ کے سینے میں لگی...... وہ اپنا سینہ پکڑے بیڈ پر ڈھیر ہو گئی...... اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی...... اور بے اختیار اس کے حلق سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔

وہ اس وقت جن خطرناک حالات اور غیر یقینی صورت حال سے دوچار تھی، اس کا دل و دماغ، لاشعوری طور پر اس کی گرفت میں تھا جو ایک ''نائٹ میئر'' کو جنم دینے کا باعث بنا تھا۔ البتہ اس نے ایسا خواب آنے پر شکر بھی کیا کہ وہ کم از کم اس طرح نیند سے تو بیدار ہوئی۔ ورنہ کل صبح تک جانے کیا ہو جاتا؟

اس ڈراؤنے خواب سے بیدار ہونے کے بعد اس نے وقت کا اندازہ لگایا۔ اس کی آنکھ لگے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ سامنے وال کلاک لگا ہوا تھا جس کی سوئیاں دو پر اٹکی ہوئی تھیں۔ گویا رات آدھی سے زائد بیت چکی تھی۔

وہ بیڈ سے اٹھی، کھڑکی کی طرف بڑھی، جھری سے باہر جھانکا۔ وہی راہداری دکھائی دی، جو اب بھی نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچھ سوچ کر زبیدہ نے دروازے پر زور آزمائی کرنے کے بجائے، اس کھڑکی کو تختۂ مشق بنانے کا سوچا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ کم از کم کھڑکی سے باہر کا کچھ منظر تو واضح تھا، جبکہ بند دروازے کے دوسری طرف کیا تھا، اسے کچھ علم نہ تھا...... چنانچہ یہی سوچ کر وہ پہلے کھڑکی کی طرف ہی متوجہ ہوئی۔

کھڑکی تھوڑی سی کھول کے اس کی چوکھٹ کا جائزہ لیا...... اس میں ڈیڑھ مربع انچ کی جالی کھنچی ہوئی تھی...... یہ لوہے کی تاروں سے بنی جالی تھی۔ زبیدہ نے اسے ہلا جلا کر اس کی مضبوطی کا جائزہ لیا، جس میں اسے واضح طور پر ایک ''جھول'' محسوس ہوا جس کا مطلب تھا جالی پر تھوڑی زور آزمائی کی جاتی تو اس کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ اس نے یہی کیا۔ زبیدہ نے اس بات کی تسلی کر لی تھی کہ کھڑکی ''آدم گزار'' تھی۔ یعنی جالی توڑ کر وہ بہ آسانی نکل سکتی تھی۔ اس نے چوکھٹ کے کناروں کو بہ غور دیکھا۔ جالی کے کچھ سرے نکلے ہوئے تھے۔ اس نے ان سروں کے ساتھ کھینچا تانی شروع کر دی۔ کوشش بار آور ہوتی محسوس ہونے لگی تو اس کی ہمت اور حوصلہ بھی سوا ہونے لگے۔

اس کوشش میں نصف، پون گھنٹا لگ ہی گیا۔ جالی ٹوٹتے ہی اس نے باہر نکلنے میں دیر نہیں لگائی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ راہداری میں تھی، بہ الفاظِ دیگر خطرے کی گود میں تھی...... زبیدہ کو اگر اپنے ''حربے'' کے دیرپا ہونے کا یقین ہوتا تو وہ اورودت یعود کو اسی طرح بے وقوف بنائے رکھتی۔

راہداری سنسان تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ محتاط روی سے آگے بڑھنے لگی...... معاً وہ بری طرح ٹھٹک کر رکی۔ اسے کچھ عجیب سی آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں۔ وہ یکدم ایک راہداری کے دیوار گیر پلر کی آڑ میں ہو گئی۔ یہ ستون نصف دیوار کے اندر اور آدھا باہر کو ابھرا ہوا تھا۔ دو وردی پوش مسلح افراد آپس میں باتیں کرتے ہوئے ایک طرف سے چلے آ رہے تھے۔

''وہ قیدی ہمارے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے...... اچھا تھا اسے گولی ماردی جاتی......'' ایک اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ قیدی کے ذکر پر زبیدہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ دوسرا ساتھی بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔

''عین آخری لمحات میں نہ جانے کیوں باس نے اس پر گولی نہیں چلائی، شاید جب تک وہ اس کے ساتھیوں کے نام نہیں اگلوا لے گا اسے اذیت میں رکھے گا۔''

''ہاں بڈی! یہی تو میں کہہ رہا ہوں...... اب ہمیں اپنے اصل کام سے ہٹ کر اس قیدی کی یہ بورنگ ڈیوٹی دینا ہوگی۔''

''اوکے ڈیوڈ (dude)! اب چلو...... بوتل مل گئی۔ اپنی تو اب ساری رات اسی کو چوستے گزرے گی......'' پہلے والے نے کہا...... اور دوسرا لاابالی پن سے ہنسا۔ دونوں زبیدہ کے قریب سے گزرتے چلے گئے اور

زبیدہ بھی خاموشی سے ان کے پیچھے ہولی۔ یوں کہ ان کی اس پر نظر نہ پڑ سکے...... وہ اس قیدی کو دیکھنا چاہتی تھی ...... جس کی یہ دونوں باتیں کر رہے تھے ...... اور اس سے بیزار بھی نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

خالد بن جنید، دانیال اور فاروق کو زبیدہ کا پیغام ملنے پر خاصی تسلی ہوئی تھی ...... وہ تینوں اس وقت پالرمو کے ایک موٹیل میں قیام پذیر تھے اور اب ...... زبیدہ کی طرف سے پیغام ملتے ہی انہوں نے فوراً موٹیل چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زبیدہ نے اپنے مختصر سے پیغام میں ان کی کوانڈو آئی لینڈ تک رسائی کی اچھی خاصی راہنمائی کر دی تھی۔

بہر طور یہ تینوں موٹیل سے اپنا مختصر بوریا بستر سمیٹ کر نکلے اور ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر سمندر کے ایک ایسے علاقے میں جا پہنچے جو عام لوگوں کی تفریح کے طور پر اسپاٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں آ کر انہوں نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر روانہ کر دیا ...... یہ تینوں ہنوز غیر ملکی ٹورسٹ کے بہروپ میں تھے۔

کچھ وقت انہوں نے دانستہ وہاں گزارا، اس کے بعد زبیدہ کے بتائے ہوئے راستے پر چل دیے۔ ان کا انداز بہ ظاہر سیر گشت کرنے کا سا تھا۔

جلد ہی یہ لوگ تفریحی اسپاٹ سے بہت دور نکل آئے ...... یہاں ساحلی علاقہ نسبتاً ویران تھا۔ ان کا رخ کھاڑی کی طرف تھا ...... اور پھر جلد ہی انہیں اپنے مطلوبہ مقام پر اسرائیلی بحریہ کی چوکی دکھائی دے گئی ...... خالد بن جنید نے فاروق اور دانیال کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور پھر یہ لوگ بہ ظاہر آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے اسی کھاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ انہیں ایک بڑا سا بورڈ بھی ریت میں گڑا نظر آیا جس پر ''ممنوعہ علاقہ'' اور ''پرائیویٹ پراپرٹی'' بڑے بڑے حروف میں درج تھا۔

مگر یہ اس کی پروا کیے بغیر آگے ہی آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ چوکی سے ذرا پہلے اور خاردار باڑھ کے پیچھے، کھڑے دو مسلح پہرے دار ...... تیزی سے اپنی گنیں سیدھی کیے ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک نے چیخ کر تحکمانہ کہا۔

''ہالٹ۔''

ان تینوں نے فوراً اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے......

''تم لوگ کون ہو؟ اور یہاں منہ اٹھائے کیوں گھسے چلے آ رہے ہو...... بورڈ نہیں پڑھا تھا تم نے؟ یہ پرائیویٹ پراپرٹی ہے۔'' دوسرے نے انہیں دھمکانے والے انداز میں کہا ...... اور تب تک خالد بن جنید کی ہدایت کے مطابق فاروق اور دانیال گرد و پیش کا جائزہ لے چکے تھے، انہیں سمندر کے مطلوبہ مقام میں داخل ہونے کی چوکی کے قرب و جوار میں کوئی دکھائی نہیں دیا تھا ...... لیکن بہر حال اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ چوکی میں کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

خالد بن جنید ان دونوں پہرے داروں کے ساتھ دانستہ منہ ماری میں مصروف رہا اور اِدھر منصوبے کے مطابق فاروق اور دانیال کے ہاتھوں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی۔ ان کی آستینوں میں چھپے ہوئے ''فائیو کونیکل اسٹار'' شڑاپ کی آوازوں سے نکلے اور سیدھا ان دونوں پہرے داروں کی گردنوں میں کھب گئے۔ دونوں تیورا کر گرے اور گرتے ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔ اپنے اسٹارز ان کی گردنوں سے نکال کر انہوں نے سنبھالے پھر تیزی سے آگے بڑھے۔

قدرے قریب پہنچ کر یہ تینوں الگ الگ ہو کر، چوکی کی سمت بڑھنے لگے ...... وہاں تین افراد ادھر ادھر ٹہلتے ... ہوئے نظر آ رہے تھے ...... مگر ان کی حرکات و سکنات چوکنا تھیں۔ ان کے خیال کے مطابق ان کا چوتھا ساتھی شاید چوکی کے اندر ہی موجود تھا۔

تینوں چیتے جیسی خاموشی کے ساتھ ان کی طرف بڑھے اور پھر یک بیک وقت ان کے سروں پہ قیامت بن کر ٹوٹے ...... دشمن کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا اور وہ ڈھیر ہو گئے۔ اسی وقت شاید ان کی کھڑبڑ کی وجہ سے چوکی کے اندر سے ان کا چوتھا ساتھی برآمد ہوا۔ اس پر دانیال نے ہلا بولا، اسے اپنی گن سیدھی کرنے کا بھی موقع نہ ملا اور دانیال کے شکاری چاقو نے اس کا کام تمام کر ڈالا۔

ان چاروں کی لاشیں وہیں اندر چوکی میں پھینک دی گئیں۔

کھاڑی میں ایک تیز رفتار بوٹ موجود تھی۔ یہ تینوں فوراً اس میں سوار ہوئے اور جزیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ زبیدہ انہیں ایک محفوظ ڈائریکشن کے تحت راہنمائی کر چکی تھی کہ انہوں نے جزیرے تک پہنچنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا تھا۔ لہٰذا وہ اسی راستے سے آگے بڑھنے لگے۔

رات کافی اتر آئی تھی۔ یہ لوگ ایک ویران ساحل سے آن لگے۔ بوٹ کو ساحلی ریت پر کھینچ کر قریبی جھاڑیوں کے جھنڈ میں چھپا دیا گیا کہ بہ وقتِ ضرورت اسے دوبارہ کام میں لایا جا سکے۔

دفعتاً تینوں چونکے۔ ساحلی ریت پر انہیں کوئی پڑا ہوا

دکھائی دیا تھا۔ وہ لپک کر آگے بڑھے۔ وہ کوئی عورت تھی۔ تاریکی کے سبب وہ اسے فوری طور پر تو پہچان نہیں پائے تھے، اسی لیے جسمانی خدوخال سے جب انہیں اس بے۔۔ ہوش وجود پر ایک عورت کا گماں ہوا تو لامحالہ یہ اسے پہلے اپنی ساتھی زبیدہ سمجھے مگر جلد ہی انہیں پتا چلا کہ یہ کوئی اور تھی......

وہ اسے ہوش میں لانے کی سعی میں مصروف ہو گئے۔ اسے ہوش آ گیا۔

پتا چلا کہ یہ نائمہ تھی، جو بڑے جاں گسل حالات میں اسرائیلی آبدوز آگوسٹا 291 کی تباہی کے بعد نکل کر یہاں آن پہنچی تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ کوانڈو آئی لینڈ کے ساحل تک آن پہنچی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد نائمہ ان تینوں کو دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئی تھی......

''ڈرنے کی ضرورت نہیں......کون ہو تم؟'' خالد نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

جزیرے کے ساحل پر کھلے آسمان پر تاروں کی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ اس ملگجی روشنی میں وہ آنکھیں پھاڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے باتوں میں مصروف تھے۔

نائمہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کو اپنے بارے میں کیا بتائے؟ نہ جانے وہ کون لوگ تھے؟ اور وہ خود اس وقت کہاں تھی؟

''م......میں ایک جہاز کی تباہی کے بعد بڑی مشکلوں سے جان بچا کر یہاں تک پہنچی ہوں......تم لوگ کون ہو؟'' اس نے ایک روایتی سا جھوٹ بولا تو خالد کو احساس ہو گیا کہ یہ عورت سچ نہیں بول رہی۔ پھر اس کا لب ولہجہ بھی عربی محسوس ہو رہا تھا اور یہی اندازہ ان کے بارے میں نائمہ بھی لگا چکی تھی۔

یہی سبب تھا کہ لب و لہجے کی ہم آہنگی اور شناسائی نے بالآخر جلد ہی حقیقتِ حال کھول کے رکھ دی......

اور جب خالد بن جنید وغیرہ کے سامنے نائمہ اور عابد کی حقیقتِ حال آشکار ہوئی تو وہ تینوں ہی حیرت سے چند ثانیوں کے لیے گنگ ہو کر رہ گئے۔ نائمہ اور عابد کے کارناموں کے بارے میں بیشتر فلسطینی مجاہد غائبانہ طور پر واقف تھے ہی لیکن ان دونوں کے تازہ ترین کارنامے (اسرائیلی ایٹمی آبدوز کی تباہی) کا سن کر تو خالد بن جنید، دانیال اور فاروق، نائمہ کو انتہائی احترام اور عقیدت آمیز ستائشی نظروں سے دیکھنے لگے۔ بلکہ خالد نے تو بڑے ہونے کے ناتے ازراہِ شفقت اس کی پیشانی پر بوسہ بھی دیا اور اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر متاثر کن لہجے میں بولا۔

''نائمہ بہن! تمہارا اور عابد جیسے مسلمان بھائیوں کا ہم فلسطینیوں پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ تم دونوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر اسرائیل کی ایک اہم ترین ایٹمی یو بوٹ آگوسٹا 291 تباہ کر کے یہودی غاصبوں کو بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے......اس سے پہلے بھی ہم تم دونوں کے قبرص اور اردن کے بے گھر اور جلاوطن فلسطینیوں کو خفیہ پہنچانے والے کارنامے کو نہیں بھولے ہیں......میں تمہیں سلام پیش کرتا ہوں......'' یہ کہتے ہوئے......خالد بن جنید نے سیلیوٹ کے انداز میں نائمہ کو سلام پیش کیا۔ نائمہ نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

''ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ جو کچھ کیا اور آئندہ بھی جو کچھ اپنے فلسطینی مسلم بھائیوں کے لیے کرتے رہیں گے اسے اپنی، بلکہ مسلم امہ کی جنگ سمجھ کے لڑتے رہیں گے۔ اس کا نہ صرف میں نے بلکہ میرے...ہم وطن (قبرص) ساتھی عابد شکیری نے بھی پختہ عزم کر رکھا ہے مگر مجھے نہیں معلوم......کہ اب میرا ساتھی عابد کہاں اور کس حال میں ہے؟'' وہ یہ کہہ کر رنجیدہ سی ہو گئی۔ اس پر خالد نے اسے تسلی دی۔

''ہم تمہارے بہادر ساتھی عابد شکیری کے لیے دل سے دعا گو ہیں......انشاء اللہ وہ ایک روز ہم سے آن ملے گا۔''

پھر تھوڑی دیر تک ان کے درمیان بہت سے موجودہ ضروری امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ اور نائمہ کو بھی اس حقیقت کا پتا چلا کہ وہ اس وقت حادثاتی طور پر کوانڈو آئی لینڈ کے ساحل پر موجود تھی۔

بہر طور......ایک مقام پر گروپ لیڈر خالد نے خفیہ ٹرانسمیٹر پر زبیدہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا......اس کے چہرے پر تفکر کے سائے نمودار ہوئے تو فاروق نے پوچھا۔

''کیا زبیدہ سے رابطہ نہیں ہو پا رہا؟''

''نہیں......'' خالد نے مختصراً جواب دیا۔

''خدانخواستہ وہ کسی مصیبت کا شکار تو نہیں ہو گئی؟'' دانیال نے تشویش ظاہر کی۔

''میرا خیال ہے زبیدہ اپنی کسی خفیہ کارروائی میں مصروف ہے۔ ورنہ اس کا ٹرانسمیٹر آف ملتا، وہ شاید اب کسی وقت بھی ہم سے رابطہ کرنے والی ہو گی......'' خالد بولا۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر ہمیں اس کی کال کا انتظار کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ اس وقت یقیناً دشمنوں کے اسپائی اسٹیشن کے اندر ہی موجود ہے۔'' فاروق نے رائے دی، تو خالد بن

جنید نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں کہا۔
"تم ٹھیک کہتے ہو...... ہمیں تھوڑا انتظار کرلینا چاہیے......"
اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک... خالد کو اپنے ٹرانسمیٹر پر مخصوص بیپ سنائی دی۔ وہ چونکا۔ کال زبیدہ کی تھی۔

☆☆☆

زبیدہ نہایت محتاط روی کے ساتھ راہداری کی دیوار سے چپکی ہوئی ان دونوں شرابی پہرے داروں کے پیچھے چلی جارہی تھی۔

زبیدہ کے ذہن میں یہی کھٹک تھی کہ آخر یہ دونوں تھوڑی دیر پہلے کون سے قیدی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے......

تھوڑی دور جا کے راہداری بائیں جانب مڑی تو زبیدہ بھی اسی طرف مڑی...... اس نے ذرا رک کر دیوار کی آڑ سے سامنے دیکھا...... وہ دونوں ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہے تھے...... ذرا دیر بعد زبیدہ بھی دبے پاؤں آگے بڑھی۔ اس نے پہلے چند ثانیے دروازے سے کان لگا کر اندر کی سن گن لی اس کے بعد دروازے کے ہینڈل کو تھام کر آہستگی سے اندر کی طرف دھکیلا، پھر قدرے جھک کر دیکھا۔ اندر اسے ایک چھوٹا سیل روم دکھائی دیا۔ جس کا دروازہ بند تھا اور اس کے سامنے وہی دونوں شرابی پہرے دار دو کرسیوں پر بیٹھے، درمیان میں دھری ایک چھوٹی ٹیبل پر پاؤں پھیلائے ہوئے، شراب پینے میں مصروف تھے۔ ان کی پشت دروازے کی طرف تھی۔

پل کے پل زبیدہ نے ایک فیصلہ کیا اور بے آواز اندر داخل ہوگئی۔ دونوں شراب پینے اور بے پر کی باتوں میں مشغول تھے۔ ان کی گنیں، کرسیوں کے ساتھ ٹکی ہوئی تھیں مگر زبیدہ ابھی ان کی گن پر قبضہ جمانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس نے پہلے نہایت آہستگی سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا مگر لاک نہیں کیا تھا۔ اس سے آواز پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

وہ آگے بڑھی اور اپنے دائیں ہاتھ کا پنجہ بنا کر ایک کی گدی پر رسید کردیا۔ وہ کرسی سے لڑھکا تو دوسرا نشے میں... ہونے کے باوجود بری طرح بدکا۔ اس نے اپنی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو زبیدہ شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی...... اور ایک پنچ اس کی ناک پر جڑ دیا۔ وہ اوغ کی کریہہ آواز کے ساتھ چند قدم لڑکھڑایا۔ زبیدہ نے اس دوران میں پہلے آدمی کی گن اٹھالی اور اسے لٹھ کی طرح گھما کر دوسرے کی کنپٹی پہ رسید کردی۔ وہ تیورا کر گرا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔

زبیدہ کا دل فرطِ جوش سے بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے سامنے سیل روم کا جائزہ لیا۔ دروازے پر تالا تھا۔ اس نے پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

سب سے پہلے اس نے واپس پلٹ کر اس بڑے کمرے کا دروازہ بند کیا اور ...... پھر جلدی جلدی ان دونوں ...کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اسے ایک کی جیب سے سیل روم کی چابی مل گئی۔۔۔ اس نے فوراً سیل روم کا دروازہ کھولا۔

کمرے میں تاریکی تھی۔ اس نے اندھیرے میں سوئچ ٹٹول کر روشنی کر دی اور سامنے دیکھ کر چونک پڑی۔ ایک شخص اسے چھت سے آہنی زنجیر کے سہارے جھولتا ہوا نظر آیا۔

اس کی ہیبت کذائی دیکھ کر زبیدہ کو یہ اندازہ لگانے میں مطلق دیر نہ لگی تھی کہ اس بدنصیب پر یہاں بری طرح تشدد کیا جاتا رہا ہے...... مگر یہ کون تھا؟ وہ ابھی یہ جان نہ پائی تھی۔

وہ نیم بے ہوش سا تھا۔ زبیدہ نے سب سے پہلے اسے زنجیر سے آزاد کیا تو وہ دھڑام سے فرش پر بے دم سا ہو کر گر پڑا۔ زبیدہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔

یہ قیدی عابد شیکھری تھا۔ اسے ہوش آیا تو جلد ہی دونوں کی حقیقت ایک دوسرے کے سامنے آشکار ہو گئی۔ زبیدہ نے اسی وقت پکا تہیہ کرلیا کہ وہ عابد جیسے بہادر ساتھی کو کبھی اس مردود یعود کے ہتھے چڑھنے نہیں دے گی...... زبیدہ نے جیسے تیسے اسے سنبھالا اور عابد بھی اب خود کو حواسوں میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک آہنی اعصاب کا مالک انسان تھا۔ مگر جبڑے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی اس کے لیے درد و اذیت کا باعث بن رہی تھی...... لیکن اس کے ساتھ اسے تسلی بھی تھی کہ وہ زبیدہ جیسی مجاہدہ کے ساتھ تھا اور اس نے اس کے سامنے، خود زخمی ہونے کے باوجود، اپنے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ اسپائی اسٹیشن کی تباہی میں اس کے شانہ بشانہ رہے گا۔

تھوڑی دیر بعد زبیدہ اپنی ہیئر پن، خفیہ ٹرانسمیٹر کے ذریعے خالد بن جنید سے رابطہ کررہی تھی۔

☆☆☆

رات کے اس ہولناک تاریک پہر میں صحرا کی زمین بھی بے گناہ مظلوموں کی آہوں اور سسکیوں سے تھرانے لگی تھی۔ ان سب کو رمشید کے بدمعاش لٹیروں نے گن... پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔

صحرا میں خنکی اتری ہوئی تھی اور ٹھٹھرا دینے والی فضا غالب تھی، جو رگوں میں دوڑتے خوف اور سراسیمگی کو مزید

ہوا دیتی محسوس ہوتی تھی اور دل پتے کی طرح لرز رہے تھے۔

بد طینت ابن قصی اور شیطانی چیلے رمشید کے درمیان شکار بانٹنے کا سودا طے پا گیا تھا۔

اور اسی وقت خواتین ہاتھ جوڑے ان دونوں شیطانوں کے آگے داد فریاد کرنے لگیں۔ حماد سے یہ سب دیکھا نہیں گیا۔ وہ اب تک موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے، تحمل سے کام لے رہا تھا۔ ایک قدم ان کی جانب بڑھاتے ہوئے ابن قصی سے بولا۔

''قصی! تمہیں یقیناً ہمارے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے...... ہمارا خاندان صدر کے حامیوں میں نہیں تھا، ہم... درپردہ تمہارے بھائی جنرل واحدی کے ہی حامی تھے......''

''اچھا......!'' اس کی بات سن کر قصی نے خبیثانہ طنز سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بغض وعناد کی تیز چمک سی لہرا گئی تھی۔ وہ بدستور حماد کی طرف اسی طرح گھورتے ہوئے آگے بولا۔ ''اپنے اور اپنے خاندان کے سر پر موت کو منڈلاتے دیکھ کر اب تمہیں میرے بھائی کی وفاداری یاد آرہی ہے؟ میرے عزیزی بھائی اور اس کے قریبی ساتھیوں کے خلاف جس قدر نفرت انگیز مہم تمہارے والد شمائل اندال نے چلائی وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے......'' یہ کہتے ہوئے فرط غیظ تلے قصی کے نتھنے بھینسے کی طرح پھولنے پچکنے لگے۔

حماد نے اپنا مفاہمانہ انداز گفتگو جاری رکھا اور بولا۔

''وہ تمہارے بھائی کے خلاف نفرت انگیز مہم نہیں تھی، بلکہ اختلافی مہم کہہ سکتے ہو اور نہ ہی میرے والد کی ان کے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی تھی۔ یہ صرف نظریاتی اختلاف تھا لیکن اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ سیاست میں یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ ایک ہی خاندان کے لوگ اتفاق رائے رکھتے ہوں۔ ہمارے خیالات مختلف تھے...... اسی لیے میں تم سے گزارش کروں گا کہ ہمیں جانے دیا جائے۔''

''بات کو گھما پھرا کر تم حقیقت کو بدل نہیں سکتے حماد! تمہیں اور تمہاری والدہ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔'' قصی اٹل لہجے میں بولا۔ ''ہاں! یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ تم میرے بھائی کے سامنے پیش ہو کر اس کے سامنے اس طرح دلائل دو اور وہ مطمئن ہو جاتے ہیں تو تم دونوں ماں بیٹے کی جان بخشی کر دی جائے گی۔'' وہ بولا تو حماد کو ہی نہیں اس کے قریب کھڑے ڈاکٹر کمال کو بھی بد طینت قصی کے لہجے سے دغا بازی اور مکاری کی بو آتی صاف محسوس ہوئی تھی۔ البتہ ڈاکٹر کمال اپنے حواس پر قابو پائے، تیزی سے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مہیب صورت حال کی اس سفاکانہ فضا کے اثرات، اس وقت سب کے بشروں سے خزاں رسیدہ موسم کی طرح ہویدا ہو رہے تھے۔

حماد ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے اگر یہ بات ہے تو میں تم سے ایک درخواست کروں گا کہ...... ابھی کوئی حتمی فیصلہ ہونے سے پہلے ہم سب تمہارے بھائی کے سامنے پیش ہونے کو تیار ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی غلط فہمی دور کر دوں گا، بلکہ وہ ہم سب کو اپنا حامی پائیں گے۔''

''ہا...... ہا...... ہا......'' قصی نے ایک شیطانی قہقہہ اگلا، وہ بولا۔

''اگر تم نے میرے بھائی کی حمایت کرنا تھی تو اس طرح راتوں رات اپنے پورے کنبے سمیت فرار ہونے کے بجائے قصر واحدی کا رخ کرتے......''

''قصی برادر! تم بلاوجہ وقت ضائع کر رہے ہو...... اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں...... وقت نے سرزمین عراق کی سیاسی بساط الٹ دی ہے۔ اپنا اپنا شکار سنبھالو اور راستہ لو......'' بے چین اور خاموشی سے کھڑے...... صحرائی لٹیروں کے سرغنہ رمشید نے چلا کر قصی سے کہا، تو وہ بھی ایک بے ہنگم قہقہہ لگا کے ایک ہاتھ کے اشارے سے بولا۔

''میں نے تمہیں کب روکا ہے برادر؟ لے جاؤ اپنا شکار......''

''ٹھہرو......'' معاً ڈاکٹر کمال احمد نے بہ آواز بلند کہا...... اس کی آواز میں نہ جانے ایسا کیا دبدبہ تھا کہ قصی ہی نہیں بلکہ رمشید بھی اس کی طرف ایک چونکتی ہوئی نظر ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے...... ڈاکٹر کمال احمد کے چہرے پر اس وقت ڈر یا خوف کا شائبہ تک نہ تھا، اس کے بشرے پر چٹانوں جیسا اعتماد ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا، رمشید کے دو گن بردار ساتھی اس کی طرف لپکے مگر وہ ان کے چھونے سے پہلے ہی...... قصی اور رمشید کے سامنے پہنچ کر رک گیا اور پھر دونوں کو باری باری گھورنے کے بعد بولا۔

''تم لوگ کیسے مسلمان ہو؟ اور اپنے اس بے ہودہ عمل سے دنیا کو کیا دکھانا چاہتے ہو کہ تم ایسے مسلمان ہو، جو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی مسلم ماں بہنوں اور بھائیوں کا گلہ کاٹنا چاہتے ہیں؟ ...... افسوس تو اس بات کا ہے کہ...... ہمارے اپنے مسلمان بھائی خود اس وقت یہودیوں کی سازش کا نشانہ بن رہے ہیں...... یاد رکھو! خون مسلم کا رقص اجل کروانے والو! اغیار کی ان سازشوں سے...... تم بھی نہیں بچ پاؤ گے......''

ڈاکٹر کمال پلٹا اور...... جینی کو بازو سے پکڑ کر ان دونوں شیطانوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔

اس وقت ڈاکٹر کمال کے بدن کا رواں رواں شدت جوش و جذبات تلے مرتعش ہو رہا تھا۔

''اپنا طاغوتی کھیل کھیلنے سے پہلے ذرا ایک نظر اس لڑکی پر بھی ڈال لو...... غور سے دیکھو اسے...... اس وقت یہاں موجود، ہم سب مسلمانوں میں سے، صرف ایک یہ فرنگن ہے...... ایک کرسچین برٹش لڑکی ہے...... یہ لندن کی ایک بڑی یونیورسٹی کی اسکالر ہولڈر ہے۔ جبکہ میں ایک تمہارے ہی ہم مذہب اور برادر اسلامی ملک پاکستان کا باشندہ ڈاکٹر کمال ہوں...... ہم یہاں عراق اور بغداد کو دیکھنے کے شوق میں آئے تھے۔ حماد نے اپنے ملک کی ہم سے بے حد تعریفیں کی تھیں...... بتاؤ مجھے تم دونوں......! ہمیں تم اپنے اس اعمال سے کیا سبق دینا چاہتے ہو؟...... میں نے ریڈیو میں ایسی خبریں نشر ہوتے سنی تھیں کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کہ اس طرح کا خون ریز کھیل یہاں کھیلا جا چکا ہے اور مقام عبرت ہے کہ...... بہ ظاہر یہاں ظلم سے نجات دلانے والے نام نہاد امریکی قابض فوجی...... لاء اینڈ آرڈر کی اس صورتِ حال سے حظ اٹھا رہے ہیں...... بلکہ وہ خود ایسے ظلم کو ہوا دے رہے ہیں...... تا کہ مظلوم لوگ انہی نام نہاد ''نجات دہندہاؤں'' سے مدد طلب کریں اور انہیں اس آڑ میں اپنے غاصبانہ قدم یہاں جمانے میں مدد ملے...... لیکن افسوس...... ذاتی مفادات کی جنگ نے تمہیں اغیار اور یہودیوں کی اس سازش میں پھنسنے پر مجبور کر دیا ہے......''

رات کے اس دم بہ خود دشت شب گزیدہ میں...... ڈاکٹر کمال کی آواز جیسے نقارے کی طرح گونج رہی تھی......

لیکن...... صد افسوس کہ اس کی آواز کو دیوانے کی ایک بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی...... اور پھر جیسے رقصِ ابلیس شروع ہو گیا...... دشتِ شب گزیدہ، گویا پل کے پل، میدانِ محشر کا سا سماں پیدا کرنے لگا......

خواتین کو بے دردی سے گھسیٹا گیا، مردوں نے جوشِ غیرت میں مداخلت کی تو رائفلوں کے کندے مار کر انہیں لہولہان کر دیا گیا...... جو ایک ملازم بچا تھا، وہشت طاری کرنے کے لیے اس بے چارے کے سر میں گولی مار دی گئی...... وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔

ابن قصی نے رمشید کے خونخوار ساتھیوں کی مدد سے حماد اور اس کی والدہ حاجراں کے ہاتھ پیر بند ھوا کر انہیں اپنی کار میں ڈلوایا اور وہ اپنے ساتھی کے ساتھ شیطانی قہقہے لگاتا ہوا چلتا بنا...... ادھر حبیبہ اور جینی پر رمشید نے ہاتھ ڈالا تو...... جوشِ غیرت تلے مغلوب ہو کر سب سے پہلے اس کا ہونے والا...... شوہر احمد حمادی جنونی انداز میں چلا کر...... اسے بچانے کے لیے لپکا...... تو اسے رائفلوں کے بٹ مار کر ریت پر گرا دیا گیا......

ڈاکٹر کمال کے اندر ایک لاوا سا پک رہا تھا...... وہ ان حالات ...... سے پہلے کبھی دو چار نہیں ہوا تھا...... جمشید حمادی ہاتھ جوڑ کر رمشید سے رحم کی بھیک مانگنے لگا...... تو رمشید نے ایک سفاکانہ قہقہہ اگلا اور اپنی جیب سے پستول نکال کر اس کی پیشانی پر نال رکھ کر بھیڑیئے جیسی غراہٹ سے بولا۔

''چل بڈھے! تیرا وقت تو پورا ہوا......''

''نن...... نہیں......'' حبیبہ چلائی مگر دوسرے ہی لمحے ایک دھماکا ہوا اور گولی جمشید حمادی کی پیشانی توڑتی ہوئی سر کے پچھلے حصے سے آر پار ہو گئی...... حبیبہ مارے دہشت کے غش کھا کر ریت پر گر پڑی۔

''والد......'' احمد اپنے باپ کا یہ حشر دیکھ کر لرز کر فرطِ غم سے چیخا اور جینی ہذیانی انداز میں چیخیں مار مار کر رونے لگی...... ڈاکٹر کمال کو یوں لگا جیسے جینی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے گی۔

رقصِ اجل کا یہ بے رحم کھیل جب تھما، تو جو زندہ تھے وہ رسن بستہ کر دیے گئے...... اور جو ان درندوں کی بربریت کا شکار ہو کے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، ان کی لاشوں کو مردار خور گدھوں کی خوراک بننے کے لیے بے گور و کفن چھوڑ دیا گیا......

ڈاکٹر کمال کی اپنی حالت ایک خوابیدہ آتش فشاں جیسی ہو رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر کسی لاوے کی طرح پک رہا تھا...... اس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ پھٹ پڑنے کو تیار تھا...... مگر وہ اپنی آنکھوں سے ظلم و بربریت کا یہ بے رحم کھیل دیکھ رہا تھا...... اور خود کو اس...... تماشائے لہو رنگ میں کودنے سے بچائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا...... وہ بزدل نہیں تھا لیکن وہ ان رذیلوں کے ہاتھوں بے موت بھی نہیں مرنا چاہتا تھا...... اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا...... جبکہ زندہ رہتے ہوئے وہ کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتا تھا...... تاکہ وہ معصوم حبیبہ، اس کے ہونے والے شوہر احمد حمادی اس کی بدنصیب ماں ام کلثوم، جو کہ بیوہ ہو چکی تھی اور جینی کی کوئی مدد کر سکتا، اس کے لیے نجات دہندہ ثابت ہوتا......

لہٰذا وہ خاموش رہا، اس تماشائے خوں رنگ کو دیدۂ

بھری نگاہ سے تکتا رہا اور اندر ہی اندر کڑھتا رہا......

اس کے تھوڑی دیر بعد ہی ان پانچوں کو اونچے ٹائروں والی گاڑیوں میں ڈال کر یہ راہزنی ٹولا روانہ ہو گیا۔

ڈاکٹر کمال اور احمد حمادی کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیے گئے تھے جبکہ حبیبہ، جینی اور ام کلثوم کے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر کمال اور احمد کو ایک گاڑی کی عقبی سیٹوں میں بوریوں کی طرح ڈال دیا گیا تھا اور اس گاڑی میں رشید کے ساتھی بدمعاش سوار تھے، جبکہ دوسری گاڑی میں خود رشید اپنے چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ دانستہ درمیانی سیٹ پر براجمان تھا اور اس کے دائیں بائیں، اس نے حبیبہ اور جینی کو بٹھا رکھا تھا......وہ دونوں بری طرح رو رہی تھیں......اور اس سے داد فریاد کیے جا رہی تھیں......مگر رشید شیطانی قہقہوں میں ان کی فریادیں اڑا دیتا۔ وہ ہوس کار، ان کے ساتھ بے ہودہ چھیڑ چھاڑ بھی کرے جا رہا تھا۔ اس درمیان میں جینی نے ذرا جرأت رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیپ سے چھلانگ لگانے کی سعی چاہی تھی ......مگر رشید کے پیچھے بیٹھے ہوئے ساتھیوں میں سے ایک نے اسے دبوچ کر دوبارہ بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا......

یہ راہزنی ٹولا کم و بیش ایک گھنٹا مسلسل سفر کے بعد ایک ایسے مقام پر پہنچ کر رکا......جو نیم صحرائی اور خود رو جھاڑیوں پر مشتمل تھا۔ یہاں چھوٹے بڑے ٹیلے بھی نظر آتے تھے۔ کہیں اونچی پہاڑیاں بھی تھیں۔ ایک جانب گھنا جنگل بھی دکھائی پڑتا تھا۔ یہ اس ٹولے کی خفیہ کمین گاہ تھی......

ان سب کو نیچے اتارا گیا......کمال کو یہ علاقہ دور افتادہ محسوس ہوا۔ اسے دور قریب کسی آبادی کے آثار نظر آتے محسوس نہیں ہوئے مگر وہ قرب و جوار کا بڑے غور سے جائزہ لینے میں مصروف تھا اور یہ دیکھ کر اسے ایک جھٹکا لگا تھا کہ موجودہ مقام......ایک پوری بستی کا منظر پیش کرتا تھا......یہاں اسے عورتیں اور بچے بھی نظر آئے تھے......جو قیدی تو نہیں تھے اور انہی کے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں... جا بجا رہائشی جھونپڑیاں بھی تھیں۔

ڈاکٹر کمال نے اندازہ لگایا کہ یہ راہزنی ٹولا اپنا باقاعدہ گھر بار بھی رکھتا تھا اور یہاں اس دور افتادہ علاقے میں فروکش تھا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ......یہ ایک پیشہ ور لٹیرے تھے......اور ان کا جدی پشتی یہی دھندا تھا......بظاہر یہاں ان کی زندگی......بنجاروں سے کم نظر نہیں آتی تھی، یہاں ان کے مال مویشی بھی تھے۔ ان کے دیگر بنے کئے ساتھی بھی اِدھر اُدھر مٹر گشت کر رہے تھے۔

ڈاکٹر کمال اور احمد کو دو لٹیرے اپنے ساتھ لیے، ٹیلوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے، ایک دو موڑ کاٹنے کے بعد ایک ایسی جگہ لے آئے، جسے دیکھ کر ہی ہول آتا تھا۔

یہاں قدرتی بنے ٹیلوں سے تنگ و تاریک گپھائیں بنی ہوئی تھیں......جن کے سروں پر گول آہنی سلاخ دار دروازے نصب تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے انہیں اس کے اندر سے نیم برہنہ قیدی جھانکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے، جو سلاخ دار گول دروازوں سے چپکے بے تاثر نظروں سے ان کی طرف تکے جا رہے تھے۔

ان دونوں کو بھی ایک ایسی ہی تنگ و تاریک گپھا میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔

ڈاکٹر کمال بے شک کتنے ہی مضبوط دل گردے اور آہنی اعصاب کا مالک سہی، لیکن یہاں کا دل خراش منظر اور ہولناک ماحول اسے بھی اندر سے بری طرح شکست و ریخت سے دوچار کرنے لگا تھا۔ یک لخت اس کے احساسات میں گہری تشویش اور ذہنی کرب کی لہریں سی، زہریلے سنپولیوں کے مانند پورے وجود میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ جو اس کی منظم اور پُراعتماد شخصیت کے بت کو بری طرح مسمار کرنے کا سبب بن رہی تھیں۔

ان دونوں کو جس تنگ و تاریک گپھا میں بند کیا گیا تھا، اس کی چھت پتھریلی محسوس ہوتی تھی۔ دیواریں اور فرش میں ریت اور مٹی کی آمیزش نظر آتی تھی۔ ایسے تو یہ تھا کہ اس قبر نما قید خانے میں انسان کے لیے کھڑے ہونا بھی محال تھا، اس کوشش میں فقط جھکے جھکے ہی کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ ورنہ بیٹھے رہنا ہی پڑتا۔

ان دونوں کے سوا اور کوئی تیسرا قیدی وہاں نہ تھا۔ وہ ان حالات کے بھلا کب عادی تھے؟ اچھے خاصے قوت برداشت کا آدمی بھی اس طرح کے ماحول میں حوصلہ ہارنے لگتا ہے اور ڈاکٹر کمال کے اس وقت کچھ ایسے ہی احساسات ہو رہے تھے۔ جبکہ اِدھر لمحہ بہ لمحہ احمد حمادی کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تھا بھی ایک نوعمر لڑکا ہی، اسے شاید خود سے زیادہ اپنی حبیبہ کی فکر، ذہنی کرب و ملال میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔ ڈاکٹر کمال اس کی ذہنی اذیتوں کا اندازہ بہ خوبی کر سکتا تھا، جیسا کہ جینی کے بارے میں وہ خود بھی اسی فکر و تشویش میں مبتلا تھا، حالانکہ کمال کی جینی سے ایسی کوئی جذباتی وابستگی تو نہیں تھی، لیکن بہرحال وہ اس کی فیلو اور ایک اچھی دوست تو تھی۔ اور پھر اس کی ہم رکاب بھی تھی۔ وہ خود

اس کے لیے پریشان تھا، جبکہ احمد حمادی کا تو معاملہ زیادہ حساس نوعیت کا تھا۔ حبیبہ تو اس کی منگیتر تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے اور اب اس کی منگیتر ایک بے بس کمزور چڑیا کی طرح رمشید جیسے ایک شیطان شکرے کے قبضے میں تھی ...... وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ غیرت کی آگ انسان کو اَدھ موا کر ڈالتی ہے اور یہی حالت اس وقت احمد کی تھی۔ وہ بچوں کی طرح کبھی رونے لگتا تو کبھی آتشِ غیرت و غیظ تلے وہ بھڑکنے لگتا۔

''حبیبہ کو کچھ ہو گیا تو میں ...... میں بھی زندہ نہیں رہوں گا ...... میں بھی خود کو ختم کر ڈالوں گا ...... نہیں بچوں گا میں بھی ......''

''حوصلہ کرو نوجوان! اس وقت سب کی جانوں پر بنی ہوئی ہے ...... سب ہی ایک جیسے حالات سے دوچار ہیں ...... اللہ بڑا ہے ...... اس سے ہر وقت ہمیں مدد کا طلب گار رہنا ہے۔'' کمال نے اس کی ڈھارس بندھائی تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''برادر کمال! ہم بھلا اب کر ہی کیا سکتے ہیں؟ کسی کی بھی جان تو محفوظ نہیں رہی ...... مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اب سب کچھ ختم اور نیست و نابود ہونے والا ہے۔ سب اپنی زندگیاں ہارنے والے ہیں ......''

''یہی تو تمہاری غلط سوچ ہے برادرم حمادی!'' ڈاکٹر کمال نے اس سے کہا۔

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ مایوسی کفر ہے؟ کیا تم مجھے نہیں دیکھ رہے؟ ہم تو یہاں کے شہری بھی نہیں ہیں، لیکن اس مصیبت میں خوامخواہ پھنس گئے ...... مگر میں ان حالات سے ناامید نہیں ہوں ......'' اس کے سمجھانے پر احمد پھر رقت زدہ سا ہونے لگا ...... کمال کو واقعی اس نوجوان پر ترس آ رہا تھا۔ اس نے حوصلہ دلانے والے انداز میں اس کے شانے پر اپنا ایک ہاتھ دھرا اور بولا۔

''برادرم حمادی! انسان پر ایسی مصیبتیں آتی ہیں مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ انسان ایسے حالات کے آگے سپر ڈال دے۔ نہیں ...... ہمیں ان حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہو گا۔ اللہ کی مدد ہمارے ساتھ ہو گی۔ وہ ہمیشہ حق کی راہ پر چلنے اور ہمت نہ ہارنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس سے زیادہ حوصلہ افزائی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے ......''

ڈاکٹر کمال کی باتوں سے احمد حمادی نے ذرا حوصلہ پکڑا اور اسے کچھ ڈھارس ہوئی تو وہ سنجیدگی سے کمال کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ہم اب کیا کر سکتے ہیں؟''

''گڈ! اب تم درست سمت پر سوچنے لگے ہو ...... ہمیں یہی تو سوچنا ہے کہ آخر ہمیں ان حالات کا کس طرح مقابلہ کرنا ہے ......؟'' ڈاکٹر کمال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا ......

☆☆☆

تاریک فضا میں ایک طیارہ گردش کر رہا تھا۔ اس کا رخ یعودم کی پہاڑیوں کی طرف تھا۔ منزل قریب تھی۔ اس چھوٹے سیسنا طیارے میں پائلٹ کے علاوہ سات افراد سوار تھے۔

یہ ''غضب خدا'' کے سربراہ یاسر العربی کی بنائی ہوئی ''سات چھاتہ بردار'' فورس تھی، جس کا گروپ لیڈر محسن تھا۔ نوروزگی ری فریش ٹریننگ کے بعد اسے اسرائیلی ہگانہ آرمی کی بدنام زمانہ فورس ''سات منکال'' کے مقابلے میں اتارا گیا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا، سات منکال وہی خونی دستہ تھا جس نے تیونس آپریشن کے ذریعے پی ایل او اور غضب خدا کے سربراہوں کو شہید کیا تھا اور اب موساد کے ہیڈ کوارٹر میں ہگانہ کی راہنمائی پر اسی خونی دستے ''سات منکال'' کو فلسطین کے چیدہ چیدہ لیڈرز کو ہلاک کرنے کا ٹاسک دے دیا گیا تھا۔

سات منکال اپنے اس خطرناک مشن میں مصروف ہو چکی تھی۔ اس کی توجہ ہٹانے اور اپنے سامنے لانے پر مجبور کرنے کے لیے ...... یاسر العربی نے محسن کی سرکردگی میں ''سات چھاتہ بردار'' فورس کو ہگانہ آرمی کے ہیڈ کوارٹر جو اس کے روح رواں آئزر مین بیری جونیئر کی اقامت گاہ بھی کہلاتی تھی، وائٹ کیسل پر ہلا بولنے کے لیے روانہ کیا تھا۔

کہا جاتا تھا کہ سات منکال ایک طرح سے آئزر مین بیری کی باڈی گارڈ فورس بھی تھی۔ وہ اپنی حفاظت کے سلسلے میں ان پر زیادہ بھروسا کرتا تھا۔ بہرطور ...... اب اس سات چھاتہ بردار فورس میں محسن کے علاوہ چھ افراد شامل تھے۔ ان میں دو عورتیں بھی تھیں۔ ایک نعمانہ بنتِ مریم اور دوسری لطیفہ شیریں تھی۔ باقی چاروں مرد جانبازوں میں، نعمان، ہیا حبیب، ابن طلحہ اور قاسم تھے۔

ان مذکورہ چھ افراد میں لطیفہ شیریں اور ہیا حبیب کو ذرا الگ قسم کی فوقیت حاصل تھی۔ کیونکہ یہ دونوں تحریک آزادی فلسطین کے بڑے راہنماؤں شہید خلیل الوزیر اور شہید ابو جواد کے ساتھ رہ چکے تھے اور ان کے خاص باڈی گارڈز میں ان دونوں کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ مل کر

لمیعہ شیریں اور ہیا حبیب نے اسرائیلیوں کے بڑے بڑے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملایا تھا۔

جبکہ باقی چار جانبازوں میں، نعمانہ بنتِ مریم، ابن طلحہ، قاسم اور نعمان بھی اپنی جگہ بھرپور گوریلا تھے۔ رہا محسن تو، اس کے کارہائے نمایاں سے یہ سبھی لوگ اچھی طرح واقف تھے اور وہ تو ان کا گروپ لیڈر بھی تھا۔

یہ ساتوں، پائلٹ سیٹ کے پچھلے حصے میں ایک مختصر سے خلا میں جمے بیٹھے تھے اور دروازہ ان کے بالکل قریب تھا۔ ان کی پشت پر پیراشوٹ بندھے ہوئے تھے اور یہ پائلٹ کی آواز کے منتظر تھے کہ کب وہ انہیں طیارے سے چھلانگیں لگانے کا ''کاشن'' دیتا ہے۔

طیارے کی منزل شاید اب قریب تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پائلٹ نے انہیں ''ریڈی فار ٹروپنگ'' کا ابتدائی کاشن دے دیا۔ یہ کاشن ملتے ہی نعمان نے جو اس وقت دروازے کے زیادہ قریب تھا، اپنے ایک ہاتھ سے دروازہ کھینچ دیا۔ دروازہ کھلتے ہی تیز ہواؤں کے فراٹے دار... جھونکوں نے ان کا استقبال کیا۔

ان ساتوں کے جسموں پر مخصوص لباس نظر آتے تھے۔ پشت پر کمانڈو کٹس تھیں جس کے اندر ہر طرح کا جدید اسلحہ اور اسپائی آلات موجود تھے۔

اس وقت ان کے دل، ایک جذبہ جوش تلے بے طرح دھڑک رہے تھے۔ یہ جاننے کے باوصف کہ اپنی نوعیت کے اس خطرناک مشن میں زندگی اور موت کا کھیل ہر پل ان کے ساتھ ہوگا۔ کئی بار ایسے مواقع بھی آئیں گے جب موت کی سرگوشیاں ان کی سماعتوں میں سرسرائیں گی...... کہ بس اب تمہارا کھیل ختم۔ مدِ مقابل دشمن بھی کم تربیت یافتہ اور کمزور نہیں تھے۔ لڑاکا ساتھیوں اور جدید ہتھیاروں سے لیس ایک پوری فوج ان کے ساتھ نبرد آزما ہو سکتی تھی لیکن...... باوجود اس کے ان ساتوں چھاتہ بردار مجاہدوں کے عزم و حوصلے بلند تھے۔ خوف یا ڈر کا ایک ذرا شائبہ تک ان کے بشروں سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ ہر لحہ موت کے خدشات کی دھمک اور سراسیمگی کی ایک تھوڑی سی رمق بھی ان کے جذبہ جنوں سے معمور دلوں میں نہیں ابھری تھی۔ یہ تو وہ کفن بہ دوش دیوانے تھے، جو جذبہ حب الوطنی سے سرشار مٹھی بھر ہونے کے... باوجود اپنے سچے مذہب اسلام، ملک اور قوم کی سلامتی کی خاطر، درانا وار اپنے سے زیادہ طاقت ور دشمن سے بھڑ جانے کے لیے ہر دم تیار رہتے ہیں۔

اسی وقت پائلٹ نے انہیں طیارے سے چھلانگیں لگانے...... کا آخری کاشن دے دیا۔

سب سے پہلے محسن نے اللہ کا نام لے کر طیارے سے چھلانگ لگا دی اور پھر یہ سلسلہ اس وقت ہی تمام ہوا جب تک کہ باری باری ساتوں چھاتہ بردار طیارے سے کود نہیں گئے۔

باہر تاریک خلا میں تیز ہواؤں نے ان کا استقبال کیا تھا۔ لباس سیاہ اور چست تھے۔ یہ ساتوں اس وقت تاریکی کا ہی حصہ معلوم ہوتے تھے۔ یہ خدشہ بھی ان کو اپنی جگہ ہر لحے دامن گیر تھا کہ...... خدانخواستہ ان کے پاؤں زمین پر ٹکنے سے قبل ہی ان پر گولیاں برسا دی جاتیں...... لیکن ان کی منصوبہ بندی بنانے والے نے...... ان سارے خدشات کو پہلے ہی سے ذہن میں رکھتے ہوئے ایسا ''پری پلان'' مرتب کیا تھا کہ یہ سب بہ خیریت یعودم کے اس پہاڑی مقام پر اتر گئے، جو خطرے کے زون سے بہت دور تھا...... ان کے مشن کی فقط یہی سب سے بڑی قباحت تھی کہ انہیں اپنے ہدف سے تقریباً چالیس کلومیٹر دور اترنا پڑا تھا۔ اگرچہ اس کی بھی ایک ٹھوس وجہ ہی تھی، کیونکہ مطلوبہ جگہ اترنے میں خطرات تھے اور ہگانہ کی پوری گوریلا نفری وائٹ کیسل کے گردو پیش میلوں تک گھات لگائے بیٹھی رہتی تھی۔ ان سات چھاتہ برداروں کے اترتے ہی وہ سب ان پر ٹوٹ پڑتے، نیز دشمن کو بھنک بھی پڑ جاتی کہ یہ ساتوں ان کے علاقے میں گھس آئے تھے تو ایسے میں انہیں اپنے مشن کی تکمیل میں کافی دشواریاں پیش آسکتی تھیں۔

جنگل میں کودنے کے بعد یہ ساتوں بہت جلد ایک دوسرے سے آن ملے۔ سب سے پہلے انہوں نے.... پیراشوٹ کسی جگہ گاڑ دیے۔ ایک مقام پر اکٹھے ہو کے انہوں نے پہلے گردو پیش کی سن گن لی اور پھر محسن نے اپنی جیب سے میپ نکال لیا۔ پنسل ٹارچ کے ذریعے میپ پر ایک بار پھر غور کیا گیا۔

وائٹ کیسل نسبتاً اونچے پہاڑی مقام پر واقع تھا۔ نیچے گردو پیش میں دس فٹ اونچی خاردار آہنی باڑھ نصب تھی۔ اس میں اگرچہ کوئی برقی رو تو نہیں دوڑائی گئی تھی، لیکن انہیں چھوتے ہی ایک ''سائلنٹ سیکیورٹی الارم'' آن ہو جاتا تھا، چھونے والے کو پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ...... پلک جھپکتے ہی اس کی تصویر اور جائے مقام وائٹ کیسل کے ''سچویشن روم'' میں موجود ایک بڑی اسکرین میں پہنچ جاتی تھی اور پھر اس کی ایک ایک حرکات و سکنات کا جائزہ لیا جاتا، جب تک وہ دھر نہیں لیا جاتا تھا۔ اس کی زندگی اور

موت کا فیصلہ بھی سچویشن روم کی ٹیبل پر کر دیا جاتا کہ آیا اسے گرفت میں لیا جائے یا پھر وہیں خفیہ طور پر نصب ہتھیاروں ...... کے ذریعے ہلاک کر ڈالا جائے۔

خاردار باڑھ کے دوسری طرف بھی ایک کڑا امتحان ہوتا۔ وہاں جابجا ''بوبی ٹریپس'' بھی نصب تھے۔ ان میں سے کئی تو ایسے مہلک تھے کہ ان سے فوراً موت بھی واقع ہو جاتی تھی۔

گویا خاردار باڑھ کے دوسری طرف بھی موت کا ایک اندھا جال پھیلا ہوا تھا۔ اس کی فضائی حدود بھی اتنی ہی خطرناک تھی کوئی جہاز یا ہیلی کاپٹر اس کی حدود میں نظر آتا تو میزائل داغ کر اسے پل بھر میں تباہ کر دیا جاتا۔

ان سارے عوامل کا پتا چلانے کے بعد ہی یہ سات چھاتہ بردار اپنے اس ناممکن حد تک خطرناک مشن پر نکلے تھے۔ اس سلسلے میں یہ پہلے ہی منصوبہ بندی تیار کر چکے تھے۔

رول میپ کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد محسن نے ایک گہری سانس خارج کی اور دھیمی آواز میں بولا۔

''ساتھیو! سب سے پہلے ہم اپنے منصوبے کے مطابق ہگانہ کے ٹریننگ بیس کیمپ میں ہلا بولنے کی کوشش کریں گے۔ وہاں ہونے والے حملے کا مقصد دشمن کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کرنا ہوگا۔ ان کی مدد کے لیے دشمنوں کی طرف سے جو کمک بھیجی جائے گی، اس کا تعلق یقیناً وائٹ کیسل سے ہی ہوگا ...... اور ہم بھی اسی راستے کو اپنی پیش قدمی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کریں گے۔ اینی کوئسچن؟''

اس نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد استفسار یہ کہا۔

چند ثانیے خاموشی طاری رہی۔ پھر لطیفہ شیریں نے ایک سوال اٹھایا۔

''دشمنوں کی پہنچنے والی متوقع کمک کو بھی پہلے ہمیں فیس کرنا ہوگا، اس کے بعد ہی ہم اپنے اصل ہدف وائٹ کیسل تک رسائی کا کوئی لائحہ عمل ترتیب دے سکیں گے۔ مگر کیا ضروری ہے کہ ہگانہ کے ٹریننگ بیس کیمپ پر ہلا بولا جائے؟ ہم وہاں تک صرف رسائی حاصل کر لیتے ہیں، حملے کا وہاں پہنچ کر ہی سوچا جائے تو بہتر ہوگا۔ ہوسکتا ہے ہمیں کوئی دوسرا متبادل راستہ مل جائے جو نسبتاً بہتر اور کم سے کم رسکی بھی ہو۔''

محسن کو ...... پچیس چھبیس سالہ خوبرو اور سرو قد لطیفہ شیریں کی تجویز قابل عمل محسوس ہوئی تھی۔

اگرچہ لطیفہ شیریں کی تجویز محسن کے لائن آف ایکشن سے ملتی جلتی تھی، تاہم اس نے اس میں جو اضافی ترمیم کی تھی وہ قابل قبول تھی۔

''ہم اس وقت اپنے اصل ہدف سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ ہمیں پیدل ہی یہ راستہ پاٹنا پڑے گا مگر ٹائمنگ کا ہمیں خیال کرنا پڑے گا۔'' محسن تھوڑی خاموشی کے بعد بولا۔ ''مطلب یہ کہ ایک گھنٹا لگاتار چلتے رہنا ہوگا اور صرف پندرہ منٹ ستانا ہوگا ...... ایگریڈ؟''

سب نے اپنے سروں کو اثباتی جنبش دی تھی اس کے بعد یہ ساتوں کمانڈوز تاریکی میں آگے بڑھ گئے۔

جنگل گھنا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ سفر بہت طویل تھا۔ یہاں کسی سواری کی توقع کرنا ایک لطیفہ سنانے کے ہی مترادف تھا۔ مشن کو مکمل رازداری اور کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچانے اور یہ حفاظت دشمنوں کے علاقے میں اترنے کے لیے مجبوراً انہیں یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا تھا۔

سخت جان اور آہنی عزم کے مالک یہ ساتوں چھاتہ بردار پیدل مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ جنگل بہت گھرا اور گھنا تھا ...... کہیں کہیں اونچی نیچی ڈھلوانیں تھیں تو کہیں یہ جنگل بالکل عمودی سمت کی طرف ہونے لگتا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جنگل پہاڑی تھا اور اب اس کی پہاڑی حدود شروع ہونے لگی تھی۔

بہر طور ...... یہ ساتوں کمانڈوز چھاتہ بردار محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے اور ہر ایک گھنٹے بعد یہ تھوڑی دیر ستانے کے بعد دوبارہ چل پڑتے ......

ان کی کمانڈو کٹ میں تھوڑا بہت کھانے پینے کا سامان بھی موجود تھا، جسے یہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر استعمال کر لیا کرتے تھے۔

نقشے کے مطابق انہوں نے اپنے طور پر جو شارٹ کٹ راستہ اپنایا تھا، وہ بھی دشوار گزار تھا۔ یہاں ان کے راستے پر چڑھائی آتی تھیں اور کہیں ڈھلوانیں، جن کے دائیں بائیں اندھی کھائیاں بھی ہوتی تھیں۔ جہاں ایک ذرا پاؤں رپٹنے کی دیر ہوتی اور قعر فنا انہیں ہڑپ کر لیتا۔ یہ لوگ اندھیرے میں ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ شکر تھا کہ آسمان صاف اور روشن تھا۔ چاند اپنی تاروں کی فوج ظفر موج کے ساتھ دمک رہا تھا۔

اچانک ایک مقام پر یہ لوگ ٹھٹک کر رک گئے۔ انہیں کوئی شے ڈھلوان میں الٹی ہوئی نظر آئی۔ معلوم ہوا یہ کوئی الٹا ہوا ایک پک اپ ٹرک تھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے جنگلے میں کچھ سبزیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک ٹائر بھی فلیٹ تھا، اس کے الٹنے کی وجہ بھی شاید یہی تھی کہ اس کا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا اور اس میں سوار افراد شاید کسی وجہ سے اسے سیدھا کرنے

کے بجائے سبزیوں کی بوریاں سمیٹ کر آگے بڑھ گئے تھے۔

انہوں نے مل کر ٹرک کو سیدھا کر دیا۔ جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ ٹرک ان کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ فیول کم تھا، جبکہ فاضل ٹائر موجود تھا۔

ان سب نے مل کر ٹرک کا تھوڑا بہت مرمتی کام، جس میں ٹائر بدلنا بھی شامل تھا، جلدی جلدی نمٹایا اور پھر اس کے بعد اسے اسٹارٹ کرنے کی باری آئی۔ پیہم کوشش کے باوجود سیلف اسٹارٹ تو نہیں ہو سکا، البتہ جب اسے تھوڑا دھکا لگا کر اسٹارٹ کیا تو وہ چل پڑا۔ سب اس میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ کے فرائض قاسم نے سنبھالے وہ روانہ ہو گئے۔ ان کا سفر اب نسبتاً بہتر اور قدرے آرام دہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ ٹرک میں فیول کم تھا، مگر ایک محتاط اندازے کے مطابق وہ اپنی مطلوبہ منزل تک نہیں تو اس کے قریب قریب ضرور پہنچ جائیں گے...... اس کی انہیں بہر حال تسلی تھی......

ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹی ہوئی تھی۔ دوسری مدھم تھی، یہ کافی تھی۔ یوں بھی وہ تیز لائٹ روشن کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ بس روشنی اتنی کافی تھی کہ سامنے چند گز تک کے راستے پر پڑتی رہے...... کیونکہ تیز روشنی سے دشمن ان کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ گاڑی کی رفتار آہستہ تھی، یہ ان کی مجبوری تھی۔ کیونکہ راستہ ناہموار تھا۔

غرضیکہ انہیں اپنی منزل تک پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ ایک مطلوبہ مقام تک پہنچ کر انہوں نے ٹرک روک دیا۔ سب اترے اور پیدل آگے چل پڑے۔ منزل آس پاس تھی۔ اب انہوں نے پہلے سے زیادہ احتیاط برتنا شروع کر دی تھی۔ وہ ڈینجر زون میں داخل ہو چکے تھے۔

رات اپنے اختتامی پہر میں تھی...... یہاں بھی جنگل گھنا ہی تھا مگر اب انہیں احساس ہوا تھا کہ یہ لوگ اب نسبتاً بلندی پر تھے۔ جنگل میں سناٹا طاری تھا، دور کہیں کسی جانور کے بولنے کی عجیب سی آواز ایک ثانیے کو ابھرتی اور پھر وہی ہیبت ناک سی خاموشی ہر سو طاری ہو جاتی۔

ایک جگہ ٹھہر کر انہوں نے رول میپ کا جائزہ لیا۔ جوش سے ان کے دل دھڑک اٹھے تھے۔ وہ اب تک بڑی کامیابی کے ساتھ ہگانہ کے بیس ٹریننگ کیمپ کے قریب یا آس پاس تھے۔ ایک راستے کا تعین کر کے یہ ساتوں پھر آگے بڑھے۔ ان کی توقع کے مطابق سامنے والی ایک عمودی ڈھلوان پر پہنچ کر انہیں...... اپنی منزل کی دید ہو جانا چاہیے تھی اور وہی ہوا۔

اس عمودی ڈھلوان پر پہنچتے ہی یہ سب لوگ فوراً سینے کے بل جھاڑی دار زمین پر لیٹ گئے...... اور اپنی اپنی دوربین نکال کر آنکھوں سے لگا لیں...... یہ انفرا ریڈ دوربین تھیں۔

ان کے سامنے قدرے ڈھلوان میں...... ایک ملگجے سے رنگ کی مستطیل نما بڑی سی عمارت تھی اور اس کے آگے کافی کھلا میدان تھا۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ کچھ چھوٹی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں...... رقبہ خاصا وسیع تھا...... اصل عمارت کے پہلو بہ پہلو بیرک نما سنگی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں، بادی النظر میں یہ پورا علاقہ ایک بڑے جیل خانے کی ہی غمازی کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ بظاہر وہاں سناٹے اور خاموشی کی سی فضا تھی، تاہم کچھ لوگ سست روی سے اِدھر اُدھر مٹرگشت کرتے ہوئے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ سب مسلح تھے اور ان کے جسموں پر مخصوص قسم کی چست وردیاں تھیں...... یہ ہگانہ آرمی کے آدمی تھے۔

انفرا ریڈ دوربین کو زوم کر کے دیکھا گیا تو ان کا خیال درست ثابت ہوا...... ان کے سینوں پر ہگانہ آرمی کا مخصوص نشان چسپاں تھا۔

"موقع اچھا ہے...... اتنا کچھ خاص پہرا نظر نہیں آ رہا......"

محسن نے دوربین آنکھوں سے لگائے...... ہلکی سرگوشی میں کہا۔ "شاید ان لوگوں کو خود پر کچھ زیادہ ہی گھمنڈ ہے کہ یہاں چڑیا کا بچہ بھی پر نہیں مار سکتا...... اور ہم ان کی شہ رگ تک جا پہنچے ہیں، جبکہ یہ خواب خرگوش کے مزے لوٹنے میں مصروف ہیں......"

محسن کی بات نے اس کے ساتھیوں کے حوصلے بلند کر دیے۔ بالآخر اس نے انہیں پیش قدمی کا حکم دے دیا......

☆☆☆

فوہاگ بیل کو بہت جلد آئرین بیری جونیئر کی طرف سے وہ ٹاسک مل گیا تھا جس کا وہ بے حد تجسس اور بے چینی سے منتظر تھا لیکن جب اسے خفیہ کوڈ میں یہ ٹاسک ملا تو اسے...... از حد مایوسی ہوئی۔

وہ اس وقت اپنی "ساموودا" میں واقع لگژری...... رہائش گاہ "پرل ہوم" میں موجود تھا۔ یہاں بھی اس نے ایک الگ دفتری کمرا بنا رکھا تھا۔ وہ اس وقت ادھر ہی موجود تھا۔ جب اسے مطلع کیا گیا تھا کہ وہ اپنے سپر کمپیوٹر میں نصب "ای، سی، ایم" (الیکٹرونک کاؤنٹر میٹرز سسٹم) کو چیک کرے۔ وال کلاک رات کا ایک بجا رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر کا ماحول خاصا خنک تھا۔ پردہ سرکا ہوا تھا اور شفاف شیشے سے باہر کا منظر عیاں تھا۔

ملنے والے ٹاسک کو ڈی کوڈ کر کے جب اسے اس کا پتا

چلا تو اسے حیرت ہوئی کہ وہ اس جیسے معمولی نوعیت کے کام کو آخر کیا نام دے؟ اس پر مستزاد کہ وہ اس مشن کے سلسلے میں مادام میڈوسا سے بھی فوری رابطہ کر کے اسے پہلی فلائٹ سے لندن سے امریکا (واشنگٹن) پہنچنے کی ہدایت بھی کرے۔

''اس میں شک نہیں کہ بڑے آدمیوں کے دماغ کچھ کھسک بھی جاتے ہیں...... لگتا ہے باس کا دماغ بھی......''

وہ آئزر مین بیری کے بارے میں خود کلامیہ بڑبڑاتے ہوئے، جانے کیوں خوف کی ایک پھریری سی لے کر یکدم چپ ہو گیا۔

''ہونہہ...... معمولی مشن سے مجھے کیا...... اس بہانے چلو مادام میڈوسا جیسی حسینہ سے لطف اندوز ہونے کا موقع تو ملے گا......'' شراب اس کے دماغ کو چڑھنے لگی تھی۔

بہر طور...... اس نے مادام میڈوسا سے ٹیلی فونک رابطہ کیا پھر دوسری طرف سے اس کی مترنم آواز سنتے ہی لہک کر بولا۔ ''آہ مادام! کتنے عرصے بعد تمہاری نرم میٹھی آواز سنی ہے...... اجڑے اور بے قرار دل کو جیسے سکھ مل گیا...... کیسی ہو مائی سوئٹ ہارٹ!؟''

دوسری جانب سے مادام میڈوسا کی کھنکتی ہوئی آواز ابھری، جس نے فوہاگ بیل کے دل کو مزید تڑپا کر رکھ دیا پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ ''لگتا ہے شغل میں معروف ہو...... بھی میری یاد آئی ہے...... خیر، میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟''

''آہ......'' وہ ریشہ خطمی سا ہونے لگا۔ اسے جانے کیوں اس وقت شراب کے علاوہ بھی ایک دوسرا سرور چڑھنے لگا تھا۔ بولا۔

''صحیح کہتی ہو ڈارلنگ میڈوسا! لیکن تم مجھے ہر وقت یاد رہتی ہو...... تمہاری خلوت کی جلوہ گریاں اور سرکش حسین ادائیں بھلا فراموش کر سکتا ہوں؟''

''کیا مشکل ہے؟ چلے آؤ پھر، ہنی! تمہاری یہ دیوانی بھی تمہارے جوشِ جنوں کی بے چینی سے منتظر ہے...... آجاؤ نا...... ہنی!'' مادام کو بھی جذبات کا نشہ چڑھنے لگا۔

دونوں کے بیچ گفتگو...... بے راہ روی کی جانب بڑھنے لگی تو، انہوں نے خوب اپنے بپھرے ہوئے جذبات کی تسکین کی۔ اس کے بعد ہی جب فوہاگ نے اسے نئے ملنے والے مشن کے بارے میں بتایا تو مادام میڈوسا کا سارا جذباتی نشہ ہرن ہو گیا۔

وہ یکدم بوکھلا کر فوہاگ بیل سے بولی۔

''کک...... کیا......؟ چیف باس نے ہمیں نیا مشن سونپا ہے اور تم...... اسے اتنا ریلیکس لے رہے ہو......؟''

''او کم آن سوئٹ ہارٹ! اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ اتنا کچھ خاص بڑا مشن بھی نہیں ہے یہ......'' فوہاگ بیل نے کہا۔

''تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے، بیل!'' دوسری جانب سے مادام میڈوسا کی قدرے جھلائی ہوئی آواز ابھری۔ ''میں فون بند کر رہی ہوں...... باقی باتیں ملاقات پر ہی ہوں گی او کے...... بائے......''

فوہاگ نے منہ بنا لیا اور سامنے رکھے ادھ بھرے پیگ کی طرف ہاتھ بڑھا لیا۔

اگلے دن مادام میڈوسا دوپہر کا لنچ اس کی پر تعیش رہائش گاہ ''پرل ہوم'' میں کر رہی تھی۔

وہ دو گھنٹے پہلے ہی پہنچی تھی، آتے ہی اس نے شاور لیا تھا۔ فوہاگ تو اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا تھا۔ موقع غنیمت جان کر وہ بھی اندر گھس گیا۔ سامنے باتھ پارٹیشن میں ہلکا دھندلا شیشہ تھا اور اس کے پار میڈوسا شاور لے رہی تھی۔ دھندلے سے شیشے کے دوسری جانب میڈوسا کے بھیگے ہوشربا جسم کے قیامت خیز خم اسے پاگل کیے دے رہے تھے۔ فوہاگ کے دل و دماغ میں طوفانی جنون سوار ہو گیا اور پھر جذبات کا طوفان تھمنے کے تھوڑی دیر بعد وہ دونوں کھانے کی ٹیبل پر تھے۔

لنچ میں بیش قیمت اور اعلیٰ درجے کی شراب ''ریڈ وائن'' بھی تھی۔

لنچ کے بعد دونوں کے درمیان بات چیت کی ابتدا ہوئی۔

میڈوسا کو فوہاگ سے شکایت تھی کہ وہ اس مشن کو بہت ''ریلیکس'' لے رہا تھا، جبکہ میڈوسا کا خیال تھا کہ آئزر مین کی طرف سے سونپا جانے والا کوئی بھی مشن...... کبھی بھی غیر اہم نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس میں تھوڑی سی بھی سستی اور تساہل کو آئزر مین برداشت کر سکتا ہے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ڈاکٹر کمال جیسا ایک غیر اہم آدمی، جسے ہمارے بارے میں کچھ علم بھی نہیں، آخر اس کے پیچھے عراق جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی ہے چیف باس کو؟'' فوہاگ بیل بیزاری سے بولا تو مادام میڈوسا نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

''کیا تم چیف باس کو چیلنج کر رہے ہو؟ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے بیل؟ مجھے تو ڈر ہے کہیں تم بھی کسی دن چیف باس کے زیرِ عتاب نہ آ جاؤ۔ لگتا ہے یہاں کی عیش کوشی نے تمہیں آرام پسند بنا دیا ہے۔'' اس کی بات سن کر فوہاگ ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

''میری بھلا کیا جرأت ہے کہ میں باس کی حکم عدولی کروں...... میں تو ویسے ہی ایک بات کر رہا تھا کہ......''

''بس! جو حکم ملے، اسے بجالاؤ......ورنہ یاد رکھنا کہ یہ عیاشیاں تو چھین ہی لی جائیں گی، ساتھ میں تمہاری زندگی کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوگی......'' میڈوسا نے اسے تصویر کا دوسرا رخ دکھاتے ہوئے اس کی بات کاٹی تو وہ بے اختیار ایک جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ تاہم پھر اَز راہِ تفنن اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''تم تو آج بالکل بگ باس کی زبان میں بات کر رہی ہو، مجھے تو تم سے بھی خوف آنے لگا ہے......'' میڈوسا کا چہرہ واقعی بڑی گہری سنجیدگی لیے ہوئے تھا وہ اسی لہجے میں آگے بولی۔

''مشن کی طرف آؤ، بگ باس نے ہم دونوں کو فوراً سے پیشتر عراق پہنچنے کا آرڈر دیا ہے اور ہمیں آج ہی روانہ ہونا ہے۔ اس کے لیے تم مجھے بتاؤ گے کہ کب تک تم وزارتِ داخلہ سے خصوصی پاس لے رہے ہو......؟''

میڈوسا کی بات پر فوہاگ نے چند ثانیوں کی پرسوچ خاموشی کے بعد جواباً کہا۔ ''آج ہی اس کا بندوبست ہو جائے گا مگر روانگی کی ٹرم اینڈ کنڈیشن کیا ہوگی؟''

''طیارہ چارٹرڈ کرانا پڑے گا......ڈاکٹر کمال اور حماد اندال کو اسی کے ذریعے وائٹ کیسل پہنچانا ہے۔'' میڈوسا نے جواب دیا تو فوہاگ بیل ذہن میں ابھرنے والے ایک فوری خیال کے تحت بولا۔

''عراق کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم ایسے نہیں جا سکتے، اس کے لیے امریکی ائرمنسٹری آف ڈیفنس سے ایک خصوصی اجازت نامہ درکار ہوگا اور ان کے کسی کانوائے کے ہمراہ ہمیں جانے کی اجازت ہوگی اور بہتر محفوظ طریقہ بھی یہی ہوگا۔''

فوہاگ بیل کی بات پر میڈوسا کی پیشانی پر الجھن آمیز سلوٹیں نمودار ہوگئیں، وہ اپنے ہاتھ میں بلوریں پیگ سنبھالے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور...... باہر کھلنے والی کھڑکی کی طرف جا کھڑی ہوئی۔

باہر دو رویہ واقع خوبصورت پائن کا مجز اور دیدہ زیب مکانات پھیلے ہوئے تھے، جو گھنے پودوں اور چھتنار سے تراشیدہ پیڑوں تلے گھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کے بیچ سیاہ تارکول کی سڑک پر ہلکا پھلکا ٹریفک اور چند پیدل چلنے والوں کی چہل پہل دکھائی دیتی تھی۔

ایک نگاہ باہر کے اس منظر پہ ڈالنے کے بعد وہ صوفے پر براجمان فوہاگ بیل کی طرف گھومی تو اسے

رشتہ

مغل بادشاہ اکبر کے نو وزیر بہت مشہور ہیں، ان کو رتن کہا جاتا تھا۔ ان وزیروں میں سے ایک مرزا عبدالرحیم خان خاناں تھے۔ مرزا عبدالرحیم بہت سخی تھے۔ ان کی سخاوت کے واقعات دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں۔ ایک دن ملازم نے آکر اطلاع دی کہ باہر ملنے کے لیے ایک آدمی آیا ہوا ہے اور وہ کہتا ہے کہ وہ ان کا ہم زلف ہے۔ یہ سن کر مرزا عبدالرحیم نے اپنی بیگم کو حیرانی سے دیکھا کہ پہلے تو کبھی بہنوئی کا ذکر نہیں کیا، یہ کون آ گیا ہے۔ بیگم نے بھی حیرانی اور لاعلمی کا اظہار کیا کہ ان کا کوئی بہنوئی نہیں ہے۔ وہ اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے باہر نکلے۔ مہمان خانے پہنچ کر آنے والے سے نہایت تپاک سے ملے، ساتھ ساتھ انہیں غور سے دیکھا۔ آنے والا ان کے لیے اجنبی تھا۔ گفتگو شروع ہوئی۔ مرزا عبدالرحیم نے گفتگو اس انداز سے شروع کی کہ آنے والے کا حسب نسب معلوم ہو سکے۔ آنے والا بھی ہوشیار انسان تھا۔ اس کو محسوس ہو گیا کہ میزبان یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ اس کا ہم زلف کیسے ہے۔ اس نے کہا کہ آپ یہ جاننے کے لیے بے چین ہیں کہ میں آپ کا ہم زلف کیسے ہوں امیری اور غریبی دو بہنیں تھیں۔ امیری آپ کی منکوحہ بنی اور غریبی میرے پلے باندھ دی گئی۔ یوں میں آپ کا ہم زلف بنا ہوں، مالی امداد حاصل کرنے آیا ہوں۔ اس کی بات سن کر عبدالرحیم خان خاناں مسکرا دیے اور پھر اس کو اس قدر رقم دی کہ اس کو زندگی بھر کسی کے سامنے دست سوال کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔

مرسلہ۔ جاوید شبیر بربرہ، علی پور مظفر گڑھ

مسئلے کا حل

امام ابوحنیفہ کے بارے میں آیا ہے کہ جب کسی مسئلے کا حل انہیں نہیں ملتا تھا تو وہ تین قرآن ختم کر ڈالتے اور مسئلے کا حل انہیں سوجھ جاتا۔

مرسلہ۔ زبیر حسین شیخ

مستفسرانہ نظروں سے بہ دستور اپنی جانب ہی گھورتے پایا، پھر ایک گہری سانس خارج کر کے بولی۔

''اس پروسیس میں تو خاصی دیر لگ جائے گی...... جبکہ ہمیں اب تک عراق کی جانب کوچ کر جانا چاہیے تھا......''

''بگ باس کو تو وہاں کی صورت حال کا علم ہوگا ہی، ایسے میں......'' وہ کچھ سوچ کر تھما پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب بگ باس کو ہی اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے ہمارے وہاں پہنچنے کا بندوبست کرنا چاہیے۔''

''اگر یہ بات تھی تو پھر تم نے اتنے تساہل سے کیوں کام لیا؟ پہلے ہی بگ باس سے یہ بات گوش گزار کر دینی چاہیے تھی تمہیں...... لیکن اب ایسا کرو گے تو جان سے جاؤ گے، لہٰذا اب اس کا بندوبست ہمیں، بلکہ تمہیں ہی کرنا پڑے گا...... ویٹس اِٹ۔'' میڈوسا نے حتمی لہجے میں کہا...... میڈوسا کی اس بات پر فوہاگ بیل کے چہرے پہ شکنوں کا جال سا پھیل گیا۔ میڈوسا اس کے بشرے کا جائزہ لیتی ہوئی چند قدم چلتی اس کے قریب آئی اور پھر اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگئی۔

جب فوہاگ کی طرف سے الجھن آمیز تشویش طول پکڑنے لگی تو وہ دوبارہ اس سے مخاطب ہو کے بولی۔ ''بیل! اب سوچنے کا وقت گزر چکا...... جو کرنا ہے جلدی کر ڈالو، بگ باس کا فون آنے سے پہلے ہمیں عراق میں ہونا چاہیے، ورنہ ہم دونوں کی وائٹ کیسل میں طلبی ہو جائے گی......''

فوہاگ بیل نے اس کی بات کا کوئی جواب دیے بغیر فوراً ہاٹ لائن پر کسی سے رابطہ کیا، تھوڑی دیر تک کسی سے گفتگو کرتا رہا، اس کے بعد اس نے اپنے سیل فون پر کسی سے بات کی اور اختتام کے بعد وہ ایک گہری سانس خارج کر کے میڈوسا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''دو گھنٹے بعد مجھے جواب مل جائے گا، کام نہیں ہوا تو اپنے ذاتی صوابدیدی اختیارات کو بروئے کار لانے کی کوشش کروں گا اور اپنا طیارہ چارٹرڈ کر کے آج ہی روانہ ہو جاتے ہیں۔''

''یہ سب اتنا آسان ہوگا کہ ہم آج ہی عراق روانہ ہو سکیں......؟'' میڈوسا نے اپنی کھنچی ہوئی کمان کی طرح دلنشیں بھوؤں کو سکیڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یقیناً، قوی امید ہے، بس دو گھنٹوں کا انتظار اور پھر روانگی......'' فوہاگ بولا اور میڈوسا اپنے پیگ سے وسکی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی......

☆☆☆

ڈی کارلو کا خیال تھا کہ اس نے اپنے باپ کے کہنے پر ڈیکسا میتھ الکارپ کی روح رواں...... مادام میڈوسا سے ملاقات کر کے نہ صرف اپنا وقت ضائع کیا تھا بلکہ ایک فاش غلطی بھی کی تھی۔ اپنی جگہ وہ بھی ایک کائیاں آدمی تھا، اسے میڈوسا کی باتوں سے جلد اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کے ''شکار'' ڈاکٹر کمال احمد کے سلسلے میں کچھ اور مقاصد لیے ہوئے ہے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس کا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کر سکتی تھی، نہ صرف یہ بلکہ اس کا شکار بھی جھپٹنے کے لیے پر تولے ہوئے تھی۔ جبکہ ڈی کارلو کے دل و دماغ میں، ڈاکٹر کمال کے لیے جو نفرت کا الاؤ دہک رہا تھا، وہ میڈوسا کے وسیع تر مفادات سے بھی بالاتر تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ میڈوسا سے بھی ناامید ہو گیا تھا بلکہ پچھتا رہا تھا کہ وہ اس سے ملا ہی کیوں؟

اپنے وکیل بیرسٹر ہاکن کے فون پر اس انکشاف کے بعد کہ ڈاکٹر کمال کا بڑا بھائی بھی کافی عرصے سے یہاں لندن میں ''ٹنل'' کے مقام پر اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھا تو وہ چونکے بنا نہیں رہ سکا۔ اس پر مستزاد، جب ہاکن نے اسے اس انکشاف کے دوران بتایا کہ ڈاکٹر کمال کے ''غیاب'' سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جینی کے باپ پولیس چیف جان نسویٹر نے کمال اور حماد کے خلاف اپنی بیٹی کو اغوا کر کے کسی نامعلوم مقام پر لے جانے کی از خود رپورٹ کر ڈالی ہے نیز اس پاداش میں اس کے بھائی ظہیر احمد کو پولیس گرفتار بھی کر کے لے گئی ہے تو...... ڈی کارلو کے شرپسند اور مکار ذہن نے کمال سے بدلہ لینے کی ٹھانتے ہوئے، اس کے بھائی اور اس کی فیملی کو تختہ مشق بنانے کا ایک مکروہ منصوبہ بنایا۔

ظہیر احمد کے گھر کا پتا اسے ہاکن نے ہی بتا دیا تھا۔ ڈی کارلو سب سے پہلے اپنے لگژری اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ وہاں سے اس نے اپنے ایک دوست کو فون کیا۔ اس کے دوست کا نام رڈنی تھا۔ وہ ایک پوکر ماسٹر تھا اور لندن کے چند بڑے کیسینو کے مالکان کی کمزوری سمجھا جاتا تھا...... تاش ہو چاہے رولیٹ...... وہ ہر گیم کا ماہر تھا مگر اس کی شہرت ایک چیٹر کی تھی۔ وہ ہاری ہوئی گیم کو اس صفائی کے ساتھ ''چیٹ'' کر جاتا تھا کہ مدِ مقابل منہ تکتا رہ جاتا تھا۔

اس طرح وہ کیسینو کے مالکان کو چیٹ کر کے لاکھوں ڈالر کما کر دیتا تھا جس میں سے اس کا اپنا حصہ بھی معقول ہوتا تھا۔

ڈی کارلو نے اسے بتایا کہ وہ اس سے فوراً ملنا چاہتا ہے، تو وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''خیریت تو ہے، آج بڑے دن بعد یاد کیا؟ کیا کسی گھٹیا پب یا قحبہ خانے کا ٹھکانا مل گیا ہے، اور چاہتے ہو کہ میں

اسے بام عروج پر پہنچادوں...... بولو؟''

''نہیں یار......! اب میں ایسے کام کروں گا؟ مجھے تم سے کچھ اور کام ہے، یہ بتاؤ کہاں ہو اس وقت؟'' ڈی کارلو نے پوچھا۔

''میں اس وقت جہاں ہوں وہاں تم بہ آسانی آ سکتے ہو۔ یعنی برکسٹن......''

''مجھے یقین تھا کہ تم کسی ایسی ہی جگہ مل سکتے ہو۔ میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں......''

''آجاؤ پھر......''

''لیکن بڈی! راز داری اور ذرا پرسکون ماحول شرط ہے۔ میں تم سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں......''

''کم آن بڈی......! ایم ریڈی فار یو......'' دوسری طرف سے رڈنی نے کھلکھلاتے لہجے میں کہا اور پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

ڈی کارلو اسی وقت برکسٹن کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہر خرابہ لندن کے باسی جانتے تھے کہ برکسٹن کیسا عجیب و غریب علاقہ تھا۔ یہ بھی لندن کے ایک دوسرے علاقے ''ہیکنی'' کی طرح بدنام تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہیکنی میں سیاہ فاموں کی اکثریت ہے جبکہ برکسٹن میں سیاہ فاموں اور ایشیائیوں، دونوں ہی کی بھرمار ہے اور یہ ایک عام تصور ہے کہ جس جگہ سیاہ فام یعنی ویسٹ انڈین زیادہ ہوں گے وہاں وہاں ناپسندیدہ سرگرمیوں کا اوسط بھی زیادہ... ہوگا۔ برکسٹن میں بھی تقریباً یہی صورت حال ہے۔ چونکہ بے روزگاری زیادہ ہے لہٰذا جرائم کا تناسب بھی زیادہ ہے۔ طرح طرح کی سرگرمیاں زیر زمین چلتی رہتی ہیں۔ منشیات کی خرید و فروخت، اسمگلنگ، چوری چکاری، غنڈا گردی، اغوا اور ریپ کے واقعات، اکثر قتل بھی ہوتے رہتے تھے۔ خفیہ جوئے خانے ہیں، عریاں ڈانس کلب ہیں مگر عام لوگ اور پولیس ان سے ناواقف ہیں۔

رڈنی نے ڈی کارلو کو جس کیسینو کا پتا دیا تھا...... وہ اسی علاقے میں واقع تھا، یہ علاقہ ایک طرح سے شرفاء کے لیے ''نوگو ایریا'' کے مانند تھا۔

بہرطور ...... ڈی کارلو، بڑے دھڑلے کے ساتھ ''پارکر اینڈ پارکر'' نامی اس کیسینو میں پہنچا، ایک خصوصی پاس یا ٹکٹ کے بغیر اندر داخلہ ممنوع تھا، تاہم دروازے پر موجود چار گرانڈیل سیاہ فام، جو اندر سے مسلح بھی تھے، ان سے اگر کوئی اندر بیٹھی کسی معروف شخصیت کا نام لے دیتا تو اندر سے کنفرمیشن کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ڈی کارلو نے بھی طریقہ اپنایا تھا اور اسے نہ صرف اندر جانے کی اجازت مل گئی تھی، بلکہ ایک آدمی بھی اس کی راہنمائی کے لیے ساتھ کر دیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں رڈنی کی ہی ہدایت کارفرما تھی۔ وہ آدمی اسے اندر لے آیا۔

دونوں ایک طویل نیم تاریک راہداری سے گزرے۔ اختتام پر دائیں جانب ایک دروازہ تھا جو ایک کمرے میں کھلتا تھا۔ کمرے سے گزر کر وہ ایک پیسیج میں پہنچے، جہاں نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ وہ آدمی ڈی کارلو کو نیچے لے چلا۔ نیچے ایک وسیع ہال تھا۔ اوپر کی عمارت، کمرے اور راہداری جتنی بھدی اور بے رونق تھیں، تہ خانے کا یہ ہال اتنا ہی آراستہ اور خوب صورت تھا۔ روشنی سے جگمگاتا ہوا۔ دیواروں پر تصویریں آویزاں تھیں جو زیادہ تر پاپ سنگرز کی تھیں۔ سامنے ایک اسٹیج تھا، جو یقیناً مختلف قسم کے ناچ اور گانے کے پروگراموں کے لیے استعمال ہوتا ہوگا۔ ہال میں جگہ جگہ میزیں لگی ہوئی تھیں جن پر مختلف قسم کا جوا ہو رہا تھا۔ کہیں رولیٹ اور کہیں تاش...... ہال میں موجود لوگوں میں دو طرح کے افراد تھے۔ ویسٹ انڈین اور انگلش...... ڈی کارلو کے لیے ان مناظر میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ ایک بے پروا نظر ان سب پر ڈالتا ہوا اس آدمی کے ساتھ چلتا رہا۔ ایک آراستہ اور قدرے بڑے کمرے میں چھوڑ کر وہ لوٹ گیا......

ایک درمیانے قد اور عام سا نظر آنے والا شخص، اس کا وہاں منتظر تھا۔ عمر اس کی پینتیس، چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ صورت سے وہ چالاک اور ذہین دکھتا تھا مگر اس کی آنکھوں میں عیارانہ چمک نمایاں تھی۔ ڈی کارلو کو دیکھتے ہی وہ اپنے دونوں بازو پھیلا کر بڑے پرتپاک انداز میں اس سے ملا۔ یہ اس کے ابتدائی دنوں کا دوست تھا، مگر ملاقات کم کم ہی ہوتی تھی۔ تاہم ان کی دوستی روز اول کی طرح گہری اور مستحکم دکھائی دیتی تھی۔

رسمی کلمات کے بعد رڈنی نے ہی اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''بڈی! معافی چاہتا ہوں، تمہیں ملنے کے لیے یہاں تک آنے کی زحمت دی۔ ایک مجبوری کی وجہ سے میں ایسا کرنے پر مجبور ہوا، ورنہ میں ہی آجاتا تمہارے پاس جہاں تم کہتے......'' اس کی بات پر ڈی کارلو نے پہلے اسے ایک موٹی سی گالی دی۔ پھر ہنس کر بولا۔

''اپنی بکواس بند کرو، اب تم میرے ساتھ بھی چیٹ کرنے لگے، اچھا یہ بتاؤ، مجھے کچھ آدمیوں کی ضرورت ہے

اور شاید ایک جگہ کی بھی...... ''یہ کہتے ہوئے وہ آخر میں سنجیدہ سا نظر آنے لگا۔ رڈنی پہلی بار بہ غور اس کے چہرے کی طرف گھورنے لگا۔ بولا۔

''بس! اتنا سا کام تھا......؟''

''میرے لیے یہ بھی بہت ہے۔'' ڈی کارلو بولا۔ ''وہ مگر آدمی پکے اور پیشہ ور ہونے چاہئیں، ذرا سی بھی غلطی کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ یاد رہے مجھ پر پہلے ہی ایک چارج لگ چکا ہے......''

''کام کی تفصیل اور پوری بات بتاؤ......'' رڈنی کی نظریں اس کے چہرے پہ مرکوز تھیں۔

ڈی کارلو نے اسے ساری بات اور کام کی صراحت بتا ڈالی۔ رڈنی کے چہرے پہ چند ثانیے کے لیے پرسوچ سنجیدگی کھنڈی رہی، اسی دوران میں ڈی کارلو دوبارہ اس سے بول پڑا۔

''زیادہ اونچے لیول کے لوگ نہیں چاہئیں مجھے، بس درمیانے درجے کے ہلکے پھلکے بدمعاش، رقم کی پروا نہ کرنا ......میرا مقابلہ کسی کرمنل گینگ سے نہیں ہے۔''

''سمجھ گیا۔'' رڈنی نے اس بار فوراً جواب دیا اور آگے بولا۔ ''چار آدمی کافی ہوں گے؟ اور جگہ بھی یہی بہتر ہوگی......''

''چار آدمی کافی ہیں مگر یہاں نہیں۔ جگہ کاکسی اور طرف بندوبست کرو......''

''ٹھیک ہے، ساؤتھ بیچ میں ایک چھوٹا سی سائڈ فلیٹ ہے، آبادی سے قدرے الگ تھلگ ...... یا پھر کہو تو ٹریلر ہوم کا انتظام ہوجائے۔''

''نہیں، ٹریلر ہوم نہیں چلے گا۔ وہاں گشتی پولیس کی دراندازی کا خطرہ ہے، بی سائڈ فلیٹ ٹھیک رہے گا۔''

''کب کرنا ہے کام؟''

''آج ہی۔''

''ڈن!''

اس کے بعد دونوں کے درمیان مزید کچھ معاملات طے ہوتے رہے ......اور روپوں پیسوں کی بھی بات طے پاتی رہی، پھر ڈی کارلو واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

پروین یوں تو ایک باہمت اور حوصلہ مند عورت تھی مگر ایک جھوٹے الزام میں شوہر کی گرفتاری نے اسے خاصا پریشان اور ژولیدہ کردیا تھا۔

جس وقت پولیس ظہیر کو گرفتار کرنے گھر پر آئی تو اس وقت ظہیر احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ناشتا کرنے کے بعد دکان پہ جانے کی تیاری کررہا تھا کہ اچانک پولیس نے کال بیل بجادی اور پھر......بغیر کوئی وجہ بتائے اسے گرفتار کرکے لے گئی۔

پروین نے صبر اور سمجھداری سے کام لیا۔ وہ لندن میں ہی پیدا ہوئی تھی اور ایک پڑھی لکھی عورت تھی۔ جانتی تھی چیخنا چلانا کمزوری اور بے بسی کی علامت ہوتی ہے۔ تاہم بعد میں اس نے متعلقہ پولیس افسر سے اس سلسلے میں ملاقات کی تو اسے پتا چلا کہ یہ کارروائی کسی جان نسویٹر نامی پولیس چیف کے ایما پر...عمل میں لائی گئی تھی، جس نے اس کے دیور ڈاکٹر کمال احمد پر الزام عائد کیا تھا کہ وہ اور اس کا ایک عراقی ساتھی حماد اندال اس کی بیٹی جینی کو اغوا کرکے لے گئے ہیں اور پوچھ گچھ کے لیے اس کے بڑے بھائی ظہیر احمد کو اَب جان نسویٹر کے حوالے کیا گیا تھا۔

پروین نے فوراً ایک وکیل کا بندوبست کیا اور اپنے شوہر کی بے گناہ گرفتاری کے خلاف کورٹ میں درخواست دائر کردی۔

ابھی یہ کیس چل رہا تھا کہ ایک رات جب وہ گھر پر اپنے دونوں بچوں پندرہ سالہ منیب اور تیرہ سالہ بیٹی عنبرین کے ہمراہ سونے کی تیاری کررہی تھی کہ اچانک کھٹکے کا احساس ہوا۔ وہ چونکی۔ منیب اور عنبرین دوسرے کمرے میں گہری نیند سو رہے تھے، جبکہ وہ خود پریشانی کے باعث ابھی تک جاگ رہی تھی۔

وال کلاک رات کا ایک بجا رہا تھا۔ کھٹکے کی آواز سن کر وہ اپنے کمرے سے نکلی اور لاؤنج میں آکر اس نے سوئچ آن کیا ہی تھا کہ اچانک وہ دہشت زدہ رہ گئی۔ چار لحیم شحیم بدمعاش وہاں موجود تھے، جنھوں نے چہروں پہ غباروں کے نقاب چڑھا رکھے تھے۔ پروین نے اپنے حلق سے ابلنے والی چیخ کا اس لیے گلا گھونٹ دیا کہ انہوں نے اس کے دونوں بچوں کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا اور ایک درانداز نے پروین کو انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کی تلقین کی تھی۔ دونوں بچوں کی بھی خوف سے گھگی بندھی ہوئی تھی۔ ان کے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا مگر ان معصوموں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''کک......کون......کون ہو تم؟'' پروین نے رواں انگریزی مگر اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا مگر اس کی بات کا جواب ...... دینے کے بجائے اسے بھی دو ''غبارہ پوش'' دراندازوں نے آگے بڑھ کر دبوچ لیا۔

باہر ان کی گاڑی موجود تھی، ان تینوں کو اس میں ڈال

کر گاڑی آگے بڑھ چکی تھی۔

☆☆☆

ڈیوڈ اسٹار کی تباہی اور اس کے سربراہ جنرل آئزک فرناش کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے اسرائیل میں پھیل چکی تھی اور ایک افراتفری کی سی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ فلسطینی حریت پسندوں کے ہاتھوں اتنی بڑی اور اہم زک اٹھانے پر اسرائیلی افسران منہ چھپاتے پھر رہے تھے اور افسرانِ بالا مارے طیش کے بلبلا اٹھے تھے۔ اسرائیل، جو خود کو ناقابلِ تسخیر اور یہودی جو خود کو دنیا کی عظیم قوم سمجھنے کے جنون میں مبتلا تھے اور اس کے لیے وہ ہر قسم کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے اور لاکھوں.... بے گناہ فلسطینیوں کا خون ناحق بہانے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے، مٹھی بھر فلسطینی جاں فروشوں نے ان کا وہ سارا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔

ان پر سب سے زیادہ دہشت لیلیٰ آفندی، محسن اور زبیدہ واسطی کی سوار تھی بلکہ ڈیوڈ اسٹار کی تباہی اور جنرل آئزک فرناش کی موت کے بعد بالخصوص لیلیٰ تو جیسے ان... یہودی افسروں کے اعصاب پر سوار ہوگئی تھی۔ وہ ان کے لیے ایک ''ہوا'' ثابت ہو رہی تھی۔

لیلیٰ کے اس تازہ کار اور اہم کارنامے کے بعد گلی گلی میں اسی کا نام گونجنے لگا تھا۔ فلسطینی عوام نے تو لیلیٰ کو ''دخترِ فلسطین'' کا بھی خطاب دے ڈالا تھا، جس نے اسرائیلی ڈیمون نیوکلیئر ریسرچ پلانٹ کو بھاری نقصان پہنچانے کے بعد یہودیوں کو اپنے تازہ کارمشن ''تیونائی آپریشن'' کو نہایت کامیابی سے ہمکنار کر کے دوسری زک پہنچائی تھی۔

موساد کے چیف بارق شمعون کو بھی اس کی اطلاع سب سے پہلے ملی تھی۔ اس کا لاکھ آئزک فرناش سے اختلاف سہی لیکن وہ بہرحال اسے اسرائیل اور پوری یہودی قوم کا ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا تھا جبکہ ڈیوڈ اسٹار کی تباہی نے تو اسے بھی بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

اس نے سب سے پہلے اَز خود، جب اس کی اطلاع آئزر مین بیری جونیئر کو دینی چاہی تو اس سے بات نہ ہو سکی۔ پھر اس نے سپیریئر اتھارٹی کے مینجمنٹ گروپ کے سربراہ سے رابطہ کیا تو اس سے پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی اس کی ہگانہ آرمی کے آئزر مین بیری جونیئر سے ہی بات ہو رہی تھی۔ ایک ہنگامی میٹنگ کال کی گئی تھی یروشلم میں اور اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کے چیدہ چیدہ افراد کے علاوہ حکومتی عہدے داروں کی کچھ سربرآوردہ شخصیات کو اس میں شامل ہونا تھا۔

میٹنگ بھی ہوگئی۔ ان یہودی افسران نے سوائے اپنی رسوا کن ناکامیوں اور ہزیمت پر اپنے ہی بال نوچنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کیا اور میٹنگ اسی بحث میں تمام ہوگئی۔ آئزر مین نے فلسطینی بستیوں پر دوبارہ بمباری کرنے کا مکروہ ایجنڈا پیش کرنا چاہا تھا جسے سب نے رد کر دیا تھا۔ اس کی بڑی ٹھوس وجہ یہی بتائی گئی تھی کہ...... الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے اس دور میں پہلے ہی عالمی سطح پر اسرائیل کی اس کھلی جارحیت کے خلاف بڑی رسوائی ہوئی ہے اور اسی عالمی دباؤ کے باعث نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اسرائیل کے حلیف بھی اسے ایسا کوئی دوبارہ قدم نہ اٹھانے کا ''دوستانہ مشورہ'' دے چکے ہیں۔ جبکہ اسرائیلی دیوار بنانے اور زبردستی بے دخل کیے گئے فلسطینی مسلمانوں کی املاک پر یہودیوں کو بسانے کی سازش بھی بے نقاب ہونے لگی۔ یہی سبب تھا کہ یہ سب یہودی درندے نما اسرائیلی افسران اس میٹنگ میں بے بسی کے مارے سوائے اپنے بال نوچنے کے اور کچھ نہ کر پائے تھے۔ یہی نہیں، اسرائیلی بحریہ کی یو بوٹس سیریل کی ایک اہم ترین ایٹمی آبدوز آگوسٹا 291 کی تباہی کا موضوع اس پر سوا تھا۔

یہ ان یہودی درندوں کی وہ واحد میٹنگ تھی جو پہلی بار کسی ''بہیمانہ'' نتیجے کے بغیر ختم ہوگئی تھی...... فقط یہی طے پایا تھا کہ اپنی طاقت کو سرِدست مجاہد گروپوں اور ان کی سورسز کے خلاف ہر طرح کے ایکشن کو بروئے کار لاتے ہوئے ---انہی کے مقابلے پر مرکوز رکھنی چاہیے۔

لہٰذا جب آئزر مین بیری کے اس مکروہ ایجنڈے کی دھجیاں خود ہی بکھر کر رہ گئیں اور میٹنگ کا لبِ لباب اسی نکتے پر آ کر ٹھہرا تو موساد کے بارق شمعون نے فوراً اپنے ادارے کی کارکردگی کو ابھارنے کی غرض سے وہ فہرست شرکاء کے سامنے پیش کر ڈالی جس میں اہم فلسطینی مجاہدوں کو مستقبل میں ہٹ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا چنانچہ اس ''ہٹ لسٹ'' کو وہاں موجود بھی افسروں نے سراہا تھا۔

☆☆☆

لیلیٰ کے مشن کا دوسرا اور آخری مرحلہ آن پہنچا تھا اور اس کے لیے اس نے پہلے ہی سے ایک لائحہ عمل تیار کر لیا تھا اور وہ تھا، پہلے بلڈ اَپ گروپ کے مالک مائیکل چپل کا اغوا...... اور بعد میں اسرائیلی نگران افسر شابک احرنوت کا قتل۔

بیت صفانہ کے اس خفیہ ٹھکانے میں رہتے ہوئے بانو نے بھی وقت اور حالات کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے

دھیرے دھیرے ٹریننگ لینی شروع کردی تھی۔ نرسنگ کا تو اسے اچھا خاصا تجربہ ہو ہی گیا تھا، البتہ لڑائی، گوریلا تربیت اور ہتھیار چلانا بھی اس نے کافی حد تک سیکھ لیا تھا۔

لہٰذا اِدھر جب لیلیٰ نے اپنے مشن کے مطابق مغربی کنارے روانگی کا قصد کیا تو بانو بھی تیار ہوگئی۔ لیلیٰ کو خود بھی اس کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ کیونکہ اس مشن کا تقاضا اور انحصار مکمل طور پر گوریلا مشن پر تھا اور اس میں اسے دھواں دھار ہتھیار اور مار دھاڑ سے زیادہ خاموشی اور... رازداری سے اپنے مشن کو تکمیل تک پہنچانا تھا۔ اس کے لیے لیلیٰ نے ایک کھجور فروخت کرنے والی ایک غریب بوڑھی عورت کا بھیس بھرا تھا اور بانو کو اس نے اپنی بیٹی کے روپ میں ساتھ رکھا تھا۔

یہ دونوں جاں فروش مجاہدائیں، ایک بار پھر یہودیوں کے ایک مکروہ سازشی منصوبے کو سبوتاژ کرنے کی غرض سے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نکلی تھیں۔

ان دونوں کو مغربی کنارے چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہاں یہ دونوں غریب ماں بیٹی کے روپ میں، گھر گھر اور گلی گلی کھجوریں فروخت کرنے لگیں۔ مقصد اصل ٹارگٹ تک بتدریج گھسنا تھا اور یہی ہوا۔

منصوبے کے مطابق جب دونوں اس مذکورہ... پروجیکٹ کے قریب پہنچیں تو انہیں......ذرا ہی فاصلے پر وہ کالونی دکھائی دے گئی، جہاں بلڈاَپ گروپ سمیت، اسرائیلی کانٹریکٹر افسران کی عارضی رہائش گاہیں بنائی گئی تھیں اور اس سے ملحقہ وہ چھولداریاں بھی تھیں جہاں ورکرز اور مزدور رہتے تھے۔

افسروں کی کالونی کو ''آفیسرز کالونی'' کے نام سے موسوم کیا گیا تھا اور وہاں سخت پہرا اور سیکیورٹی دیکھنے میں آتی تھی۔ لیلیٰ نے گھاگ نگاہوں سے اس کے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد وہ اور بانو اپنے سروں پہ کھجوروں کے ٹوکرے اٹھائے ہوئے مذکورہ کالونی کی بیرونی سمت کے قریب سے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی آگے بڑھنے لگیں ......لیلیٰ کا مقصد کالونی کی عقبی سمت سے پیش قدمی کا تھا، مگر ساتھ ہی ساتھ وہ عقابی نگاہوں سے گردو پیش اور کالونی کی حدود میں واقع تعینات ان مسلح اسرائیلی فوجیوں کو بھی دیکھے جارہی تھی جو دو دو کی ٹولیوں میں بٹے ہوئے پہرے پر مامور تھے۔

لیلیٰ کی ''اشتہاری مہم'' کے بعد سے......جس میں یہودی تو آبادکاری کے اس گھناؤنے اور غاصبانہ صیہونی منصوبے کے خلاف متعلقہ اسرائیلی سرکاری افسران اور بلڈ اَپ گروپ سمیت ورکروں اور مزدوروں تک کو دھمکی دی گئی تھی کہ......وہ اپنے اس عمل سے باز آجائیں بصورت دیگر ان کی جانیں محفوظ نہیں رہیں گی۔

اس دھمکی کے باوجود وہاں تعمیراتی کام کی بڑے زور و شور .... سے ابتدا کردی گئی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہاں دبے دبے خوف کی فضا ضرور قائم تھی۔ البتہ سیکیورٹی کے انتظامات خاصے اور پہلے سے زیادہ سخت کردیے گئے تھے۔ مگر لیلیٰ کے عزم صمیم کے آگے یہ سب ریت کی دیوار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ صیہونیوں کے اس نئے غاصبانہ منصوبے اور فلسطینیوں کو اپنے ہی ملک سے بے دخل کرنے کی اس مکروہ سازش نے لیلیٰ کو حد درجے بے چین کرڈالا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہودی غاصبوں کے اس نئے منصوبے کے پیچھے کیا مقاصد تھے۔ اس طرح کی حد بندی کرکے، ایک نسلی اسرائیلی دیوار تعمیر کرکے، وہ فلسطینیوں کو دھیرے دھیرے بے دخل کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ اس کے خلاف لاکھوں فلسطینیوں نے احتجاج بھی کیا تھا اور اب بھی کر رہے تھے، بلکہ عالمی سطح پر بھی اپنا احتجاج ریکارڈ کرواچکے تھے اور کسی حد تک پیش رفت بھی دیکھنے میں آئی تھی مگر مکار اسرائیلیوں نے اس کے جواب میں اپنا موقف یہ بتایا تھا کہ وہ اس طرح کی حدود بندی کرکے دونوں جانب کی قوموں کے بیچ جاری فسادات اور نفرت کی فضا کو کم کرنا چاہتے ہیں۔

ان کے اس ''لنگڑے لولے'' موقف کو فلسطینیوں نے رد کردیا تھا۔ اور اب بھی اپنے طور پر اس تعمیر اور حدود بندی اور نئی یہودی بستیوں کے ممکنہ قیام کے خلاف احتجاجی تحریکیں چلا رہے تھے۔... اسرائیلی فوجی طاقت اور ہتھیار کے زور پر ان کی تحریکوں کو کچلنے میں کوئی عار نہیں محسوس کر رہے تھے۔ نہتے بے گناہ فلسطینی عوام اسرائیلیوں کا یہ جبر برداشت کیے ہوئے تھے مگر کمزور اور بے یارو مددگار ہونے کے باوجود وہ مسلح اسرائیلیوں کے آگے ڈٹے ہوئے تھے۔ وہ اکثر اپنے گھروں سے نکل کر ان پر پتھراؤ کرتے اور اسرائیلی فوجی ان پر آنسو گیس کے شیل فائر کرتے۔ اکثر و بیشتر بے دریغ ان پر گولیاں بھی داغ دی جاتیں۔

اس وقت بھی مغربی کنارے پر آباد فلسطینی بستیوں میں ہنگاموں کی فضا قائم تھی۔

لیلیٰ اور بانو یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھ رہی تھیں ......اسے دکھ تھا کہ ان لوگوں کی یہاں دادرسی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ان حالات کو مدنگاہ رکھتے ہوئے لیلیٰ نے یہاں مستقل طور

پر ڈیرا ڈالے رکھنے کا ارادہ کرلیا تھا مگر ساتھ ہی اسے غضبِ خدا کے سربراہ یاسر العربی کی وہ نصیحت بھی یاد تھی جو اسے انہوں نے یہ نیا اہم مشن سونپنے کے دوران دی تھی......

''عزیزی لیلیٰ ......! تم اس وقت اسرائیلیوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہو، اس لیے اپنا خیال بھی رکھنا۔ تم اس وقت فلسطینی عوام کا قیمتی سرمایہ ہو......''

بہرطور...... بھلا یہاں لیلیٰ اور بانو کی رہائش کا کیا مسئلہ تھا۔ ایک عرب فلسطینی مسلم گھرانے کا پہلے سے ہی انتخاب عمل میں لایا جاچکا تھا۔ یہ ان کے ایک ساتھی گوریلا کا ہی خاندان تھا جو بیتِ صفانہ میں رہائش پذیر تھا اور ان کے گروپ میں شامل تھا۔

اس گھر میں تین ہی مکین تھے۔ دو بوڑھے میاں بیوی اور ایک بیٹی سامہ۔ یہ اس ساتھی گوریلا راشدین کی چھوٹی بہن تھی، وہ بوٹے سے قد کی...... خاصی خوبصورت اور سیدھی سادی نظر آتی تھی۔

پہلے دن راشدین ان کے ہمراہ ہی آیا تھا۔ اگرچہ اس نے لیلیٰ سے مؤدبانہ عرض بھی کیا تھا کہ اگر اس کی ضرورت ہو تو وہ بھی ان کے اس مشن میں شامل ہوسکتا ہے۔ مگر لیلیٰ نے انکار کرتے ہوئے اسے واپس بیتِ صفانہ والے ٹھکانے کی طرف لوٹ جانے کا ہی حکم دیا تھا، تاہم اتنا ضرور کہا تھا کہ اسے جب بھی ساتھیوں کی ضرورت پڑے گی، وہ ان کی مدد ضرور لے گی۔

بہرطور انہیں وہاں رہنے کے لیے ایک کمرا دے دیا گیا تھا۔ یہ ایسا کمرا تھا کہ اس کا ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا۔ یعنی کسی نے اگر بہ وقتِ ضرورت گھر سے باہر جانا ہوتا تو وہ اندر گھر کے صحن سے گزرنے کے بجائے ادھر ہی سے بہ آسانی باہر نکل سکتا تھا۔

سامہ اچھی لڑکی تھی۔ راشدین نے اپنی اس بہن کو، اپنی لیڈر لیلیٰ اور بانو سے ہر طرح کا تعاون کرنے کی ہدایت دی تھی۔ راشدین کے بوڑھے ماں باپ بھی لیلیٰ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے...... پہلے جب ان کے بیٹے نے انہیں یہ بتایا کہ یہ لیلیٰ ہے تو انہیں اپنی آنکھوں پر اور اپنے بیٹے کی بات پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ لیلیٰ کی شہرت چار دانگ پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم لیلیٰ نے ان کو بھی سختی سے یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ ان کی یہاں موجودگی کو راز میں ہی رکھا جائے۔

دو روز وہاں قیام کے دوران لیلیٰ اور بانو نے اچھی طرح گھوم پھر کر سارا جائزہ لے لیا تھا اور اب عملی قدم اٹھانا باقی تھا۔

بلڈ اپ گروپ کا ڈائریکٹر مائیکل مچل یہاں آچکا تھا اور دھمکی کے باوجود اس نے یہود دی آفیسر شابک احرنوت کے ساتھ کام کی ابتدا کرڈالی تھی۔

مغربی کنارے کی ان آباد فلسطینی عرب بستیوں میں جو مزاحمتی و احتجاجی تحریکیں ابھرتیں، انہیں اسرائیلی ہتھیار کے زور پر کچلنے کی کوشش کرتے تھے۔ درحقیقت اس طرح وہ اپنے ''تعاون کاروں'' کے حوصلے بلند کرنے کی سعی کرتے تھے تاکہ وہ کسی قسم کے خوف کے بغیر اپنا کام جاری رکھ سکیں۔

لیلیٰ نے اسی صورتِ حال کو مدنگاہ رکھتے ہوئے سب سے پہلے مائیکل مچل کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ اسے اغوا کرکے بیتِ صفانہ لے جانا چاہتی تھی اور پھر اسے یرغمال بنانے کے بعد اسرائیلی حکام کو اس سلسلے میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے اس تازہ مکروہ فعل سے باز آجائیں...... بہ صورتِ دیگر انہیں یہ دیوار تعمیر کرنا تو ایک طرف رہا، اپنے ملکی و غیر ملکی افسروں کی لاشیں اٹھانے کا ہی کام کرنا پڑے گا۔

رات جب اپنے بھرپور جوبن پر اتری اور ہر سو گہری خاموشی چھانے لگی تو لیلیٰ اور بانو نے گھر سے نکلنے کا قصد کیا۔ گھر کے مکین سو رہے تھے۔ وہ دونوں اپنے مشن کے سلسلے میں آزاد تھیں۔ پوری تیاری کے بعد دونوں نہایت محتاط روی کے ساتھ مہمان کمرے کے بیرونی دروازے سے باہر نکلیں۔ ایک نگاہ گلی میں جھانکا۔ دور تک گمبھیر سناٹے کا راج تھا، تاریکی اس پر سوا تھی۔ کہیں اکا دکا لیمپ پوسٹ روشن تھے مگر ان کی روشنی بھی بیمار سی تھی۔ دونوں نے سیاہ رنگ کی چادریں اوڑھ رکھی تھیں...... یہ دونوں ابھی دروازے کے باہر ہی تھیں کہ اچانک بانو ٹھٹکی۔ اس نے ایک سایہ سا میزبان گھر کے دروازے سے نکلتے دیکھا۔ اس نے سرگوشی میں لیلیٰ کو اس طرف متوجہ کیا۔ پھر دونوں یکدم دیوار کے ساتھ چپک گئیں۔

''یہ کون ہوسکتا ہے......؟'' لیلیٰ نے گومگو سے انداز میں سرگوشی کی۔

''یہ ہمارے ان تینوں میزبانوں میں سے تو کوئی نہیں تھا؟'' بانو نے سوالیہ کہا۔ دونوں کی ٹھٹکی ہوئی نگاہیں ہنوز اس سائے پر جمی ہوئی تھیں جو ان کی قریب ہی موجودگی سے بے خبر گلی میں ایک طرف تیز تیز قدموں سے آگے بڑھا جارہا

تھا۔ وہ خاصا دراز قامت تھا اور نوجوان ہی نظر آتا تھا۔ پہلے بھی انہوں نے اسے اپنے میزبانوں کے گھر میں نہیں دیکھا تھا۔

"اس کے بارے میں تو اب سامہ ہی بتا سکتی ہے، ابھی ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔" لیلیٰ نے ذومعنی لہجے میں کہا تو بانو نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ وہ شاید اس کا اشارہ سمجھ رہی تھی۔ پھر وہ دونوں بھی ایک طرف کو ہولیں۔

ان کا رخ آفیسرز کالونی کی طرف تھا۔ وہاں اب بھی پہرا نظر آتا تھا مگر مین گیٹ کی طرف جانے کے بجائے وہ دونوں رہائشی کالونی کی دیوار کے متوازی، ذرا فاصلے سے آگے بڑھتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ ...... اپنے طے شدہ راستے پر چلتی ہوئی اس جگہ پہنچ گئیں جہاں سے انہیں اندر داخل ہونے میں آسانی ہوسکتی تھی۔ اگرچہ گشتی اسرائیلی پہرے دار یہاں بھی مٹرگشت کرتے دکھائی دے رہے تھے لیکن یہاں یہ دو دو کی ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ وہ پوری طرح چوکس اور مسلح بھی تھے۔

کالونی کی دیوار تقریباً بارہ تیرہ فٹ بلند تھی، سرے پر آہنی خم دار بریکٹ اور ان کے ساتھ تین رویہ خاردار باڑھ تنی تھی۔ چارکونوں کی اس کالونی کے ہر کارنر پر ایک مچان نما چوکی بنائی گئی تھی جہاں گردشی سرچ لائٹ روشن تھی۔ جس کے باعث دور قریب کا علاقہ خاصا روشن رہتا تھا، تاہم ایک مختصر وقفے کے لیے تاریکی اپنا اثر جمانے لگتی تو وہاں مکمل اندھیرے کا راج ہونے لگتا تھا۔ لیلیٰ اور بانو نے اسی قلیل مدت کے دوران وہ سب کچھ کرنا تھا، جس کی پلاننگ وہ پہلے سے کرچکی تھیں۔

ایک موقع پر جیسے ہی سرچ لائٹ کا روشن دائرہ گردش کرتا ہوا دوسری جانب کو گھوما تو بیک وقت لیلیٰ اور بانو کے دائیں ہاتھ حرکت میں آئے۔ ان کے ہاتھوں میں دبے ہوئے خنجر ہلکی شائیں کی آوازوں سے لپکے تھے اور پھر چشم زدن میں دونوں اسرائیلی تیورا کر گرے۔ لیلیٰ اور بانو نے بہ سرعت اپنی جگہ سے حرکت کی اور بانو ان کی لاشوں کو ایک طرف گھسیٹ کر دیوار کی آڑ میں کرنے کی کوشش میں جت گئی کہ فوری طور پر کسی کی نظر ان پر نہ پڑسکے جبکہ لیلیٰ اپنی بیلٹ پر بندھی کمانڈو کٹ سے نقب زنی کا سامان نکال چکی تھی۔ یہ پرانے وقتوں والا نقب زنی کا سامان نہ تھا ایک... لوہے کی ڈوری نما تار تھی، جس کے سرے پر آہنی کنڈا تھا۔ یہ تار ایک بڑے سے گول فیتے میں لپٹی ہوئی تھی اور مکمل طور پر اس کا سسٹم خودکار تھا۔ فیتے کے دونوں جانب ہینڈل تھے جنہیں دونوں ہاتھوں کی مٹھی میں پکڑ لیا جاتا تھا، اور تھوڑا پیچھے جھٹکا دینے سے وہ انسانی بوجھ کو اوپر کو اٹھاتا تھا مگر اس میں ایک قباحت یہی تھی کہ یہ زیادہ وزن والے آدمی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا اور یہ موزوں بھی صرف ہلکے پھلکے وجود رکھنے والی عورتوں کے لیے ہی تھا۔

یہ ڈبل ایکشن اینکر سسٹم تھا، یعنی اس کے ذریعے چڑھا بھی جاسکتا تھا اور اترا بھی۔

سب سے پہلے لیلیٰ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دیوار پر پاؤں سہارتی ہوئی اوپر پہنچی تھی، اس کے بعد بانو۔ اس دوران میں سارے وقت کو مہارت کے ساتھ "کیلکولیٹ" کیا گیا تھا کہ اس مدت تک یہ سب کرگزرنا تھا۔

دیوار کے سرے پر پہنچ کر پہلے بانو نیچے اتری تھی۔ اس دوران ان کی تھکی ہوئی نگاہیں اس گردشی لائٹ پر بھی مرکوز تھیں جو اپنا ایک مخصوص "چکر" پورا کر کے اسی طرف تھرکتی ہوئی لوٹ رہی تھی۔ اس لائٹ کے دائرے کی زد میں

آنے کا مطلب ہی یقینی موت تھا۔ ذرا سا سایہ بھی ان دونوں کا اس کی زد میں آجاتا تو گولیوں کی بوچھاڑ ان پر آ پڑتی۔

عین اس وقت جب لیلیٰ نیچے اترنے کی تیاری میں تھی کہ اچانک گردشی لائٹ کا وہ منحوس دائرہ اس کے بالکل قریب آ چکا تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ لیلیٰ اس کی زد میں آنے والی تھی کہ اس نے نہایت پھرتی کے ساتھ خود کو دیوار سے نیچے گرالیا۔ اب وہ صرف اپنے ہاتھوں کے پنجوں کے سہارے دیوار سے نیچے جھول رہی تھی۔ اسی وقت روشنی کا وہ مہیب دائرہ اس جگہ سے دھیرے دھیرے سرکنے لگا اور لیلیٰ کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا، جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔

اچانک روشنی کا وہ مہیب دائرہ...... عین اس جگہ پر رک گیا تھا جدھر لیلیٰ...... اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجوں کے سہارے دیوار کی دوسری طرف جھول رہی تھی......

☆☆☆

رابطہ ہوتے ہی زبیدہ نے جوش سے مرتعش آواز میں کہا۔ ''زبیدہ کالنگ ہیئر ......! تم لوگ اپنی لوکیشن بتاؤ؟ کہاں ہو اس وقت؟ اوور......'' دوسری جانب سے خالد بن جنید کی بھی جوش سے لرزتی آواز ابھری تھی۔

''یس...... زبیدہ! خالد کالنگ...... ہم اس وقت کوانڈو آئی لینڈ کے کسی گمنام ساحل پر ہیں...... بدقسمتی سے ہم اپنی موجودہ لوکیشن نہیں بتا سکتے...... اوور!'' اس کی بات سن کر زبیدہ کو حیرت آمیز مسرت ہوئی تھی کہ اس کے ساتھی بھی یہاں پہنچ چکے تھے...... تاہم اس نے کسی خیال کے تحت خالد سے ان کی موجودہ پوزیشن کے محل وقوع کے بارے میں پوچھا تو زبیدہ کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے یہ خود بھی یہاں تک پہنچی تھی۔ بس پھر کیا تھا، اس نے انہیں آگے کی راہنمائی کر ڈالی۔ خالد نے بھی اس سے جلد ساتھ مل جانے اور مشن کو تکمیل تک پہنچانے کے عزم کا اظہار کیا اور جب آخر میں زبیدہ نے خالد کو یہ بتایا کہ ان کے ہمدرد قبرصی ''جوڑے'' (عابد شیکھری اور نائمہ) میں سے ایک ساتھی...... عابد شیکھری بھی یہاں قید تھا مگر اب وہ اس کے (زبیدہ کے) ساتھ ہے تو خالد چونکے بنا نہ رہ سکا اور تب اس نے بھی زبیدہ کو...... عابد شیکھری کی ساتھی نائمہ کے بارے میں بھی بتا دیا کہ اس کے ہمدرد ساتھی کو یہ خوش خبری سنا دو کہ اس کی ساتھی ہمارے ساتھ ہے اور محفوظ ہے......

ان باتوں کے تبادلے کے بعد ادھر زبیدہ کے ساتھ موجود عابد شیکھری اور وہاں خالد وغیرہ کے پاس، نائمہ کی

آنکھوں میں خوشی کے مارے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

زبیدہ نے عابد جیسے مضبوط اور آہنی اعصاب رکھنے والے آدمی کی آنکھوں میں فرط جذبات تلے آنسو دیکھے تو ''رمز اشک'' نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ یہ بھی کہ...... کس طرح محبت کرنے والے دل جب مایوسیوں اور نارسائیوں کے عذاب ناک اندھیروں تلے شمع امید کی اک ذرا لو بھی ٹمٹماتے دیکھ لیتے ہیں تو ان کے حالات زدگاں اور ستے... ہوئے چہروں پر کیسی بچوں جیسی خوشیاں پھوٹ پڑتی ہیں...... وہ اس وقت عابد شیکھری کے بشرے سے ایسی ہی خوشی مترشح ہوتے دیکھ رہی تھی۔

''بہت محبت کرتے ہو نائمہ سے تم......؟'' بالآخر زبیدہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی میں اس سے کہا تو عابد اس کی طرف دیکھ کر بس...... ایک ذرا مسکرا کر رہ گیا۔

ایسے ہی وقت زبیدہ کے دل نہاں میں...... کسی بھولی بھٹکی یادوں کی ایک ٹیس سی ابھری تھی...... جس نے اسے اندر سے تڑپا کر رکھ دیا اور پھر جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا بھی دیا تھا کہ...... جو راز آج تک اس کے سینے میں ایک امانت کی طرح پوشیدہ تھا، وہ ایک بند سیپ قرار پا چکا تھا...... اسے اب کسی ابر نیساں کی ضرورت نہ تھی کہ چپکے چپکے ظالم تنہائیوں میں بہنے والے آنسوؤں نے خود ہی یادوں کی ایسی بارش کی تھی کہ...... کسی کی یادوں کا وہ بند سیپ اپنے خول میں ایک سچے موتی کو آپوں آپ ہی پروان چڑھا چکا تھا۔

اپنا غم نہاں چھپانے کی زبیدہ کو خاصی مہارت ہو گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ اپنی غیر معمولی کشادہ آنکھوں میں امڈ آنے والی نمی کو وہ ایک آہ نا تمام کی آڑ میں جذب کر گئی......

''تم خاصے زخمی ہو عابد......! مگر فکر نہ کرو، میرے ساتھیوں کے پاس فرسٹ ایڈ کا سامان موجود ہے۔'' زبیدہ نے اس سے کہا تو عابد مسکرا کر بولا۔

''اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے زخموں پر کسی کی سلامتی کی خبر نے جیسے مرہم رکھ دیا ہے......'' زبیدہ اس کی بات سمجھ کر پوری فراخ دلی سے مسکرائی تھی۔

عابد نے اس بار گہرے جوش سے کہا۔ ''لگتا ہے قدرت نے ہم سب کو یہاں اس لیے اکٹھا کیا ہے کہ ہم سب مل کر یہودیوں کے اس شیطانی ٹھکانے کو انہی مردودوں کے لیے جہنم زار بنا دیں......''

''یقیناً ایسا ہی ہوگا...... انشاء اللہ۔'' زبیدہ نے کہا۔

''تو کیا اب ہمیں تمہارے ساتھیوں کا پہلے یہاں انتظار کرنا ہوگا؟'' عابد نے چند ثانیوں کی پرسوچ خاموشی

کے بعد اس سے پوچھا تو وہ ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولی۔

”انہیں ابھی یہاں تک پہنچنے میں دیر لگ سکتی ہے...... تب تک مجھے بہت کچھ کر گزرنا ہوگا۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ ہوں ...... کیا پلان ہے آئندہ کا تمہارے ذہن میں......؟“

”نہیں، تمہاری حالت......“

”میری حالت کو چھوڑو...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ عابد نے زبیدہ کی بات کاٹ کر کہا۔

”تم ابھی اور اسی وقت اپنے مشن کے سلسلے میں کیا کر سکتی ہو، وہ مجھے بتاؤ......؟“ اس کی بات پر زبیدہ نے ایک پُرغور سی نگاہ عابد کے چہرے پر ڈالی تھی، وہ اسے خاصا پرجوش سا دکھائی دے رہا تھا۔

”اصل مشن کی شروعات تو میرے ساتھیوں کی آمد کے بعد ہی ہوسکتی ہے، لیکن تب تک میں اس یہودی کتے ایڈمرل اردوت یعود کو واصلِ جہنم کر دینا چاہتی ہوں......“

”وہ خبیث یہاں کس جگہ ہوسکتا ہے؟“ عابد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ دفعتاً دونوں ایک آواز پر ٹھٹکے۔ یہ بھاری جوتوں کی آواز تھی اور لگتا ایسے ہی تھا جیسے بہت سے لوگ ہنگامی حالت میں ہوں...... زبیدہ کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ دشمن اس کی وہاں کمرے میں غیر موجودگی پر بدک گئے ہیں اور اب اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں...... حالات کسی وقت بھی پلٹا کھانے والے تھے۔ اس کا ادراک اگرچہ زبیدہ کو پہلے سے ہی تھا، مگر اس قدر جلدی یہ سب آشکار ہو جائے گا اس کی اسے توقع نہیں تھی۔ ان دونوں کے پاس مردہ پہرے داروں کے ہتھیار تھے...... عابد کی اپنی ہیت کذائی اگرچہ جنگ کرنے کی سی نہیں تھی، مگر ایک عزم اور خود اعتمادی کے سہارے اس نے دل میں دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی...... پھر نائمہ کے نہ صرف زندہ بچ جانے بلکہ...... اس کی یہاں موجودگی کی خبر نے بھی عابد کے اندر جیسے ایکا ایکی ایک نئی جان سی بھر دی تھی۔

دوڑتے قدموں کی آوازیں اب قریب آتی اور کہیں کہیں رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں بلکہ اب تو زور زور سے بولنے کی بھی متعدد آوازیں آنے لگی تھیں...... ہتھیاروں کی چھنک بھی صاف آتی محسوس ہو رہی تھی۔

زبیدہ کے چہرے پر پریشانی اور تشویش کے آثار نمودار ہو گئے۔ عابد کا چہرہ جوش تلے سرخ ہو رہا تھا جبکہ زبیدہ کی پریشانی و تشویش کی وجہ عابد ہی تھا کہ وہ زخمی تھا اور یہ کہ اس کی محبت نائمہ اس سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس نازک گھڑی میں عابد کو کچھ مزید گزند بھی پہنچے۔ اس نے عابد کو اسی جگہ رہنے کی ہدایت کی اور خود تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس دوران میں اس نے ٹرانسمیٹر پر اپنے ساتھیوں کو خطرے کا ایک مخصوص سگنل بھی دے دیا تھا۔

دروازے کے پاس آ کر اس نے باہر جھانکا تھا کہ اچانک وہ ٹھٹکی، اسے اس افراتفری کی وجہ اور ہی محسوس ہوئی تھی۔ کیونکہ اگرچہ یہ دونوں ہوتے تو ان مسلح افراد کا رخ یقیناً ان کا کمرا ہوتا۔ ایسے ہی وقت میں اچانک گڑگڑاہٹ اور سماعت شکن دھماکوں نے انہیں بھی لرزا کر رکھ دیا۔ زبیدہ سمجھی تھی کہ شاید اس کے ساتھیوں نے ہلا بول دیا ہے، مگر پھر جلد ہی اس نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ اول تو یہ کہ...... یہ گڑگڑاہٹ کی آوازیں طیاروں کی محسوس ہوتی تھیں اور ان کے کسی ساتھی کے پاس طیارہ نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ ایسی کسی کارروائی کے ابھی متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔

اسی وقت ایک لرزا دینے والا دھماکا ہوا اور زبیدہ گرتے گرتے بچی۔ خود عابد کو ایک جھٹکا لگا اور اس کا دل دہل گیا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے عابد کو سنبھالا دیا اور ساتھ ہی ہانپنے والے انداز میں کہا۔

”شاید یہ کوئی اور ہی معاملہ چھڑ گیا ہے، ہمیں پیش قدمی کرنا ہوگی......“

”اگر یہ بات ہے تو میں اسے دشمن پر وار کرنے کا ایک سنہری موقع سمجھتا ہوں...... آگے بڑھو......“ عابد نے بھی اسی جوش تلے زبیدہ سے کہا اور پھر دونوں کمرے سے باہر نکلے...... ہر طرف گرد و غبار کا ایک طوفان سا بپا تھا۔ اب تو سائرن بھی چیخنے لگے تھے...... دونوں اسی گرد و غبار کی دھندلی آڑ کا سہارا لیے ایک طرف کو بڑھے جہاں ایک مختصر سی راہداری نظر آ رہی تھی......

زبیدہ نے عابد کو مقدور بھر حد تک سہارا ہوا تھا جبکہ عابد کی حتی المقدور یہ کوشش تھی کہ وہ زبیدہ پر کسی قسم کا بوجھ نہ بنے...... بہرطور...... دونوں آگے بڑھتے رہے......۔ گولیوں اور دھماکوں کی آوازوں میں بتدریج شدت آتی جا رہی تھی۔ زبیدہ نے ایک موقع پر اپنے خفیہ ٹرانسمیٹر پر خالد بن جنید سے رابطہ کیا کہ شاید وہ ہی اس موجودہ صورت حال کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ جواباً دوسری جانب سے خالد نے اپنی اور اپنے ساتھیوں دانیال اور فاروق وغیرہ کی موجودہ

پوزیشن بتاتے ہوئے ایک اہم انکشاف کر ڈالا۔

''ہم اسپائی اسٹیشن کی عمارت سے زیادہ دور نہیں تھے کہ ......ایک طیارے اور دو گن شپ ہیلی کاپٹر نے اس جزیرے پر یک دم ہلا بول دیا۔ ساحلِ سمندر سے بھی آٹھ، دس گن بوٹس نے یہاں اپنے ٹروپس اتارے ہیں......اوور......''

''کیا خیال ہے، کہیں یہ کسی دوسرے فلسطینی مجاہد گروپ کی کارروائی تو نہیں؟ اوور......''

زبیدہ نے رائے طلب لہجے میں کہا تو جنید بولا۔

''ابھی ایسا کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا ......لیکن ہمارے لیے قدرت نے موقع فراہم کر دیا ہے......ہمیں بھی فوری طور پر ایکشن میں آجانا چاہیے......اوور......''

''ہرگز نہیں ......'' زبیدہ نے فوراً اور قطعیت سے کہا۔ ''جو جہاں ہے ابھی وہیں چھپ کر خاموشی سے تماشا دیکھا جائے۔ نامعلوم گروہ کے اس حملے کے بعد ......ہمارے لیے از خود مواقع پیدا ہو جائیں گے ......لیکن ابھی آگ اور شعلوں کے اس کھیل میں کودنے کی کوشش نہ کی جائے تو بہتر ہوگا۔ اوور......'' خالد بن جنید کو زبیدہ کی اس بات سے اختلاف تھا۔ لہٰذا حتمی لہجے میں بولا۔

''زبیدہ ......! تم اندر اس وقت کس پوزیشن میں ہو اوور......''

''میں اسپائی اسٹیشن کی عمارت کے اندر کسی نامعلوم گوشے میں ہوں اور میرے ساتھ ......عابد شیکھری بھی ہے۔ تشدد کی وجہ سے وہ خاصا زخمی ہے۔ کیا آپ کوئی اَسالٹ اینڈ ایکشن پلان ......کرنا چاہتے ہیں ......؟ اوور......'' زبیدہ نے اندازہ لگانے کی سعی چاہی۔

''یس ......عزیزی زبیدہ ......! ہم تاخیر کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ طاقت ور دشمن پر وار کرنے کا یہی ایک سنہری موقع ہے ہمارے پاس ......تم اندر جتنے متعلقہ اسرائیلی افسروں کو نشانہ بنانا چاہتی ہو......اور انہیں جس قدر نقصان پہنچانے کی کوشش کرسکتی ہو کر ڈالو......یہی موقع ہے......مگر تمہاری اولین کوشش یہی ہونی چاہیے کہ کسی طرح ان کے ایمونیشن ڈمپ تک رسائی حاصل کرو۔ تم اس وقت دشمنوں کی شہ رگ کے بالکل قریب ہو۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟ ہم بھی قریب آنے کی کوشش کرتے ہیں ......اوور اینڈ آل......''

یہ کہہ کر دوسری طرف سے جنید نے رابطہ منقطع کر دیا۔

زبیدہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر نہ کہہ پائی اور بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئی۔ عابد بھی ان کی باتیں سن رہا تھا۔ زبیدہ کے چہرے پر اسے الجھن آمیز پریشانی کے تاثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگے تو اس نے اس کی وجہ پوچھ لی۔ جواباً اس نے اپنے گروپ سربراہ کی بات دہرا دی۔ اس پر عابد نے بھی صاد کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں یہی کرنا چاہیے، دشمن پر کاری وار کرنے کا ہمارے پاس یہ بہترین موقع ہے۔ تم میری فکر نہ کرو، میں خود کو سنبھالے ہوئے ہوں۔''

زبیدہ اس سے متفق تو نہ تھی تاہم اس کے گروپ لیڈر کا حکم تھا لہٰذا وہ دوبارہ حرکت میں آئی۔

عمارت کے جس گوشے میں اس وقت یہ دونوں دبکے کھڑے تھے، وہ ایک لاکر نما کوئی کمرا تھا۔ یہاں دیواروں پر چھوٹی بڑی الماریاں نصب تھیں جن پر تالے لگے ہوئے تھے۔ اس کمرے سے متصل کچھ دیگر کمروں کے بھی دروازے ملحق نظر آرہے تھے۔

دفعتاً......آتش و آہن کا یہ سلسلہ کچھ تھمتا ہوا محسوس ہوا۔ اب بس وقفے وقفے سے ہی کوئی برسٹ چلتا یا کسی دھماکے کی آواز ابھرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ البتہ دوڑتے قدموں اور زور زور سے بولنے کی آوازیں جوں کی توں سنائی دے رہی تھیں ......اگرچہ اس میں بھی اب کسی حد تک کمی واقع ہوگئی تھی مگر سائرن مسلسل چیخ رہے تھے......

زبیدہ لاکرز روم کا گہری نگاہوں سے جائزہ لے رہی تھی اور ......پھر اس نے ایک ملحقہ کمرے کا رخ کیا۔ ابھی انہوں نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ اچانک دھڑ سے لاکرز روم کا دروازہ کھلا اور تین چار مسلح افراد اندر داخل ہوئے۔ زبیدہ اور عابد بری طرح چونکے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا تھا کہ چشم زدن میں شاید دونوں کی ہیئت کذائی اور ''باڈی لینگویج'' نے ایک دوسرے پر یہ باور کروا دیا کہ وہ دونوں بھی ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ اگرچہ غیر ارادی طور پر دونوں نے ایک دوسرے پر اسلحہ تانے رکھا تھا۔ تب بھی در آنے والے اس چار رکنی مسلح گروپ میں سے ایک نے ......خاصے درشت لہجے میں ان کی طرف بہ غور گھورتے ہوئے کہا۔ ''کون ... ہو تم ......؟ دشمن ......؟'' اس نے استفساریہ انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

''دشمن ہوتے تو تمہاری طرح اپنا سر نہیں چھپا رہے ہوتے ......'' زبیدہ نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ... ڈال کر سپاٹ مگر کڑک دار لہجے میں کہا تھا۔

''وقت نہیں ہے ہمارے پاس ......اگر ہمارا دشمن ایک ہے تو ہمیں مل کر اس مشن کو پورا کرنا چاہیے۔ آگے تم لوگوں کی مرضی۔'' عابد نے مزید کسی بحث و تمحیص میں پڑے بغیر کہا تو

مخاطب نے فوراً اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ پھر یہ نووارد گروپ بھی ان کی تقلید میں اسی کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

نہایت محتاط روی کے ساتھ وہ سب مذکورہ کمرے میں داخل ہوئے تھے، مگر جسے وہ کمرا سمجھے ہوئے تھے وہ زینے پر مشتمل ایک راستہ تھا، جو اوپر کہیں جاتا تھا۔ زبیدہ نے کچھ سوچ کر اپنے مخاطب سے پوچھا، جو ان کا گروپ لیڈر ہی نظر آیا تھا انہیں۔

''کیا تمہیں اس عمارت کے محل وقوع کا کچھ اندازہ ہے......'' اس کی بات پر مخاطب معنیٰ خیز نظروں سے زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''خاصی ہوشیار ہو، شاید تمہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ ہمارا اس گروپ سے تعلق ہے......؟''

''یہ وقت فضول باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں ہے، دو ٹوک بات کرو اور جواب دو۔'' زبیدہ نے کھنڈی... ہوئی متانت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ جس پر مخاطب کے بشرے پر ایک لمحے کے لیے تندی کی چمک ابھری پر وہ بھی شاید اس کی نصیحت کو سمجھ گیا اور جواباً بولا۔

'' ہمارا چیک ڈوکر گروپ سے تعلق ہے۔ ''بلیو شارک'' نامی اس تنظیم کا بانی یہی تھا جسے ان یہودی دھوکے باز کتوں نے ہلاک کر ڈالا تھا اور......''

''کیا......؟'' اس کی بات پر زبیدہ چونکی اور درمیان میں بول پڑی۔

''تت......تم لوگ چیک ڈوکر... کے ساتھی ہو، جس کے دو ساتھی چک اور روجر مذاکرات کے لیے یہاں بھیجے گئے تھے اور......''

اب چونکنے کی باری مخاطب کی تھی...... پھر مختصر ترین جملوں میں چند ضروری باتوں کا تبادلہ خیال ہوا جس کے مطابق اسرائیلیوں کے ہاتھوں چیک ڈوکر کی ہلاکت کے بعد اس کی بیوی ڈیبورا مرسیانو نے اپنے شوہر کی ہلاکت کا انتقام لینے کی قسم کھائی تھی مگر تنظیم کے سربراہ کی موت کے بعد ساتھیوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے، مگر ڈیبورا زخمی ناگن کے مانند انتقام کے لیے تڑپ رہی تھی اسے ادراک تھا اس حقیقت کا بھی کہ چیک ڈوکر کی موت کے بعد تنظیم میں وہ جوش اور طاقت نہیں رہی تھی جو اس کے شوہر کی زندگی میں تھی، اسی لیے اس نے اپنے شوہر کے ایک حلیف گروپ کے سربراہ رچرڈ لی سے مدد طلب کر لی تھی۔

رچرڈ لی بھی سسلی کی زیرِ زمین دنیا کا ایک بڑا ڈان مانا جاتا تھا مگر جرائم کی دنیا میں دوستیاں بھی مفادات اور زندگی سے مشروط رہتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب ڈیبورا مرسیانو نے رچرڈ لی سے مدد کی درخواست کی تو اس نے بھی خود غرضی کی عینک چڑھاتے ہوئے ڈیبورا سے ''مشروط'' مدد کی ہامی بھر لی تھی۔

اس سلسلے میں اس نے دو شرائط آنجہانی چیک ڈوکر کی حسین جوان بیوہ کے سامنے رکھ دی تھیں۔ پہلی یہ کہ...... وہ اس کے مرحوم شوہر کی تنظیم ''بلیو شارک'' کو اپنی مافیا میں ضم کرتا اور دوسری ڈیبورا سے شادی کرتا۔

ڈیبورا کے لیے دونوں ہی شرطیں ناقابلِ برداشت تھیں لیکن وہ انتقام میں اندھی ہو رہی تھی اور اس وقت ہر قیمت پر اسرائیلیوں کو اس دھوکے بازی کا مزہ چکھانا چاہتی تھی۔ لہٰذا اسے یہ کڑوا گھونٹ پینا تو پڑا تھا مگر جہاں اس نے رچرڈ لی کی دو شرطیں مانی تھیں تو ایک شرط اپنی بھی اس سے منوائی تھی۔ جو بالکل منطقی انداز کی تھی اسی لیے رچرڈ لی کو بھی اس کی شرط ماننے میں مطلق عار محسوس نہ ہوا تھا کہ ڈیبورا نے اسے مدد کی کامیابی کے بعد ہی اس کی دونوں شرائط پر عمل کرنے کا کہا تھا۔

مخاطب کا نام ہینڈلر تھا اور وہ ڈیبورا مرسیانو کا مقرب خاص کارپرداز تھا۔ اس نے بھی محض اس لیے زبیدہ کو یہ ساری حقیقت بتائی تھی کہ زبیدہ نے اس کے دونوں آنجہانی ساتھیوں چیک اور روجر کے حوالے سے بے وقوف بنایا تھا اور وہ زبیدہ کو اپنے مفاد میں سود مند سمجھنے لگا تھا۔ اس کی جمالی صراحت مختصر تھی۔ زبیدہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک فری لانسر جاسوس کے طور پر مختلف تنظیموں کے لیے ''اجرتِ خاص'' پر اور پوری راز داری کے ساتھ کام کرتی تھی، مگر ایک طویل عرصے سے وہ صرف ڈریگون کے لیے ہی کام کر رہی تھی، جس کا رابطہ صرف چیک اور روجر سے ہی رہتا تھا۔

زبیدہ نے اپنی چرب زبانی سے...... مس ہینڈلر کو ''ہینڈل'' کر لیا تھا اور وہ اس سے متاثر بھی تھا۔

اس مشن میں رچرڈ لی نے پوری افرادی قوت اور جدید اسلحے سے لیس ہو کر گوانڈو آئی لینڈ پر ہلا بولا تھا، مگر۔ بہ قول ہینڈلر کے ابھی تک اسے وہ خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی جس کی وہ لوگ توقع کیے بیٹھے تھے، البتہ رچرڈ لی نے ڈیبورا مرسیانو کے توسط سے ایک ترپ کا پتا اپنے پاس ضرور رکھا تھا کہ ناکامی کی صورت میں وہ گوانڈو آئی لینڈ کا راز نہ صرف آشکار کر ڈالتا بلکہ اس کے لیے وہ اٹلی سمیت سسلی کے عوام کو حکومت اور اسرائیلیوں کے اس خفیہ گٹھ جوڑ کے بارے میں اکسا کر مشتعل کر سکتا تھا۔ یہ دشمن کے خلاف

آخری سیاسی چال ثابت ہو سکتی تھی۔
ایک اعتماد کی فضا قائم ہوتے ہی ہینڈلر اور اس کے ساتھی زبیدہ کے ساتھ نتھی ہو کر رہ گئے تھے اور سب کچھ اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔
تب پھر ہینڈلر نے اپنی جمع شدہ معلومات کے مطابق اسے یہاں کے پورے محلِ وقوع کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ اس آگاہی کے بعد زبیدہ نے سب سے پہلے عمارت کے ایسے مقام کا رخ کرنے کی ٹھانی تھی جہاں ...... ایڈمرل اروودت یعود سے اس کا ممکنہ ٹکراؤ ہو سکتا تھا...... ہینڈلر اور اس کے ساتھی اس کے ساتھ تھے۔

☆☆☆

خالد بن جنید، خفیہ ٹرانسمیٹر پر زبیدہ کو فوری اسالٹ اینڈ ایکشن کی ہدایت دینے کے بعد خود بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ فوراً حرکت میں آ گیا تھا۔
نائمہ کو بھی حفاظت کے پیش نظر ایک پستول تھما دیا گیا تھا۔ یہ لوگ زبیدہ کی بتائی ہوئی لوکیشن کے مطابق آگے بڑھتے رہے...... آسمان میں گردش کرتے دو طیاروں میں سے ایک کو مار گرایا جا چکا تھا جبکہ دوسرا غائب تھا۔ ہیلی کاپٹر دونوں تباہ کر دیے گئے تھے۔ جزیرے پر ایک جنگ کا سا سماں طاری تھا...... مگر جلد ہی جیسے سب کچھ تھم گیا تھا۔
خالد اور اس کے ساتھی حالاتِ رن کا فائدہ اٹھا کر اسپائی اسٹیشن کی عمارت کے قریب پہنچنے لگے تھے، مگر خالد کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی کہ اسرائیلیوں نے اپنے دشمنوں کا یہ حملہ ناکام بنا ڈالا تھا مگر خالد اب بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے ..... پر تلا ہوا تھا اور پیش قدمی جاری رکھے ہوئے تھا کہ اچانک ایک مقام پر گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ مگر ان کی محتاط روی نے انہیں بچا لیا۔ وہ فوراً زمین پر گر گئے تھے اور گرتے ہی انہوں نے بھی فائرنگ کی آوازوں کی سمت کا اندازہ کرتے ہوئے، جوابی فائر کھول دیا تھا۔ متعدد حملہ آوروں کی کریہہ انگیز چیخوں نے انہیں دشمنوں کی پوزیشن مزید واضح کر دی اور پھر یہ لوگ نہیں رکے...... اٹھے اور اسی سمت فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے کہ دفعتاً فاروق کی نظر دو مسلح وردی پوش اسرائیلیوں پر پڑی جن میں سے ایک زخمی تھا مگر وہ اپنے ساتھی کی مدد کر رہا تھا جو اپنے کاندھے پر ایک بڑا سا راکٹ لانچر رکھے اسی سمت پر حملہ کرنے کے لیے پر تولے ہوئے تھا۔ فاروق نے فوراً اپنی تھنڈر بولڈ کومپیکٹ رائفل کا ایک پورا برسٹ ان پر فائر کر دیا مگر اسے تھوڑی دیر ہو چکی تھی۔ راکٹ اسی وقت ہی فائر کیا جا چکا تھا، تاہم بعد میں وہ دونوں اسرائیلی اس کے داغے ہوئے برسٹ کی زد میں آ کر ڈھیر ہو چکے تھے۔
''راکٹ فائر ہو چکا ہے...... ہوشیار۔'' وہ حلق کے بل چلّایا اور یکدم خود بھی راکٹ پھٹنے کی مہلک شعلہ گردی سے بچنے کی خاطر زمین پر گر گیا تھا۔
ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ راکٹ خاصا تباہ کن تھا۔ پھٹتے ہی اس کے آتشی بارودی ریزوں کے ''پھیلاؤ'' نے کافی دور تک اپنا دائرہ وسیع کیا تھا اور اسی وقت فاروق کو اپنے ایک ساتھی کی اذیت ناک چیخ سنائی دی تھی۔ وہ دہل گیا اور دیوانوں کی طرح اسی سمت کو اٹھ کر دوڑا۔ یہ دانیال کی چیخ تھی۔ وہ ایک طرف خون میں لت پت پڑا تھا۔ خالد اور نائمہ بھی اس کی چیخ کی آواز سن کر اس طرف دوڑے چلے آئے تھے۔
دانیال کا بایاں شانہ بری طرح چھلنی تھا۔ چہرے پر بھی خراشیں تھیں۔ خالد نے فاروق کو اسے سنبھالنے کا کہا اور خود تیزی سے آگے بڑھا...... اس کا یہ بروقت اقدام سود مند ثابت ہوا تھا کیونکہ اسی وقت جب وہ دیگر دشمنوں کی ممکنہ موجودگی کو بھانپ کر آگے بڑھا تھا، اسی طرف سے اسے تین مسلح اسرائیلی لپکتے دکھائی دیے گئے۔ خالد کی رگ رگ میں لہو کی گردش مثلِ پارہ کی طرح گردش کر رہی تھی۔ دشمنوں کی جھلک دیکھتے ہی اس نے اپنی تھنڈر بولٹ رائفل کا رخ ان کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ برسٹ کی گرج ابھری اور اس میں دشمن کی کریہہ انگیز چیخیں بھی شامل تھیں، دو تو چھلنی ہو کر گر گئے تھے جبکہ تیسرے نے کمال پھرتی کے ساتھ خود کو ایک قدرے چوڑے تنے والے درخت کی آڑ میں چھپا لیا تھا اور ساتھ ہی اس نے بھی غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی طرف ایک ہینڈ گرینیڈ اچھال دیا۔ جنید کو دشمن کی طرف سے ایسی ہر قسم کی پھرتی کا اندازہ تھا، یہی سبب تھا کہ جیسے ہی اس کا ایک شکار بچ کر گھات میں چلا گیا تھا تو جنید کو اس کی طرف سے ایسے حملے کی پوری توقع تھی۔ ادھر جیسے ہی ہینڈ گرینیڈ اس کے بالکل قریب گرا، اس نے بہ سرعت اپنی جگہ بدلتے ہوئے دوسری جانب کے جھنڈ دار پودوں میں جست بھری۔ کان پھاڑ دھماکا ہوا۔ جنید محفوظ تو رہا تھا لیکن اس کا دشمن بھی کائیاں تھا۔ اس نے اسی پر اپنی شکرے جیسی نظریں گاڑے رکھی تھیں۔ جس جگہ اس نے خالد کو جست بھرتے اور گرتے دیکھا تھا اسی سمت اس نے اپنی رائفل کا رخ کر کے لبلبی دبا دی۔ رائفل گرجی اور دوسرے ہی لمحے اسرائیلی دشمن کو خالد کی چیخ سنائی دی۔ وہ جوشِ

کامیابی میں اسی طرف بڑھا اور پھر جیسے اچانک اسے اپنی اس بھیانک غلطی کا احساس ہوا مگر اب دیر ہو چکی تھی...... موٹے چوڑے پتوں والے پودوں سے ایک نال نے جھانکا اور اگلے ہی لمحے اس کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ آخری دشمن اپنے حلق سے لرزاتی چیخ خارج کرتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

خالد اپنے آخری دشمن کی بروقت چالاکی اور مستعدی کے باعث اس کی ایک بھولی بھٹکی گولی کا نشانہ ضرور بنا تھا۔ مگر شکر تھا کہ وہ پورے برسٹ کی زد میں آتے آتے رہ گیا تھا۔ گولی اس کے دائیں بازو میں پیوست ہوئی تھی اور اس نے دانستہ اپنے دشمن کو "بلف" کرنے کے لیے اپنے حلق سے زوردار چیخ بلند کی تھی۔

وہ جھاڑیوں سے ابھرا اور ایک نظر دشمن کی لاش پر ڈال کر اپنا زخمی بازو سنبھالتے ہوئے واپس پلٹا، جہاں اس کا زخمی ساتھی دانیال پڑا تھا۔

فاروق نے اپنی کمانڈو کٹ سے فرسٹ ایڈ کا سامان نکال کر اس کی مرہم پٹی شروع کر دی تھی...... مگر اس کا بایاں شانہ بری طرح گھائل تھا۔ فاروق اس کی مرہم پٹی میں مصروف رہا جبکہ نائمہ دانیال کو سنبھالے ہوئے تھی، فاروق نے اپنی کٹ سے سادے پانی کی بوتل نکال کر اسے تھمائی۔ تاکہ وہ وقفے وقفے سے دانیال کو گھونٹ گھونٹ پانی پلاتی رہے۔ دانیال پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی، مگر وہ سمجھتا تھا کہ ان حالات میں اسکے ساتھی کسی زخمی کا بوجھ برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اسی لیے وہ.... بے چارہ اپنے قوتِ ارادی کے بل بوتے پر بھی خود کو سنبھالے رکھنے کی سعی کر رہا تھا...... خالد نے دانیال کی زخمی کیفیت کا اندازہ لگایا۔ وہ ان کے سر پر موجود تھا اور گرد و پیش پر عقابی نظریں جمائے ہوئے تھا۔

فاروق نے جب مرہم پٹی کا کام نمٹا دیا تو دانیال کو درد رفع کرنے والی دو گولیاں بھی پانی کے ساتھ کھلا دیں۔

"م...... میں ٹھ...... ٹھ...... ٹھیک ہوں ابھی......"

وہ کراہ کے بولا۔ "ہمیں آگے بڑھنا چاہیے......" دانیال نے اٹھ بیٹھنے کی سعی چاہی تو فاروق نے منع کر دیا۔

"نہیں عزیزی! تمہاری حالت ٹھیک نہیں......"

فاروق خود پریشان تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہو گا؟ اس نے مستفسرانہ نظروں سے اپنے گروپ لیڈر خالد کی طرف بھی دیکھا تھا۔ دانیال کی بات اس کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ خود بھی خاموشی سے ہونٹ

باتوں سے خوشبو آئے

✉ اگر دنیا میں صرف سکون ہوتا تو لوگ اللہ پاک کو بھول جاتے۔ سکون تو صرف ان لوگوں کے پاس ہے جو اللہ کی رضا کو اپنی رضا سمجھتے ہیں۔

✉ اپنے لیے دعا مانگنا عبادت ہے اور دوسروں کے لیے مانگنا خدمت ہے اور عبادت سے جنت ملتی ہے اور خدمت سے خدا ملتا ہے۔

✉ خوب صورتی ایک نعمت ہے، لیکن سب سے خوب صورت آپ کی زبان ہے۔ چاہے تو دل جیت لے چاہے تو دل چیر دے۔

✉ پاک ہے میرا رب جو دلوں کا حال جانتا ہے مگر پھر بھی دنیا کے سامنے ہمیں رسوا نہیں کرتا۔

✉ مدد کرنا ایک بہت بڑا مہنگا تحفہ ہے اس لیے سب سے اس کی توقع نہ رکھیں کیونکہ بہت کم لوگ دل کے امیر ہوتے ہیں۔

✉ کسی کا دل توڑ کر معافی مانگنا تو آسان ہے لیکن اپنا دل ٹوٹ جائے تو کسی کو معاف کرنا بہت مشکل ہے۔

✉ ماں باپ کے لیے سب کو چھوڑ دینا لیکن کسی کے لیے ماں باپ کو مت چھوڑنا کیونکہ جب ماں باپ روتے ہیں تو فرشتوں کو بھی رونا آجاتا ہے۔

مرسلہ۔ محمد جاوید عباسی، ہائی سیکیورٹی زون، نیو سینٹرل جیل ملتان

کترنیں

امام ابن رہب دوسری صدی ہجری کے مشہور عالم اور فقیہ ہیں۔ فرماتے ہیں، میں نے غیبت سے بچنے کے لیے ایک طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس دن کسی کی غیبت کرتا، اس کے اگلے دن اپنے نفس کو سزا دینے کے لیے روزہ رکھ لیتا لیکن بات نہیں بنی اور روزہ رکھنا ایک عادت سی بن گئی اور سزا میں تلخی کے بجائے لطف آنے لگا اور ظاہر ہے جس سزا میں لطف ہو، وہ سزا کیسے ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں نے غیبت کے عوض ایک درہم صدقہ دینا شروع کر دیا اور یہ سزا نفس کو شاق گزری اور یوں غیبت کے روگ سے نجات مل گئی۔

مرسلہ۔ زبیر حسین شیخ، ڈیرہ مراد جمالی

بھینچے کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر فاروق سے بولا۔
''میرا خیال ہے دانیال کو اِدھر ہی کہیں محفوظ جگہ پر چھوڑ دیتے ہیں اور عزیزی نائمہ کو بھی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نائمہ کی طرف تائید چاہنے کے انداز میں بھی دیکھا تھا تو اس نے فوراً اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ مگر دانیال نے فوراً کہا۔
''نہیں ...... میں ٹھیک ہوں، یہ زخم تو مشن کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ دوں ......''
''لیکن عزیزی دانیال ...... ! تمہاری حالت ......''
''میں نے کہا نا ...... میں بالکل ٹھیک ہوں ......''
دانیال نے فاروق کی بات کاٹ دی۔
''میرا صرف بایاں شانہ ہی تو زخمی ہوا ہے، ابھی میرا دایاں بازو سلامت ہے ...... تم ایک کام کرو فاورق ...... ! جلدی سے لکڑی کی کوئی کھپچی سی بنا کر ...... میرے بائیں بازو پر مضبوطی سے باندھ دو تاکہ میں بہ وقتِ ضرورت اپنے زخمی بازو کو تھوڑی بہت ہی سہی، حرکت دے سکوں ......''
خالد خاموش تھا۔ بے شک وہ گروپ لیڈر تھا مگر وہ اپنے کسی ساتھی کے جذبے کے آڑے نہیں آنا چاہتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ یہ معاملہ ایک حب الوطن مجاہد اور اس کی مادرِ گیتی کے لیے قرض کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی ادائیگی کرنا اس کا ''ذاتی'' معاملہ ہوتا ہے، اس لیے وہ خاموش رہا جبکہ فاروق اسے مزید سمجھانے کے لیے مناسب الفاظ کا ابھی متلاشی تھا کہ خالد نے، جو اس کے قریب ہی خاموش کھڑا تھا، نہایت آہستگی سے فاروق کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر ہولے سے دبایا۔ فاروق یہ اشارہ بھانپ کے خاموش ہوگیا۔
کچھ وقت اور بیت گیا۔ اس کے بعد یہ چاروں آگے بڑھے۔ دانیال ایک عزم اور اپنی خود اعتمادی کے سہارے اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ اسے کوئی سہارا دینے کی سعی چاہتا تو یہ کہہ کر منع کر دیتا کہ اس وقت ان سب کو صرف موجودہ حالات کی اہمیت اور خطرناکی کو مدِنگاہ رکھنا چاہیے، ذرا سی غفلت سب کے لیے مصیبت کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔
دانیال نے اپنے سیدھے ہاتھ میں گن پکڑے رکھی تھی اور وہ سب سے آخر میں، گردوپیش اور عقب میں نگاہ رکھے ہوئے چل رہا تھا ...... سب سے آگے خالد، پھر نائمہ اور فاروق تھے۔
جزیرے میں جو تھوڑی دیر پہلے رن اور افراتفری کی فضا طاری تھی، وہ اب کافی حد تک معدوم ہوتی محسوس ہو رہی تھی، جس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ نامعلوم حملہ آوروں کا ''ہلا'' ناکامی سے دوچار ہوا تھا۔
البتہ ان کے لیے خطرہ ابھی موجود تھا۔ نامعلوم حملہ آوروں کو جزیرے کے چپے چپے میں تلاش کرنے کے لیے اسرائیلی فوجی یقیناً جزیرے کا کونا کونا چھاننے میں مصروف تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان کی بھی اچانک ہی ان کے ایک ٹولے سے مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔
چونکہ یہ دور افتادہ جزیرہ نہ تھا اور نہ ہی گمنام اور ویران ...... اسی لیے زیادہ گھنا بھی نہ تھا اور نہ ہی کسی مہلک درندے یا جانور اور زہریلے حشرات الارض کا خطرہ تھا۔ البتہ جابجا کسی زمانے کے بنے بوسیدہ پرانے ہٹ اور چوبی کاٹیج بھی نظر آتے تھے۔ بہرطور، وہ ان کاٹیجز وغیرہ سے ہٹ کر اپنا راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ جزیرے پر رات اتر آئی تھی۔ تاریکی ان کے لیے مفید ثابت ہو سکتی تھی۔
ایک مقام پر پہنچ کر انہیں ذرا دور سامنے روشنیاں سی دکھائی دینے لگیں۔ وہ کسی وسیع و عریض عمارت کے ہیولے کو کافی حد تک روشن کیے ہوئے تھیں لیکن وہاں دھواں سا اٹھ رہا تھا، یہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سب تھوڑی دیر پہلے پڑنے والے رن کی وجہ سے ہے۔ خالد بھانپ گیا کہ وہ اب منزل کے قریب تھے۔ یہاں رک کر خالد نے ایک بار پھر زبیدہ سے رابطہ کرنا ضروری سمجھا اور ٹرانسمیٹر پر اس سے بات کی تو اس نے بھی اپنی موجودہ پوزیشن کے علاوہ خالد کو مختصراً الفاظ میں بتا دیا کہ ان نامعلوم حملہ آور افراد کا تعلق کس گروپ سے تھا۔ نیز یہ بھی کہ وہ کون تھے اور اب وہ اور عابد ڈریگون نامی ایک مافیائی گروپ کے چند بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ ''الحاق'' بھی کر چکے تھے۔
خالد کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرنے کا زبیدہ کا ایک مقصد بھی تھا کہ وہ، یعنی خالد کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے، کیونکہ اسرائیلیوں نے مذکورہ مافیائی گروپ ڈریگون کا یہ حملہ بری طرح پسپا کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر اس وقت زبیدہ کو خالد کے اگلے حکم پر مایوسی ہوئی کہ وہ ہر قیمت پر اسی وقت عمارت پر ہلا بولنے کا حتمی اور آخری فیصلہ کر چکا تھا اور زبیدہ پر بھی سختی سے اپنا وہی حکم مسلط رکھا تھا کہ وہ اندر رہتے ہوئے اسرائیلیوں کی جڑیں کاٹتی رہے ...... اور موقع ملتے ہی اسرائیلی ایڈمرل اردوت یعود کو فنا کے گھاٹ بھی اتارنے کی کوشش کرے۔
یہ حکم صادر کرتے ہی خالد نے دشمن پر آخری وار

کرنے کی نیت سے آگے قدم بڑھا دیے......

☆☆☆

دور صحرائی ٹیلوں کی اوٹ سے سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ڈاکٹر کمال اور احمد حمادی نے رات بھر سے ایک آنکھ تک نہیں جھپکی تھی۔ان کی ذہنی کیفیات سخت بے کلی اور تشویش سے دوچار تھیں۔احمد حمادی نے تو حوصلہ ہی ہار دیا تھا اور بار بار خودگزیدگی پر مائل ہو رہا تھا۔حتیٰ کہ اس نے گپھا کی پتھریلی دیواروں سے اپنا سر بھی ٹکرایا تھا اور پھاڑ ڈالا تھا،کمال نے اسے ہر طرح سے حوصلہ دینے کی سعی بھی چاہی تھی اور کافی حد تک وہ سنبھلا بھی تھا مگر خیالات کی یلغار کو روکنا اس کے بس میں، بلکہ کسی کے بھی بس میں کب ہوتا ہے؟ اسے رہ رہ کر اپنی منگیتر حبیبہ کا خیال آ رہا تھا جو اس شیطان راہزنی سردار ......رشید کے قبضے میں تھی۔اس کریہہ انگیز حوالے سے احمد حمادی کے دل و دماغ میں ہول سے اٹھ رہے تھے۔خود کمال بھی حبیبہ اور جینی کی وجہ سے پریشان تھا مگر اس نے احمد حمادی کی طرح اپنے حواس مختل نہیں ہونے دیے تھے۔اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ احمد حمادی اور اس کے ''معاملے'' کے بیچ واضح فرق تھا کیونکہ احمد حمادی کا معاملہ زیادہ حساس نوعیت کا تھا۔

''کچھ کیجیے ......برادرم کمال......! ورنہ ...... ورنہ......میں اپنا سر پھوڑ ڈالوں گا......''

اچانک ہی ایک بار پھر احمد حمادی پر دورہ پڑ گیا۔وہ تقریباً چلا کر ڈاکٹر کمال سے بولا، جو اس کی دلی و ذہنی کیفیات ---اور اس کے دل و دماغ کی ابتر ہوتی حالت سے اچھی طرح ---واقف تھا۔ڈاکٹر کمال کے سمجھانے بجھانے کے ذرا دیر بعد تک تو اس کی حالت ٹھیک رہتی مگر پھر متوحش اور کریہہ انگیز سوچوں کے سنپولیے اس کے اندر رینگنا شروع کر دیتے اور وہ پھر ذہنی کرب و ہیجان میں مبتلا ہونے لگتا۔کمال بھی تھک چکا تھا، بالآخر بولا۔

''دیکھو عزیزم احمد! نامساعد حالت کا یہ کڑوا گھونٹ کبھی کبھی انسان کو پینا پڑتا ہے۔میں تمہاری دلی اور ذہنی کیفیات کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ان حالات میں بے شک اللہ عزوجل سے دعا ہی کی جا سکتی ہے، جو ہم کر رہے ہیں......لیکن اس بے کسی اور بے بسی میں بھی اپنے طور پر ہاتھ پاؤں ہلانے کی ہم کوشش ہی کر سکتے ہیں۔مگر خدا کے لیے تم ذرا خود کو سنبھالو، میرے ذہن میں مفر کا ایک راستہ تو آتا ہے......''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک گپھا کے سرے پر بنے گول سلاخ دار دروازے پر کوئی نمودار ہوا ......ڈاکٹر کمال چونکا اور اس طرف متوجہ ہوا۔وہاں کوئی تھا۔کمال آگے بڑھا، اور بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔وہ ان رذیل راہزنوں کا ہی ایک بدمعاش مشٹنڈا ساتھی تھا، جس کے ہاتھوں میں ایک گندی سندی سی ٹرے تھی۔وہ شاید ان کے کھانے پینے کے لیے کچھ لایا تھا۔اس کے جسم پر ملاحوں جیسا کھلا ڈلا لباس تھا۔یعنی پھولی ہوئی کھلے گھیر کی شلوار اور اوپر صرف بنیان تھی۔چہرے پر سفاکی اور شیطانیت ٹپک رہی تھی۔ اس کے کاندھے پر رائفل بھی جھول رہی تھی، وہ کمال کو سلاخ دار دروازے کے قریب آتے دیکھ کر درشت اور تحکمانہ لہجے میں اس سے بولا۔

''سلاخوں سے دور ہو کے کھڑے ہو جاؤ......فوراً...... ورنہ......''اس نے تہدیدی انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو کمال فوراً چند قدم پیچھے کی طرف ہٹ گیا......اس کے بعد راہزنی ڈشکرے نے اکڑوں بیٹھ کر......سلاخ دار دروازے کے نچلے خلا سے ٹرے اندر کھسکا دی اور جب واپس پلٹنے لگا تو کمال نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اسے پکارا۔

''ٹھہرو......خدا کے لیے ہم پر رحم کرو ......میں تمہارے سردار رشید سے ملنا چاہتا ہوں......''ڈاکٹر کمال نے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس سے لجاجت آمیز لہجے میں کہا تو وہ ڈشکرا اس کی جانب قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے درشتی سے بولا۔

''بکواس بند کرو......جاؤ......اپنی جگہ جا کے خاموشی سے بیٹھ جاؤ......ورنہ گولی مار دی جائے گی......'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا......ڈاکٹر کمال مایوسی سے واپس پلٹا تو چونک پڑا، حمادی اپنا سر زور زور سے گپھا کی سنگی دیوار سے ٹکرا رہا تھا ......یہاں تک کہ اس کا سر اور پیشانی پھٹ گئی......کمال اس کی اس دیوانگی پر لرز اٹھا اور فوراً اسے سنبھالنے کو لپکا۔

''یہ کیا کر رہے ہو......؟ تمہارا دماغ چل گیا ہے؟'' ......کمال نے اسے تھامتے ہوئے تیز لہجے میں کہا تو حمادی لہو رنگ آنکھوں اور چہرے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جنونیوں کی طرح بولا۔

''ہاں......ہاں......میں پاگل ہو گیا ہوں......میں ایک بزدل انسان ہوں......اپنی بیوی کی عزت بھی اس خبیث انسان سے نہیں بچا سکا تو مجھے بھی جینے کا کوئی حق نہیں......مجھے مرجانے دو......مرجانے دو مجھے ......آہ......''

وہ فرطِ غم اور آتشِ غیرت کے مارے نڈھال سا ہونے لگا تو کمال نے اسے خود سے لگا کر تھپکیاں دیں۔ وہ بالکل بچوں کی طرح اس سے لپٹ کر رونے لگا تو کمال نے اسے دھیرے سے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا...... ''تم ایسا کرتے رہو گے تو میں بھی پریشان رہوں گا اور کچھ سوچ پاؤں گا نہ کر پاؤں گا...... پلیز...... حمادی...... فار گاڈ سیک خود کو سنبھالو......''

حمادی اس سے تھوڑا پرے جا کے خاموش سا کھڑا ہو گیا...... اور ڈاکٹر کمال اپنی جگہ کھڑا اسے دیکھنے لگا۔ حمادی نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر بولا۔

''برادرم......! اب شاید سب کچھ ختم ہو چکا...... پتا نہیں اب تک وہ بھیڑیا صفت انسان میری حبیبہ کے ساتھ کیسا گھناؤنا سلوک کر چکے ہوں گے۔ وہ بے چاری ان درندہ صفت انسانوں کے درمیان تنہا ہو گی...... اور میری ہی راہ تک رہی ہو گی...... کیا اسے نہیں پتا...... کہ خود یہاں مجھ پر کیا بیت رہی ہے؟'' وہ یہ کہتے ہوئے غیر ہموار فرش پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا...... اور رونے لگا...... جبکہ کمال وہیں سوچتا ہوا سا کھڑا رہا۔

ظالم وقت ننگی تلوار کی طرح ان کے سر پر جیسے معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ وقت گزر رہا تھا مگر بری گھڑی سر پر جوں کی توں کھڑی تھی۔ گزرتا وقت اسے نہیں دھکیل رہا تھا۔

کھانے کی ٹرے کی طرف انہوں نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ البتہ پیاس سے مجبور ہو کر ڈاکٹر کمال نے پاس رکھے مٹی کے ایک گھڑے سے، ایک ''آب خورے'' میں پانی نکال کر پیا تھا اور حمادی کو بھی پلایا تھا۔ پانی نے سوکھے پڑے حلق میں تراوٹ سی بھری تو...... کچھ سکون سا ملا۔ پھر جیسے جیسے دن ابھرنے لگا اور دھوپ پھیلنے لگی تو گرمی کا احساس بھی سوا ہونے لگا۔ اس تنگ و تاریک گپھا میں گھٹن کا احساس بھی زیادہ ہونے لگا۔ اگرچہ تیز دھوپ اندر تو نہیں پڑ رہی تھی لیکن سامنے اور اطراف کے ٹیلوں پر چمکتی سورج کی پرتپش تمازت ان پر بھی پڑ رہی تھی۔ جس کے باعث ان دونوں کے جسم پسینے میں نہا گئے تھے۔ دونوں گھٹن کا احساس کم کرنے کے لیے سلاخ دار دروازے کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔

غیر یقینی صورتِ حال کے بیچ یہ کڑا وقت بیتا جا رہا تھا حتیٰ کہ سہ پہر کی سنہری دھوپ چمکنے لگی۔

صبح کی کھانے کی لائی گئی ٹرے اسی طرح دھری پڑی تھی۔ نہ جانے اس کے اندر کھانے کو کیا رکھا تھا، کمال اور حمادی نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ دل و دماغ پریشانی کا شکار ہو تو کھانا پینا بھلا کسے اچھا لگتا ہے، لیکن کب تک؟ آخر تو پیٹ کا جہنم بھرنا ہی پڑتا ہے...... انہوں نے اب تک فقط پانی پر ہی گزارہ کیا تھا۔

دوپہر کا کھانا نہیں دیا گیا تھا۔ البتہ وہی خونخوار صورت ڈشکرا آ کر ٹرے واپس اٹھا لے گیا تھا...... اس نے ان سے یہ پوچھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ...... انہوں نے کھانا کیوں نہیں کھایا تھا۔

وقت کچھ اور سرکا تو سہ پہر کی سنہری دھوپ آتشی ہو کر غائب ہو گئی۔ رات ہوتے ہی...... انہیں شور و غل کی آواز سنائی دینے لگی...... اور تاریکی کی چادر کو ایک متحرک آتشی روشنی چاک کرنے لگی۔ گول سلاخ دار دروازے سے باہر مقدور بھر نظر آنے والے آسمان پر تارے بھی ٹمٹما رہے تھے۔ ان کی ضوافشانی، الاؤ کی متحرک روشنی میں مدغم ہو کر ماحول میں عجیب سا تاثر پیش کر رہی تھی۔

حمادی تو نڈھال سا ایک طرف گپھا کے کونے میں پتھریلی دیوار سے اپنی پشت ٹکائے اور سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ شاید اس نے بھی اب ذہنی طور پر حالاتِ دگرگوں کی اس کڑوی گولی کو ناچار نگل ہی لیا تھا۔ جبکہ ڈاکٹر کمال گول سلاخ دار دروازے کے قدرے قریب بیٹھا...... باہر تکے جا رہا تھا۔ شور اور سرخ تھرکتی روشنی کو دیکھ کر وہ اٹھ کر دروازے کے قریب آیا اور جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ سرخ روشنی درحقیقت کسی جلتے بھڑکتے الاؤ ہی کی تھی، اور یہ شور وہ طوفانِ بدتمیزی کا ہی ہو سکتا تھا، جو کسی شیطانی جشن کی ہی غمازی کر رہا تھا۔ اور...... تب ہی اس کی نظر، گپھا کے قریب آتے ہوئے کسی پر پڑی۔ یہ وہی راہزنی ڈشکرا تھا۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر کمال ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ قریب آ کر اس نے پہلے سلاخوں سے اندر جھانکا، انہیں دیکھ کر وہ مطمئن ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جو اس نے پہلے ہی کی طرح ذرا جھک کر نیچے سرکائی۔ ڈاکٹر کمال ابھی اس سے مخاطب ہونے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اچانک ہی اس کی نظر اس سائے پر پڑی جو معاً ہی ڈشکرے کے عقب میں نمودار ہوا تھا۔ کمال دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہ گیا۔ پھر اگلے ہی لمحے ڈاکٹر کمال احمد نے اپنی نظروں سے اس پراسرار ہیولے کو اس راہزنی ڈشکرے پر جھپٹتے دیکھا......

(جاری ہے)



ہیرا پھیری

تنویر ریاض

دنیا میں سب سے آسان کام جھوٹ بولنا اور ڈھٹائی سے جھوٹ پر ڈٹے رہنا ہے لیکن اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی جبکہ وہ بازی گر ایسا تھا جسے بازی لگانے اور مات دینے میں کمال حاصل تھا۔ اس کے باوجود جب اس کے گرد سچ کا گھیرا تنگ ہوا تو سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا... اور اسی ایک لمحے کی گرفت کو قدرت کا قہر کہتے ہیں جب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

لمبے ہاتھ رکھنے والے مجرموں کی چھوٹی گردن کی پیمائش

''لگتا ہے کہ ان دنوں تمہارا کام کچھ مندا چل رہا ہے۔'' کرک سیون نے بیئر کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا جبکہ حقیقت یہی تھی کہ ان دنوں میرے پاس کوئی خاص کام تھا بھی نہیں۔ کرک سے میرے پرانے تعلقات تھے۔ وہ ٹیکساس کا رہنے والا تھا اور چوبیس برس پہلے ایم جی ایم کے یونٹ میں بطور الیکٹریشن موٹینی آن دی باؤنٹی کی شوٹنگ کے سلسلے میں تاہیٹی آیا تھا پھر اس نے یہیں پر ایک مقامی لڑکی سے شادی کر لی

اور واپس جانے کے بجائے اسی جزیرے پر اپنی جنت بسالی۔ پچیس سال گزر جانے کے بعد بھی وہ ایک مشہور فلم اسٹار بننے کا خواب دیکھا کرتا تھا لیکن اس کی قسمت میں ایکٹر بننا نہیں لکھا تھا لہٰذا وہ مشہور ہوٹل میں منیجر ہی بن گیا۔ یہ ہوٹل صدر مقام تاہیٹی سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا اور یہاں امیر سیاحوں کے لیے عیش و عشرت کا تمام سامان میسر تھا۔

میں تاہیٹی کا پہلا اور واحد امریکی پرائیوٹ سراغ رساں تھا اور گزشتہ دو برس سے یہاں کام کر رہا تھا۔ ویسے تو میں نے شہر کے قلب میں واقع ایک گرجا کے سامنے والی عمارت میں دفتر کرائے پر لے رکھا تھا لیکن کام مندا ہونے کی وجہ سے اسے عارضی طور پر بند کر کے اپنا ٹھکانا چند بلاک کے فاصلے پر واقع لی کپسی نامی بار میں بنا لیا تھا جو ایک سابق فوجی کی ملکیت تھا۔ اس چھوٹے سے شراب خانے میں فوجی اپنی ساتھی خواتین کے ساتھ آتے اور بھانت بھانت کی بولیاں بولتے۔

اس وقت بھی میں اور کرک وہاں بیٹھے ہوئے کاروبار کی زبوں حالی پر گفتگو کر رہے تھے کہ بار کا بیرونی دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی میرا پرانا فوجی ساتھی بپو جیلیس اندر داخل ہوا۔

''کیا میں باتھ روم میں چھپ سکتا ہوں؟'' اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا آئے تو اسے یہ نہ بتانا کہ میں یہاں پر ہوں۔''

''کیا پولیس تمہارا تعاقب کر رہی ہے؟''

''وہ ان سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں اپنا مہمان بنائے لیتا ہوں۔ تم وہ سامنے والا دروازہ کھول کر اندر چلے جاؤ۔''

وہ ایک کم عمر اور نرم دل فوجی تھا۔ فوجی ملازمت کے دوران میں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا۔ اس وقت میں سارجنٹ میجر تھا جبکہ وہ ہمیشہ سے ہی اناڑی اور بدھو واقع ہوا تھا۔

جب بپو اپنی خاکی وردی سمیت ٹوائلٹ میں چھپ گیا تو میں اپنی ٹھوڑی کو کھجاتے ہوئے سوچنے لگا کہ پولیس سے زیادہ خطرناک اور برا دشمن کون ہو سکتا ہے۔ گو کہ اب میں پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر کام کر رہا تھا لیکن پولیس کے بارے میں میری رائے ملی جلی تھی۔

''ممکن ہے کہ کوئی خوف ناک بلا اس سے چمٹ گئی ہو اور وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے چھپتا پھر رہا ہو۔'' کرک نے کہا۔ اس کا اشارہ ان مقامی عورتوں کی طرف تھا جو گاہکوں کو پھانسنے کے لیے ان کے گلے کا ہار بن جاتی ہیں۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' یہ کہہ کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک کرسی اٹھا کر ٹوائلٹ کے دروازے کے ساتھ لگا دی۔ یہ گویا اس امر کا اشارہ تھا کہ ٹوائلٹ ناقابلِ استعمال ہے۔

ابھی میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ بار کا دروازہ ایک بار پھر زوردار جھٹکے سے کھلا اور ایک ایسا شخص اندر داخل ہوا جسے میں نے کئی سالوں سے نہیں دیکھا تھا اور میری خواہش تھی کہ ساری عمر اسے نہ دیکھوں۔ وہ گھنی ڈاڑھی والا چھ فٹ لمبا اور شاید چوڑائی میں بھی اتنا ہی تھا۔ اس کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن سب لوگ اسے بروٹس کہہ کر پکارتے تھے۔

اس وقت میرے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ میرے ہاتھ میں بیئر کے گلاس کے بجائے کوئی تیز دھار والی چھری ہوتی جس سے میں اس کا پیٹ پھاڑ سکتا۔ بروٹس سے نمٹنا کوئی آسان کھیل نہیں تھا۔ اس وقت بھی جب ہم دونوں سارجنٹ میجر تھے جبکہ اب وہ کیپٹن بن چکا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی خاکی قمیص پر بنے ہوئے نشان کو دیکھ کر ہوا۔ وہ بڑی گہری نظروں سے بار روم کا جائزہ لے رہا تھا۔ پہلے اس نے کرک کو دیکھا پھر اس کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ پھر اپنے مخصوص لہجے میں غراتے ہوئے بولا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''کون؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''میں بپو کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔

''اگر تم اتنے بدصورت نہ ہوتے تو میں یہی سمجھتا کہ شاید ماضی میں کسی نے تمہیں زہر دینے کی کوشش کی ہوگی۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے بات بنائی۔

''مجھ سے مذاق مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ وہ یہیں کہیں ہے۔''

''تم خود ہی دیکھ لو۔'' میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''فی الحال تو یہاں میں اور کرک ہی ہیں۔''

بروٹس نے ایک بار پھر غور سے گرد و پیش کا جائزہ لیا پھر اس کی نگاہ ٹوائلٹ کے دروازے پر ٹھہر گئی اور وہ بولا۔

''ٹوائلٹ میں کون ہے؟''

''کوئی نہیں۔ ٹوائلٹ قابلِ استعمال نہیں ہے۔ اس

لیے باہر سے دروازہ بند کر کے کرسی رکھ دی گئی ہے۔''

''اگر کسی گاہک کو حاجت ہو تو وہ کیا کرے گا؟''

''مجبوری ہے، یہاں کوئی دوسرا ٹوائلٹ نہیں، اسے رفع حاجت کے لیے عقبی حصے میں واقع جھاڑیوں کی طرف جانا ہوگا۔''

''اگر تمہاری بپو سے ملاقات ہو تو اس سے کہنا کہ وہ چیز مجھے واپس کر دے۔ اس کے حق میں یہی بہتر ہوگا۔''

''ورنہ......'' میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

''ورنہ تم خود دیکھ لوگے۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے زور سے دھکا دیا اور میں فرش پر جا گرا۔ میرے سر میں بہت زور کی چوٹ آئی تھی۔ میں نے سر کو دو تین بار جھٹکا دیا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ اس وقت بار میں کرک کے علاوہ کوئی اور گاہک نہیں تھا ورنہ مجھے بڑی خفت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں نے سوچا کاش میرے پاس بیس بال کا بیٹ ہوتا تو برونس کو اس گستاخی کا مزہ چکھا دیتا۔

وہ جا چکا تھا۔ کرک نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے ترس کھا رہا ہو اور ہمدردی جتانے کے انداز میں بولا۔ ''تمہیں اس طرح کے لوگوں سے نمٹنے کے لیے دفاعی تربیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔''

''اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔'' میں نے جل کر کہا۔ ''اس نے مجھے اچانک ہی دھکا دے دیا ورنہ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ اس کا مقابلہ کرسکوں۔''

ابھی میری بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ وردی میں ملبوس دو فوجی بار میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ پانچ چھ مقامی لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ سگریٹ کے مرغولے بناتی اور زور زور سے قہقہے لگا رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر ٹوائلٹ کے دروازے سے کرسی ہٹائی اور آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہوگیا۔ بپو کی طرف سے مجھے فکر نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میدان صاف دیکھ کر نکل جائے گا۔

پیر کی صبح بار کا مالک واپس آگیا اور مجھے واپس اس بدصورت عمارت کی تیسری منزل پر واقع اپنے کابک نما دفتر میں آنا پڑا۔ میں بےزاری کے عالم میں اپنی دونوں ٹانگیں میز پر رکھے بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک سن کر چونک پڑا۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے کسی گاہک کا شدت سے انتظار تھا۔ شاید خدا نے میری سن لی تھی۔ میں نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بلند آواز سے کہا۔ ''اندر آجاؤ۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے دونوں پاؤں میز کے نیچے رکھ لیے، اپنا بوسیدہ ہیٹ بھی میز سے اٹھا کر کرسی کے پیچھے چھپا دیا تاکہ آنے والے کی نظر اس پر نہ جاسکے۔ مجھے دوسری حیرت بپو کو دیکھ کر ہوئی جو سرخ لباس میں ملبوس ایک مقامی لڑکی کے ساتھ اندر آرہا تھا۔ میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے لڑکی کو اس کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جو بہتر حالت میں تھی۔ بپو سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''بپو......تم؟''

اس دوران ہم سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ وہ لڑکی بڑی باریک بینی سے میرے دفتر کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کام میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا کیونکہ وہاں اس کے دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

''میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہ رہا تھا۔'' بپو بولا۔

''کل تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا اس کی وجہ سے میں ایک بہت بڑی مشکل میں پھنسنے سے بچ گیا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں لیکن تم نے اس خوب صورت خاتون کا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔''

''یہ میری دوست ایلیسا ہے۔ ہم دونوں شادی کا پروگرام بنا رہے ہیں۔''

''مبارک ہو۔'' میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم دونوں بہت خوش رہوگے۔''

یہ بات میں نے اوپری دل سے کہی تھی کیونکہ مجھے اس بارے میں کئی شبہات تھے۔ ایلیسا پچیس چھبیس سال کی انتہائی خوش شکل، خوش لباس اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ وہ اپنے ہونے والے دُلہا سے کم از کم بیس برس چھوٹی اور قد میں چھ انچ لمبی تھی۔ ویسے بھی یہ میرا تجربہ اور مشاہدہ تھا کہ یورپین اور تاہیٹی کے باشندوں کے درمیان ہونے والی زیادہ تر شادیاں ناکام ہوجاتی ہیں۔

''اس شادی میں ایک رکاوٹ آن پڑی ہے۔'' ایلیسا ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''اس نے میرا جہیز چرا لیا ہے۔''

''تمہارا جہیز؟'' میں چونکتے ہوئے بولا۔ میرے لیے یہ لفظ اجنبی نہیں تھا، کتابوں میں پڑھا اور لوگوں سے سن رکھا تھا کہ انڈیا میں لڑکی کے ماں باپ شادی کے موقع پر نئی زندگی شروع کرنے کے لیے اسے کپڑے، زیور، برتن اور فرنیچر وغیرہ دے دیتے ہیں لیکن یہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تاہیٹی میں بھی اس کا رواج ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں مسلتے

ہوئے کہا۔ ’’تمہارا جہیز کس نے چرا لیا؟‘‘

’’برونس، اسی نے میرا جہیز چرایا ہے۔ یہ کام اس کے علاوہ اور کوئی نہیں کرسکتا۔‘‘ وہ لڑکی اب پہلے سے زیادہ غصے میں نظر آرہی تھی اور میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کررہا تھا کہ میں اس کا ہونے والا دولہا نہیں تھا۔ اس وقت مجھے پیو سے بہت ہمدردی محسوس ہورہی تھی۔

میں نے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا لیا اور بولا۔ ’’کیا تم مجھے تفصیل بتانا پسند کرو گی؟‘‘

☆☆☆

اس کہانی کا آغاز 1941ء کے موسم خزاں میں ہوا۔ اس زمانے میں عالمی شہرت یافتہ مصنف جیمس نارمن ہال پپیٹ سے تین میل کے فاصلے پر واقع درختوں سے گھرے ہوئے شہر آریو میں اپنے چھوٹے سے خوب صورت مکان میں رہا کرتا تھا۔ وہ امریکا میں پیدا ہوا۔ پہلی جنگِ عظیم کے آغاز پر اس نے امریکی فوج میں ملازمت کرلی جہاں اس کی ملاقات ایک اور ہوا باز چارلس نورڈ ہوف سے ہوئی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ دونوں تاہیٹی چلے آئے اور کتابیں لکھنا شروع کردیں۔ 1932ء میں شائع ہونے والی کتاب موٹینی آن دی باؤنٹی سے انہیں بہت شہرت ملی۔ تین سال بعد اس ناول پر مبنی فلم ریلیز ہوئی جو بے حد کامیاب رہی اور اس نے سال کی بہترین فلم کا اکیڈمی ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ اس فلم کے بعد نورڈ ہوف اور ہال کی شہرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

اس کے بعد یہ دونوں کئی کتابیں لکھتے رہے۔ جن میں سے بیشتر پر فلمیں بھی بنائی گئی تھیں۔ وہ دونوں تاہیٹی میں ہی رہ رہے تھے البتہ کبھی کبھار امریکا کا چکر لگا لیتے۔ ہال نے اسی جزیرے پر رہنے والی ایک نوجوان لڑکی سارہ ونچسٹر سے شادی کرلی اور جب دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ آریو والے گھر میں ہی رہ رہا تھا۔ گو کہ امریکا خفیہ طریقے سے برطانیہ کی حمایت کررہا تھا لیکن اس وقت تک اس نے جنگ میں عملاً شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔ فرانس کو جرمنی کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ جنگ کے دوران ہال کو ایک ہیرو کی حیثیت حاصل رہی۔ مقامی آبادی کے لوگ اس سے محبت کرتے تھے اور اس کے گھر کی حفاظت اور دیکھ بھال کا پورا بندوبست کرتے تھے۔

1941ء کے موسم خزاں میں جاپان، برطانیہ، امریکا اور دیگر ممالک کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔ انہی دنوں ہال کو ایک ناول لکھنے کا خیال آیا۔ وہ اسے دی اٹلانٹک کو بھیجنا چاہ رہا تھا جنہوں نے بوسٹن میں اس کی کئی کہانیاں چھاپی تھیں۔ اس کے ذہن میں ایک ایسے جزیرے کا خیال آیا جو تاہیٹی اور ہوائی کے درمیان واقع تھا اور کرسمس آئی لینڈ کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اس جزیرے کو 1777ء میں کرسمس کی شام کیپٹن کک نے دریافت کیا اور اسی مناسبت سے اس کا نام کرسمس آئی لینڈ رکھا گیا۔

ہال نے سوچا کہ اگر اس بار کرسمس کے موقع پر سانتا کلاز کو کرسمس آئی لینڈ بھیجا جائے اور وہ معمول کے مطابق بچوں میں کھلونے بانٹنے کے بجائے جاپانیوں اور امریکیوں سے صلح کروا دے تو کتنا اچھا ہو۔ ہال خود بھی پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جرمن فوجیوں کے ہاتھوں زخمی ہوکر جنگی قیدی رہ چکا تھا لہٰذا جب اس نے یہ کہانی لکھنا شروع کی تو تصور کیا کہ پیری نوئل یعنی سانتا کلاز اپنی برفانی گاڑی میں ہوائی سے جنوب کی جانب اس جزیرے کی طرف جارہا ہے جو تاہیٹی کے شمال میں واقع ہے۔ شدید برفانی ہواؤں کی وجہ سے اس کی گاڑی کی رفتار سست ہورہی تھی۔ اچانک اس کی نظر سمندر میں کھڑے جہاز کی روشنیوں پر پڑی اور اس نے اپنی گاڑی کا رخ جہاز کی سمت کرلیا۔ اس کا خیال تھا کہ جہاز پر بچے ہوں گے جیسے ہی وہ جہاز کے نزدیک پہنچا تو وہ ایک اینٹی ائرکرافٹ جہاز تھا۔ انہوں نے یہ سوچ کر فائرنگ شروع کردی کہ نامعلوم دشمن نے ان پر حملہ کردیا ہے۔ سانتا کی گاڑی کو بھی ایک گولی لگی اور وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ تاہم غیر معمولی مہارت سے کام لیتے ہوئے وہ کرسمس آئی لینڈ کے قریب اترنے میں کامیاب ہوگیا۔

ابھی وہ ساحل کی ریت پر کھڑا اپنی تباہ شدہ گاڑی کا معائنہ کررہا تھا کہ اسے ایک درجن کے قریب جاپانی سپاہیوں نے گھیر لیا جو اپنی رائفلوں کا رخ اس کی جانب کیے ہوئے تھے۔ وہ ایک جاپانی آبدوز کا ردعمل تھا جو وہیں قریب ہی لنگرانداز تھی اور یہ سپاہی پھلوں اور ناریل کی تلاش میں اس جزیرے پر آئے تھے۔

پیری نوئل ان جاپانیوں کے درمیان گھرا سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے زیادہ اس کے ساتھ کیا برا ہوسکتا ہے کہ امریکی سپاہیوں کا دستہ ایک موٹر بوٹ سے اترتا ہوا دکھائی دیا جو اینٹی ائرکرافٹ جہاز سے بھیجا گیا تھا۔ وہ بھی پوری طرح مسلح تھے اور لگتا تھا کہ ان کے جبڑے خون سے سرخ ہورہے ہیں۔

’’ہاں اب یہ کہانی آگے بڑھتی نظر آرہی ہے۔‘‘ میں نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ’’پھر کیا ہوا؟‘‘

ایلیسا نے کندھے اچکائے اور بولی۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کیسے ہوا۔ البتہ پیری نوئل نے دونوں فریقوں کے درمیان امن قائم کر دیا پھر آبدوز اور طیارہ بردار جہاز کے عملے کے دوسرے لوگ بھی وہاں آ گئے اور ان سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر کرسمس کا ڈنر کیا پھر انہوں نے پیری نوئل کی گاڑی کی مرمت بھی کر دی اور وہ اس میں سوار ہو کر بچوں میں کھلونے بانٹنے چلا گیا۔ تمام افسروں اور عملے کے دوسرے لوگوں نے ایک دوسرے سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور گلے مل کر وعدہ کیا کہ وہ واپس جا کر پوری دنیا میں امن پھیلائیں گے۔“

”لیکن ایسا نہ ہو سکا۔“ میں نے طویل خاموشی کے بعد کہا۔ ”اس خوب صورت کہانی کا انجام کیا ہوا؟“

ہیو نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے مسٹر ہال نے کہانی مکمل کر لی تھی اور وہ اسے میگزین کو بھیجنے ہی والے تھے کہ جاپانیوں نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔“

”میں جانتا تھا ایسا ہی ہوا ہوگا۔“

”ہاں۔“ ایلیسا نے کہا۔ ”ماما لالا، بچے اس روز صبح میں گرجا گئے ہوئے تھے اور گھر میں صرف مسٹر ہال کے علاوہ میری نانی تھی جو رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔“

”تم مسز ہال کو ماما لالا کہہ رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں کیونکہ سب لوگ اسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔ بہرحال میری نانی کھانا بنا رہی تھیں کہ مسٹر ہال اس سے کوئی بات کرنے کے لیے اپنی اسٹڈی سے باہر آئے۔ اسی وقت ان کا ایک فرانسیسی دوست دوڑتا ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ جاپانیوں نے حملہ کر کے ان کے بیڑے کو تباہ کر دیا ہے۔ میری نانی کے کہنے کے مطابق وہ ایک لفظ کہے بغیر اسٹڈی میں چلے گئے۔ جب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں کہانی کا مسودہ اور لفافہ تھا جس میں رکھ کر وہ اس مسودے کو سپرد ڈاک کرنے والے تھے۔ وہ کچن میں گئے اور اس مسودے کو پھاڑ کر کوڑے دان میں پھینکنا ہی چاہ رہے تھے کہ میری نانی نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا کیونکہ وہ اس کہانی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھیں۔ جب میری نانی نے انہیں کہانی کا مسودہ پھاڑنے سے روکا تو انہوں نے وہ سارے کاغذات اس کے حوالے کر دیے اور کہا کہ وہ دوبارہ اس بارے میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہیں گے۔ یہ کہہ کر وہ اپنی اسٹڈی میں چلے گئے۔“

”اور تمہاری نانی نے وہ مسودہ اپنے پاس رکھ لیا۔“

”ہاں، اسے مسٹر ہال سے بہت عقیدت تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ وہ دنیا کے بہترین انسان ہیں لہٰذا وہ مسودہ اپنے ساتھ گھر لے گئی اور اسے اپنے سب سے بڑے صندوق کی تہ میں رکھ دیا۔ جہاں اس نے اپنے بہترین کپڑے اور دوسری قیمتی چیزیں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔“

”اور اب وہ مسودہ تمہارے پاس ہے؟“

”ہاں لیکن وہ اب چوری ہو چکا ہے۔ نانی نے اسے مرتے وقت میری ماں کے حوالے کیا تھا اور جب گزشتہ برس ...اس کا انتقال ہوا تو وہ مسودہ میرے پاس آ گیا۔ میری ماں اکثر کہا کرتی تھی کہ وہ اس مسودے کو مسز ہال کو دینا چاہ رہی تھی لیکن اس کا موقع ہی نہ مل سکا۔“

”اب تم اس مسودے کا کیا کرو گی؟“

”مسز ہال بہت بوڑھی ہو چکی ہیں اور اپنا زیادہ وقت امریکا میں ہی گزارتی ہیں لہٰذا اس بات کا بہت کم امکان نظر آتا ہے کہ یہ مسودہ ان کے حوالے کر دیا جائے۔ میں نے اپنی ماں کے مرنے کے بعد یہ کہانی ایک دوست کو دکھائی تھی جو اسکول میں انگلش پڑھاتی ہے۔ اس نے وہ کہانی پڑھی اور کہا کہ یہ مسودہ بہت قیمتی ہے کیونکہ مسٹر ہال بہت بڑے مصنف تھے۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اس کہانی کو فروخت کرنے کی کوشش کروں۔ اس طرح مجھے جہیز کی تیاری کے لیے ایک معقول رقم مل جائے گی۔“

”میرے خیال میں اس نے صحیح مشورہ دیا تھا لیکن اب تم کہہ رہی ہو کہ بروئس نے وہ مسودہ چرا لیا ہے۔“

”ہاں۔“ ہیو نے کہا۔ ”اسی لیے وہ میرا پیچھا کرتا ہوا شراب خانے تک آیا تھا وہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے وہ مسودہ اس کے پاس سے چرا لیا ہے۔“

”جبکہ تم نے ایسا نہیں کیا تھا؟“

”نہیں البتہ کوشش ضرور کی تھی۔“

میں نے گہری سانس لی اور کہا۔ ”مجھے پوری بات بتاؤ۔“

☆☆☆

ایک ہفتہ یا اس سے مزید کچھ دن پہلے ہیو اپنی فوجی ملازمت کے بیس سال پورے کرنے کے بعد ریٹائر ہو رہا تھا اور اس روز اس کے اعزاز میں الوداعی تقریب منعقد ہوئی تھی جس میں بروئس بھی موجود تھا۔ ہیو کو اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ اب وہ آزاد شہری کی حیثیت سے زندگی گزار سکے گا اور اس کی بروئس جیسے سخت گیر آفیسر کی ڈانٹ پھٹکار اور گالم گلوچ سے جان چھوٹ جائے گی۔ اب اسے کوئی ڈر نہیں تھا اس لیے ہیو نے دل کھول کر اپنی بھڑاس نکالی اور بروئس کو بے بھاؤ کی سنائیں۔ اسے یقین تھا کہ بروئس اب

اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اس واقعے کے چند دنوں بعد پیو اور ایلیسا اس چھوٹے سے گھر کے لیونگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے جس میں وہ اپنی دو بہنوں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ کمرے میں مدھم روشنی والا بلب جل رہا تھا اور اس کی واحد کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ پرانے طرز کے دیگر مکانوں کی طرح اس میں شیشوں کے بجائے پلائی ووڈ کے پرانے تختے لگا کر کام چلایا گیا تھا۔ کمرے میں خاصی گھٹن ہو رہی تھی۔ اس لیے ایک چھری کی مدد سے تختے کو تھوڑا سا اوپر اٹھا دیا گیا تھا تاکہ ٹھنڈی ہوا اندر آتی رہے۔ اس وقت وہ دونوں اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ جیمس نارمن ہال کے لکھے ہوئے اس مسودے کا کیا کیا جائے۔ اس وقت بھی یہ مسودہ ان کے درمیان میز پر رکھا ہوا تھا۔ چند گز کے فاصلے پر ایک پردہ ٹنگا ہوا تھا اور اس کی دوسری جانب ایلیسا کی بہن اور تین کزن ٹیلی ویژن پر سوپر شو دیکھ رہے تھے۔ پیو اور ایلیسا کا خیال تھا کہ یہ مسودہ کئی ہزار امریکی ڈالرز میں فروخت ہوسکتا ہے لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس سلسلے میں کس سے رجوع کیا جائے۔ عین اسی وقت انہوں نے بروٹس کو کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر آتے دیکھا۔ جیسے ہی اس کے قدم زمین پر جمے، اس نے چھری ہٹا کر کھڑکی بند کر دی اور غراتے ہوئے بولا۔

”تم کیا سمجھتے تھے کہ مجھے گالیاں دے کر سکون سے رہ سکو گے؟“

ایک لمحے کے لیے وہ دونوں ہی سکتے میں آ گئے پھر پیو اپنی جگہ سے اچھلا اور اس نے بروٹس کا راستہ روکنے کے لیے میز الٹ دی۔ ایلیسا کے حلق سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی اور وہ لپک کر پردے کے پیچھے چلی گئی۔ بروٹس کا دایاں ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور اس نے پیو کی گردن پر زوردار ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ عین اسی وقت ایلیسا کے تینوں کزن وہاں آ گئے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے، فرائی پان اور گٹار پکڑا ہوا تھا لیکن بروٹس انہیں کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ ان کے آنے سے پہلے ہی کھڑکی سے فرار ہو چکا تھا۔

ایلیسا ابھی تک خوف زدہ تھی۔ اسے اس کے ایک کزن نے اپنی بانہوں میں لے رکھا تھا۔ پیو نے میز سیدھی کی اور فرش پر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھا۔ وہاں وائن کی خالی بوتل کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ بروٹس مسودہ ساتھ لے گیا ہے۔ وہ کسی بھی ارادے سے یہاں آیا ہو لیکن اس نے باہر کھڑے ہو کر پیو اور ایلیسا کی باتیں سن لی تھیں اور جان گیا تھا کہ وہ مسودہ کتنا قیمتی ہے لہٰذا اس نے موقع غنیمت جان کر اسے چرا لیا۔

پیو ننگے پاؤں باہر کی طرف بھاگا اور اس نے دیکھا کہ گھر کی سیڑھیوں کے پاس ہی ایلیسا کے کسی کزن کا ویسپا اسکوٹر کھڑا ہوا ہے۔ وہ بے دھیانی میں اسکوٹر کی چابی نکالنا بھی بھول گیا تھا۔ اچانک اس کی نظر بروٹس پر گئی جو کچھ ہی فاصلے پر کھڑی اپنی پرانی فیٹ کار میں سوار ہو رہا تھا۔ پیو نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور کچھ فاصلہ رکھ کر بروٹس کی کار کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔

اچانک ہی بروٹس کی کار کی رفتار کم ہوئی اور وہ ایک گیس اسٹیشن کی جانب مڑ گیا۔ پیو کو بھی رکنا پڑا اور اس نے اپنا اسکوٹر سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار کے پیچھے روک دیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا چینی اسٹور سے برآمد ہوا۔ اس نے بروٹس سے کچھ بات کی اور کار میں گیس بھرنا شروع کر دی۔ اس دوران بروٹس اسٹور میں چلا گیا اور شیلف میں رکھی ہوئی مختلف اشیا کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ اپنے لیے ضرورت کی کوئی چیز خریدنا چاہ رہا تھا۔ اتنی دیر میں گیس بھری جا چکی تھی لہٰذا چینی لڑکا بھی اسٹور کے اندر چلا گیا۔

پیو نے آگے بڑھ کر بروٹس کی کار کا جائزہ لیا۔ اس کا شیشہ کھلا ہوا تھا۔ پیو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ دبے قدموں کار کی جانب بڑھا اور اس نے ڈرائیونگ سائڈ والی کھڑکی میں سر ڈال کر دیکھا وہ مسودہ پسنجر سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ مسودہ اٹھانا چاہا لیکن عقب سے آنے والی آواز سن کر اسے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

”اے...... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا گردن موڑ کر دیکھا تو پارکنگ لاٹ کے کونے میں کھڑی جیپ میں دو پولیس والے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور ان میں سے ایک اسے دیکھ کر جیپ سے اتر رہا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ پیو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال تھا......“ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر وہ مسودہ سیٹ کے نیچے دھکیل دیا اور بڑبڑاتا ہوا بوجھل قدموں سے وہاں سے ہٹ گیا۔ تبھی اس نے بروٹس کو اسٹور سے باہر آتے دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں سامان سے بھرا تھیلا پکڑا ہوا تھا۔

”اے... یہ کیا ہو رہا ہے؟“

پیو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بھاگا اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور تیزی سے یوٹرن لے کر واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

”یقیناً انہوں نے تمہارا تعاقب کیا ہوگا؟“ میں نے

فکر مندی سے پوچھا۔

"نہیں، انہوں نے اس کی زحمت گوارا نہیں کی کیونکہ سڑک پر ٹریفک تھا اور انہیں میرا پیچھا کرنے کے لیے کافی دور جا کر یوٹرن لینا پڑتا۔"

"یہ بھی غنیمت ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو لیکن لگتا یہی ہے کہ تم وہ مسودہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور اسی سلسلے میں مجھ سے بات کرنے کے لیے آئے ہو۔"

"ہاں۔" ایلیسا بولی۔ "ہم چاہتے ہیں کہ تم وہ مسودہ کسی بھی طرح اس سے حاصل کر لو۔ اس کے عوض تم کیا معاوضہ لینا چاہو گے؟"

"تم پولیس میں رپورٹ درج کیوں نہیں کرواتے؟ یہ تو سیدھا سادہ چوری کا کیس ہے۔"

"اگر اس نے انکار کر دیا تو ہم کس طرح ثابت کریں گے کہ اسی نے چوری کی ہے اور اگر پولیس نے وہ مسودہ اس سے برآمد کر لیا تو ممکن ہے کہ وہ اسے ہال فیملی کے حوالے کر دیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ "گویا تم سمجھ رہے ہو کہ وہ مسودہ ابھی تک اس کی کار کی سیٹ کے نیچے پڑا ہوا ہے اور تم چاہتے ہو کہ میں اسے چرا کر تمہارے حوالے کر دوں؟"

"ہم اپنی چیز واپس لینا چاہ رہے ہیں، یہ چوری نہیں ہے۔" ایلیسا بولی۔

"بروٹس کی رہائش کہاں ہے؟"

"ہم نہیں جانتے۔ یہ معلوم کرنا تمہارا کام ہے سراغ رساں تم ہو ہم نہیں۔"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے پیپو سے کہا۔ "اس روز تم دوڑتے ہوئے بار میں آئے تھے اور بروٹس تمہارا پیچھا کر رہا تھا آخر کیوں جبکہ تم وہ مسودہ حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے؟"

"اس شام میں اور ایلیسا فلم دیکھنے گئے تھے۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو میں نے بروٹس کی کار کو کیکری بار کے باہر کھڑا دیکھا۔ میں نے سوچا کہ دیکھنا چاہیے وہ مسودہ ابھی تک کار کی سیٹ کے نیچے پڑا ہوا ہے یا نہیں، میں کھڑکی کا شیشہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بروٹس بار سے باہر آ گیا اور......"

"مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم واقعی خوش قسمت ہو کہ ابھی تک زندہ سلامت ہو۔ ورنہ جو احمقانہ حرکتیں کرتے پھر رہے ہو انہیں دیکھتے ہوئے یہ ایک معجزہ ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" پیپو نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا تم وہ کہانی حاصل کر سکتے ہو؟"

"فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے میں تمہیں کل تک کچھ بتا سکوں گا۔"

☆☆☆

اگلے روز اپنے دفتر کی سیڑھیاں چڑھتے وقت بھی میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے اس کام میں ہاتھ ڈالنا چاہیے۔ ایک سراغ رساں ہونے کے ناتے یہ تو معلوم کر سکتا تھا کہ بروٹس کہاں رہتا ہے اور یہ کہ اس کی کار میں وہ مسودہ موجود ہے یا نہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں چوروں کی طرح اس کی کار کا دروازہ کھول کر وہ مسودہ نکال لوں۔ جب میں اپنے دفتر کے دروازے پر پہنچا تو پیپو اور ایلیسا پہلے سے وہاں موجود تھے۔ میں نے دروازے کا تالا کھولا اور وہ دونوں بھی میرے ساتھ اندر چلے آئے۔ مجھے ان کی اتنی جلدی آمد پر حیرت ہو رہی تھی لیکن جب انہوں نے وجہ بتائی تو میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔

گزشتہ روز میرے پاس سے جانے کے بعد انہوں نے اپنے کزن سے ویسپا اسکوٹر مستعار لیا اور اس پر سوار ہو کر ماما لالا سے ملنے چلے گئے۔

"میرا خیال تھا کہ ہم اس کے شوہر کی لکھی ہوئی کہانی کے بارے میں کچھ مزید تفصیلات معلوم کر سکیں گے اور......"

"تم نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ شاید وہ اس کہانی کو خریدنے میں دلچسپی ظاہر کرے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی۔"

"وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مادام ہال موجود نہیں ہیں اور فی الوقت وہ امریکا گئی ہوئی ہیں البتہ ہاؤس کیپر سے ملاقات ہو گئی۔ ہم اس سے باتیں کر ہی رہے تھے کہ ہم نے ایک کار کو آتے دیکھا۔" یہ کہہ کر پیپو خاموش ہو گیا۔

"وہ بروٹس تھا۔" ایلیسا نے بات مکمل کی۔

"اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اسے دیکھتے ہی ہم باورچی خانے میں چھپ گئے اور ہاؤس کیپر اس سے سیڑھیوں پر ہی کھڑے ہو کر بات کرنے لگی۔ ہم ان کی ساری گفتگو سن رہے تھے۔ ہاؤس کیپر کو اس کا آنا اچھا نہ لگا اور اس نے بڑے روکھے لہجے میں اسے بتا دیا کہ مادام ہال امریکا گئی ہوئی ہیں۔ ہم اس کی آمد کا مقصد سمجھ گئے تھے۔ وہ یقیناً چاہ رہا ہو گا کہ مادام ہال یا ان کے خاندان کے کسی فرد کو بتا دے کہ کہانی کا مسودہ اس کے پاس ہے اور اس نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ سب سے پہلے یہی لوگ اسے خریدنا چاہیں گے۔"

''مادام ہال کے خاندان کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟''میں نے نجس سے پوچھا۔

''اس کی بیٹی کی شادی ایک امیر کبیر امریکی سے ہوئی ہے اور وہ مادام ہال کے گھر کے پیچھے واقع پہاڑی کے دامن میں رہتی ہے۔اس کے علاوہ اس کا بیٹا بھی مشہور فلم ڈائریکٹر ہے۔''

''کونارڈ۔''اچانک ہی میرے ذہن میں اس کا نام آگیا۔''کونی ہال، وہ کیمرا مین ہے کیونکہ فلم کی عکس بندی وہی کرتا ہے اس لیے لوگ اسے فلم ڈائریکٹر سمجھنے لگتے ہیں۔''

''مجھے اس سے مطلب نہیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔''ایلیسا بولی۔''جب بروئس نے ان دونوں کے بارے میں پوچھا تو نومی نے صاف کہہ دیا کہ وہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اس کا کورا سا جواب سن کر وہ خاموش ہو کر چلا گیا۔''

''کیا وہ دونوں بھی امریکا میں ہیں؟''

ایلیسا نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔''نومی نے تو یہی بتایا تھا۔فرض کرو اگر وہ یہیں ہیں تب بھی ان سے ملنا بہت مشکل ہے۔''

''ٹھیک ہے۔میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔تمہیں اس کی فروخت سے جو آمدنی ہوگی اس کا پندرہ فی صد میں لوں گا جو کسی طرح بھی بیس ہزار فرانک سے کم نہیں ہونا چاہیے۔''

ایلیسا نے یہ سن کر ناک بھوں چڑھائی لیکن بیو فوراً بولا۔''ہمیں منظور ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں معاہدہ تیار کر لیتا ہوں جس کے مطابق تم میری خدمات لٹریری ایجنٹ کے طور پر حاصل کر رہے ہو۔''

''لیکن تم تو سراغ رساں ہو؟''ایلیسا نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں لیکن اپنے آپ کو ایجنٹ ظاہر کروں گا۔ میرے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔''

☆☆☆

دو سال پہلے جب میں اپنا کام جمانے کی کوشش کر رہا تھا تو ان دنوں میں نے مختلف ہوٹلوں کے بھی چکر لگائے کہ شاید مجھے سیکیورٹی سے متعلق کوئی کام مل جائے۔ ایک دن میں رائل تاہیتی میں اس کے انگریز منیجر کے ساتھ بیٹھا بیئر سے شغل کر رہا تھا کہ ایک خوش پوش خاتون ایک نوجوان شخص کے ساتھ وہاں آگئی۔ انہیں دیکھتے ہی منیجر اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ منیجر نے میرا ان دونوں سے تعارف ... کروایا۔ وہ

مسز ہال اور ان کا بیٹا کونارڈ تھے۔ جب کونارڈ کو معلوم ہوا کہ میں ایک سراغ رساں ہوں تو اس نے مجھے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا کہ میں کسی وقت اسے فون کر لوں۔ شاید وہ مجھ سے کوئی کام لینا چاہ رہا تھا۔

چند دنوں بعد میں شہر سے پچیس میل دور کونارڈ کے چھوٹے سے جزیرے پر پہنچ گیا۔ یہ زمین مسٹر ہال نے 1930ء میں خرید کر کونارڈ کے نام کر دی تھی۔ کونارڈ نے وہاں مقامی طرز کا ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر تعمیر کیا تھا۔ ویک اینڈ گزارنے کے لیے یہ ایک اچھی جگہ تھی۔ اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کی ذمے داری پڑوس میں رہنے والے ایک مقامی شخص کو سونپ رکھی تھی لیکن اس کے باوجود اس گھر میں چوری کی چھوٹی موٹی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ کونارڈ کو شبہ تھا کہ ان وارداتوں میں مقامی پولیس کا کوئی فرد ملوث ہے لہٰذا اس نے اسی لیے مجھے وہاں آنے کی دعوت دی تھی تاکہ میں اس سلسلے میں کچھ کر سکوں۔ تین ہفتے کی تگ و دو کے بعد میں ان دو نو عمر لڑکیوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا جو رات کے وقت اپنی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر وہاں آتیں اور ان کے ہاتھ جو چیز لگتی وہ لے کر چلی جاتیں۔ کونارڈ بنیادی طور پر رحم دل شخص تھا لہٰذا اس نے ان لڑکیوں کی عمروں اور معصومیت سے متاثر ہو کر معمولی تنبیہ کے بعد انہیں چھوڑ دیا۔

میں نے وہ مسودہ حاصل کرنے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا اس میں کونارڈ کے گھر کو مرکزی اہمیت حاصل تھی لیکن اس سے پہلے میں یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ ان دنوں اپنے گھر میں نہیں ہے۔ یہ جاننے کے لیے میں نے اس کی بہن کے گھر فون کیا اور کونارڈ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ کئی ہفتے پہلے اپنی ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں امریکا جا چکا ہے اور آئندہ چند مہینوں تک اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس جانب سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے ایک اور ٹیلی فون کال کی۔

ایک گھنٹا بعد میں کرک کے ساتھ اس کے ہوٹل کے ٹیرس پر بیٹھا مشروب کے گھونٹ لے رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر تھوڑا سا حیران تو ضرور ہوا لیکن میں اسے فون پر بتا چکا تھا کہ اسے میرے منصوبے میں کیا کردار ادا کرنا ہے۔

''تم نے کچھ عرصہ قبل اپنے کسی جاننے والے کا تذکرہ کیا تھا جو بقول تمہارے میک اپ کرنے کا ماہر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے اس کی ضرورت پڑے گی۔''

کرک کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ عمر کے کسی حصے میں اس

کا ایکٹر بننے کا خواب پورا ہوسکتا ہے۔ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا یہ ممکن ہے؟''

''شاید! لیکن تم کن سوچوں میں پڑ گئے؟''

''میں یہ کردار کرنا پسند کروں گا۔'' وہ پرجوش انداز میں بولا۔ ''تم تو جانتے ہی ہو کہ میں اب بھی ایکٹر بننے کا خواب دیکھتا رہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے مزید ڈرنکس اور اسنیکس کا آرڈر دیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا نام جمی ٹیلر ہے۔ تم نے اکثر اسے سفید رنگ کی کیڈی لاک چلاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔''

''ممکن ہے کہ دیکھا ہو لیکن اسے جانتا نہیں ہوں۔''

''وہ ایم جی ایم کے یونٹ کے ساتھ کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں یہاں آیا تھا پھر اس نے ایک مقامی لڑکی سے شادی کرلی اور یہیں رہنے لگا۔ وہ وارڈ روب ماسٹر ہونے کے ساتھ میک اپ بھی کیا کرتا تھا۔ شاید تمہیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ فلم اسٹار رابرٹ ٹیلر کا بھائی ہے۔''

''پھر تو وہ ہمارے کام آسکتا ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

دوسری صبح کرک نے مجھے فون کر کے بتایا کہ اس نے جمی ٹیلر سے بات کرلی ہے اور اس کے پاس ہماری ضرورت کا تمام سامان موجود ہے۔

''زبردست۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ اب تک سب کچھ میرے منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا لیکن اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ابھی مجھے اور بھی بہت کچھ کرنا تھا لہٰذا میں نے کرک سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ابھی تو میں الفریڈو کے پاس جا رہا ہوں اس کے بعد تم سے ملوں گا۔''

تاہیٹی میں شراب کی دکانوں پر منشیات بھی دواؤں کی آڑ میں فروخت کی جاتی ہیں۔ الفریڈو کی بھی ایسی ہی فارمیسی شاپ تھی جسے وہ اپنی خوب صورت چینی بیوی کی مدد سے چلا رہا تھا۔ میں نے کچھ معاملات میں اس کی مدد کی تھی جس کی وجہ سے وہ میرا ممنون رہا کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس سے جو مانگوں گا وہ انکار نہیں کرے گا۔ اس وقت بھی میں اس کی دکان کے عقب میں بنے ہوئے چھوٹے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ رسمی ہائے ہیلو کے بعد میں نے اس سے اپنی ضرورت بیان کی۔

''مجھے دو ایسی بوتلیں چاہئیں جن میں اٹھانوے فی صد الکحل ہو۔''

اس نے مجھے چونک کر دیکھا پھر قہقہہ لگاتے ہوئے

بولا۔ ’’مجھے یقین نہیں آرہا کہ تمہیں ان چیزوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔‘‘

میں جواب میں مسکرا دیا۔ ڈر تھا کہ کہیں میرے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے جو الفریڈو کے لیے شک کا سبب بنے۔ اس لیے میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

’’تم یہاں میرا انتظار کرو۔‘‘ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک بیگ تھا جس میں تین بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں دو بوتلیں بڑی اور ایک چھوٹی تھی۔

’’اس چھوٹی بوتل میں کیا ہے؟‘‘

’’گلیسرین۔ اس کا ایک چمچ تم اپنے گلاس میں ڈالو۔ یہ ایک بے ذائقہ محلول ہے اور اس کی بدولت الکحل بڑی تیزی سے تمہارے خون میں سرایت کر جاتی ہے۔‘‘

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے دکان سے باہر آگیا۔

☆☆☆

میں اپنے دفتر میں بیٹھا صبح کا اخبار پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ایک نیا گاہک دفتر میں داخل ہوا۔ وہ طویل قامت، گنجا اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔

’’اندر آجاؤ موسیو۔‘‘ میں نے اپنی جگہ پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ’’میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟‘‘

’’میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جب ہم کونارڈ کے گھر میں داخل ہوں گے تو اس کا پڑوسی جسے اس نے مکان کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے رکھا ہے پولیس کو اطلاع تو نہیں دے گا؟‘‘

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ’’کرک۔‘‘

’’اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔‘‘ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

’’گویا یہ جمی ٹیلر کا کارنامہ ہے؟‘‘

’’میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ میک اپ کے فن میں ماہر ہے۔‘‘

’’وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’تم نے اسے کیا بتایا تھا کہ یہ لباس اور روپ کس لیے چاہیے؟‘‘

’’میں نے اسے بتایا تھا کہ اسپورٹس کلب کے ایک ڈرامے میں یہ رول کر رہا ہوں۔‘‘

’’بہت خوب۔‘‘ میں نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ’’اب میں تمہیں آگے کا پروگرام سمجھاتا ہوں۔ میں بروٹس کو لے کر رات ساڑھے نو بجے آفیسرز کلب آؤں گا۔ میں نے اسے یقین دلا دیا ہے کہ ہال فیلی وہ مسودہ دیکھنا چاہتی ہے اور یہ کہ اس موقع پر میں بھی موجود رہوں گا کیونکہ انہوں نے میری خدمات باڈی گارڈ کے طور پر حاصل کر لی ہیں۔ یہ مسودہ بے حد قیمتی اور نایاب ہے۔ اس لیے وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔‘‘

’’کیا اس نے باڈی گارڈ والی کہانی پر یقین کر لیا؟‘‘

’’کیوں نہیں۔ اس کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھی ہوئی ہے اور وہ جلد از جلد اس مسودے کو بیچ کر پیسے کمانا چاہ رہا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ مسٹر ہال لال اینجلس سے روانہ ہو چکے ہیں لیکن شام سے پہلے جزیرے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔‘‘

’’تم بے فکر رہو۔ میں نو بجے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔‘‘

☆☆☆

’’آؤ، آؤ موسیو۔‘‘ کرک نے خالص فرانسیسی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ’’تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ آؤ یہاں بیٹھو۔‘‘

اس نے دو کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جن کے درمیان میں ایک چھوٹی سی گول میز بھی رکھی ہوئی تھی۔

’’میں نے تمہارے لیے ایک خاص مشروب کا اہتمام کیا ہے اور دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تاہیٹی میں اس سے بہتر شراب نہیں مل سکتی۔ یہ بہت خوش ذائقہ ہے کیا میں تمہارے لیے ایک گلاس تیار کروں؟‘‘

’’ہاں ہاں، کیوں نہیں۔‘‘ بروٹس نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔ ’’بہتر ہوگا کہ پہلے ایک نظر کہانی پر ڈال لو۔‘‘

’’بالکل۔‘‘ یہ کہہ کر وہ میری جانب متوجہ ہوا۔ ’’کونیلی! فریج میں دو بوتلیں رکھی ہیں وہ لے آؤ اور ساتھ ہی تھوڑی سی برف بھی لیتے آنا۔‘‘

’’کیا میں مسودہ دیکھ سکتا ہوں؟‘‘ اس نے بروٹس سے کہا۔

’’ہاں یہ اس کی فوٹو کاپی ہے۔‘‘

’’لیکن تمہیں اصل مسودہ اپنے ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا۔‘‘ کرک نے تیز لہجے میں کہا۔

’’ہاں ہاں، وہ بھی ہے۔‘‘ بروٹس نے ایک بڑا لفافہ دکھاتے ہوئے کہا۔

جولائی 2015ء کے پاکیزہ کے خوش کُن انداز

کراچی

ماہنامہ

پاکیزہ

نگہت سیما کے ناول **اعتبارِ وفا** کی انکشافات سے پُر نئی قسط

قیصرہ حیات کا نیا سلسلے وار ناول ...... **آخری امید** بالکل ایک اچھوتے اور پُراثر بیان کے ساتھ

زندگی خاک نہ تھی ...... **شیریں حیدر** کا نیا منی ناول

متاعِ دل میں **نبیلہ ابر راجا** نے نمایاں کیے کچھ انوکھے رنگ

عبادات و معاملات کی اصل روح سے آگاہ کرتی **سارہ ملک** کی بے حد دلنشیں تحریر

خشیتِ الٰہی

پر **اختر شجاعت**

کا ایک پُرفکر مضمون

اس کے علاوہ پڑھیے **فرحین اظفر** ، **نگہت اعظمی** ، **سحرش رانی**، **غزالہ عزیز**، **بشریٰ گوندل**، **سویرا فلک**، **ریحانہ حسن**، **نور عین** و دیگر مایہ ناز رائٹرز کی پُرلطف کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ معلومات اور تفریح سے پُر مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

اس دوران میں فریج سے بوتلیں اور دو خالی گلاس لے کر آ گیا۔ میں نے دو گلاسوں میں شراب انڈیلی اور ٹرے ان کے آگے رکھ دی۔ کرک نے اپنا گلاس اٹھایا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے پہلے میں ایک نظر فوٹو کاپی پر ڈال لوں بعد میں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اصل مسودہ بھی دیکھ لوں گا۔ تم جانتے ہو مسٹر کہ اس معاملے میں احتیاط کتنی ضروری ہے کیونکہ ہم اس کے عوض ایک خطیر رقم ادا کریں گے۔ تم جب تک مشروب سے دل بہلاؤ۔''

یہ کہہ کر اس نے مسودے کا پہلا صفحہ پڑھنا شروع کر دیا۔ بروٹس نے اپنا گلاس اٹھایا۔ اس نے پہلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ میں بول پڑا۔ ''موسیو، شاید یہ مشروب کچھ تیز ہو اس لیے تمہیں بھی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔''

بروٹس نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کرتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ایک گلاس اور......''

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ کرک آہستہ آہستہ مسودے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس طرح سوا گھنٹا گزر گیا۔ میں مستعدی سے اس کے پیچھے کھڑا باڈی گارڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میرا کام صرف یہ تھا کہ جیسے ہی بروٹس کا گلاس خالی ہو، اسے دوبارہ بھر دوں۔ وہ ایک کے بعد ایک گلاس چڑھاتا رہا۔ لگتا تھا جیسے وہ شراب نہیں سادہ پانی پی رہا ہو لمحہ بھر کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں الفریڈو نے مجھے غلطی سے الکحل کے بجائے منرل واٹر کی بوتلیں تو نہیں پکڑا دیں۔ میں بار بار بروٹس کو دیکھتا لیکن اس پر ذرا بھی نشہ طاری نہیں ہوا تھا۔

بالآخر کرک نے مسودے کا آخری صفحہ ختم کیا اور پرجوش لہجے میں بولا۔ ''واقعی زبردست کہانی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ڈیڈی نے اس سے بہتر کہانی نہیں لکھی ہوگی۔'' اس نے اپنا گلاس اٹھا کر ایک ہلکا سا گھونٹ لیا اور بولا۔ ''موسیو، میں اصل مسودہ بھی دیکھنا چاہوں گا۔''

''کیا تم رقم لائے ہو؟'' بروٹس نے کہا۔

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔'' نقلی کونارڈ ہال یعنی کرک نے کہا۔ ''کونیلی انہیں رقم دکھا دو۔''

میں نے اپنی جیب سے ایک بھاری بھر کم لفافہ نکال کر اسے دکھایا جس میں پانچ ہزار فرانک کے نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ بروٹس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک ابھری اور اس نے اصل مسودہ کرک کو پکڑا دیا۔

''بہت خوب۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''کونیلی! ہمارے دوست کو ایک اور ڈرنک پیش کرو۔'' میں نے حکم کی تعمیل کی اور بروٹس نے لپک کر گلاس تھام لیا۔ کرک نے مسودے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا۔

''ہاں، یہی اصل مسودہ ہے اس پر ڈیڈی کے دستخط بھی ہیں۔ میں اسے ضرور خریدوں گا، کیوں نہ اس خوشی میں ایک اور شراب کا دور ہو جائے۔''

بروٹس بہت زیادہ پی چکا تھا۔ اس کے باوجود اس نے نیا گلاس اٹھایا اور لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔ ''جیمس نارمن ہال کے نام......''

یہ کہہ کر اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور ایک ہی گھونٹ میں پورا گلاس خالی کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سر کرسی کی پشت سے جا لگا۔ وہ مکمل طور پر مدہوش ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں اور منہ کھلا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ نیچے کی جانب جھول رہے تھے۔

''بہت سخت جان نکلا۔'' میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

اس کے بھاری بھر کم جسم کو گھسیٹ کر کار تک لانے میں ہم دونوں کو کافی جدوجہد کرنا پڑی۔ کار کی سیٹ پر ڈالنے کے بعد میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی تو اس کے بٹوے سے پانچ یا چھ ہزار فرانک کے نوٹ برآمد ہوئے جنہیں میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے چلتے وقت کرک کو ہدایت کی کہ وہ مکان کو تالا لگا کر اپنے ہوٹل پہنچ جائے۔ اب میرا رخ شہر کی جانب تھا۔ چند منٹ بعد مجھے بروٹس کے خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ میں کسی ایسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا جہاں اسے پھینک سکوں اور یہ کام مجھے اس کے ہوش میں آنے سے پہلے کرنا تھا۔

پندرہ منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد میری نظر ناریل کے درختوں میں گھرے ایک ریستوران پر پڑی۔ رات کی تاریکی میں اس کا نیون سائن وہاں سے گزرنے والوں کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا پھر میں نے شہر سے آنے والی دو کاروں کو اس جانب جاتے دیکھا تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ تین چار سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بڑی پارکنگ لاٹ میں پہنچے جہاں پہلے سے ایک درجن کے قریب گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنی کار نسبتاً تاریک گوشے میں پارک کی اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک درخت کے تنے کے ساتھ مجھے جلتے سگریٹوں کی روشنی

دکھائی دی۔ میں نے اپنی جیب سے برونس کے نوٹ نکالے اور انہیں فضا میں لہرانے لگا۔ فوراً ہی پانچ لڑکیاں دوڑتی ہوئی آئیں اور میری کار میں جھانکنے لگیں۔

''میرا دوست تفریح کی غرض سے یہاں آیا ہے۔'' میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔''تم سب میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی لیکن فی الحال اسے نیند آ گئی ہے۔ اگر تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ تمہارا وقت بھی اچھا گزرے گا۔'' اس کے بعد میں نے ان پانچوں لڑکیوں کو ہزار ہزار فرانک کے نوٹ دیے۔ ان میں سے ایک لڑکی نے سیلیوٹ کرنے کے انداز میں مجھے سلام کیا اور پھر ان سب نے مل کر برونس کو کار سے باہر نکال لیا۔ اس کے بعد میرا وہاں رکنا بے کار تھا۔ پارکنگ لاٹ سے گاڑی باہر نکالتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ لڑکیاں برونس کو سہارا دیے ہوئے جھاڑیوں کی طرف لے جا رہی ہیں۔

میں تقریباً رات تین بجے کے قریب گھر پہنچا۔ بہت تھک چکا تھا۔ سب سے پہلے شاور لے کر لباس تبدیل کیا اور فریج سے ایک ٹھنڈی بیئر نکال کر پینے لگا۔ جب میرے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے تو دوبارہ کار میں سوار ہو کر قریبی پبلک ٹیلی فون کی جانب چل دیا۔ وہاں سے جا کر میں نے مقامی فوجی کمانڈر کو ایک گمنام ٹیلی فون کال کی وہ بے چارہ دن بھر کا تھکا ہارا سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹا ہی تھا لیکن میری کال سن کر اس کی نیند اڑ گئی۔

صبح ریڈیو پر برونس کے بارے میں خبر سن کر میری جان میں جان آئی۔ اسے فوجیوں نے نیم برہنہ حالت میں جھاڑیوں سے برآمد کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ خراٹے لے رہا تھا۔ اس کی ڈاڑھی مونچھیں صاف ہو چکی تھیں۔ کپڑے، جوتے اور بٹوہ غائب تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک زیر جامہ ہی باقی رہ گیا تھا اور برہنہ پشت پر سرخ اور گلابی لپ اسٹک سے نازیبا القابات لکھے ہوئے تھے۔ فوجیوں نے اسے فوری طور پر اپنے مرکزی اڈے پر منتقل کیا اور جب اس کی حالت معمول پر آ گئی تو اسے کسی دوسرے مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اسے کہاں بھیجا گیا۔ بہرحال اس واقعے کے بعد وہ اس شہر میں نظر نہیں آیا۔

مسودہ ملنے کے تین ماہ بعد میرا حقیقی کونارڈ ہال سے رابطہ ہو گیا اور میں نے مسودہ اس کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس طرح لٹریری ایجنٹ کے طور پر مجھے پندرہ فی صد کمیشن ملا جو اٹھاون ہزار فرانک سے کچھ زیادہ تھا۔ یہ رقم میرے اندازے سے بڑھ کر تھی اور جب میں نے بپو اور ایلیسا سے معاہدہ کیا تھا تو نہیں جانتا تھا کہ میرے حصے میں اتنی بڑی رقم آئے گی۔ دو ہفتے بعد ہال نے مجھے فون کر کے بتایا کہ اس کے باپ کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی ہے اور دی اٹلانٹک منتھلی نے اس کہانی کو اپنی قریبی اشاعت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ میں نے اس کہانی کا اصل مسودہ اس کے حوالے کر کے بہت بڑا احسان کیا ہے اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش اسے اصل حقیقت کا کبھی پتا نہ چل سکے۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ جس مسودے کی خاطر اتنی تگ و دو ہوئی وہ نامکمل تھی۔ جب میں نے اس پر سرسری نظر ڈالی تو اندازہ ہو گیا کہ مسٹر ہال اس کہانی کا کلائمکس نہیں لکھ پائے تھے۔ جب انہیں پرل ہاربر پر جاپانیوں کے حملے کی خبر ملی تو وہ طیش میں آ کر اس مسودے کو نذر آتش کرنے لگے تھے کہ ایلیسا کی نانی نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور ان سے وہ مسودہ لے لیا۔ وہ ان پڑھ عورت تھی اور اسے نہیں معلوم تھا کہ کہانی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ایلیسا نے اپنی جس دوست کو وہ مسودہ دکھایا تھا وہ بھی مسٹر ہال کی بہت بڑی پرستار تھی۔ اس نے پورا مسودہ پڑھے بغیر ہی ایلیسا کو مشورہ دے دیا کہ وہ اس کہانی کو فروخت کر کے اپنی شادی کے لیے ایک بڑی رقم حاصل کر سکتی ہے۔

میں نے اس کہانی کو بار بار پڑھا لیکن ہر بار میری مایوسی بڑھتی گئی۔ کلائمکس کے بغیر یہ کہانی بے کار تھی اور کوئی بھی اسے خریدنے پر تیار نہ ہوتا۔ اس طرح میری ساری محنت رائگاں چلی جاتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایلیسا کے خواب بکھر جاتے۔ پھر میں نے ایک کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گو کہ میں کبھی مسٹر ہال سے نہیں ملا تھا اور نہ ہی ان کی کوئی تحریر میری نظر سے گزری تھی لیکن یہ کہانی پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی لہٰذا میں نے قلم اٹھایا اور آخری صفحات لکھنا شروع کر دیے۔ جب مسودہ مکمل ہوا اور میں نے اسے پڑھا تو یقین آ گیا کہ مسٹر ہال نے بھی اس کا یہی انجام سوچا ہوگا اور وہ بھی اسے اسی انداز میں لکھتے۔ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی کہ یہ سب میرے تخیل کا نتیجہ تھا اور میں اس کہانی کو مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

مرزا امجد بیگ

سوا سیر

کبھی کبھی اپنی دانست میں کوئی کام صحیح ہونے کے باوجود انتہائی غلط اقدام تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ ایک ایسا کام جس کے نتیجے میں انجام خطرناک اور مستقبل تباہ ہو جائے اسے کسی طور درست نہیں مانا جاسکتا۔ بے شک اس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ تھا جبکہ مسئلہ بھی انتہائی سنگین تھا مگر اس کا حل ہرگز یہ نہ تھا جو اس نے اپنے تئیں نکالا۔ سونے پر سہاگا مرزا امجد بیگ نے بھی اپنے فن سے کھرا اور کھوٹا سب کے سامنے لا کھڑا کیا اور یہ ان کے شعور و ہنر کا کمال تھا کہ ہزار نقابوں کے باوجود اصل مجرم کو بے نقاب کرتے ہوئے ایسے حقائق سامنے لائے کہ ہر آنکھ میں حیرانی لہرانے لگی۔

عزت کے پاسبان کے ہاتھوں ایک

خونی واردات کا احوال

دنیا میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں جن میں سے اکثر آپ کے مزاج پر پورے نہیں اترتے۔ ہم خیال اور ہم مزاج افراد کی تلاش میں اگر آپ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب کا سفر طے کریں تو ممکن ہے، آپ کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے اور اس بات کا بھی اغلب امکان ہے کہ چند روز یا چند ماہ کے بعد آپ یہ کہتے ہوئے سنے جائیں کہ آپ کو جانچنے اور پہچاننے میں غلطی لگی ہے، مذکورہ بندہ آپ کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا لہٰذا...... جو ہے، جہاں ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر اگر نباہ کرنے کی کوشش کی جائے تو بھلی بری ہنسی خوشی گزر جاتی ہے یا پھر ''تنگ آمد بہ جنگ آمد'' کے مصداق اس فارمولے پر عمل کرنا چاہیے۔ تعلق روگ بن جائے تو اسے توڑنا اچھا!

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

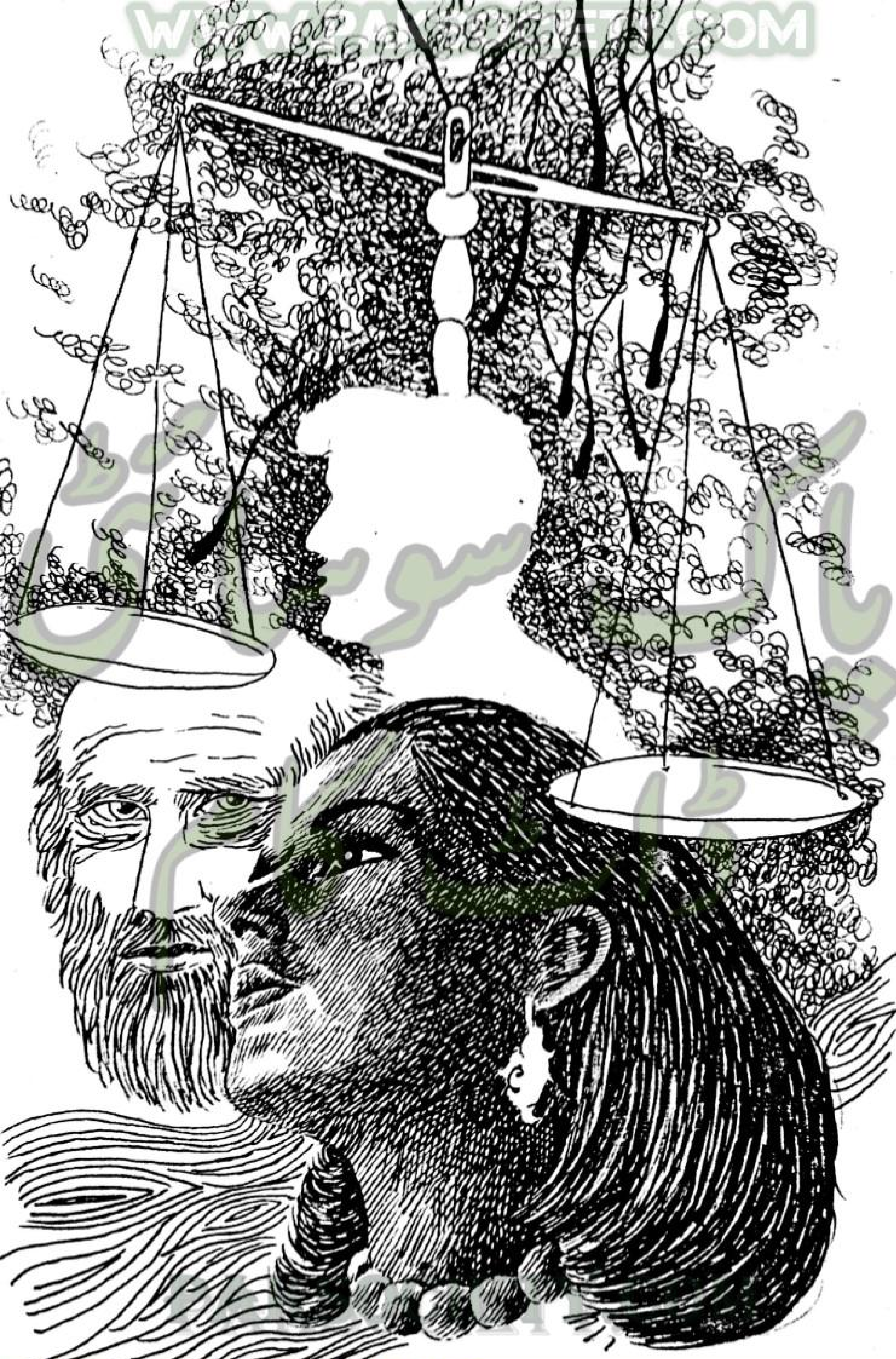
آج میں آپ کی نذر، جس کیس کی روداد کر رہا ہوں وہ ہمارے معاشرے کا ایک جیتا جاگتا المیہ ہے۔ ''کرے کوئی اور بھرے کوئی'' کی مثال آپ نے اکثر سنی ہوگی۔ اس کہانی میں آپ کو مذکورہ کہاوت کی عملی تفسیر پڑھنے کو ملے گی۔

کیس کو عدالت میں لگے لگ بھگ پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ ابتدائی چند پیشیوں میں تمام ٹیکنیکل معاملات کو نمٹایا جاچکا تھا۔ عدالتی کارروائی کے شروع کے مراحل اتنے خشک اور بور ہوتے ہیں کہ میں نے ان کی تفصیل بیان کرنے سے ہمیشہ احتراز برتا ہے۔ آج بھی اسی روش پر چلتے ہوئے میں آپ کو کیس کے زندہ اور دلچسپ حصے کی طرف لیے چلتا ہوں۔

کیس کی باقاعدہ سماعت ماہ ستمبر میں ہوئی۔ جج کرسیِ انصاف پر براجمان ہو چکا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم ریاض نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے آٹھ سے زیادہ گواہوں کی فہرست عدالت میں دائر کی گئی تھی لیکن یہاں پر انہی گواہوں کے حوالے سے عدالتی کارروائی کا بیان کروں گا جن کی کیس کی مناسبت سے کوئی اہمیت ہوگی۔

استغاثہ کا پہلا گواہ محمد سالک کٹہرے میں آکر کھڑا



ہوا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔

محمد سالک کا تعلق کورنگی کے اسی علاقے سے تھا جہاں میرا مؤکل اور مقتول رہائش پذیر تھے۔ میرا مؤکل ریاض اور مقتول ساجد تو ایک ہی عمارت کے رہائشی تھے۔ مذکورہ عمارت تین منزلہ تھی اور ہر منزل پر دو دو چھوٹے گھر بنے ہوئے تھے۔ آپ انہیں ''فلیٹس'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ استغاثہ کا گواہ محمد سالک بھی اسی گلی میں رہتا تھا یعنی وہ مقتول اور ملزم کا محلے دار تھا۔ گلی کے نکڑ پر ہی اس کی پان سگریٹ کی دکان تھی۔

سالک کی عمر سینتالیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ بھاری بدن کا مالک ایک میانہ قامت شخص تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔

وکیلِ استغاثہ نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے خاصی کراری آواز میں سوال کیا۔ ''سالک! کیا آپ اس نوجوان کو جانتے ہو؟''

وکیلِ استغاثہ کا واضح اشارہ اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) میں کھڑے اس کیس کے ملزم اور میرے مؤکل ریاض کی جانب تھا۔ کسی بھی کیس کی سماعت کے دوران میں ملزم کی حیثیت اور حالت بے چارگی اور بے بسی کا مرقع ہوتی ہے۔ اسے سب کی اچھی بری، تلخ ترش سر جھکا کر خاموشی سے سننا پڑتی ہے اور اپنے خلاف کسی بھی سخت ریمارکس پر کسی جارحانہ عمل کا مظاہرہ نہیں کرنا ہوتا۔ اس کی طرف آنے والے ہر تیر کو وکیلِ صفائی اپنے دلائل کی ڈھال پر لیتا ہے۔

''جی...... میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔'' سالک نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''ملزم کس فطرت کا مالک ہے؟''

''فطرت......!'' گواہ نے الجھن زدہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

''میرا مطلب ہے......'' وکیل استغاثہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ملزم کی عادات اور مزاج کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟''

''جناب! جہاں تک عادت وغیرہ کا تعلق ہے تو یہ ایک پھڈے باز اور آوارہ گرد قسم کا شخص ہے۔'' گواہ نے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''اور مزاج کا تو کچھ نہ پوچھیں جی......!''

''کیوں نہ پوچھیں جی!'' وکیل استغاثہ نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔ ''جب عادت کا بتایا ہے تو مزاج کا بھی بتانا ہوگا؟''

''یہ بندہ شاہانہ مزاج کا مالک ہے وکیل صاحب!'' استغاثہ کے گواہ محمد سالک نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن میری نظر میں بے غیرت درجۂ اول......''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وکیل استغاثہ نے گواہ کے چٹکی لی۔

''جناب! اس کا بوڑھا باپ نہاری کے ایک ہوٹل میں بیرا گیری کرتا ہے۔'' گواہ سالک نے خفگی بھرے انداز میں ملزم کی طرف دیکھا۔ ''اور یہ بے شرم سارا دن آوارہ کتوں کی طرح علاقے میں ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔''

''آرڈر...... آرڈر......!'' جج نے اپنا مخصوص ہتھوڑا بجا کر استغاثہ کے گواہ محمد سالک کو تنبیہ کی۔ ''کسی بھی بات کو منہ سے نکالنے سے پہلے الفاظ کے چناؤ پر دھیان دیا جائے تا کہ عدالت کا وقار مجروح نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' گواہ نے معذرت خواہانہ انداز میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے بیان کو ان الفاظ میں مکمل کردیا۔ ''میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ملزم ماشاءاللہ صحت مند اور جوان ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی سلامت ہیں۔ اسے چاہیے کہ بوڑھے باپ کی مدد کرے لیکن اس شہزادے کو تو لڑائی جھگڑے ہی سے فرصت نہیں۔''

''ہوں......'' وکیل استغاثہ نے بڑے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا۔ ''ملزم آوارہ، جھگڑالو اور غصہ ور ہے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے کے بعد سوچتی ہوئی نظر سے گواہ کو دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''اگر میں غلط نہیں کہہ رہا تو وقوعہ سے ہفتہ بھر پہلے آپ کی دکان کے سامنے مقتول اور ملزم کے درمیان شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا اور نوبت ہاتھا پائی و دست و گریبان تک جا پہنچی تھی؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!'' استغاثہ کے گواہ نے تصدیقی انداز میں سر کو جنبش دی۔ ''یہ دونوں گتھم گتھا ہو رہے تھے اور بڑے وحشیانہ انداز میں ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ ان کا تماشا دیکھنے کے لیے میری دکان کے قریب درجن بھر افراد جمع ہوگئے تھے۔ جب ان کی لڑائی خون ریزی میں بدلنے لگی تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے انہیں چھڑا دیا تھا۔''

استغاثہ کا گواہ ملزم اور مقتول کے بیچ برپا ہونے والے فساد کی تفصیلی منظرکشی کر چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"کیا یہ درست ہے کہ اس لڑائی میں زیادہ نقصان ملزم ہی کو پہنچا تھا۔ مقتول نے بڑی بے دردی سے اس کی پٹائی کی تھی۔ ملزم کے ہونٹوں اور چہرے کے دیگر حصوں سے خون نکل آیا تھا۔ اس کی قمیص کا گریبان بھی دامن تک پھٹ گیا تھا؟"

"جی ہاں، آپ کی معلومات سو فیصد درست ہیں۔"
گواہ نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

"اس موقع پر ملزم نے کیا ردعمل ظاہر کیا تھا؟" وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

"شدید اور خطرناک ردعمل۔" گواہ نے آنکھیں پھیلا کر جواب دیا۔ "پہلے تو یہ مقتول کو غلیظ گالیاں دیتا رہا پھر اس نے اسے خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دے ڈالی۔"

"خطرناک نتائج کی دھمکی!" وکیل استغاثہ نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا......؟"

گواہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ملزم نے مقتول کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بڑے خوف ناک انداز میں دھمکی دی تھی...... ساجد! تم نے ٹھیک نہیں کیا۔ میں آج کے واقعے کو بھولوں گا نہیں۔ دیکھ لینا، بہت جلد تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں تمہیں پچھتانے کا بھی موقع نہیں دوں گا۔"

"دیٹس آل یور آنر۔" وکیل استغاثہ نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے جرح ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ "ملزم کی اس خطرناک دھمکی کے چند روز بعد ہی مقتول کی موت واقع ہو جاتی ہے......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر کندھے اچکا کر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!"

اس کے بعد جج سے اجازت حاصل کر کے میں وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں جرح کا آغاز کیا۔

"سالک صاحب! کیا میں آپ سے ذاتی نوعیت کے چند سوالات پوچھ سکتا ہوں؟"

"ضرور پوچھیں۔" میرے نرمی بھرے دوستانہ انداز کے جواب میں وہ جلدی سے بولا۔ پھر محتاط لہجے میں پوچھا۔ "آپ کے سوالات کا تعلق زیر سماعت کیس ہی سے ہے نا؟"

"جی ہاں...... بالکل۔" میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔

وہ خاصا مطمئن دکھائی دینے لگا۔

میں نے گھسائی کے عمل کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"سالک صاحب! کیا آپ کی شادی ہو گئی ہے؟"

"جی...... الحمدللہ!......" وہ کراری آواز میں بولا۔ "ماشاءاللہ! میرے تین بچے بھی ہیں۔"

"دو بیٹیاں اور ایک بیٹا......!" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"بالکل درست۔" وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا، پھر پوچھا۔ "مگر یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوئی؟"

"معلومات جمع کرنے کے میرے اپنے خفیہ ذرائع ہیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ابھی تو آپ دیکھتے جائیں، میں کون کون سے انکشاف کرتا ہوں۔ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کا بیٹا بڑا ہے اور دونوں بیٹیاں اس سے چھوٹی......"

"کمال ہے......" وہ حیرت سے آنکھیں چوڑی کرتے ہوئے بولا۔ "آپ وکیل ہیں یا کوئی جاسوس؟"

"دونوں ہوں......" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنی جرح کا موڈ تبدیل کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "سالک صاحب! کیا ملزم سے آپ کی کوئی ذاتی رنجش یا دشمنی ہے؟"

"جی نہیں......" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"پھر آپ نے اسے بے غیرت درجۂ اول کیوں کہا؟" میں نے جارحانہ لہجے میں پوچھا۔ "اس کے علاوہ آپ نے ملزم کے لیے 'بے شرم اور آوارہ گرد' کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں...... آخر کیوں؟"

"میں اس کی وضاحت کر چکا ہوں جناب۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ "یہ دن بھر کچھ نہیں کرتا اور محلے کی گلیوں میں ادھر ادھر منڈلاتا نظر آتا ہے جبکہ اس کا بوڑھا باپ نہاری کے ایک ہوٹل میں ویٹری کرتا ہے۔ ملزم کو آوارہ گردی چھوڑ کر اپنے باپ کی بوڑھی ہڈیوں کا خیال کرنا چاہیے۔"

"کیا آپ ہڈیوں کے بغیر ہی بنے ہوئے ہیں؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ایسا کیوں کر ممکن ہے جناب۔" وہ حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "کوئی بھی انسان ہڈیوں کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔"

"پھر آپ کوئی مولوی صاحب ہوں گے۔" میں نے اپنے لہجے کی کاٹ کو برقرار رکھتے ہوئے پوچھا۔ "جس نے اصلاح معاشرہ کا ٹھیکا لے رکھا ہو۔ ہیں نا......؟"

''ایسی کوئی بات نہیں وکیل صاحب!'' وہ جزبز ہو کر بولا۔

میں نے تابڑتوڑ حملے جاری رکھے۔ ''اگر ایسا بھی نہیں ہے اور ویسا بھی نہیں ہے۔ جیسا، تیسا اور کیسا بھی نہیں ہے تو پھر...... آپ کو دوسروں کے گھروں میں جھانکنے کا شوق ہوگا؟''

''پتا نہیں، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔ ''یہ کس قسم کی جرح ہے......؟''

میں ایسے سوالات کی مدد سے استغاثہ کے گواہ کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنا چاہتا تھا اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن عین وقت پر وکیل استغاثہ نے ہمارے بیچ کود کر سارا مزہ کنکریلا کر دیا۔

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ کی چیخ سے مشابہ آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔ ''میرے فاضل دوست غیر متعلقہ سوالات کی مدد سے استغاثہ کے معزز گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکات سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

جج نے وکیل استغاثہ کی بات کو اہمیت دیتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا۔ ''وکیل صاحب! آپ کے سوالات کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق بنتا ہے؟''

''یس سر!'' میں نے سر کی ہلکی سی اثباتی جنبش کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں نے ابھی تک استغاثہ کے گواہ سے ایک بھی غیر متعلقہ یا غیر ضروری سوال نہیں کیا اور......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور میں پوچھی گئی ہر بات کو معزز عدالت کے روبرو ثابت بھی کر سکتا ہوں۔''

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔'' جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کو کہا۔

میں دوبارہ وٹنس باکس کی جانب متوجہ ہو گیا اور استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔ ''سالک صاحب! ابھی تک آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

''کون سا سوال؟'' وہ جیسے نیند سے بیدار ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے بھی تفریح کے انداز میں وضاحت کر دی۔ ''وہی...... دوسروں کے گھروں میں آپ کا جھانکنے کا شوق؟''

''نہیں جناب۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کسی کے گھر میں جھانکنے کا کوئی شوق نہیں۔''

''آپ کو کسی کے گھر میں جھانکنے کا شوق نہیں۔'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے معاشرے کی اصلاح کا بیڑا ابھی نہیں اٹھا رکھا اور...... آپ ہڈیوں کے بغیر بھی بنے ہوئے نہیں ہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی ہاں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''اگر میں صحیح کہہ رہا ہوں تو پھر......'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کو ملزم کے باپ کی بوڑھی ہڈیوں کا اتنا خیال کیوں ہے...... ملزم کی آوارہ گردی کا ملال کیوں ہے؟''

''جناب! میں نے تو ایک حق سچ بات کی تھی۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''میری طرف سے یہ باپ بیٹا دونوں جائیں جہنم میں۔''

''جہنم اور جنت میں کوئی اپنی مرضی سے جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کسی کو زبردستی بھیج سکتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور جہاں تک تعلق ہے حق سچ بات کا تو...... یہ حق سچ آپ کو اپنے گھر میں نظر کیوں نہیں آتا؟''

''جی...... کیا مطلب؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''مطلب یہ کہ......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بوڑھی ہڈیوں والا معاملہ تو آپ کے ساتھ بھی ہے اور آپ کا سپوت کاشف بھی جوانِ جہان اور ماشاءاللہ صحت مند بھی ہے۔ وہ آپ کا ہاتھ کیوں نہیں بٹاتا۔ اگر میں اس کے بارے میں یہ کہوں کہ ''نہ کام کا، نہ کاج کا۔ دشمن اناج کا'' تو یہ مناسب نہیں ہوگا اور یقیناً آپ کو بھی برا لگے گا۔''

مجھے جو بھی کہنا تھا وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں کہہ ڈالا تھا۔ میری معلومات کے مطابق سالک کا بیٹا کاشف خاصا ہٹا کٹا اور موٹا تازہ تھا۔ اس نے نہ تو تعلیم حاصل کی تھی اور نہ ہی کوئی کام وغیرہ کرتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک آوارہ نوجوان تھا۔

''اگر آپ کو یہ خیال ہوتا کہ مجھے اپنے بیٹے کے حوالے سے یہ الفاظ برے لگیں گے تو آپ ایسا کہتے ہی نہیں۔'' وہ بہ دستور خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''میرے کاشف اور ملزم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

''ہر ماں باپ کی نظر میں اس کی اولاد دودھ کی دھلی ہوتی ہے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''بہرحال...... ابھی تک آپ نے بتایا نہیں کہ ملزم سے آپ کی کیا دشمنی ہے؟''

''میں آپ کے سوال کا جواب دے چکا ہوں۔'' وہ

برہمی سے بولا۔

''کیا جواب؟''میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''یہی کہ میری ملزم سے کوئی دشمنی نہیں۔''

''پھر آپ ہاتھ دھوکر اس بے چارے کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔''میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔''آپ اس سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''وہ بھونچکا رہ گیا۔''میں بھلا ملزم سے نفرت کیوں کروں گا......؟''

''اس لیے کہ ملزم آپ کی چھوٹی بیٹی فوزیہ کو پسند کرتا ہے۔''میں نے سنسنی خیز انکشاف کرتے ہوئے کہا۔''وہ فوزیہ کو قانوناً، اخلاقاً اور شرعاً اپنانا چاہتا تھا اسی لیے اس نے آپ کے گھر اپنا رشتہ بھیجا تھا۔کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے وکیل استغاثہ کی مداخلت سے پہلے ہی...

بہ آواز بلند کہا۔''سالک صاحب! میں نے اس سلسلے میں بڑی تحقیق اور تفتیش کی ہے۔میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لیجیے گا۔میں اس سلسلے میں ٹھوس ثبوت بھی عدالت میں پیش کرسکتا ہوں۔''

''آپ......غلط نہیں کہہ رہے۔''وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔''ملزم نے میری چھوٹی بیٹی کے لیے رشتہ بھیجا تھا اور ہم نے اس رشتے سے انکار کردیا تھا۔بس اتنی سی بات ہے۔''

''بات اتنی سی نہیں ہے سالک صاحب!''میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''آپ لوگوں نے ملزم کے رشتے سے محض انکار نہیں کیا تھا بلکہ ملزم کے والدین کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ آپ لوگ پہلے بڑی بیٹی شازیہ کی شادی کریں گے لہٰذا اگر وہ ملزم اور شازیہ کی شادی کے لیے تیار ہوں تو ٹھیک ہے مگر چونکہ ملزم فوزیہ کو پسند کرتا تھا اور اپنی پسند کو بدلنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا بلکہ اس موقع پر ملزم نے ایک ایسی بات کردی تھی جس سے آپ کا پارہ چڑھ گیا اور اسی لمحے سے آپ ملزم سے نفرت کرنے لگے تھے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کو ناگوار گزرنے والی اس بات کا تذکرہ کرتا ہوں......''

''اس کی ضرورت نہیں بیگ صاحب!''وہ جلدی سے بولا۔''میں خود ہی اس نالائق کی بے ہودگی معزز عدالت کے سامنے رکھتا ہوں......''لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک مضمحل سی سانس لی پھر بتانے لگا۔

''اس بدبخت نے میری بڑی بیٹی شازیہ کے بارے میں کہا تھا کہ وہ بدصورت ہے اس لیے وہ کسی بھی قیمت پر شازیہ سے شادی نہیں کرے گا۔''

''یہ تو واقعی ملزم کی ایک غیر اخلاقی حرکت تھی۔''میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔''بلکہ اس موقع پر اس بے وقوف کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ فوزیہ چونکہ زیادہ خوب صورت ہے اس لیے یہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

استغاثہ کا گواہ سالک میری اس جرأت رندانہ پر کھا جانے والی نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔میں نے اس کی نگاہ کی پروا کیے بغیر کہا۔

''اسی دن سے آپ کو ملزم سے نفرت ہوگئی۔آپ اٹھتے بیٹھتے، ہر ملنے جلنے والے سے اس کی برائی کرنے لگے حتیٰ کہ......آپ کی یہ نفرت اتنے عروج کو پہنچ گئی کہ آپ نے اسے جھگڑالو، پھڈے باز اور پتا نہیں، کیا کچھ کہہ ڈالا۔ اس پر بھی آپ کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تو آج اس معصوم کے خلاف گواہی دینے عدالت بھی پہنچ گئے۔''

''میں نے جو کچھ دیکھا وہی بیان کیا ہے۔''وہ بات بناتے ہوئے بولا۔''صرف میرے ہی نہیں، وقوعہ کے روز درجن بھر افراد کے سامنے ملزم نے مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ...... بہت جلد تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

''اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ملزم نے اپنی''خمیازہ بھگتنے والی دھمکی''پر عمل کرتے ہوئے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے؟''میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''م......میں......کیا کہہ سکتا ہوں جناب......!''وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔''میں نے اپنی آنکھوں سے قتل کی یہ واردات ہوتے نہیں دیکھی۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ میرے مؤکل ہی نے مقتول ساجد کی جان لی ہوگی؟''

''جی......میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

میں نے اپنی جرح موقوف کرتے ہوئے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں ملزم اور مقتول کے خاندانی پس منظر اور اس کیس کے بارے میں آپ کو بتاتا چلوں تاکہ آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔واضح رہے کہ میں حاصل شدہ معلومات میں سے بہت سی غیر ضروری باتوں کو

حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

☆☆☆

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، ملزم اور مقتول دونوں کا تعلق کراچی کے ایک معروف علاقے ''کورنگی'' سے تھا۔ وہ دونوں ہی ایک تین منزلہ عمارت کے رہائشی تھے جس کی ہر منزل پر دو چھوٹے چھوٹے فلیٹس بنے ہوئے تھے۔ مقتول ساجد اپنی فیملی کے ساتھ فلیٹ نمبر دو میں رہتا تھا جبکہ ملزم کی رہائش اسی عمارت کی تیسری منزل کے فلیٹ نمبر چھ میں تھی۔ ملزم ریاض اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔

ملزم کی والدہ نرگس ایک گھریلو عورت تھی جبکہ اس کا باپ عبدالصمد نہاری والے ایک ہوٹل پر بیرا گیری کرتا تھا۔ مذکورہ ہوٹل کورنگی ہی کے علاقے میں مین روڈ پر واقع تھا۔ ملزم نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ وہ پڑھائی میں کوئی اچھا اسٹوڈنٹ نہیں تھا لہٰذا اس نے آگے تعلیم جاری رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کوشش نہ کرنے کا ایک سبب معاشی بھی تھا۔ ظاہر ہے، عبدالصمد کی اتنی آمدنی نہیں تھی کہ وہ بیٹے کے کالج کے اخراجات آسانی سے برداشت کر سکے۔ ملزم ریاض درمیانے قد اور بھرے ہوئے جسم کا مالک ایک سانولا شخص تھا جو کوئی ملازمت وغیرہ کر کے اپنے والد کا ہاتھ تو بٹانے کا خواہش مند تھا مگر اسے کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں ملتی تھی اور وہ اپنے باپ کی طرح ویٹری کرنے کے موڈ میں نہیں تھا، اسی لیے وہ یا تو گھر میں پڑا رہتا تھا یا پھر ادھر ادھر گشت پر رہتا تھا۔ اس کا یہی گھومنا پھرنا استغاثہ کی نظر میں ''آوارہ گردی'' ٹھہرا تھا۔

مقتول ساجد کے پاس تعلیم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اپنے بڑے بھائی ماجد کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ مقتول کا بھائی ماجد جامع کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے کی ایک بڑی دکان پر سیلز مین کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ وہ شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی عالیہ ایک ہاؤس وائف تھی۔ ان کی ایک پانچ سالہ بچی تھی جس کا نام کرن تھا۔ ماجد نے اپنے ایک جاننے والے کی دکان پر مقتول ساجد کو نوکری دلا دی تھی۔ مذکورہ دکان صدر کے جیولری بازار میں تھی اور ان کا میکنگ کا بھی کام تھا۔ مقتول ایک محنتی اور ایمان دار شخص تھا اس لیے اس کا سنار سیٹھ اس پر بہت بھروسا کرتا تھا۔ میں نے اس کیس کے عدالت میں لگنے سے لے کر اب تک ملزم کے حوالے سے جتنی بھی تحقیق کی تھی، اس میں ان دونوں کرداروں کے بیچ کسی نئی یا پرانی دشمنی کا نشان نہیں ملتا تھا۔ پھر ملزم نے جتنی تفصیل کے ساتھ مجھے اس تین منزلہ عمارت کے اندرونی حالات سے آگاہ کیا تھا، اس سے ملزم کی بے گناہی مسلم ہو جاتی تھی اور اس کی بے گناہی کو عدالت میں ثابت کرنا میری ذمے داری تھی۔

آئندہ پیشی سے قبل میں نے اپنے مؤکل اور اس کیس کے ملزم ریاض کے گھر جا کر اس کی والدہ نرگس سے ایک تفصیلی ملاقات کی۔ اس وقت ملزم کا باپ عبدالصمد اپنی ڈیوٹی پر تھا لہٰذا مجھے اطمینان سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ نرگس کی زبانی مجھے کام کی بہت سی باتیں معلوم ہوئیں خصوصاً استغاثہ کے بعض گواہوں کے حوالے سے اہم نکات میرے ہاتھ لگے تھے جنہیں میں عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مقامات پر استعمال کر سکتا تھا۔

نرگس بڑی دکھی عورت تھی۔ ریاض اس کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ گھوم پھر کر ایک ہی سوال پر آجاتی تھی۔

''وکیل صاحب! آپ سچ سچ بتائیں، میرا ریاض باعزت رہا ہو جائے گا نا؟''

میں نے بھی اسی کے انداز میں پوچھا۔ ''میں آپ کے سوال کا جواب بعد میں دوں گا۔ پہلے آپ مجھے ایک بات سچ سچ بتائیں۔''

''کیا......'' وہ آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ ''کون سی بات وکیل صاحب؟''

''کیا ریاض نے ساجد کو قتل کیا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

''نن...... نہیں!'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرا بیٹا قاتل نہیں۔ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا......''

''بس تو پھر آپ اللہ کی قدرت اور میری پیشہ ورانہ مہارت پر بھروسا رکھیں۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر ریاض بے گناہ اور بے قصور ہے تو وہ ضرور باعزت بری ہوگا۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے وکیل صاحب۔'' وہ تہ دل سے بولی۔

میں مزید کچھ دیر تک نرگس کے پاس بیٹھا پھر واپس آگیا۔

جب میں نرگس کے گھر کے دروازے سے نکل رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سامنے والے دروازے کے پیچھے کوئی موجود ہو۔ مذکورہ دروازہ نیم وا تھا اور نرگس کے دروازے کے عین سامنے پڑتا تھا۔ اس عمارت کی ہر منزل پر دو، دو فلیٹس بنے ہوئے تھے۔ وہ عمارت ایک سو بیس گز

(پانچ منزلہ) زمین پر تعمیر کی گئی تھی۔ یعنی ہر فلیٹ کے حصے میں ساٹھ گز آئے تھے۔ میری معلومات کے مطابق ہر فلیٹ کے دو چھوٹے کمرے اور ایک چھوٹا سا کامن تھا۔ عمارت کا ایک مین گیٹ تھا۔ اندر کی جانب پانچ فٹ جگہ چھوڑ کر عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ پہلے مین گیٹ سے اندر داخل ہونا پڑتا تھا۔ اس کے بعد ہر منزل پر آمنے سامنے دو فلیٹس پڑتے تھے اور ایک جانب سے زینہ اوپر کی طرف جاتا تھا۔

نرگس کے گھر سے نکل کر میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا تھا اور پھر آگے بڑھ گیا تھا۔ اسی ایک لمحے میں مجھے محسوس ہوا تھا کہ فلیٹ نمبر پانچ کے نیم وا دروازے کے عقب میں کوئی چھپا کھڑا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اس احساس کو اپنا وہم جانتے ہوئے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ اس رپورٹ کی روشنی میں مقتول ساجد کی موت سترہ اور اٹھارہ مارچ کی درمیانی رات واقع ہوئی تھی۔ موت کا وقت رات ایک اور دو بجے کے درمیان بتایا گیا تھا یعنی اصولی طور پر اٹھارہ مارچ کی تاریخ لگ چکی تھی۔ جائے وقوعہ اسی عمارت کی چھت تھی جس میں ملزم اور مقتول رہائش پذیر تھے۔ مقتول ساجد کی لاش پانی والی ٹینکی کے نزدیک بلاکس کے اوپر پڑی ملی تھی۔ مقتول کو کسی وزنی آہنی شے کی مدد سے سر پر ایک طوفانی ضرب لگا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ رپورٹ کے اختتامی حصے میں اس امر کی وضاحت بھی موجود تھی کہ مقتول کو بے خبری کی حالت میں قتل کیا گیا تھا۔ یعنی جب کسی وزنی آہنی شے سے اس کی کھوپڑی کو نشانہ بنایا گیا تو اسے حملہ آور کی اس حرکت کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔ آلۂ قتل کے ایک ہی کاری وار نے مقتول کی کھوپڑی کو پاش پاش کر ڈالا تھا اور وہ آن واحد میں اس دنیا سے اُس دنیا میں منتقل ہو گیا تھا۔

جائے وقوعہ کی ابتدائی کارروائی کے دوران ہی میں پولیس آلۂ قتل کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ آلۂ قتل ایک وزنی رینچ پانا تھا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے قادر خان کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ قادر خان بھی اسی بلڈنگ کا رہائشی تھا جہاں مقتول اور ملزم رہتے تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ مذکورہ عمارت میں کل چھوٹے چھوٹے چھ فلیٹس بنے ہوئے تھے یعنی ہر منزل پر ساٹھ ساٹھ گز کے دو فلیٹس۔ ان چھ فلیٹس میں سے پانچ میں کرائے دار رہائش پذیر تھے جبکہ ایک فلیٹ میں مالک مکان خود رہتا تھا۔

قادر خان نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ نے اسے گھیر لیا۔ وکیل استغاثہ لگ بھگ بیس منٹ تک گواہ سے مختلف سوالات کرتا رہا پھر اس نے جرح موقوف کر دی۔ قادر خان اس حوالے سے اہم گواہ تھا کہ مقتول ساجد کی لاش کو سب سے پہلے اسی نے دیکھا تھا۔ علاوہ ازیں اس کی گواہی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ قادر خان نے بھی ملزم کو غصیلا اور جھگڑالو قرار دیا تھا۔

میں اپنی باری پر وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا اور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''قادر صاحب! کیا میں آپ کو صرف ''خان صاحب'' بھی کہہ سکتا ہوں......؟''

''جی ضرور......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں پختون ہوں تو مجھے ''خان'' یا ''خان صاحب'' کہنے میں کوئی حرج نہیں۔''

''خان صاحب!'' میں نے مخصوص انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم بہت غصے والا اور جھگڑالو الطبیعت کا مالک ہے؟''

''جی ہاں...... میں نے یہی کہا ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''آپ کو اس عمارت میں رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''لگ بھگ چار سال۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کتنے نمبر فلیٹ میں رہائش پذیر ہیں؟''

''چار نمبر......!''

مذکورہ عمارت کی پہلی منزل پر فلیٹس نمبر ایک اور دو، دوسری منزل پر تین اور چار، تیسری منزل پر پانچ اور چھ واقع تھے یعنی فلیٹ نمبر ایک کے اوپر تین اور تین کے اوپر پانچ۔ اسی طرح فلیٹ نمبر دو کے اوپر چار اور چار کے اوپر چھ واقع تھے۔

''چار نمبر......'' میں نے استغاثہ کے جواب کو زیر لب دہرایا پھر بہ آواز بلند کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، آپ عمارت کی دوسری منزل پر رہتے ہیں؟''

''جی ہاں......'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''یعنی...... مقتول کے اوپر اور ملزم کے نیچے؟''

''جی وکیل صاحب۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی۔

''کیا آپ فلیٹ نمبر چار میں اکیلے ہی رہتے ہیں؟''

''جی نہیں، میں فیملی والا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔''

''جب آپ اس بلڈنگ میں رہنے کے لیے آئے تو کیا ملزم پہلے سے وہاں رہائش پذیر تھا؟'' میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' اس نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''اب میں آپ سے ایک بہت ہی ضروری اور اہم سوال پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہت سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا۔''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے چار سال میں ملزم کا آپ سے کتنی بار جھگڑا ہوا ہے؟''

''ایک بار بھی نہیں۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

''جس شخص کا چار سال میں آپ سے ایک مرتبہ بھی جھگڑا نہیں ہوا اس کے بارے میں آپ نے غصیلا اور جھگڑالو ہونے کا فتویٰ جاری کیا ہے۔'' میں نے قدرے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''اس کا کوئی خاص سبب؟''

''اگر ملزم کا کبھی مجھ سے جھگڑا نہیں ہوا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا کسی اور سے بھی جھگڑا نہیں ہوا ہوگا۔'' وہ برہمی سے بولا۔ ''میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے مقتول کے ساتھ لڑائی کرتے دیکھا تھا۔''

''آپ کا اشارہ کہیں اس واقعے کی طرف تو نہیں جب محمد سالک کی دکان کے سامنے مقتول نے ملزم کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''یہ وقوعہ سے چند روز پہلے کا واقعہ ہے......؟''

''نہیں......!'' استغاثہ کے گواہ نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں نے اس واقعے کے بارے میں صرف سنا ہے۔ میں اس کا چشم دید گواہ نہیں ہوں۔''

''پھر آپ کس واقعے کا ذکر کر رہے ہیں؟'' میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ وقوعہ کی شام کا ذکر ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے گھر آئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے۔ میں نے ان کے جھگڑنے کا شور سنا تو اپنے گھر کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ یہ دونوں بلڈنگ کے مین گیٹ کے پاس کھڑے جھگڑا کر رہے تھے۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس کے اگلے روز ہی پتا چلا کہ ملزم نے ساجد کو قتل کر دیا ہے......''

''سترہ مارچ کی شام آپ نے ملزم اور مقتول کو بلڈنگ کے مین گیٹ کے قریب آپس میں لڑائی جھگڑا کرتے دیکھا تھا۔'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند فرمائیں گے کہ وہ دونوں کس بات پر جھگڑ رہے تھے؟''

''مقتول کا خیال تھا کہ ملزم اس کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے بے ہودہ گانے گنگناتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن ملزم بضد تھا کہ اس نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔ مقتول خوامخواہ اس پر الزام تراشی کر رہا ہے...... وغیرہ وغیرہ!'' وہ ایک بار پھر رکا۔ اس کے بعد بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اسی بات پر ان دونوں میں پہلے تلخ کلامی ہوئی، پھر معاملہ گالم گلوچ تک جا پہنچا اور پھر نوبت ہاتھا پائی کی آ گئی۔ بہرحال، مار پیٹ کے شروع ہونے سے پہلے ہی انہیں ٹھنڈا کر کے اپنے اپنے گھر بھیج دیا گیا تھا۔''

''اور اس کی اگلی صبح بلڈنگ کی چھت پر مقتول ساجد کی لاش پڑی ملی تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور اس لاش کی دریافت کا سہرا آپ کے سر بندھتا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا خان صاحب؟''

''نہیں جناب...... آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''آپ نے مقتول کی لاش کو کتنے بجے چھت پر پڑے دیکھا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''لگ بھگ نو بجے۔'' وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا۔

''کیا نو بجے روزانہ چھت پر جانا آپ کا معمول ہے یا وقوعہ کی صبح آپ کسی خاص کام سے بلڈنگ کی چھت پر گئے تھے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''معمول کی کوئی وجہ نہیں وکیل صاحب۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''چھت پر روزانہ صبح جانے کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔''

''اس کا مطلب ہے، وقوعہ کی صبح آپ کسی خاص مقصد سے بلڈنگ کی چھت پر گئے تھے؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی ہاں۔''

''کیا آپ معزز عدالت کے سامنے اپنے مقصد کی وضاحت کریں گے؟''

''کئی دنوں سے ہمارا ٹی وی صاف نہیں آرہا تھا۔'' وہ

سرسری سے لہجے میں بتانے لگا۔ ''میری بیوی تین چار بار اس طرف میری توجہ دلا چکی تھی لیکن میں ٹال جاتا تھا۔ وقوعہ کی صبح بیوی اور بچوں نے ایک ساتھ مل کر احتجاج کیا کہ میں پہلے ٹی وی کا مسئلہ حل کروں۔ اس کے بعد ہی وہ لوگ مجھے ڈیوٹی پر جانے دیں گے......''

''ایک منٹ خان صاحب۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹوک دیا۔ ''آپ کے ٹی وی کی خرابی کا بلڈنگ کی چھت سے کیا تعلق؟''

''چھت پر ٹی وی کا انٹینا نصب ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''میں نے سوچا، پہلے اس انٹینا کو ہلا جلا کر دیکھتا ہوں۔ شاید مسئلہ حل ہو جائے۔ چند روز پہلے ایک رات بہت تیز ہوا چلی تھی۔ ذہن میں یہی آیا کہ اس جھکڑ کی وجہ سے انٹینا اپنی جگہ سے کھسک گیا ہوگا۔ بس جناب......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک مضمحل سی سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں اسی مقصد سے چھت پر گیا تھا۔''

''آپ نے چھت پر کیا دیکھا؟'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں چھت والا دروازہ کھول کر اوپر پہنچا اور سیدھا اپنے انٹینا کی جانب بڑھ گیا۔'' وہ بڑے اطمینان سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں انٹینا والی ڈنڈی کو ہلا ہی رہا تھا کہ میری نگاہ بلاکس پر پڑی اور میں ان بلاکس پر ساجد کی لاش کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ انٹینا کو سیٹ کرنے کا خیال میرے ذہن سے اڑن چھو ہو گیا اور میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نیچے بھاگا......''

''قادر خان!'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کے انٹینا اور بلاکس کے درمیان کتنا فاصلہ رہا ہوگا؟''

''زیادہ نہیں...... یہی کوئی بیس پچیس فٹ۔''

''کیا آپ کو اتنے فاصلے سے ایک نظر دیکھتے ہی اس بات کا اندازہ بلکہ یقین ہو گیا تھا کہ بلاکس کے اوپر ساجد ہی کی لاش پڑی ہوئی ہے۔'' میں نے گواہ سے استفسار کیا۔ ''ابھی آپ نے اس سے پہلے میرے سوال کا جواب دیا ہے، اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔''

''جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب میں اپنا انٹینا ٹھیک کر رہا تھا تو اس وقت مجھے بلاکس کے اوپر کوئی آڑھا ٹیڑھا پڑا دکھائی دیا تھا۔ جب میں نے قریب جا کر دیکھا تو پتا چلا کہ وہ اسی بلڈنگ کا ایک رہائشی ساجد تھا اور...... اور وہ مردہ حالت میں پڑا تھا، اس کی کھوپڑی پر شدید چوٹ آئی تھی بلکہ کھوپڑی چٹخ کر ہی رہ گئی تھی اور وہاں سے خارج ہونے والا خون بلاکس کے اوپر جما ہوا دکھائی دے رہا تھا...... بس اتنی سی بات ہے جناب۔''

''ٹھیک ہے اگر یہ اتنی سی بات ہے تو اسے اتنا ہی رہنے دیتے ہیں۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''خان صاحب! آپ کے بیان کے مطابق ساجد کی لاش کو دیکھتے ہی آپ کے اوسان خطا ہو گئے تھے اور آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نیچے کی طرف بھاگے تھے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی ہاں...... میں نے یہی بیان دیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ساجد کی لاش کے بارے میں آپ نے سب سے پہلے کس کو بتایا تھا؟''

''داؤد صاحب کو۔''

''داؤد صاحب......!'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کا مطلب ہے، اس عمارت کے مالک جو تیسری منزل کے فلیٹ نمبر پانچ میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں۔ ملزم کے فلیٹ کے عین سامنے؟''

''جی ہاں۔ میں انہی داؤد صاحب کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں چھت کی طرف جاتے ہوئے انہی سے چابی لے کر گیا تھا۔''

''چابی...... کیسی چابی؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''چھت والے دروازے پر تالا پڑا رہتا ہے۔'' گواہ قادر خان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''جس کی چابی داؤد صاحب اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اگر بلڈنگ کے رہائشیوں میں سے کسی کو بھی کسی کام سے چھت پر جانا ہوتا ہے تو وہ داؤد صاحب سے یا ان کے گھر والوں سے چابی لے لیتا ہے اور اپنا کام کرنے کے بعد چابی واپس داؤد صاحب کو یا ان کے گھر میں دے دی جاتی ہے۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، عام طور پر بلڈنگ کی چھت والے دروازے پر تالا لگا رہتا ہے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''یہی حقیقت ہے۔''

''وقوعہ کے روز جب آپ اپنا ٹی وی انٹینا ٹھیک کرنے چھت پر گئے تو آپ چھت والے دروازے کا تالا

کھول کر اوپر پہنچے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''یعنی صبح نو بجے مذکورہ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا؟''

''جی۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے ایک بار پھر سر کو اثباتی جنبش دی۔

''اور چھت پر...... بلاکس کے اوپر...... ساجد کی لاش پڑی تھی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے استفسار کیا۔ ''اس کی کھوپڑی بری طرح چٹخی ہوئی تھی اور سر سے جاری ہونے والے خون نے مقتول کا لباس اور بلاکس کو رنگین کر دیا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''خان صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ ذرا بلڈنگ کی چھت کی تفصیل بتائیں گے؟''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے اس کی الجھن دور کرنے کی غرض سے کہا۔ ''میرے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ چھت کے اوپر کس قسم کی تعمیرات ہیں اور جائے وقوعہ کس مقام پر ہے؟''

میرے استفسار کے جواب میں اس نے بتایا کہ چھت والا دروازہ کھول کر جب اوپر پہنچیں تو چھت کے عین وسط میں پانی والی ٹینکی بنی ہوئی ہے جس میں پانی جمع کر کے بلڈنگ کے فلیٹس کے استعمال کے لیے چھوڑا جاتا ہے۔ پہلے موٹر کے ذریعے لائن میں سے پانی کھینچ کر زمین کے نیچے بنے ہوئے ٹینک میں اسٹاک کیا جاتا ہے پھر حسبِ ضرورت اس ذخیرہ شدہ پانی کو چھت والی ٹینکی میں چڑھا دیا جاتا ہے۔

چھت والی ٹینکی کے عقب میں، ٹینکی کی دیوار کے ساتھ پندرہ بیس بلاکس اس طرح چن دیے گئے تھے کہ دو افراد بڑے آرام سے ان پر بیٹھ کر گپ شپ کر سکتے تھے۔ کچھ عرصہ قبل چھت کی منڈیر تعمیر کی گئی تھی جس سے یہ بلاکس بچ گئے تھے جو ٹینکی کے عقب میں رکھ دیے گئے تھے۔ اگر دروازہ کھول کر چھت پر قدم رکھیں تو بلاکس والی ٹینکی کا عقبی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کو دیکھنے کے لیے گھوم کر پچھلی طرف آنا پڑتا تھا۔ قادر خان کا ٹی وی انٹینا چونکہ دوسری جانب تھا اسی لیے وہ بلاکس کے اوپر پڑی مقتول ساجد کی لاش کو دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وٹنس باکس میں کھڑا استغاثہ کا گواہ متاملانہ انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا لہٰذا میں اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے اسے نمٹانے میں مصروف ہو گیا۔

''قادر خان! جب چھت کی چابی بلڈنگ کے مالک داؤد کے پاس رہتی ہے تو پھر مقتول ساجد آدھی رات کے بعد چھت پر کیسے پہنچ گیا۔ وہ داؤد سے چابی لے کر چھت پر گیا تھا؟''

''نہیں جناب!'' وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''داؤد صاحب کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ جب میں افراتفری میں بھاگتے ہوئے چھت سے نیچے آیا تھا اور میں نے داؤد صاحب کو ساجد کی لاش کے بارے میں بتایا تھا تو انہوں نے بھی اس بات پر شدید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا...... جب کسی نے ہم سے چھت کی چابی مانگی ہی نہیں تو پھر ساجد کب اور کیسے اوپر گیا اور...... وہ بھی اس طرح کہ دروازہ بند اور تالا لگا ہوا۔''

''بات صرف مقتول ساجد کے چھت پر پہنچنے کی نہیں ہے خان صاحب!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ساجد کو بڑی بے دردی سے کھوپڑی پر آہنی رینچ پانے کا وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ قاتل بھی چھت پر پہنچا تھا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''قاتل اوپر پہنچا ہے جبھی تو اس نے ساجد کو قتل کیا ہے۔''

''اور وہ بھی تالا بند دروازے کے اندر سے گزرتے ہوئے۔'' میں نے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔ ''یہ تو بالکل ناقابلِ یقین سا لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، قاتل اور مقتول جادو جانتے تھے۔ وہ دروازے کا تالا کھولے بغیر ایک ساتھ یا باری باری چھت پر پہنچ گئے تھے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں خان صاحب؟''

''میں کیا کہوں جی۔'' وہ خجالت آمیز انداز میں بولا۔ ''میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ...... یہ ہوا کیا ہے۔''

''یہ قتل کی ایک سنگین واردات ہوئی ہے...... بلکہ ہوئی تھی خان صاحب!'' میں نے سرسری لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''یہ بھی ممکن ہے، آس پاس کی کسی بلڈنگ کی چھت سے کود کر وہ اپنی چھت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔''

''نہیں وکیل صاحب! یہ ممکن نہیں ہے۔'' وہ قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''کیوں ممکن نہیں ہے؟'' میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

''اس لیے ممکن نہیں ہے کہ ہماری بلڈنگ کے آس پاس ایک اور دو منزلہ سے اونچی کوئی عمارت ہے ہی نہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس لیے ادھر ادھر کے

نیچے دکانوں اور عمارتوں سے کود کر ہماری تین منزلہ عمارت کی چھت پر کودنا کسی بھی طور ممکن نہیں۔"

"ادھر ادھر کی عمارتوں سے پھلانگ کر جائے وقوعہ تک پہنچنا ممکن نہیں۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔"خان صاحب! آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں نا کہ قاتل اور مقتول دونوں وقوعہ کی رات آپ کی عمارت کی چھت پر پہنچے تھے؟"

"اس میں شک والی کون سی بات ہے جناب۔" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔"اگر وہ دونوں اس رات چھت پر نہ پہنچے ہوتے تو پھر یہ واقعہ کیسے پیش آتا......"

"جب آپ نے بلڈنگ کے مالک داؤد کو چھت والی صورت حال سے آگاہ کیا تو ان کا ردعمل کیا تھا؟" میں نے اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے تو انہیں میری بات کا یقین ہی نہیں آیا۔" اس نے بتایا۔"وہ فوراً میرے ساتھ چھت پر پہنچے۔ پھر انہیں ماننا پڑا کہ ہماری بلڈنگ کی چھت پر قتل کی ایک سنگین واردات ہو چکی ہے۔ اس کے بعد ہی داؤد صاحب نے فون کر کے پولیس کو وہاں بلا لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پورے علاقے کو اس واقعے کی خبر ہو چکی تھی۔"

میں نے ایک دو ضمنی سوالات کے بعد جرح موقوف کر دی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......"

☆☆☆

استغاثہ کی جانب سے اگلی پیشی پر مقتول کے بڑے بھائی ماجد کو گواہی کے لیے عدالت میں حاضر کیا گیا۔ ماجد ایک عام سی شکل وصورت کا مالک سیدھا سادہ انسان تھا۔ اس کی عمر چالیس سے متجاوز نظر آتی تھی۔ وہ جامع کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے کی ایک بڑی دکان پر سیلز مین کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اسی بلڈنگ کے فلیٹ نمبر دو میں رہائش پذیر تھا جس کی چھت پر اس کے بھائی کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ مقتول ساجد اپنے بھائی کے ساتھ ہی رہتا تھا اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، مقتول کے پاس تعلیم نہیں تھی۔ وہ صدر کے صرافہ بازار میں ایک جیولری کی دکان پر ملازم تھا۔ یہ ملازمت اسے اپنے بھائی ماجد کی سفارش پر ملی تھی۔

ماجد نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ لگ بھگ بیس منٹ تک مختلف سوالات وجوابات کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہا کہ ملزم، مقتول سے شدید نفرت کرتا تھا۔ ان کے بیچ کئی جھڑپیں بھی ہو چکی تھیں جن میں مقتول ہی نے ملزم کو زدوکوب کیا تھا چنانچہ ملزم، مقتول کی طرف سے بہت زیادہ ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے چکا تھا لہٰذا ملزم کو جیسے ہی موقع ملا، اس نے مقتول کو ٹھکانے لگا دیا......وغیرہ وغیرہ!

اپنی باری پر میں جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا پھر استغاثہ کے گواہ ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"ماجد صاحب! یہ ایک حقیقت ہے کہ میں اس کیس میں ملزم کا وکیل یعنی وکیل صفائی کا کردار ادا کر رہا ہوں لیکن یہ بھی ایک سچ ہے کہ مجھے آپ کے بھائی کی المناک موت کا بہت دکھ ہے۔ مجھے اس بات کا بھی سخت افسوس ہے کہ اپنا فرض نبھاتے ہوئے مجھے آپ سے ترش وتیکھے سوالات کرنا پڑیں گے۔"

"کوئی بات نہیں وکیل صاحب۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔"آپ اپنا فرض پورا کریں۔ میں ہر قسم کی جرح کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں۔"

"اگر آپ ذہنی طور پر تیار ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ میرے سوالات کے سیدھے اور سچے جواب دیں گے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "پوچھیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں مجھ سے......"

میں نے پوچھا۔"آپ کے بھائی کی ڈیوٹی کی ٹائمنگ کیا تھی؟"

"گیارہ سے آٹھ بجے تک۔" اس نے جواب دیا۔

"یعنی وہ دن کے گیارہ بجے صرافہ بازار پہنچتا تھا اور رات کے آٹھ بجے اس کی چھٹی ہوتی تھی......؟"

"جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔" وہ بڑی رسان سے بولا۔

"کیا سترہ مارچ کی رات بھی وہ آٹھ بجے ہی گھر پہنچا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"آٹھ بجے اس کی چھٹی کا وقت ہے جناب۔" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔"گھر پہنچتے پہنچتے اسے نو بج

جاتے تھے۔ سترہ مارچ کی رات جب میں گھر آیا تو وہ پہلے سے گھر میں موجود تھا...... ‘‘ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بتایا۔

’’میں ساڑھے نو، دس بجے تک گھر پہنچتا ہوں۔‘‘

’’ماجد صاحب!‘‘ میں نے گواہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ’’پچھلی پیشی پر استغاثہ کے ایک گواہ قادر خان جو کہ آپ کی بلڈنگ کے فلیٹ نمبر چار کا رہائشی ہے، اس نے معزز عدالت کے روبرو بتایا تھا کہ وقوعہ کی شام، اس نے اپنے فلیٹ کی کھڑکی میں سے مقتول اور ملزم کو جھگڑا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیا وقوعہ کے روز آپ کا بھائی مقررہ وقت سے پہلے ہی گھر آ گیا تھا کیونکہ شام اور رات نو بجے میں اچھا خاصا فرق ہوتا ہے...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟‘‘

’’نہیں جناب! نہ تو آپ غلط ہیں اور نہ ہی قادر خان نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ’’سترہ مارچ کی شام ساجد واقعی گھر میں موجود تھا۔‘‘

’’وقت سے پہلے چھٹی کی کوئی خاص وجہ؟‘‘ میں نے دریافت کیا۔

’’ساجد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اسی لیے وہ اس روز سرِشام ہی گھر آ گیا تھا۔‘‘ ماجد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

’’مقتول کی طبیعت میں کس قسم کی خرابی تھی؟‘‘

’’دوپہر کے کھانے کے بعد سے اسے ہلکا ہلکا بخار محسوس ہو رہا تھا۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’لہٰذا اس نے دکان سے لگ بھگ پانچ بجے چھٹی کی اور سیدھا گھر آ گیا۔‘‘

’’اور سیدھا گھر پہنچتے ہی اس نے ملزم سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا۔‘‘ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’ہیں نا......؟‘‘

’’ایسی بات نہیں ہے وکیل صاحب۔‘‘ وہ جلدی سے بولا۔

میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ’’پھر کیسی بات ہے ماجد صاحب؟‘‘

’’جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، ساجد بخار کی وجہ سے وقوعہ کے روز جلدی چھٹی لے کر گھر آ گیا تھا۔‘‘ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ’’گھر آ کر وہ آرام کرنے کی غرض سے لیٹا ہی تھا کہ ملزم نے ہماری کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر بے ہودہ گانے گانا شروع کر دیے۔ ملزم کا مقصد صرف اور صرف میرے بھائی کو تنگ کرنا اور ذہنی اذیت پہنچانا تھا۔ ساجد پہلے تو کافی دیر تک برداشت کرتا رہا۔ ایسی ہی واہیات حرکات پر ملزم پہلے بھی ساجد کے ہاتھوں دو تین بار پٹ چکا تھا اور ساجد اب اس سے مزید الجھاؤ نہیں چاہتا تھا لیکن جب ملزم نے انتہائی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گانے کا سلسلہ جاری رکھا تو ساجد کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ دونوں میں پہلے تو تلخ کلامی ہوئی پھر جب ملزم نے میرے بھائی کو گالی دی تو وہ مزید برداشت نہ کر سکا، اس طرح ان کے بیچ دنگا شروع ہو گیا۔ بعدازاں لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے انہیں چھڑا دیا تھا۔‘‘

’’اتنی تفصیل سے بتانے کا شکریہ ماجد صاحب۔‘‘ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ’’آپ نے فرمایا ہے کہ ملزم آپ کے بھائی کے ہاتھوں دو تین مرتبہ پٹ چکا تھا۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ آخر ان دونوں کے بیچ لڑائی جھگڑے کا آخر سبب کیا تھا...... وہ کیوں آئے روز دست و گریباں ہوتے رہتے تھے؟‘‘

’’یہ تو آپ اپنے مؤکل سے پوچھیں۔‘‘ وہ اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’میرا بھائی تو سیدھا سادہ انسان تھا۔ ہر مرتبہ فساد کا آغاز ملزم ہی کی طرف سے ہوا ہے۔ ایک بار جب یہ دونوں سالک کی دکان کے سامنے پھڈا کر رہے تھے تو ملزم نے میرے بھائی کو سنگین نتائج کی دھمکی بھی دی تھی اور......‘‘ لمحاتی توقف کر کے استغاثہ کے گواہ نے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ’’اور پھر اس کے چند روز بعد ہی میرا بھائی بلڈنگ کی چھت پر مردہ حالت میں پایا گیا۔ اسے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔‘‘

’’تو آپ کے خیال میں ملزم نے اپنی خطرناک دھمکی پر عمل کرتے ہوئے آپ کے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟‘‘ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

’’جی ہاں......‘‘ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’میرا یہی خیال ہے۔‘‘

’’آپ صبح روزانہ کتنے بجے بیدار ہو جاتے ہیں؟‘‘ میں نے جرح کے زاویے میں اچانک تبدیلی لاتے ہوئے سوال کیا۔

’’یہی کوئی آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے......‘‘

’’کیا وقوعہ کے روز بھی آپ انہی اوقات میں بیدار ہوئے تھے؟‘‘

’’جی ہاں!‘‘ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ’’کیا آپ کا بھائی یعنی مقتول ساجد، آپ سے پہلے اٹھنے کا عادی تھا؟‘‘

''نہیں جناب! وہ میرے بعد ہی بیدار ہوا کرتا تھا۔''
''یعنی نو، ساڑھے نو بجے تک؟'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تصدیق چاہی۔
اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔
میں نے اپنی جرح میں تیزی و تندی لاتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ نے چند لمحے پہلے مجھے بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی اٹھارہ مارچ کی صبح آپ آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے بیدار ہوئے تھے جبکہ استغاثہ کے ایک معزز گواہ اور آپ کے اوپر والے فلیٹ نمبر چار میں رہائش پذیر قادر خان نے اٹھارہ مارچ کی صبح ٹھیک نو بجے بلڈنگ کی چھت پر آپ کے بھائی کی لاش دریافت کی تھی......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے بڑے بھائی ماجد کو گہری نظر سے دیکھا اور پوچھا۔
''جب آپ آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے سو کر اٹھے تو آپ کو اپنے بھائی کی گھر میں غیر موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا؟''
''ہمارے گھر میں سب سے پہلے میری بیوی عالیہ بیدار ہوتی ہے۔'' وہ بڑے اطمینان سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''چھوٹی کرن کو ناشتا وغیرہ کرانے کے بعد اسکول بھیجنا ہوتا ہے۔ جب میں حسب معمول بیدار ہوا تو عالیہ نے مجھے بتایا تھا کہ ساجد گھر میں نہیں ہے۔''
''اوہ...... پھر آپ نے کیا کیا؟'' میں نے پوچھا۔
''میرا مطلب ہے، بھائی کو گھر سے غائب پا کر آپ نے اس کی تلاش کے سلسلے میں کیا اقدام کیے؟''
''اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔'' وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''عالیہ، ساجد کو غائب پا کر بہت پریشان تھی کیونکہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بغیر بتائے صبح ہی صبح کہیں غائب ہو گیا ہو۔ میں نے عالیہ کو تسلی دی کہ وہ فکر مند نہ ہو۔ میں ہاتھ منہ دھونے کے بعد اسے دیکھتا ہوں لیکن جب میں فریش ہو کر گھر سے نکل ہی رہا تھا تو بلڈنگ میں شور مچ گیا کہ چھت پر ساجد کی لاش پڑی ہے...... اس اندوہناک اطلاع کے بعد ساجد کی تلاش میں کہیں جانے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔''
''ماجد صاحب!'' میں نے استغاثہ کے گواہ کے گرد اپنی شاطرانہ جرح کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق آپ کے بھائی کی موت سترہ اور اٹھارہ مارچ کی درمیانی رات، ایک اور دو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں؟''
''نہیں جناب! میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھلا کس طرح اختلاف کر سکتا ہوں۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔
''یعنی آپ مانتے ہیں کہ وقوعہ کی رات ایک اور دو بجے کے درمیان آپ کا بھائی مقتول ساجد بلڈنگ کی چھت پر موجود تھا؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔
''جی...... جی ہاں۔'' اس کے پاس اقرار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔
''کیوں......؟'' میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ جس نوجوان کو بخار چڑھا ہوا ہو، وہ طبیعت کی خرابی کے باعث نوکری سے جلدی چھٹی کر کے گھر آ گیا ہو...... وہ آدھی رات کے بعد بلڈنگ کی چھت پر کیا لینے گیا تھا۔ اسے ایسا کون سا ضروری کام تھا چھت پر...... اور چھت بھی ایسی جس کے داخلی دروازے پر تالا پڑا رہتا ہو......؟''
''مم...... میں......'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔
''میں...... اس بارے میں کچھ نہیں جانتا...... اگر ساجد زندہ ہوتا تو اس سے پوچھا جا سکتا تھا۔''
''وہ زندہ نہیں ہے اس لیے آپ سے پوچھا جائے گا ماجد صاحب۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر وقوعہ کی رات مقتول ایک اور دو بجے کے درمیان چھت پر موجود تھا تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وہ چھت والا دروازہ کھول کر اوپر پہنچا تھا کیونکہ اس دروازے کے سوا بلڈنگ کی چھت تک رسائی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ میں کسی بھی طور پر...... اور معزز عدالت بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ مقتول جادو کے زور پر ہوا میں اڑ کر بلڈنگ کی چھت پر پہنچ گیا ہوگا۔ وہ یقیناً دروازے کے راستے ہی چھت پر پہنچا تھا، یعنی دروازے کا تالا کھول کر......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی پھر گواہ سے استفسار کیا۔
''کیا آپ کے بھائی نے چھت والے دروازے پر لگے تالے کی ڈپلی کیٹ چابی بنوا رکھی تھی کیونکہ میری معلومات کے مطابق اس تالے کی چابی بلڈنگ کے مالک داؤد صاحب کے پاس رہتی ہے۔ بلڈنگ میں رہنے والے کسی شخص کو جب بھی چھت پر جانا ہوتا ہے وہ مالک مکان سے یا اس کے گھر سے چابی حاصل کرتا ہے جیسا کہ اٹھارہ مارچ کی صبح نو بجے قادر خان نے کیا تھا......؟''
''میں کسی ڈپلی کیٹ چابی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ قدرے برہمی سے بولا۔ ''مجھے یقین ہے، ساجد کے پاس کوئی ڈپلی کیٹ چابی نہیں تھی اگر...... اگر وہ کسی ڈپلی کیٹ چابی کی مدد سے چھت والا دروازہ کھول کر چھت پر

پہنچا تھا تو پھر چھت والے دروازے پر تالا کیوں لگا ہوا تھا۔ تالا تو زینے کی جانب سے لگایا جاتا ہے نا!''

اپنی وضاحت کے اختتام پر اس نے میرے لیے ایک چبھتا ہوا سوال چھوڑ دیا تھا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔

''آپ بتائیں ماجد صاحب!'' میں نے قدرے نرمی سے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کے خیال میں زینے کے اختتام پر واقع چھت والے دروازے پر تالا کس نے لگایا ہوگا؟''

''ظاہر ہے...... ملزم نے۔'' وہ انگلی سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم ریاض کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس نے میرے بھائی کو موت کے گھاٹ اتارا اور چپکے سے چھت والے دروازے پر تالا لگا کر نیچے اتر آیا۔ اگر اس تالے کی کوئی ڈپلی کیٹ چابی ہوگی تو ملزم ہی کے پاس ہوگی ورنہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آدھی رات کو کوئی رہائشی داؤد صاحب سے چھت والے دروازے کے تالے کی چابی مانگنے اور وہ اسے دے بھی دیں......''

''میں چند لمحات کے لیے آپ کی تھیوری سے اتفاق کر لیتا ہوں ماجد صاحب!'' میں نے ایک مختلف انداز سے استغاثہ کے گواہ کو اپنے دام میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو کچھ معلوم نہیں کہ آپ کا مقتول بھائی کس غرض سے آدھی رات کے بعد بلڈنگ کی چھت پر پہنچا تھا۔ مقتول کے پاس کوئی ڈپلی کیٹ چابی بھی نہیں تھی۔ اس کی طبیعت خراب تھی اور وہ رات کو جلدی سو گیا تھا...... وغیرہ وغیرہ!'' میں نے ذرا دیر کو رک کر ایک طویل سانس لی پھر اپنا استفسار مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ معزز عدالت کو صرف اتنا بتا دیں کہ آپ کا بھائی مقتول ساجد بلڈنگ کی چھت پر کیسے پہنچا تھا کیونکہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس رپورٹ کے مطابق آپ کے بھائی کو چھت پر بنی ہوئی پانی والی ٹینکی کے عقب میں پڑے ہوئے بلاکس کے اوپر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ جب اس کی موت واقع ہوئی وہ مذکورہ بلاکس پر موجود تھا اور اس کی بے خبری میں، کھوپڑی پر آہنی رینچ پانے کا وار کر کے اسے ابدی نیند سلا دیا گیا تھا۔''

''آپ ایک ہی سوال کو گھما پھرا کر بار بار پوچھ رہے ہیں۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں......''

''آبجیکشن یور آنر......!'' وکیل استغاثہ ہمارے بیچ کود پڑا۔ ''میرے فاضل دوست استغاثہ کے معزز گواہ کو... خوامخواہ زچ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔''

وکیل استغاثہ کافی دیر سے خاموش کھڑا، میرے اور استغاثہ کے گواہ کے درمیان ہونے والی سوالاً جواباً گفتگو کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میرے انداز نے اس کے صبر کے پیمانے کو لبریز کر دیا...... بلکہ چھلکا دیا تھا اسی لیے وہ چیخ سے مشابہ آواز میں معترض ہوا تھا۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں جلتی پر تیل چھڑکنا ضروری جانا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''میں نے تو ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں۔''

وہ غصیلے انداز میں بولا۔ ''آپ کے سوالات ایک ہی دائرے میں گردش کر رہے ہیں جس سے گواہ کو الجھن ہو رہی ہے اور...... اس کے ساتھ ہی معزز عدالت کا قیمتی وقت بھی برباد ہو رہا ہے......''

''میں سمجھتا ہوں، آپ کی مداخلت کے بعد عدالت کے قیمتی وقت کی بربادی کا آغاز ہوا ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''ورنہ جرح کا سلسلہ تو بڑے موزوں طریقے سے آگے بڑھ رہا تھا۔''

''آرڈر پلیز......'' جج نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ آپس میں الجھنے کے بجائے عدالتی کارروائی کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔''

''جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے نہایت ہی ادب واحترام کے ساتھ کہا۔ ''میں عدالت کے قیمتی وقت کا ایک سیکنڈ بھی ضائع کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ مقتول ساجد کو بلڈنگ کی چھت پر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور وہ بھی آدھی رات کے بعد۔ یہ استغاثہ کا دعویٰ ہے۔ ڈیفنس کو یہ پوچھنے کا حق تو ہے نا کہ مقتول آدھی رات کے بعد بلڈنگ کی چھت پر کیوں موجود تھا۔ اس سوال کا جواب استغاثہ کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا۔ اگر میرے فاضل دوست کو اعتراض ہے کہ میں یہ سوال استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے بھائی ماجد سے کیوں پوچھ رہا ہوں تو......'' میں نے ڈرامائی انداز میں رک کر حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر سنسنی خیز انداز میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''تو اس اہم سوال کا جواب میرے فاضل دوست ہی دے دیں؟''

''آپ کیا کہتے ہیں وکیل صاحب؟'' جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

جج کے استفسار پر وکیل استغاثہ الجھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ کیا جواب دے مگر جواب دینا بھی ضروری تھا کیونکہ یہ سوال کسی ہما شما کی طرف سے نہیں بلکہ کرسیِ انصاف پر براجمان جج کی جانب سے آیا تھا۔

''یور آنر......'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں، مقتول کسی بھی کام سے چھت کی طرف گیا ہوگا اور ملزم دبے پاؤں اس کا تعاقب کرتے ہوئے چھت پر پہنچ گیا ہوگا اور موقع ملتے ہی ملزم نے رینچ پانے کا وار کر کے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا......''

''آپ کی وضاحت بہت بودی اور کمزور ہے وکیل صاحب!'' جج نے ناگواری سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس سوال کا جواب نہیں جو آپ سے پوچھا گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ...... بخار میں مبتلا مقتول سترہ اور اٹھارہ مارچ کی درمیانی شب آدھی رات کے بعد عمارت کی چھت پر کس غرض سے گیا تھا؟''

''جیسا کہ...... یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ......'' وہ ایک بار پھر لنگڑی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مقتول کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ممکن ہے، وہ چہل قدمی کرنے چھت پر چلا گیا ہو...... اس نے سوچا ہو کہ تازہ ہوا میں تھوڑی دیر تک ٹہلنے سے اسے سکون ملے گا۔''

''بہت خوب میرے فاضل دوست!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''آپ نے بڑے عمدہ طریقے سے مقتول کی، چھت پر موجودگی کا جواز بیان کیا ہے۔ اب ذرا یہ بھی بتا دیں کہ وہ تالا بند، چھت والے دروازے سے کیسے گزرا ہوگا......؟''

''مجھے کیا معلوم......؟'' وہ بے ساختہ بولا۔

''آپ کو تو یہ بات سب سے پہلے معلوم ہونا چاہیے تھی۔''

''کیوں......'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''مجھے ہی کیوں معلوم ہونا چاہیے تھی؟''

اب ہم دونوں وکیل ون ٹو ون ہو گئے تھے۔ جج بڑی دلچسپی سے ہمارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں نہایت ہی تحمل سے کہا۔

''میرے فاضل دوست! آپ کو یہ بات اس لیے سب سے زیادہ پتا ہونا چاہیے تھی کہ آپ استغاثہ کے وارث ہیں۔ پولیس کی کڑی تفتیش کے بعد عدالت میں جو چالان پیش کیا گیا تھا، وہ یقیناً آپ کی نظروں سے گزرا ہوگا بلکہ استغاثہ کا وارث ہونے کے ناتے وہ رپورٹ آپ کو ازبر ہونا چاہیے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ چھت والے دروازے کے تالے کی چابی صرف اور صرف بلڈنگ کے مالک داؤد صاحب کے پاس رہتی ہے۔ آپ کے تفتیشی افسر نے اس حوالے سے داؤد نامی اس شخص سے یہ تو ضرور پوچھا ہوگا کہ آیا مقتول نے وقوعہ کی رات، آدھی رات کے بعد اس سے چھت والے دروازے کی چابی مانگی تھی یا نہیں؟''

''نہیں مانگی تھی......'' وہ بے ساختہ بولا۔ ''پولیس نے اس سلسلے میں بلڈنگ کے مالک داؤد سے متعدد سوالات کیے تھے۔ داؤد کے بیان کے مطابق سترہ اور اٹھارہ مارچ کی درمیانی شب اس بلڈنگ کے کسی بھی مکین نے اس سے چھت والے دروازے کی چابی نہیں مانگی تھی......'' وہ ذرا دیر کو تھما پھر سرسری لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''داؤد کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں موجود ہے۔ جب بلڈنگ کے مالک کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کیا جائے گا تو یہی سوال آپ اس سے کر کے اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔''

''یقیناً......!'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں داؤد صاحب سے یہ سوال اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے سوالات کروں گا لیکن اس وقت معاملہ کہیں اور اٹکا ہوا ہے۔''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وکیل استغاثہ نے چونک کر پوچھا۔ ''کون سا معاملہ کہاں اٹکا ہوا ہے......؟''

''معاملہ یہ ہے میرے فاضل دوست کہ مقتول آدھی رات کے بعد بلڈنگ کی چھت پر کیا لینے گیا تھا۔'' میں نے وکیل مخالف کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اور اس سوال کا جواب آپ کے پاس نہیں ہے...... ہیں نا؟''

''اگر مقتول زندہ ہوتا تو میں اس سے پوچھ کر ضرور آپ کو بتا دیتا۔'' وہ میرا مذاق اڑانے والے انداز میں بولا پھر بڑے اسٹائل سے کندھے اچکا کر اضافہ کیا۔ ''آئی ایم ویری سوری مائی ڈیئر!''

''نو نیڈ آف سوری مائی ڈیئر کونسلر!'' میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے توقع نہیں تھی کہ کسی استغاثہ کا وکیل اتنا بے خبر بھی ہو سکتا ہے...... اینی ہاؤ! میں آپ کا دل رکھنے کے لیے مان لیتا ہوں کہ وقوعہ کی رات مقتول ہوا خوری کے لیے بلڈنگ کی چھت پر چلا گیا ہوگا اور اس نے کسی عامل کامل سے کوئی ایسا جادو وغیرہ سیکھ رکھا ہوگا جس کی مدد سے وہ نہ صرف یہ کہ تالے کھول لیا کرتا تھا بلکہ

چھت پر پہنچنے کے بعد وہ زینے کی طرف سے دروازے پر تالا لگانے کی جادوئی صلاحیت بھی رکھتا تھا اسی لیے استغاثہ کے پاس ان معاملات کے حوالے سے کوئی معقول اور جامع وضاحت نہیں ہے۔''

وکیل استغاثہ میری اس خطرناک چوٹ پر بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ میں اسے نظرانداز کر کے وٹنس باکس میں کھڑے مقتول کے بڑے بھائی ماجد کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ماجد صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو کچھ پتا نہیں کہ آپ کا بیمار بھائی آدھی رات کے بعد بلڈنگ کی چھت پر کیا لینے گیا تھا اور تالا بند دروازے سے وہ کیونکر گزرا۔ چلیں کوئی بات نہیں...... ہر انسان کو ہر ایک بات کی خبر نہیں ہوسکتی لیکن اگر میں آپ سے مقتول کے ماضیِ بعید اور ماضیِ قریب کے بارے میں کوئی سوال کروں تو آپ یقیناً اس سلسلے میں معذرت خواہانہ رویہ نہیں اپنائیں گے۔''

''جو بات میرے علم میں ہوگی، میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔'' وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ''پوچھیں، آپ کو میرے بھائی کے ماضی کے بارے میں کیا پوچھنا ہے؟''

''آپ صرف جواب ہی نہیں دیں گے بلکہ اس امر کو بھی یقینی بنائیں گے کہ آپ کا وہ جواب سچ پر مبنی ہوگا؟'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔

''میں نے ابھی تک عدالت میں کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام نہیں لیا۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔ ''اور آئندہ بھی سچ ہی بولوں گا۔''

''دیٹس فائن!'' میں نے تعریفی انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کچھ دیر پہلے آپ نے اپنے مقتول بھائی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان تھا۔ ایک امن پسند اور صلح جو، سیدھا سادہ شخص جس کی زندگی گھر سے دکان اور دکان سے گھر تک محدود تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''جی نہیں۔ میرے مرحوم بھائی میں یہ خصوصیات موجود تھیں۔''

''امن پسند، صلح جو اور سیدھا سادہ ہونے کے باوجود بھی مقتول نے دو تین مرتبہ ملزم کو روئی کے مانند دھنک ڈالا تھا۔''

''یہ...... یہ ایسے ہی نہیں تھا۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''پھر کیسے تھا ماجد صاحب؟'' میں نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔

''میرے بھائی نے جو بھی دنگا فساد کیا، وہ ''تنگ آمد، بہ جنگ آمد'' کی بنا پر تھا۔'' وہ جوش بھرے انداز میں بولا۔ ''ملزم نے اپنے ہتھکنڈوں اور شرانگیز حرکتوں کی وجہ سے ساجد کو اتنا تنگ کر دیا تھا کہ مجبوراً اسے دو تین بار ملزم پر ہاتھ اٹھانا پڑا تا کہ وہ ایسی گھٹیا حرکتوں سے باز آجائے مگر اس ڈھیٹ پر اس مار پیٹ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔''

''ملزم کی فتنہ پروری اور شرانگیز حرکتوں کے باعث مقتول کو مجبوراً ہاتھ اٹھانا پڑا تھا۔'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر گواہ سے پوچھا۔ ''ماجد صاحب! ملزم کے ریکارڈ میں یہ کہیں نہیں ملتا کہ وہ اکثر لوگوں سے لڑائی جھگڑا کرتا رہا ہو۔ پھر آپ کے بھائی کے ساتھ ہی یہ امتیازی سلوک کیوں...... آپ کے بھائی نے کیا ملزم کی بکری چوری کر لی تھی؟''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''کیا یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ ملزم ہمیشہ آپ کے بھائی کے ساتھ ہی دنگا فساد کرنے کا شوقین تھا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''اسے دنیا میں اور کوئی شکار نظر نہیں آتا تھا؟''

وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''ہاں، واقعی...... یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔''

''ماجد صاحب! یہ بات آپ کو اس لیے عجیب محسوس ہو رہی ہے کہ آپ اپنے بھائی کو انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہیں۔''

''جی...... کیا مطلب؟'' وہ یکدم اچھل پڑا۔

''مطلب یہ کہ آپ مقتول کی ایک خاص الخاص خوبی کو تو ذہن میں لا ہی نہیں رہے۔'' میں نے تیکھے انداز میں کہا۔ ''اور معزز عدالت کو بھی ابھی تک مرحوم کی اس خوبی سے بےخبر رکھا ہوا ہے۔''

''آپ کس خوبی کی بات کر رہے ہیں؟'' وہ سخت الجھن میں نظر آیا۔

''عشق بازی کی خوبی......!'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔

''میں نے تو ساجد میں ایسی کوئی خوبی نہیں دیکھی۔'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پتا نہیں...... آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟''

اس سے پہلے کہ وکیل استغاثہ اپنی موجودگی کا یقین

دلانے کے لیے چھلانگ لگا کر ہمارے درمیان آن کھڑا ہوتا، میں نے گواہ ماجد کو اپنے کڑے سوالات کی باڑ پر رکھ لیا۔

''کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ آپ کا مقتول بھائی فوزیہ نامی ایک لڑکی کو ملزم کے خلاف بھڑکانے کی کوشش میں مصروف رہتا تھا؟''

''فوزیہ......کون فوزیہ؟'' وہ یکدم انجان بن گیا۔

''میں استغاثہ کے ایک معزز گواہ محمد سالک کی چھوٹی صاحبزادی فوزیہ کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ملزم نہ صرف فوزیہ کو پسند کرتا تھا بلکہ اس نے باقاعدہ فوزیہ کے گھر اپنا رشتہ بھی بھیجا تھا جبکہ......'' میں نے دانستہ توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جبکہ آپ کا مقتول بھائی گاہے بگاہے فوزیہ کے کان میں ملزم کی آوارہ گردی اور بے روزگاری کی باتیں پھونک پھونک کر ملزم کی طرف سے اس کا دل کھٹا کرنے کی سعی میں لگا رہتا تھا۔ فوزیہ نے کئی بار مقتول کو اس کی اس گھٹیا حرکت پر ڈانٹا بھی تھا۔ جب وہ اپنی روش سے نہیں ہٹا تو فوزیہ نے یہ ساری باتیں ملزم کو بتا دی تھیں۔ اس کے بعد ہی ملزم اور مقتول کے بیچ لڑائی بھڑائی کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس لڑائی جھگڑے میں ہمیشہ نقصان ملزم ہی کو اٹھانا پڑا تھا۔''

''میں ایسے کسی معاملے سے واقف نہیں ہوں۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ ''مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ ملزم نے فوزیہ کے گھر رشتہ بھیجا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ فوزیہ والا معاملہ تو ماضیِ قریب کا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب ذرا ماضیِ بعید کی بات کر لیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، آپ کی لانگ ٹرم میموری زیادہ طاقت ور ہو۔''

وہ ہونقوں کی طرح مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے کہا۔ ''دو سال پہلے آپ کے فلیٹ کے بالکل سامنے والے فلیٹ یعنی فلیٹ نمبر ایک میں فاخرہ بیگم نامی ایک بیوہ عورت رہا کرتی تھی۔ کیا وہ بیوہ آپ کے حافظے میں محفوظ ہے؟''

''جی...... جی ہاں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''وہ خاتون مجھے یاد ہیں......''

جواب کے اختتام پر گواہ کے چہرے پر کچھ اس نوعیت کے تاثرات ابھرے جیسے اس سے کوئی سنگین غلطی ہوگئی ہو۔ غلطی ہوئی تھی یا غلط فہمی، منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اور کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں ہوسکتا لہٰذا میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''ویری گڈ......'' میں نے نمک پاشی کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اگر فاخرہ بیگم آپ کی یادداشت میں تازہ ہیں تو پھر اس پڑوسن کی بیٹی کو بھی آپ نہیں بھولے ہوں گے......؟''

''جی...... جی......'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''فاخرہ کی ایک جوان بیٹی رضوانہ بھی تھی۔''

''جوان اور خوب صورت......!'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا۔ ''ماجد صاحب! کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ وہ خاتون آپ والی بلڈنگ چھوڑ کر قیوم آباد کیوں شفٹ ہوگئی تھی......؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا لیکن میں نے فوراً ٹوک دیا۔

''ماجد صاحب! ادھر کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟''

''وہ جی...... میں کیا بتاؤں۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ''کسی کی مرضی ہے، وہ کہیں بھی رہے...... جب تک فاخرہ بیگم کا دل چاہا، وہ ہماری بلڈنگ میں رہی۔ جب وہاں سے دل اچاٹ ہوگیا، وہ قیوم آباد شفٹ ہوگئی۔''

''دل اچاٹ ہوگیا...... بہت خوب!'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''دل اچاٹ ہونے کی وجہ آپ بتائیں گے یا...... معزز عدالت کے روبرو یہ زحمت مجھے کرنا ہوگی ماجد صاحب......؟''

''آپ...... آپ ہی بتا دیں......'' وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ کے مقتول بھائی کی ایک نازیبا حرکت کی وجہ سے آپ کو بلڈنگ والوں اور محلے والوں کے سامنے بہت زیادہ شرمندگی اٹھانا پڑی تھی۔'' میں نے گھسنے والے انداز میں کہا۔ ''خاص طور پر فاخرہ بیگم کے سامنے...... کیونکہ وہ آپ کا بہت زیادہ احترام کرتی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''جی......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''کیا میں آپ کی اس شرمندگی کی تفصیل بیان کرسکتا ہوں؟''

وہ ہچکچاہٹ کا شکار نظر آیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''ماجد صاحب! آپ مجھ سے راست گوئی کا وعدہ کر چکے ہیں......؟''

''جی...... جی ہاں۔'' وہ لکنت زدہ انداز میں بولا۔

''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ آپ کہیں، جو بھی کہنا چاہتے ہیں......''

''آپ کے مقتول بھائی کی ''عاشق مزاجی'' نے آپ کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''مقتول نے فاخرہ بیگم کی بیٹی رضوانہ کو بری طرح ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی اور موقع پر پکڑا گیا تھا......'' میں نے تھوڑا توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اس سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ رضوانہ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ محبت کے فریب میں پھنس کر اپنا سب کچھ گنوانے کے قریب تھی کہ معاملہ ایکسپوز ہو گیا اور اس بے چاری کی عزت محفوظ رہی ورنہ آپ کا مقتول بھائی تو پتا نہیں......''

میں نے دانستہ معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ رحم طلب نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس موقع پر حقائق کو منظر عام پر لانے کی غرض سے کسی نرمی کا مظاہرہ نہیں کیا اور کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

''بتائیں ماجد صاحب! ایسا ہوا تھا یا نہیں؟''

''وہ بات دراصل یہ تھی جناب کہ......''

''یہ تھی...... وہ تھی...... نہیں ماجد صاحب!'' میں نے جارحانہ انداز میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس افسوس ناک واقعے کی تصدیق کے لیے آپ ہی کے محلے سے نصف درجن افراد کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر سکتا ہوں اس لیے جو بھی کہنا ہے، بہت سوچ سمجھ کر کہیں۔ یہ نہ ہو کہ کسی غلط بیانی کی وجہ سے، بعد میں آپ کو ''لینے کے دینے'' پڑ جائیں۔''

وہ تھوک نگل کر اپنے حلق کو تر کرتے ہوئے بولا۔ ''میں مانتا ہوں، وہ ساجد کی غلطی تھی۔ اس نالائق کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس واقعے کی وجہ سے میری محلے میں بڑی سبکی ہوئی تھی۔ میں نے بھائی کو بہت لتاڑا تھا اور فاخرہ بیگم کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی بھی منگوائی تھی لیکن فاخرہ بیگم کچھ ہی دنوں کے بعد وہ علاقہ چھوڑ کر قیوم آباد شفٹ ہو گئی تھیں۔''

''اس بے چاری بیوہ کے پاس اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔'' میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جس گھر میں پڑوسیوں کی وجہ سے عزت محفوظ نہ ہو وہاں رہ کر کوئی کیا کرے گا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ ندامت آمیز انداز میں بولا۔

''اس واقعے کے بعد سے اب تک...... یعنی پچھلے دو سالوں میں آپ کے مقتول بھائی نے اور کتنے اسی نوعیت کے ''کارنامے'' انجام دیے تھے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''کوئی نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کے بعد ساجد سدھر گیا تھا۔ پھر اس نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔''

''وہ واقعی سدھر گیا تھا یا بڑی مہارت سے اپنے کارناموں کو چھپانے لگا تھا......؟''

''میں سمجھتا ہوں، وہ سدھر گیا تھا۔'' وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔ ''اگر اس نے اپنی روش نہ چھوڑی ہوتی تو مجھے کہیں نہ کہیں سے سن گن تو ملتی۔''

''آج کل کے ہم سب بڑے اپنے چھوٹوں کے حوالے سے اسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم خود کو اپنے چھوٹوں سے زیادہ دانا و بینا اور تیز سمجھتے ہیں اور ہمیں اس بات پر بڑا فخر محسوس ہوتا ہے کہ ہم ان کی چھوٹی بڑی تمام سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے ماجد صاحب۔ اب یہی دیکھ لیں نا......!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر استغاثہ کے گواہ ماجد کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے الجھن اور پریشانی کے سوا کچھ نظر نہ آیا تاہم اس نے میری ادھوری بات کے جواب میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔

میں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''ماجد صاحب! یہی دیکھ لیں نا کہ آپ کو کچھ خبر ہی نہیں اور...... آپ کا مقتول بھائی سترہ اور اٹھارہ مارچ کی درمیانی شب آدھی رات کے بعد بلڈنگ کی چھت پر پہنچا ہوا تھا اور...... اور...... وقوعہ کی رات وہ کوئی پہلی مرتبہ تو بلڈنگ کی چھت پر نہیں گیا ہو گا نا...... وہ اس سے پہلے بھی جاتا رہا ہو گا...... کسی خاص کام سے، کسی اسپیشل مقصد سے۔ اتنی رات گئے کوئی خوامخواہ محض ہوا خوری کے لیے تو چھت کا رخ نہیں کرتا نا......؟''

میرے کڑے استفسار پر وہ کھسیانا سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ میری جرح کا سامنا کرتے ہوئے گھبرا رہا ہے۔ میں نے اس کی گھبراہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قدرے جارحانہ انداز میں کہا۔

''ماجد صاحب! آپ فوزیہ والے معاملے سے صاف انکاری ہیں...... اور یہ بھی بتانے کو تیار نہیں ہیں کہ

رضوانہ والے واقعے کے بعد سے اب تک یعنی پچھلے دو سال میں آپ کے مقتول بھائی نے کتنے عشق فرمائے تھے......''

میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سنسنی خیز انداز میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''ایسی صورتِ حال میں جرح ختم کرنے سے پہلے میں آپ سے ایک نہایت ہی اہم سوال پوچھنا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ اس سوال کا بالکل درست جواب دیں گے۔''

وہ منتظر نظر سے مجھے تکنے لگا کہ میں سوال کروں۔

میں نے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ رضوانہ نامی وہ خوب صورت لڑکی آپ کے مقتول بھائی کے دامِ محبت میں آ گئی تھی لیکن اس کی خوش قسمتی کہ داغ دار ہونے سے محفوظ رہی اور اس بات میں بھی کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں کہ جب تک رضوانہ پر مقتول کی حقیقت یعنی اس کی نیت نہیں کھلی تھی، یہ لوگ چوری چھپے ملاقاتیں بھی کیا کرتے تھے اور ایسی ہی ایک خفیہ ملاقات میں جب مقتول نے اپنے مذموم ارادے کا کھل کر اظہار کیا تو رضوانہ بھڑک اٹھی تھی اور ان کا معاملہ کٹنائی میں بلکہ جگ ہنسائی میں پڑ گیا تھا۔ یہاں پر آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ......'' میں نے ایک بار پھر ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر انکشاف انگیز لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا آپ اس تلخ حقیقت سے انکار کریں گے کہ آپ کا مقتول بھائی ساجد، فاخرہ بیگم کی صاحب زادی رضوانہ سے رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر بلڈنگ کی چھت پر ملاقاتیں کیا کرتا تھا اور اس مقصد کے لیے مقتول نے چھت والے دروازے پر لگے تالے کی ایک ڈپلی کیٹ چابی بنوا رکھی تھی...... اس کا راز کھل جانے کے بعد داؤد صاحب نے وہ تالا ہی تبدیل کر دیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟''

وہ ''پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' کی کیفیت میں دکھائی دیا لیکن میں نے اس کے لیے پناہ کی کوئی جگہ چھوڑی تھی اور نہ فرار کا راستہ لہٰذا وہ لکنت زدہ آواز میں بولا۔

''آپ...... بالکل درست...... کہہ رہے ہیں...... وکیل صاحب......!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

جج سمیت عدالت کے کمرے میں موجود ہر شخص کو ماجد کے جواب سے ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ وہ مقتول کے بھائی سے ایسے جواب کی توقع نہیں کر رہے تھے کیونکہ وہ ابتدا ہی سے اپنے مقتول بھائی کا دفاع کرتا چلا آ رہا تھا اور خاص طور پر ڈپلی کیٹ چابی کے حوالے سے تو اس نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ جج نے فوراً میری فرمائش پوری کر دی جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کسی بھی کیس کا انکوائری آفیسر ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتا ہے اور اس کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ کی ہوتی ہے۔

انکوائری آفیسر وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوا تو میں جرح کے لیے اس کے قریب چلا گیا۔ وہ عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا اور عام پولیس والوں کی بہ نسبت وہ خاصا ہینڈسم اور اسمارٹ نظر آتا تھا۔ اس کا نام بھی اتفاق سے ساجد ہی تھا۔

''آئی او صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کو بڑا عجیب سا نہیں لگ رہا کہ آپ بھی ساجد ہیں اور ساجد ہی کے قتل کے کیس کی تفتیش اور پیروی بھی آپ کو کرنا پڑ رہی ہے......؟''

وہ بے پروائی سے بولا۔ ''اس میں عجیب لگنے والی کون سی بات ہے۔ میں پیشہ ورانہ ذمے داریوں کو پورا کرتے ہوئے ناموں پر زیادہ غور نہیں کرتا۔ میری تمام تر توجہ کیس حل کرنے پر لگی رہتی ہے۔''

''ویری گڈ......!'' میں نے نیم طنزیہ انداز میں اسے سراہا پھر اس کی بے پروائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چوٹ کی۔ ''آپ لوگوں کے ناموں پر غور نہیں کرتے یعنی اگر آپ جمشید کی گرفتاری پر نکلے ہوں تو فاروق کو بھی پکڑ کر لا سکتے ہیں۔ اس سے آپ کے تفتیشی عمل میں کوئی خلل یا فرق نہیں پڑتا......؟''

''آپ میری بات کا غلط مطلب لے رہے ہیں......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر مقتول میرا ہم نام ہے تو اس میں میرے لیے کچھ بھی انوکھا اور عجیب نہیں ہے۔''

''آئی او صاحب! اس وضاحت کے لیے بہت بہت شکریہ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کو اس واردات کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟''

''ہمارے روزنامچے کے مطابق، اس واقعے کی

اطلاع اٹھارہ مارچ کی صبح لگ بھگ دس بجے فون کے ذریعے دی گئی تھی۔'' اس نے پُر وثوق انداز میں جواب دیا۔'' اور یہ فون بلڈنگ کے مالک داؤد نے کیا تھا۔''

'' ٹھیک ہے۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور پوچھا۔'' آپ جائے وقوعہ پر کب پہنچے تھے؟''

'' ساڑھے دس بجے۔''

'' جب آپ جائے واردات یعنی بلڈنگ کی چھت پر پہنچے تو وہاں اور کون کون موجود تھا؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

'' کوئی بھی نہیں۔'' اس نے بتایا۔

'' کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

'' مطلب یہ کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' بلڈنگ کے مالک یعنی داؤد صاحب نے واردات کا انکشاف ہونے کے بعد پہلے تو پولیس کو فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی پھر چھت والے دروازے کو تالا لگا دیا تھا تاکہ پولیس کے شواہد کے معاملے میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ اگر چھت کھلی رہنے کی وجہ سے بہت سے افراد جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے پہنچ جاتے تو بہت سارے ثبوت اور شواہد ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ بعض اوقات ایک معمولی سی واقعاتی شہادت بھی کیس کا پانسا پلٹ دیتی ہے۔''

'' میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں آئی او صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔'' آپ نے جائے وقوعہ پر مقتول کی لاش کا معائنہ کرنے کے بعد فوری طور پر کیا رائے قائم کی تھی؟''

'' مقتول کی لاش پانی والی ٹینکی کے عقب میں موجود ...... بلاکس پر پڑی ملی تھی۔'' وہ بڑے پُر سکون انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' آہنی رینچ پانے کی خوفناک ضرب نے مقتول کی کھوپڑی کا ستیاناس کر دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول پر بے خبری میں وار کیا گیا تھا اور اس کی موت فوراً ہی واقع ہو گئی تھی۔ مقتول کی مجروح کھوپڑی بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہے۔ کھوپڑی کے عقبی حصے کا پاش پاش ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قاتل نے اس کے پیچھے سے وزنی آہنی رینچ پانے کا وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔''

'' آپ نے آلۂ قتل کو بھی فوراً ہی ڈھونڈ نکالا تھا۔'' میں نے کہا۔'' کیا قاتل آلۂ قتل کو جائے وقوعہ پر ہی چھوڑ گیا تھا؟''

'' نہیں......!'' آئی او نے نفی میں گردن ہلائی۔'' آلۂ قتل کی تلاش میں ہمیں تھوڑی سی مغز سوزی کرنا پڑی تھی۔ بہر حال، وہ رینچ پانا چھت ہی کے ایک کونے میں جمع کاٹھ کباڑ کے اندر سے مل گیا تھا۔''

'' آئی او صاحب......!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔'' کیس فائل کے اندر مجھے فنگر پرنٹس کی رپورٹ کہیں نظر نہیں آ رہی۔ کیا آپ آلۂ قتل سے '' ایف پی'' اٹھانا بھول گئے تھے؟''

'' ہم ایسی سنگین غلطی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔'' لیکن حقیقت یہ ہے کہ آلۂ قتل پر سے ہمیں کسی کی بھی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے تھے اسی لیے ان کا کہیں ذکر نہیں......''

'' آپ کا مطلب ہے، شاطر قاتل نے اپنے شکار کو ٹھکانے لگانے کے بعد آلۂ قتل پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات کو صاف کر دیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

'' یہ بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ ذومعنی لہجے میں بولا۔

'' اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟'' میں سوال کیے بنا نہ رہ سکا۔

'' اس بات کے بھی روشن امکانات ہیں کہ قاتل نے دستانے پہن کر یہ واردات کی ہو......'' آئی او نے جواب دیا۔

'' اس سے قاتل کی ہوشیاری اور چالاکی ثابت ہوتی ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔'' میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

'' جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔'' اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے۔''

'' آئی او صاحب!'' میں نے اپنی جرح کے گھیرے کو تنگ کرتے ہوئے کہا۔'' آپ میری اس بات سے تو اتفاق کریں گے نا کہ وقوعہ کی رات ایک اور دو بجے کے درمیان قاتل اور مقتول دونوں بلڈنگ کی چھت پر، پانی والی ٹینکی کے عقب میں موجود تھے؟''

'' آپ بھی کمال کرتے ہیں وکیل صاحب!'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔'' اس بات میں کیا شک ہو سکتا ہے......؟''

'' لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چھت والے دروازے پر تالا لگا ہونے کے باوجود بھی وہ کس طرح اوپر پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔'' کیا آپ اس معاملے پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ آپ نے اس پہلو کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھی تو تفتیش کی ہو گی؟''

'' جی ہاں۔ تفتیش کے دوران ایک ساتھ بہت سے پہلوؤں کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن

ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس حوالے سے میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مقتول نے چھت والے دروازے کے تالے کی ڈپلی کیٹ چابی بنوار کھی تھی اور وہ اسی چابی کی مدد سے وقوعہ کی رات تالا کھول کر چھت پر پہنچا تھا۔''

''مقتول کا سابق عاشقانہ ریکارڈ بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''ماضی میں بھی وہ اسی قسم کی ایک حرکت کر چکا تھا جب وہ رضوانہ نامی ایک خوب صورت لڑکی سے پیار بھری باتیں کرنے بلڈنگ کی چھت پر جایا کرتا تھا۔ پچھلی پیشی پر مقتول کے بڑے بھائی نے اس امر کی تصدیق بھی کی ہے۔ کیا اس بار بھی اسی نوعیت کا کوئی معاملہ تھا......؟''

''میں سمجھا نہیں جناب؟'' جواب دینے کے بجائے وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا وقوعہ کی رات بھی مقتول ایسی ہی کسی عاشقانہ ملاقات کے لیے بلڈنگ کی چھت پر پہنچا تھا؟ آپ نے اپنی تفتیش کے دوران میں عشق ومحبت کی ''خوشبو'' کو کسی مرحلے پر محسوس کیا ہے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''آپ میرا مطلب تو سمجھ گئے ہوں گے؟''

''جی ہاں۔ بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''لیکن جائے وقوعہ پر اور بعد ازاں تفتیش کے دوران میں مجھے ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مقتول وقوعہ کی رات کسی لڑکی سے ملاقات کرنے بلڈنگ کی چھت پر گیا ہو اور قاتل بھی اس کا تعاقب کرتے ہوئے جائے وقوعہ پر پہنچ گیا ہو پھر موقع ملتے ہی قاتل نے مقتول کو ٹھکانے لگا دیا ہو......؟''

''ایسا ہونا ممکن تو ہے لیکن چونکہ مجھے جائے واردات سے کسی لڑکی کی موجودگی کے آثار نہیں ملے اس لیے میں اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا البتہ......'' وہ چند سیکنڈ کے لیے تھما پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''......البتہ میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وقوعہ کی رات مقتول کسی بھی غرض سے بلڈنگ کی چھت پر پہنچا تھا۔ اس کے پاس چھت والے تالے کی ڈپلی کیٹ چابی تھی جس کی مدد سے وہ چھت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اسی شام چونکہ ملزم اور مقتول میں اچھی خاصی جھڑپ ہوئی تھی لہٰذا اس بات کا روشن امکان ہے کہ ملزم، مقتول کی تاک میں رہا ہوگا اور اس کے پیچھے ہی ملزم بھی چپکے سے چھت پر پہنچ گیا اور موقع ملتے ہی مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''آئی او صاحب!'' میں نے تفتیشی افسر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''مقتول کی لاش کے معائنے کے دوران آپ نے مقتول کی جامہ تلاشی تو لی ہوگی؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے سوال کیا۔ ''کیا آپ کو مقتول کے لباس میں سے، چھت والے تالے کی ڈپلی کیٹ چابی ملی تھی؟''

''جی نہیں......'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

''اگر مقتول ڈپلی کیٹ چابی کی مدد سے تالا کھول کر چھت پر گیا تھا تو پھر وہ چابی اس کے لباس سے برآمد ہونا چاہیے تھی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مذکورہ چابی کہاں غائب ہوگئی؟''

''میرے خیال میں وہ چابی ملزم نے مقتول کی جیب میں سے نکال لی ہوگی۔'' آئی او وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور اس نے مقتول کو، موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد واپس جاتے ہوئے اسی چابی کی مدد سے تالا بند کر دیا ہوگا۔''

''آپ کا مطلب ہے، چھت کے دروازے کا تالا کھٹکے سے بند ہونے والا نہیں۔'' میں نے پوچھا۔ ''اسے بند کرنے کے لیے بھی چابی کا استعمال کرنا پڑتا ہے؟''

''جی ہاں...... میرا یہی مطلب ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''تو آپ اس حوالے سے کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتے کہ وقوعہ کی رات مقتول کس مقصد سے بلڈنگ کی چھت پر پہنچا تھا؟''

''سوری وکیل صاحب!'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''میں اس سلسلے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا، اگر مقتول اس وقت زندہ ہوتا تو میں اس سے پوچھ کر ضرور آپ کو بتا دیتا۔''

''اگر مقتول زندہ ہوتا تو آج ہم عدالت میں یوں کھڑے ایک دوسرے کا ٹرائل نہ کر رہے ہوتے آئی او صاحب۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور نہ ہی گڑے مردے اکھاڑ کر مقتول کے معاشقوں کا ذکر ہو رہا ہوتا اور...... نہ میں آپ سے پوچھتا کہ آپ کو مقتول کے چھت پر جانے والے معاملے میں سے پیار ومحبت کی خوشبو آ رہی ہے یا نہیں......''

جج جو کافی دیر سے ہمارے سوال وجواب کو دلچسپی سے سن رہا تھا، مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''وکیل صاحب! آپ جتنے تواتر اور مستقل مزاجی سے مقتول کے ساتھ کسی لڑکی کی ملاقات کو نتھی کر رہے ہیں اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس لڑکی کو اچھی طرح جانتے ہیں؟''

''جی ہاں...... کسی حد تک!'' میں نے مبہم سا جواب دیا۔

''اور آپ ان کے معاشقے سے بھی واقف ہیں؟''

''جی...... جی ہاں!'' میں نے احتیاط کے دامن کو تھامے رکھا۔

''کیا آپ مقتول کی محبوبہ کا نام ظاہر کریں گے؟''

''ضرور جناب عالی!'' میں نے نہایت ہی احترام سے کہا۔ ''مگر ابھی نہیں۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' جج نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس پیشی پر مقتول کی محبوبہ کا نام کھل کر سامنے آ گیا تو آئندہ کی عدالتی کارروائی متاثر ہو سکتی ہے۔ میں انشاء اللہ! اگلی پیشی پر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے اپنے مؤکل کی...... بے گناہی کو معزز عدالت کے سامنے ثابت کر دوں گا۔''

اس کے بعد جج نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ حالات و واقعات کی نزاکت اور کیس کی حساس نوعیت کو بہ خوبی سمجھ سکتا تھا۔ میں نے آئی او پر کچھ زیادہ ہی طویل جرح کر دی تھی لہٰذا عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

میں نے گزشتہ پیشی پر مقتول کے عشقیہ معاملات کی کہانی چھیڑ کر اس کیس کی عدالتی کارروائی میں سنسنی سی دوڑا دی تھی اور یہ کوئی من گھڑت قصہ نہیں تھا۔ میں نے پچھلے دنوں اس سلسلے میں اچھی خاصی چھان بین بلکہ ریسرچ کر ڈالی تھی اور مقتول کے تازہ ترین معاشقے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں اس نوعیت کے جاسوسانہ کام کیسے کرتا ہوں، اس سلسلے کے مستقل قارئین اچھی طرح جانتے ہیں۔ بہرحال کئی روز کی دوڑ دھوپ کے بعد میں اپنی ضرورت اور طلب کے نکات جمع کرنے میں سرخرو ہو گیا تھا اور آج کی عدالتی کارروائی میں مجھے انہی معلومات کی مار، مار کر اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنا تھا۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ استغاثہ کی جانب سے بلڈنگ کے مالک داؤد کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ داؤد نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے پاس پہنچ گیا۔

وکیل استغاثہ نے گواہ پر بڑی ڈھیلی ڈھالی جرح کی اور دس پندرہ منٹ ہی میں اسے فارغ کر دیا۔ اپنی باری پر جج کی اجازت حاصل کر کے میں وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا اور گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''داؤد صاحب! کیا یہ بات درست ہے کہ چھت والے دروازے کی چابی صرف آپ ہی کے پاس رہتی ہے؟''

''جی ہاں...... یہی حقیقت ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''وقوعہ کی رات مقتول یا ملزم میں سے کسی نے آپ سے، چھت پر جانے کی خواہش کا اظہار تو نہیں کیا تھا؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو دھیرے دھیرے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں۔'' اس کا جواب نفی میں تھا۔

''اس کا مطلب ہے، سترہ اور اٹھارہ مارچ کی درمیانی رات اس تالے کی چابی آپ ہی کے پاس رہی تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''پوری رات چھت والا دروازہ بند رہا تھا؟''

''اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ چابی وقوعہ کی رات میرے گھر میں موجود رہی تھی اور بلڈنگ کے کسی بھی رہائشی نے چھت پر جانے کے لیے مجھ سے چابی نہیں مانگی تھی لیکن......'' اس نے رک کر گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ پوری رات چھت والا دروازہ بند رہا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہوا ہوتا تو پھر قاتل اور مقتول چھت پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وہ دونوں چھت پر پہنچے تھے جبھی تو وہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا تھا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں داؤد صاحب!'' میں نے استغاثہ کے گواہ کو رفتہ رفتہ اپنے گھیرے میں لاتے ہوئے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ ''حالات و واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل اور مقتول میں سے کسی ایک کے پاس یا پھر دونوں کے پاس چھت والے تالے کی ڈپلی کیٹ چابی موجود تھی جس کی مدد سے وہ تالا کھول کر چھت پر پہنچے تھے۔ آپ کے خیال میں مقتول ساجد کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہوگا؟''

''ظاہر ہے ملزم نے...... اور کس نے۔'' وہ کٹہرے میں کھڑے میرے مؤکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''پچھلے کافی عرصے سے انہی دونوں کے بیچ پھڈا چلا آ رہا ہے اور دو تین مرتبہ مقتول نے ملزم کی اچھی خاصی ٹھکائی

بھی کر دی تھی اور جیسا کہ آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ ایک موقع پر تو ملزم نے مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی اور اس کے کچھ دن بعد ہی یہ واقعہ پیش آ گیا تھا لہٰذا زیادہ امکانات اسی بات کے ہیں کہ ملزم نے موقع ملتے ہی مقتول کو ٹھکانے لگا دیا ہوگا......''

''امکانات اسی بات کے ہیں......'' میں نے گواہ کے الفاظ کو معنی خیز انداز میں دہرایا۔ ''یعنی آپ کو یقین نہیں ہے کہ ملزم نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا؟''

''دیکھیں جناب! سیدھی سی بات ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''میں نے ملزم کو اپنی آنکھوں کے سامنے تو قتل کی واردات کرتے ہوئے دیکھا نہیں تھا جو قسم کھا کر اس امر کی تصدیق کروں۔ حالات و واقعات اور مقتول و ملزم کے بیچ ہونے والی سابق جھڑپوں کی روشنی میں تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ملزم نے مقتول کی زندگی کا چراغ گل کر دیا ہوگا۔''

''آپ نے وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب میں ملزم کو لڑاکا، غصہ ور اور جھگڑالو طبیعت کا مالک قرار دیا ہے۔'' میں نے داؤد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ اس بلڈنگ کے مالک ہیں جہاں دوسرے کرائے داروں کے علاوہ مقتول اور ملزم بھی رہائش پذیر ہیں اور اتفاق سے آپ کی رہائش بھی اسی بلڈنگ میں بلکہ ملزم کے فلیٹ کے عین سامنے ہے لہٰذا اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ اکثر آپ لوگوں کا آمنا سامنا ہوتا رہتا ہوگا۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ آپ کے ساتھ ملزم نے کتنی بار جھگڑا کیا ہے؟'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ملزم اگر جھگڑالو اور پھڈے باز قسم کا شخص ہے تو یقیناً کبھی نہ کبھی تو آپ سے بھی اس کی منہ ماری ہوئی ہوگی؟''

''ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں وکیل صاحب!'' گواہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں نے ملزم کے غصہ ور، جھگڑالو اور فتنہ پرور ہونے کا جو حوالہ دیا ہے وہ معاملہ صرف مقتول اور ملزم کی ذات کی مناسبت سے ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو صاف بات یہ ہے کہ مجھ سے کبھی اس کا جھگڑا نہیں ہوا۔''

''یعنی اگر آپ کی ذات کو فوکس کیا جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ ملزم جھگڑالو اور شر پسند نہیں ہے؟'' میں نے تیکھے انداز میں استفسار کیا۔

''جی...... آپ ایسا سمجھ سکتے ہیں۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''داؤد صاحب! آپ اس بات سے تو انکار نہیں کریں گے کہ......'' میں نے جرح کے سلسلے کو دھیرے دھیرے سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''دو، ڈھائی سال پہلے بھی نہایت ہی چالاکی کے ساتھ مقتول نے چھت والے تالے کی ڈپلی کیٹ چابی بنوائی تھی اور وہ رضوانہ نامی ایک خوب صورت لڑکی سے رات کی تاریکی میں، چھت پر ملاقاتیں کیا کرتا تھا۔ بعدازاں جب یہ معاملہ کھلا تو بلڈنگ میں اور بلڈنگ کے باہر محلے میں بڑی ''تھوتھو'' ہوئی تھی۔ رضوانہ کی بیوہ ماں فاخرہ بیگم آپ کی بلڈنگ چھوڑ کر قیوم آباد شفٹ ہو گئی تھی اور آپ نے چھت والے دروازے کا کھٹکے والا تالا تبدیل کر کے اس کی جگہ پرانی وضع کا ایک بڑا سا ایسا تالا لگا دیا تھا جو بند بھی چابی ہی کی مدد سے ہوتا ہے...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مقتول نے بڑی ہوشیاری اور عیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھت والے تالے کی ڈپلی کیٹ چابی بنوائی تھی۔''

''اگر میں غلط نہیں کہہ رہا تو پھر یقیناً اس بار بھی مقتول نے جو ڈپلی کیٹ چابی بنوائی تھی تو اس کے پیچھے بھی کوئی عشق پیچا قسم کی داستان ہی کارفرما رہی ہوگی۔'' میں نے اپنی ریسرچ سے حاصل ہونے والی سنسنی خیز معلومات کا برمحل استعمال کرتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے سوال کیا۔ ''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ جب وقوعہ پیش آیا ان دنوں مقتول کا کس لڑکی سے چکر چل رہا تھا؟''

''میں کیا بتا سکتا ہوں......'' وہ گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''یہ...... یہ...... تو آپ...... اپنے مؤکل سے پوچھیں۔''

''میرے سوال پر آپ اتنے گھبرا کیوں گئے ہیں داؤد صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''اور...... یہ بھی فرمائیں کہ میں اپنے مؤکل سے کیوں پوچھوں؟''

''میں تو ٹھیک ہوں......'' وہ قدرے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''آ...... آپ کو کیوں لگا کہ میں...... گھبرا گیا ہوں؟''

اس انداز میں الٹا مجھ سے استفسار کرنا اس بات کا ثبوت تھا کہ ان لمحات میں وہ واقعی گھبراہٹ کا شکار تھا۔ میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے داؤد صاحب! آپ بالکل بھی گھبرائے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک دم نارمل نظر آ رہے ہیں۔ اب ذرا میرے سوال کا بھی جواب دے دیں۔''

''کون سا سوال؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

اگر اس کا ذہن الجھن کا شکار نہ ہوتا تو وہ یہ سوال نہ کرتا بہرحال، میں نے اس کی آسانی کی غرض سے کہا۔

''یہ بتائیں کہ میں اپنے مؤکل سے کیوں پوچھوں کہ

اپنی موت سے قبل اس کے دشمن یعنی مقتول ساجد کا کس لڑکی سے عشق چل رہا تھا......؟''

''یہ بات میں نے اس لیے کی ہے کہ......'' وہ بگڑتی ہوئی پچویشن کو سنبھالا دیتے ہوئے بولا۔ ''ملزم کا فوزیہ نامی ایک لڑکی کے حوالے سے مقتول کے ساتھ جھگڑا ہو چکا تھا۔ یہ لڑکی ان دونوں کے بیچ فساد کا سبب بن گئی تھی۔''

اس کے جواب کا کوئی سر پیر نظر نہیں آتا تھا۔ میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ آخر وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اس کی سوچ کو واضح کرنے کے لیے پوچھ لیا۔

''داؤد صاحب! آپ کہیں اس فوزیہ کا ذکر تو نہیں کر رہے جو محمد سالک کی چھوٹی بیٹی ہے اور جس کے لیے ملزم نے اپنا رشتہ بھی بھیجا تھا؟''

''جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''میں اسی لڑکی کا ذکر کر رہا ہوں۔''

میری مستند معلومات چیخ چیخ کر مجھے بتا رہی تھیں کہ استغاثہ کا گواہ حقائق کی جانب سے میرا دھیان ہٹانے کے لیے مجھے اور میری جرح کی گاڑی کو کسی اور پٹری پر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے داؤ د پر کچا ہاتھ ڈالا تھا اور نہ ہی اسے فرار کا کوئی موقع دینا چاہتا تھا لہٰذا بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے میں نے میٹھی چھری سے اسے ذبح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''داؤد صاحب! آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں۔'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''ملزم فوزیہ نامی مذکورہ لڑکی سے محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا جبکہ مقتول، فوزیہ کو ملزم کے خلاف بھڑکانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وقوعہ کی رات مقتول اور فوزیہ بلڈنگ کی چھت پر......''

''یہ آپ کا خیال ہے کہ مقتول محض فوزیہ کو ملزم کے خلاف بھڑکانے کی کوشش میں رہتا تھا۔'' وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔ ''یہ بھی تو ممکن ہے کہ مقتول اور فوزیہ میں گہرا ربط ضبط ہو اور ملزم کی انٹری نے انہیں ڈسٹرب کر دیا ہو۔ آپ تو وہ بیان کر رہے ہیں نا جو کہانی آپ کے مؤکل نے آپ کو سنائی ہے۔ معاملہ اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے۔''

وہ جتنی ڈھٹائی کے ساتھ محمد سالک کی بیٹی فوزیہ کو مقتول کے ساتھ نتھی کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا اس سے اس کی ذہنی پس ماندگی اور اخلاقی گراوٹ کا اظہار ہوتا تھا۔ میں نے استغاثہ کے گواہ کو کاسٹک سوڈا میں دھونا شروع کر دیا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں داؤد صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے...... مثلاً یہ کہ لڑکی کے باپ کو مقتول کے اس ''حساس'' معاملے کی خبر ہو گئی ہو گی۔ وہ ان دونوں کی ملاقات سے پہلے کسی طرح بلڈنگ کی چھت پر پہنچ گیا ہو اور پھر جیسے ہی اسے موقع ملا، اس نے تاریکی کا فائدہ اٹھا کر مقتول کی بے خبری میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔''

''جی ہاں......ایسا ہو سکتا ہے۔'' وہ سرسری انداز میں بولا۔

''جب ہم امکانات ہی کی بات کر رہے ہیں تو پھر یہ بھی تو سوچا جا سکتا ہے کہ وقوعہ کی رات مقتول، فوزیہ سے ملاقات کرنے بلڈنگ کی چھت پر نہ پہنچا ہو بلکہ......''

میرے ادھورے جملے پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بے ساختہ بولا۔ ''بلکہ......کیا وکیل صاحب؟''

''بلکہ یہ کہ وہ فوزیہ کے علاوہ کوئی اور لڑکی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ نے نہ تو مقتول کو اپنی آنکھوں سے چھت پر جاتے دیکھا تھا اور نہ ہی فوزیہ کو تاہم وقوعہ سے مقتول کا چھت پر پہنچنا ثابت ہوتا ہے لیکن اگر ہم فوزیہ کی جگہ کسی اور لڑکی کو اس کہانی میں فٹ کر لیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں......؟''

''میں بھلا کیوں اعتراض کروں گا؟'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے اپنی جرح کی مدد سے بڑی صفائی کے ساتھ عدالتی کارروائی کو ملزم ریاض کی طرف سے ہٹا کر مقتول اور کسی نامعلوم لڑکی تک محدود کر دیا تھا۔ استغاثہ کے گواہ کو غیر محسوس انداز میں گھیر گھار کر میں اس کیس کے ڈراپ سین اور منطقی انجام کے قریب لے آیا تھا۔

''اور اگر......'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سنسنی خیز انداز میں پوچھا۔ ''ہم فرض کر لیں کہ اس لڑکی کا تعلق بھی آپ ہی کی بلڈنگ سے تھا تو......؟''

''تت......تو......کیا......'' وہ بے حد الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''میرا مطلب ہے، آپ اس بلڈنگ کے مالک ہیں۔'' میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو اس سلسلے میں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

وہ ہاتھ کی پشت سے ماتھے کے پسینے کو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''نن......نہیں!''

''داؤد صاحب!'' میں یک دم سفاک ہو گیا۔ ''آپ کو کب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مقتول نے ''م'' کو اپنی محبت کے سنہری جال میں پھانس لیا ہے؟''

''کیا......؟'' وہ حیرت بھری پریشانی سے بولا۔ ''مم......مجھے......کیوں اندازہ ہونے لگا......اس معاملے سے میرا کیا تعلق......؟''

''کیا واقعی تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں؟'' میں نے ''آپ'' سے ''تم'' پر آتے ہوئے جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

''نن...... نہیں۔'' وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولا۔

''کیا آپ ''م'' کو بھی نہیں جانتے......؟''

''کک...... کون...... ''م''......!'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

''جس سے ملاقات کے انتظار میں مقتول وقوعہ کی رات آپ کی بلڈنگ کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی بے خبری میں......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ڈرامائی انداز میں یوں اضافہ کیا۔ ''شقی القلب قاتل نے آہنی رینچ پانے کا مہلک وار کر کے مقتول کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ میں اسی لڑکی یعنی جس کا نام ''م'' سے شروع ہوتا ہے، کی بات کر رہا ہوں۔''

اس نے ایک بار پھر اپنی پیشانی سے پسینا صاف کیا اور بڑے کڑوے لہجے میں بولا۔ ''آپ تو اتنے وثوق سے ''م......م'' کی رٹ لگائے ہوئے ہیں جیسے اس لڑکی کو ذاتی طور پر جانتے ہیں؟''

''ذاتی طور پر نہ سہی مگر جانتا ضرور ہوں۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''اور آئندہ دس سیکنڈ میں تم نے اس سلسلے میں عدالت کی معلومات میں اضافہ نہ کیا تو مجبوراً مجھے ہی اس لڑکی کا نام ظاہر کرنا پڑے گا جس سے ملاقات کے انتظار میں مقتول اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا...... اور اس کے ساتھ ہی تمہارے یہ دس سیکنڈ شروع ہوتے ہیں...... ایک...... دو...... تین......''

''شیطان کی اولاد......!'' وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ ''اگر تم...... میری بیٹی منزہ کا نام اپنی زبان پر لائے تو میں...... تو میں...... تمہیں بھی......!''

''مجھے بھی آہنی رینچ پانے کی مدد سے موت کے گھاٹ اتار دو گے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے... بہ آوازِ بلند کہا۔ ''یہی کہنا چاہتے ہونا......؟''

وہ بڑے افراتفری کے انداز میں اچھل کر وٹنس باکس سے باہر نکلا پھر خوں خوار انداز میں میری جانب بڑھتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ''تمہاری گردن دبانے کے لیے تو میرے یہ دونوں ہاتھ ہی کافی ہیں۔''

میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا لہٰذا قبل اس کے کہ اس کے آگے کو پھیلے ہوئے ہاتھ میری گردن تک پہنچتے، میں بڑی ہوشیاری سے ایک جانب کھسک لیا اور جج کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جنابِ عالی! مجھے استغاثہ کے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ اس سے مزید پوچھ گچھ اب پولیس ہی کرے گی کیونکہ میرے محتاط اندازے کے مطابق، مقتول ساجد کو اسی شخص نے قتل کیا ہے...... دیٹس آل یور آنر!''

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل کو باعزت بری کر دیا کیونکہ وہ بے گناہ تھا۔ پچھلی پیشی پر داؤد کے رویے نے بادی النظر میں اسے ساجد کے قتل میں ملوث تو ثابت کر ہی دیا تھا تاہم جب عدالت کے حکم پر پولیس نے اسے شاملِ تفتیش کیا تو وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کر سکا۔ پولیس کو اس سے ''اقبالِ جرم'' کرانے میں خاص ''محنت'' نہیں کرنا پڑی تھی۔

داؤد کے اقبالی بیان کے مطابق وہ مقتول کے اپنی بیٹی منزہ کے ساتھ تعلقات سے آگاہ ہو گیا تھا۔ وہ مقتول کے سابق عاشقانہ ریکارڈ سے بھی واقف تھا لہٰذا اس نے اس معاملے کو اچھالنے یا اپنی بیٹی کو سمجھانے کے بجائے مقتول کی زندگی کا پتّا ہی صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ موقع کی تاک میں رہا پھر جب ملزم اور مقتول کے بیچ لڑائی جھگڑے کی فضا قائم ہو گئی اور وقوعہ کی شام بھی ان میں اچھا خاصا پھڈا ہو گیا تھا تو داؤد نے اسی رات کو اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے چن لیا۔ وہ جانتا تھا کہ مقتول نے منزہ کے تعاون سے تالے کی ڈپلی کیٹ چابی بنوا رکھی ہے لہٰذا وقوعہ کی رات وہ بھی دبے قدموں مقتول کے پیچھے ہی چھت پر پہنچ گیا پھر قبل اس کے کہ منزہ، مقتول سے ملاقات کے لیے ادھر کا رخ کرتی، داؤد نے مقتول کو بے خبر پا کر اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا اور اس کی جیب سے ڈپلی کیٹ چابی نکال لی، پھر وہ چھت والے دروازے کو تالا لگا کر اپنے گھر آ گیا۔

میں نے ایک موقع پر داؤد سے سوال کیا تھا کہ وہ تو اس بلڈنگ کا مالک تھا۔ وہ مقتول کے خون میں ہاتھ رنگنے کے بجائے ان لوگوں سے فلیٹ ہی خالی کرا لیتا؟ اس نے بڑے تلخ الفاظ میں جواب دیا تھا۔

''میں اس موذی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ گھر بدلنے سے اس کی خبیثانہ خصلت تبدیل نہیں ہوتی اور وہ کسی اور معصوم لڑکی کو محبت کا فریب دیتا۔''

انسان کو کسی بھی لمحے اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگر وہ سیر ہے تو قدرت نے اسی دنیا میں، اس کی سرکوبی کے لیے ''سوا سیر'' بھی پیدا کر رکھا ہے۔ ساجد نے اس نکتے کو ذہن میں نہیں رکھا اور اپنے کیے کے انجام کو پہنچا۔

(تحریر: حسام بٹ)



کاش

منظر امام

غلطی پر ندامت اچھی بات ہے مگر دیر سے احساس ہونے کا مطلب صرف اور صرف پچھتاوئوں کے سوا کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا۔ اگر وہ بھی زندگی کے اس موڑ پر حالات سے ایک چھوٹا سا سمجھوتا کر لیتی تو آج لختِ جگر سے جدائی جیسا بڑا غم اسے جھیلنا نہ پڑتا۔ بس یہی ایک چبھن ”کاش“ کی پھانس کو گویا دل میں اتارتی جا رہی تھی جب کہ اس کا مداوا بھی کسی کے پاس نہ تھا۔

جھوٹی انا کی قیدی ایک حسینہ کی عاقبت نااندیشی کا عذاب

ماں اکثر اپنے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔

”دیکھو بیٹا۔ زندگی میں جوتوں اور کپڑوں کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی اہمیت اچھے اخلاق، اچھے کردار اور اچھے رویے کی ہوتی ہے۔ انسان کے لیے یہ چیزیں زیادہ اہم ہیں۔ جوتے تو پرانے ہو کر خراب ہو جاتے ہیں۔ کپڑے تو پھٹ بھی جاتے ہیں لیکن یہ چیزیں زندگی بھر انسان کے ساتھ رہتی ہیں۔“

”ماں، میں کچھ نہیں جانتا۔“ بیٹا ضد کرنے لگا۔

”مجھے تو ویسے جوتے چاہئیں جیسے میرے پڑوسی وحید کے

پاس ہیں۔ ویسے کپڑے چاہئیں جیسے کپڑے میرا دوست صدام پہنتا ہے۔"

اس وقت ماں نے ایک دکھ بھری گہری سانس لی۔

"بیٹا، یہ سب میں تمہیں کیسے دلا سکتی ہوں۔ میں تو ایک معمولی سی پنشن پر گزارہ کر رہی ہوں۔ میرے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا ماں۔" وہ ضدی لہجے میں کہتا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے۔ "مجھے تو یہ سب چاہیے۔"

ماں اس وقت سر جھکا کر خاموش ہو جاتی۔ وہ سوچنے لگتی کہ کاش اس نے سعدون کی بات مان لی ہوتی۔

لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کا بیٹا چیزوں کے لیے اتنی ضد کرنے لگے گا۔ وہ جب اپنے دوستوں کو نئے جوتوں اور نئے کپڑوں میں دیکھے گا تو اتنا شور کرے گا۔

سعدون اس عورت کے مرحوم شوہر کا گہرا دوست تھا۔ شوہر کی موت کے بعد جب عدت ختم ہو گئی تو سعدون نے اسے اپنی شادی کا پیغام دے دیا تھا۔

اس عورت نے صاف انکار کر دیا بلکہ اسے سعدون پر بہت غصہ آ گیا تھا۔

"تم نے تو میرے مرتے ہوئے شوہر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ تم اس کی بیوی اور بچے کا خیال رکھو گے۔" اس نے ناراض ہو کر کہا۔ "اور تم اس طرح خیال رکھ رہے ہو کہ تم نے شادی کا پیغام دے دیا۔ واہ، کیا ہمدردی ہے تمہاری؟ تم کس طرح اپنی دوستی کا حق ادا کر رہے ہو۔"

"سلمان کی ماں۔" سعدون نے اسے مخاطب کیا۔ اس وقت وہ اس عورت کے ردعمل سے بوکھلا گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ "دیکھو، میں نے جو کچھ کہا ہے، تم اس پر ٹھنڈے دل سے سوچو۔"

"اب کیا سوچوں؟"

"دیکھو، تمہیں یہ تو اندازہ ہے نا کہ تمہارا شوہر میرا بہت اچھا دوست تھا۔" سعدون نے کہا۔

"ہاں، اس لیے تو میں تم پر بھروسا کرتی تھی کیونکہ میرا بیٹا بھی تم سے مانوس ہے۔"

"اور اسی بیٹے کی بھلائی کے لیے تو میں نے یہ پیشکش کی ہے۔" سعدون نے کہا۔

ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔

سلمان کی ماں (نجلا) کی سوچ یہ تھی کہ اس کے خیال میں سعدون اس طرح اس کی مدد کرتا کہ ہر مہینے وہ اس کے اور سلمان کے گزارے کے لیے کچھ رقم دے دیا کرتا۔ (اگرچہ یہ اس کا فرض نہیں تھا اور نہ ہی نجلا کا کوئی حق تھا لیکن سعدون اس کے شوہر کا... گہرا دوست تھا۔ وہ اپنے دوست کی بیوی اور بچے کو پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا تھا)

لیکن سعدون نے تو ایک الگ ہی بات کر دی تھی۔

جبکہ سعدون یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اور کس طرح اپنی بات کو مؤثر بنا کر دوبارہ پیش کرے۔ وہ شادی جیسے عمل سے دوبارہ گزرنے کی کوئی خاص خواہش نہیں رکھتا تھا۔ اس کی پہلے شادی ہو چکی تھی لیکن وہ ایک ناکام شادی تھی۔

سعدون دوبارہ اس المیے کو دہرانا نہیں چاہتا تھا لیکن اس عورت کے ساتھ بات کچھ اور تھی۔ اپنے مرحوم دوست کی بیوی کے ساتھ شادی کرنے کا خیال بہت پریشان کن بھی تھا۔ فرض کریں اگر یہ شادی ہو گئی تو اس کے مرحوم شوہر کی روح بے قرار نہیں ہو گی؟ کیا وہ خواب میں آ کر اسے برا بھلا نہیں کہے گی؟

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ کیا وہ یہ شادی اس بچے کے مستقبل کے لیے کرے گا...... یا اس عورت سے وہ محبت کرنے لگا ہے؟

دونوں کے پاس اپنے اپنے خیالات کی راہیں تھیں۔

سعدون نے اپنے دوست کی بیوی نجلا کی طرف دیکھا۔ اگرچہ عدت گزر چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ ابھی تک سیاہ ماتمی لباس میں تھی۔

اس کا بیٹا سلمان ایک طرف بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ ان دونوں کی طرف اس کی توجہ نہیں تھی۔ وہ اپنے کھیل میں مگن تھا۔

سعدون نے اضطرابی کیفیت میں اپنی ہتھیلیوں کو رگڑا۔ چھت کی طرف دیکھا۔ ان دیواروں کو دیکھا جن کو وہ سیکڑوں بار دیکھ چکا تھا۔ پھر اس نے ہمت کر کے اپنی بات دہرا دی۔

"دیکھو سلمان کی ماں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا تم اس بات کو بھول گئے کہ میں تمہارے مرحوم دوست کی بیوی ہوں۔؟" نجلا نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے یہ نہیں سوچا ہو گا کہ اس شادی پر لوگ کیا کہیں گے۔ مرد حضرات ہمیشہ اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنا مطلب سامنے رکھ کر سوچتے ہیں۔ وہ عورت کی مجبوریاں نہیں سمجھتے۔"

''لیکن سلمان کی ماں۔ تم یہ سب کیوں سوچنے لگیں کہ شادی کے بعد کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ زندگی اپنی ہوتی ہے۔ لوگوں کا ہماری زندگی سے کیا تعلق...... ہم ان کے سوچنے کی پروا کیوں کریں۔''

''یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم ایک مرد ہو۔''

''چلو ٹھیک ہے...... تو پھر؟''

''میرے انکار کی ایک اور وجہ بھی ہے۔'' نجلا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہوگے، مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''سلمان کی ماں۔ بہتر یہی ہے کہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ حقیقت پسند بن جاؤ۔ تم جانتی ہو کہ زندگی کی سختیاں بڑھتی چلی جارہی ہیں۔''

''دیکھو! میں نے اپنے آپ کو اپنے بچے کے لیے وقف کر دیا ہے اور اپنی زندگی اور اپنی خواہشات کو بھول گئی ہوں۔ سعدون! میں سب سے پہلے ایک ماں ہوں۔ تم نے کہا کہ تم اس بچے کے مستقبل اور اس کی بھلائی کے لیے مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ چلو...... وقتی طور پر تمہاری بات مان لی لیکن کیا ضروری ہے کہ ہمیشہ ایسا ہی رہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد تم اس بچے سے اکتا جاؤ۔ جس کی وجہ سے تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو اور ہم دونوں کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ خود سوچو پھر ہمارا کیا ہوگا؟''

''اوہ...... بہت افسوس ہوا یہ سن کر کہ تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔'' سعدون ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا تھا۔ ''جیسی تمہاری مرضی۔ خدا کرے تم دونوں خوش رہو۔''

سعدون چلا گیا۔ نجلا نے اس کے بعد پھر اسے نہیں دیکھا۔ نہ جانے وہ کہاں تھا۔ اس نے شادی کرلی تھی یا نہیں۔ نجلا کو اس کے بارے میں پھر کچھ نہیں معلوم ہوسکا تھا۔

اس کے بعد بھی نجلا کے لیے کئی رشتے آئے لیکن وہ انکار کرتی رہی...... کیوں؟

کیا اس لیے کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کی یادوں کو ہر دم اپنے ذہن میں تازہ اور زندہ رکھنا چاہتی تھی یا پھر اس لیے کہ اس نے اپنی زندگی اپنے بیٹے سلمان کے لیے وقف کردی تھی......؟

اس نے پھر اس موضوع پر کچھ سوچا ہی نہیں۔

خود اس کی ماں اس کے لیے کئی رشتے لے کر آئی لیکن وہ انکار کرتی رہی۔ حالانکہ وہ جوان بھی تھی اور خوب صورت بھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا۔

یہ احساس اس وقت اور شدید ہوجاتا جب وہ کسی شادی شدہ جوڑے کو دیکھتی۔ یہ دیکھتی کہ شوہر بیوی سے پیار کا اظہار کررہا ہے یا دونوں کسی بات پر ہنس رہے ہیں۔ اس وقت اسے اپنی تنہائی کا شدید احساس ہونے لگتا۔

اس وقت اس کو اپنا مرحوم شوہر بہت یاد آنے لگتا۔ اسے اس کی موجودگی پورے گھر میں محسوس ہوتی۔ اسے ایسا لگتا جیسے اس کے شوہر کی روح قریب کھڑی ہوکر سلمان کو دیکھ رہی ہے۔ جو کھلونوں سے کھیل رہا ہے یا ننھے ننھے قدموں سے پورے گھر میں گھوم رہا ہے۔

نجلا کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہوکر رہ گئی تھی۔

ایک طرف اس کی فطری خواہشات تھیں۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی مرد اس کے ساتھ رہے تاکہ وہ خود کو بے سہارا اور تنہا محسوس نہ کرے اور دوسری طرف اس بات کا عزم کہ اسے ہر حال میں اپنے بیٹے کو پروان چڑھانا ہے۔ اس کی پرورش کرنی ہے۔ اس کو اچھی تعلیم دلوانی ہے۔

اسے خیال تھا کہ اگر اس نے کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کرلیا تو وہ اس کے بچے کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر پائے گا۔ وہ اسے قبول نہیں کرے گا۔

اس لیے وہ اپنے بچے کی خاطر، اس کی معصوم شرارتوں اور اس کے لمس کی حرارتوں میں زندگی گزارتی چلی گئی۔

اس لیے اس نے اپنے آپ کو مار لیا۔ اپنی تنہائیوں اور محرومیوں سے سمجھوتا کرلیا اور اب اس کا بیٹا بڑا ہوچکا تھا۔

اتنا باشعور ہوچکا تھا کہ اسے اپنی مجبوریوں کا احساس نہیں رہا۔ اسی لیے وہ نئے جوتوں اور نئے کپڑوں کے لیے ضد کرتا رہتا تھا اور جب ماں اسے نہیں دلا پاتی تو وہ ایک قیامت کھڑی کردیتا تھا۔

اس وقت نجلا کو سعدون یاد آتا۔ اس کی باتیں یاد آتیں۔ جو یہ کہا کرتا تھا کہ زندگی بہت بے رحم ہے۔ تم حقیقت سے آنکھیں چرا کر زندہ نہیں رہ سکو گی۔

اور ایک وقت ایسا آئے گا، جب تمہارے پاس سوائے آنسوؤں کے اور کچھ نہیں ہوگا...... اور یہ وہی وقت تھا شاید۔

وہ رو رہی تھی اور اس کا بیٹا سلمان غصے میں آکر گھر کے برتنوں کو توڑنے لگا تھا۔

محفلِ شعر و سخن



❊ امتیاز احمد...... عظیم پورہ، کراچی

در کھلا، پر بیٹھے رہے پر سمیٹ کر
کرتے بھی کیا کہ جائے اماں ہی قفس میں تھی

❊ عبدالقدیر...... فیصل آباد

لیتی ہے جلتی شمع بھی بجھنے میں کچھ تو وقت
ہے آدمی سا کوئی کہاں بے ثبات اور
سیلاب جیسے لیتا ہے دیوار کے قدم
کرتا ہے تم بھی دل سے کوئی واردات اور

❊ ملائکہ حریم...... اوکاڑہ

بھول جانے کے لیے عذرِ شناسائی تو ہو
جاتے جاتے وہ مجھے میرا بھرم دے جائے گا



❊ محمد قدرت اللہ نیازی...... خانیوال

میری بنجر، بوجھل آنکھوں سے
تیری یاد کا زم زم جاری ہے

❊ اعجاز احمد راحیل ماہی، ساہیوال

اس کے جانے کا اس دل کو ڈر سا تھا
میرا دل بھی گویا کچا گھر سا تھا
اجڑی بستی کے پنچھی خوش حال ہیں
جینا تو انسانوں میں دوبھر سا تھا

❊ جاوید اختر رانا...... حیدر آباد

یوں دوستوں نے ختم کیا ہے یقین کو
میں چہرہ دیکھتا ہوں کبھی آستین کو

❊ اطہر حسین بیچار...... ہزاری جتوئی

اس دور میں توفیقِ وفا دی گئی مجھ کو
آخر یہ کس جرم کی سزا دی گئی مجھ کو

❊ سعدیہ بخاری...... ضلع اٹک

بستی بھی مری، سمندر بھی، بیاباں بھی مرا ہے
آنکھیں بھی مری، خواب پریشاں بھی مرا ہے
جو ڈوبتی جاتی ہے، وہ کشتی بھی ہے مری
جو ٹوٹتا جاتا ہے، وہ پیماں بھی مرا ہے

❊ بلقیس خان...... واہ کینٹ

جاتے ہو خدا حافظ، ہاں اتنی گزارش ہے
جب یاد ہم آ جائیں ملنے کی دعا کرنا

❊ مہتاب احمد...... حیدر آباد

علم کی حد سے پرے بندہ مومن کے لیے
لذتِ شوق بھی ہے، نعمتِ دیدار بھی ہے

❊ ایم کامران خالد...... ضلع اٹک

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ ترا
ہم بھی وہاں موجود تھے ہم سے سب پوچھا کیے
ہم چپ رہے، ہم ہنس دیے، منظور تھا پردہ ترا

❊ نوشہ گلزار...... بھکر

باتوں میں بھی پہلی سی کوئی بات نہیں ہے
ملتے ہیں مگر لطفِ ملاقات نہیں ہے

❁ جاوید شبیر بربرہ......علی پور مظفر گڑھ
قبریں ہی جانتی ہیں کہ اس شہرِ جبر میں
مر کر ہوئے ہیں دفن کہ زندہ گڑے ہیں لوگ

❁ ایم یوسف سانول...... تور پور تھل
تم جو ہوتے تو زندگی ہم سے
تلخ لہجے میں بات کیوں کرتی

❁ رمضان پاشا...... گلشن اقبال، کراچی
تمنا وہ تمنا ہے جو دل ہی دل میں رہ جائے
جو مر کر بھی نہ ہو پورا اسے ارمان کہتے ہیں

❁ رائے طیب اکرم بھٹی...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
دیکھ کر اس کے حسین چہرے پہ کچھ گردِ ملال
روشنی تیز چراغوں کی بھی مدھم سی لگی

❁ قاری وقاص ملاح...... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
ہم دعا لکھتے رہے وہ دغا پڑھتے رہے
ایک نقطے نے ہمیں محرم سے مجرم بنادیا

❁ سید عبادت کاظمی...... ڈیرہ اسماعیل خان
مٹی میں ملادیتی ہے ہنستے ہوئے چہرے
تقدیر کو رشتوں کی پہچان کہاں ہے

❁ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......خانیوال
مان جاؤ تمہیں بھی کوئی اچھا لگتا ہے
میں نے اکثر تمہیں اداس دیکھا ہے

❁ محمد جاوید عباسی...... نیو سینٹرل جیل ملتان
مانا کہ تیرے دل میں میری چاہ نہیں
تو پھر بھی میرا غم ہے، عقیدہ ہے یقین ہے
وہ تیرا تغافل ہے کہ سونا بھی لگے ہے مٹی
یہ میری عقیدت ہے کہ پتھر بھی نگین ہے

❁ نعمان شازل...... واہ کینٹ
میں فقیروں سے ہی کرتا ہوں تجارت اکثر
جو ایک پیسے میں لاکھوں کی دعا دیتے ہیں

❁ محمد جاوید ...... تحصیل علی پور
پلکوں کے دھاگے میں موتی آنسو کے پرو کر
سوچا اے میری آنکھ میرے نصیب کی طرح

❁ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان...... ہارون آباد
کیوں نہ اس حسرت سے میرا شیشۂ دل چور ہو
باغ تھا، ساقی تھا، سبزہ تھا، ہوا تھی میں نہ تھا

❁ محمد امجد ریاض...... تحصیل چیچہ وطنی
قافلے راکھ ہوئے دشتِ جنوں میں کتنے
کاش خوشیوں کی طرح درد بھی ہجرت کرتے

❁ رضوان تنولی کریز دی......اورنگی ٹاؤن کراچی
ہم اکیلے ہی نہیں شامل اس جرم میں
نظریں جب بھی ملیں مسکرائے وہ بھی تھے

❁ ادریس احمد خان...... ناظم آباد، کراچی
انہی خوش گمانیوں میں کہیں جاں سے بھی نہ جاؤ
وہ جو چارہ گر نہیں ہے اسے زخم کیوں دکھاؤ

❁ احمد حسن عرضی خان...... قبولہ شریف
کل انہی رستوں سے گزرا تو بہت رویا
سوچی ہوئی باتوں کو سوچا تو بہت رویا
دل میرا ہر اک شے کو آئینہ سمجھتا ہے
ڈھلتے ہوئے سورج کو دیکھا تو بہت رویا

❁ ریاض بٹ...... حسن ابدال
زخمی ہوئے جو ہونٹ تو محسوس یہ ہوا
چوما تھا میں نے پھول کو دیوانگی کے ساتھ

❁ ماہین فاطمہ......اوکاڑہ
سوچتا رہتا ہوں تنہائی میں انجامِ خلوص
پھر اسی جرمِ محبت کو دوبارہ کرکے

❁ داؤد اشفاق......اوکاڑہ
محبت ایک خوشبو ہے ہمیشہ ساتھ چلتی ہے
کوئی انسان تنہائی میں بھی تنہا نہیں رہتا

❁ اشفاق شاہین...... کراچی
وقت کے پاس نہ آنکھیں ہیں نہ احساس نہ دل
اپنے چہرے پر کوئی درد نہ تحریر کرے

❁ وزیر محمد خان...... بٹل ہزارہ
حسرت کو لے تو آئیں تیری بزمِ ناز میں
کم بخت رو نہ دے کہیں محفل کے سامنے

❁ شاہین اقبال...... گجرات
تو ہوا کے ہاتھ پر چاہتوں کا دیا جلانے کی ضد نہ کر
یہ اداس لوگوں کا شہر ہے یہاں مسکرانے کی ضد نہ کر

❁ مرزا طاہر الدین بیگ...... میر پور خاص
کسی کو روح میں پیوست پایا
مری آغوش میں وہ کلبلایا

❁ فرحانہ عاصم......سکھر
ہمارے پاؤں ہواؤں کی زد میں تھے ورنہ
گزرتی عمر کو رک رک کے ہم صدا دیتے
اب اس کی یاد سے اس کا بدن تراشتے ہیں
وہ خواب بھی تو نہیں تھا کہ بھلا دیتے

❁ اویس رضا......ملتان
دل کا بھی کبھی ہوتا ہے بچوں کا سا عالم
ہو زہر بھی خوش رنگ تو پینے کو مچل جائے

❁ منیر شگفتہ......وہاڑی
ایسے زخموں کا کیا کرے کوئی
جن کو مرہم سے آگ لگ جائے

❁ اطہر حسین......کراچی
ترکِ تعلق کے سارے ہی مرحلے
میں دیکھتا رہا وہ پار کر گیا

❁ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
آج تو اس قدر یاد آ رہے ہو
جس قدر تم نے بھلا رکھا ہے

❁ شاہین تبسم......حیدرآباد
کوئے جاناں میں سوگ برپا ہے
کہ اچانک سدھر گیا ہوں میں

❁ خرم عزیز......کراچی
قدموں تلے جو ریت بچھی تھی وہ چل پڑی
اس نے چھڑایا ہاتھ تو صحرا بدل گیا
کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں رہی
جاتے ہی ایک شخص کے کیا کیا بدل گیا

❁ انعم کمال......کراچی
مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا زمانے میں کیا

❁ فہد رضا......چکوال
تیری گلی میں آئے تھے بس تجھ کو دیکھنے
اس کے سوا ہمارا کوئی مدعا نہ تھا

❁ حنا عروج......کورنگی، کراچی
کسی ترنگ، کسی سرخوشی میں رہتا تھا
یہ کل کی بات ہے دل زندگی میں رہتا تھا

❁ شاہ زیب......سیالکوٹ
اس لمحے کے جادو سے پھر وقت نہیں نکلا
جو چیز جہاں پر تھی وہ چیز وہیں پر ہے

❁ ثاقب ریاض......گوجرانوالہ
خدا گواہ، وہ آسودگی نہیں پائی
تمہارے بعد کسی سے بھی پیار کرتے ہوئے

❁ آصف شیخ......راولپنڈی
ہر دم دنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں فرصت رہتی ہے

❁ نافع ضیا......اسلام آباد
کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
وہ شخص ایسا گیا پھر نظر نہیں آیا

❁ جبران ملک......کوئٹہ
کمرے میں میرے غم کے سوا اور کچھ نہیں
کھڑکی سے جھانکتی ہے کسے بار بار دھند

❁ ماہ رخ فیاض......لاہور
اندر کے موسموں کی خبر اس کو ہوگئی
اس نو بہارِ ناز کا چہرہ بدل گیا

❁ یعقوب شاہ......مردان
آندھی اڑا کے لے گئی جس کو ابھی ابھی
منزل کے سب نشان اسی راستے میں تھے

❁ صبا سحر......فیصل آباد
کچھ زمانے کے بھی حالات میں فرق آیا ہے
اور کچھ مجھ میں مری ذات میں فرق آیا ہے

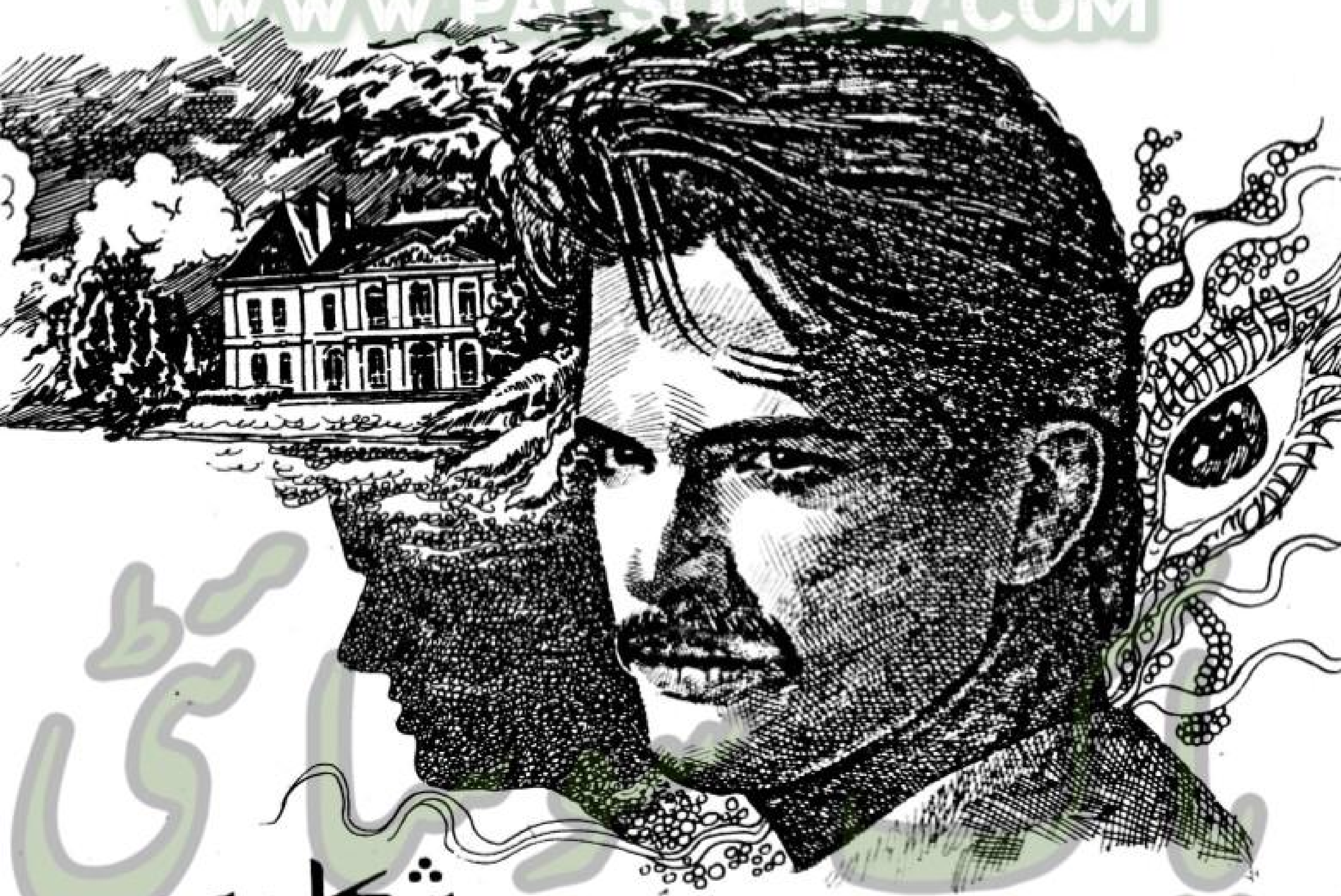
❁ علی رضا حسین......لاڑکانہ
ڈالا مصیبتوں میں دیوانہ وار خود کو
ہونے دیا نہ بالکل بااختیار خود کو

کوپن برائے شمارہ اگست 2015

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --



شکارپور سے شکاگو تک

ڈاکٹر شیر شاہ سید

ضمیر زندہ ہو تو زندگی کیسے کیسے واقعات رقم کرتی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھا جب جلاوطنی اس کے دل پر زخم تو لگا رہی تھی لیکن وطن کی ریت و رواج، پیار بھرم، اتحاد و یگانگت اور انصاف کے اصولوں کو جلتے دیکھ کر اس کی روح پر کبھی نہ بھرنے والے گھاؤ پڑ رہے تھے۔ جن کی تکلیف ناقابلِ برداشت تھی لہٰذا... بوجھل دل کے ساتھ اسے دیارِ غیر میں اپنے نئے یار تلاش کرنے پڑے۔

اپنے گھر کے اندھیروں سے ڈر کر سمندر پار روشنی پانے والوں کا قصہ

کراچی ائرپورٹ پر ستار موجود تھا۔ شکاگو سے جہاز کو کراچی پہنچنے میں چھبیس گھنٹے لگ گئے تھے۔ جہاز شکاگو سے آٹھ گھنٹے میں فرینک فرٹ آیا جہاں سے دو گھنٹے بعد نو گھنٹے کا سفر دبئی تک تھا۔ دبئی میں چار گھنٹے رکنے کے بعد کراچی پہنچنے میں مزید تین گھنٹے لگ گئے تھے۔

میں دس سال سے شکاگو میں تھا۔ لیاقت میڈیکل کالج حیدرآباد سے ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد ہی میں نے امریکا کے ویزے کا امتحان بھی پاس کرلیا تھا۔ امریکا آنے کے بعد میں نے دماغی بیماریوں کے علاج میں مہارت حاصل کی اور اسی میں امریکا کے بورڈ کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ امریکا میں بڑے اسپتال اور بڑے لوگ ہیں اور شاید میں بھی اچھا ہی ڈاکٹر تھا۔ جب میں نے نوکری تلاش

کرنی شروع کی تو تقریباً ایکس جگہوں سے میرے لیے انٹرویو کالز آئے تھے، تو جگہ انٹرویو دینے کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ شکاگو میں کام کروں گا۔

شکاگو میں کام کرنے کی کئی وجوہات تھیں۔ یہ شہر مجھے بہت پسند تھا۔ یہ امریکا کا پرانا شہر ہے، اس کی اپنی خوب صورتی ہے۔ یہاں کی شدید سردی بھی اچھی ہے اور گرمی کا مزہ بھی کچھ اور ہے۔ شہر ایسا ہے کہ ہر ایک کے لیے اپنا دامن پھیلائے بیٹھا ہے۔

میرا بچپن شکارپور میں گزرا تھا۔ ہزاروں سال پرانے اس شہر میں، میں پیدا ہوا۔ اس کی دھول مٹی کھا کر پلا بڑھا تھا۔ میرے بچپن کا شکارپور بہت خوب صورت تھا جہاں ہندو مسلمان دونوں مل جل کر رہتے تھے۔ کہتے ہیں برسوں سے مختلف تجارتی قافلے شکارپور کے مختلف دروازوں سے آتے اور کاروبار نمٹا کر ان دروازوں سے باہر چلے جاتے تھے۔ شہر میں رہنے والوں کی بڑی عزت تھی۔ یہ تو خود مجھے بھی یاد ہے میرے بچپن کا شکارپور صاف اور خوب صورت تھا۔ شام کے وقت جب شہر کی دیواریں گرم ہوتی تھیں تو بازاروں میں پانی کے چھڑکاؤ کے بعد تو سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی تھی۔ شکارپور کی شام کا دنیا میں کسی بھی شام سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جامشورو میں پڑھنے کے دوران ہر مہینے میں دو دفعہ شکارپور کا چکر لگتا تھا۔ شکارپور کی قلفی، حلوا اور شکارپور کا اچار۔ شکارپور کی صبح، شکارپور کی شام، شکارپور کی رات۔ ہر ایک کا ایک طلسم تھا۔

ڈاکٹر بننے کے بعد ایک سال کراچی میں، میں نے ہاؤس جاب کی تھی پھر سوچا تھا کہ کسی طرح سے شکارپور میں بھی نوکری مل جائے تو پھر شکارپور ہی چلا جاؤں گا مگر کراچی میں سارا پروگرام بدل گیا۔ وہاں سول اسپتال میں ڈاؤ میڈیکل کالج کے لڑکے تھے، کوئی انگلستان جانے کا پروگرام بنا رہا تھا، کسی نے امریکا جانے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ میں نے بھی سوچا چلو امریکا کا امتحان تو دے ہی دیتا ہوں۔ امتحان دیا اور پاس بھی ہوگیا۔ اس زمانے میں فوراً ہی امریکا سے نوکری کی آفر آجاتی تھی۔ مجھے بھی آگئی۔

میں نے سوچا کہ چار پانچ سال امریکا میں گزار کر کسی قابل بن جاؤں تو پھر واپس پاکستان آکر شکارپور میں کام کروں گا۔ شکارپور کی ٹھنڈی ہوا کی کیا بات تھی۔ صاف ستھری جیسے سیدھی جنت سے چلی آئی ہو۔ مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا تھا اور گرمیوں کی رات کو سوتا تھا تو فجر کے وقت کی سوندھی ٹھنڈی ہواؤں سے سردی لگتی تھی۔ میری ماں نماز پڑھنے اٹھتی تھی تو وضو سے پہلے کوئی اجرک، کوئی رلی میرے جسم پر ڈال دیتی تھی اور میرے ٹھنڈے سکڑتے ہوئے جسم میں جیسے جان پڑ جاتی تھی۔ میں روزانہ ان مہربان ہاتھوں کا انتظار کرتا تھا۔ وہ گرم گرم چادر، وہ شفیق جذبہ، وہ پیار بھرا سایہ پھر کبھی نہیں ملا۔ بڑا ہوا تو بابا مجھے بھی زبردستی نماز کے لیے اٹھاتے تھے اور میں نماز میں اونگھتا ہوا اس گرم چادر کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ پہلے تو ماں باپ راضی نہیں تھے جب راضی ہوئے تو یہ پابندی لگادی کہ شادی کر کے جانا ہوگا۔ پھر جلدی جلدی رضیہ سے میری شادی ہوگئی۔ رشتہ تو شاید اسی وقت طے ہوگیا تھا جب میں میڈیکل کالج میں تھا مگر میں نے نہیں سوچا تھا کہ اتنی جلدی شادی بھی ہوجائے گی۔

امریکا آنے کے چھ مہینے بعد رضیہ بھی آگئی تھی۔ میں بڑا مصروف رہتا تھا۔ کام میں میرا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ اپنا کام، سائنٹیفک میٹنگ میں تقریریں، میڈیکل اسٹوڈنٹس کو پڑھانا، ہر کوئی میری عزت کرتا تھا اور میں ہر ایک کے کام آتا تھا۔

بیچ میں دو دفعہ پاکستان گیا تھا دس بارہ دن کی چھٹیوں پر، یہ عجیب قسم کے دورے تھے دو تین دن جہاز میں، ایک دن کراچی میں۔ چار پانچ دن حیدرآباد میں اور پانچ چھ دن شکارپور میں۔ وقت نکل جاتا تھا اور واپس آکر لگتا تھا جیسے خواب ہو۔

میرے بابا اور ماں، رضیہ کے والدین بھی ایک دفعہ شکاگو آکر گئے تھے مگر شکاگو ان لوگوں کو پسند نہیں آیا تھا۔ تھوڑے دن گھومنے پھرنے کے بعد انہیں پاکستان کی اور شکارپور کی یاد ستانے لگتی تھی۔ میں اور میرے تینوں بچے ان لوگوں کو بہت مس کرتے تھے۔

پھر یکایک نہ جانے رضیہ کو کیا ہوگیا تھا کہ ایک روز کہنے لگی کہ اب ہم لوگوں کو واپس چلے جانا چاہیے، بہت ہوگیا امریکا میں رہنا۔ بہت کچھ سیکھ لیا، بہت کچھ کمالیا، دنیا دیکھ لی۔ شکاگو بہت اچھا ہے لیکن شکارپور تو نہیں ہے۔ نہ وہ گلیاں ہیں، نہ وہ دیواریں، نہ وہ آوازیں، نہ وہ ہوائیں۔ میرے دل نے کہا شاید یہ صحیح کہہ رہی ہے۔ دس سال میں پہلی بار میں نے سوچا تھا کہ چلنا چاہیے۔ میری یہاں یہ بہترین نوکری تھی، سال کے تقریباً چار لاکھ ڈالرز سے زیادہ کماتا تھا۔ بڑا سا خوب صورت مکان تھا جس میں دنیا کی ہر چیز موجود تھی۔ کام والوں کے درمیان عزت تھی لیکن لگتا تھا دل کہیں اور ہے۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ دوسرے دن ہی مجھے ستار کا خط آیا، ستار میرے کالج کا دوست تھا۔ اس نے لندن میں سرجری کی تھی اور کراچی کے جناح اسپتال میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھا۔ اس نے بہت ساری باتیں لکھی تھیں، دوستوں کی خبریں دی تھیں اور آخر میں لکھا تھا کہ میں پاکستان واپس آجاؤں۔ کراچی میں بہت کام ہے، سرکاری نوکری بھی مل جائے گی۔

میں اور رضیہ بہت دنوں تک سوچتے رہے۔ پھر ڈرتے ڈرتے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک ماہ کے لیے پاکستان جاؤں اور دیکھوں کے ستار کیا کہہ رہا ہے۔ اگر عزت اور انصاف کے ساتھ ذرا سا بھی کام کا آسرا ہو گیا تو پھر گڈ بائی شکاگو۔

ائرپورٹ سے میں ستار کے گھر گیا تھا۔ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں اس کا خوب صورت بڑا سا بنگلا تھا۔ ساری آسائشوں کے ساتھ۔ یہاں پہنچنے کے بعد کھانا وغیرہ کھا کر بارہ گھنٹے تو ایسی نیند آئی کہ کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ جاگا تو شام کا وقت تھا اور ستار ابھی تک کلینک سے واپس نہیں آیا تھا۔ میں نہا دھو کر چائے پینے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ وہ آگیا۔

اس نے بتایا کہ سندھ گورنمنٹ میں تو فوراً ہی مجھے نوکری مل جائے گی۔ اس کے بقول میں قابل تھا۔ شکار پور کا ڈومیسائل تھا تو نوکری نہ ملنے کا سوال ہی کیا ہے۔ گو کہ اس وقت نوکریوں پر پابندی ہے مگر پابندی ان لوگوں کے لیے ہے جن کی کوئی شنوائی نہیں ہے تمہارا تو کیس بنے گا، ایسا کیس بنے گا کہ نوکری ضرور ملے گی۔ مگر سوال یہ تھا نوکری کہاں ملے گی؟ اس کا خیال تھا کہ مجھے ہر صورت میں ڈاؤ میڈیکل کالج میں کام کرنا چاہیے۔

اس نے بتایا کہ کل شام کو سائیں کے پاس ہم لوگوں کو جانا ہے۔ وہاں سب پتا لگ جائے گا کہ یہ کس طرح ہوتا ہے۔

اس رات ہم لوگوں کی دعوت شکار پور کے پرانے دوست کے گھر میں تھی جو کراچی میں وکیل تھا اور آج کل وزیر بھی تھا۔ اس کا گھر بھی ڈیفنس کے عالی شان گھروں میں سے ایک تھا۔ بڑا سا لان، سوئمنگ پول، گھر میں شاندار فرنیچر۔ کھانا بھی بڑے تکلف سے پکایا گیا تھا۔ ہم لوگ کھاتے رہے اور بچپن کی باتوں سے دل بہلاتے رہے۔ پرانے دوستوں کو یاد کرتے رہے۔ ستار نے بتایا تھا کہ علی بخش آج کل سندھ کا اٹارنی جنرل ہے۔ مولا بخش سپریم کورٹ میں جج ہے اور اسلام آباد میں رہتا ہے۔ امتیاز سومرو، آفتاب اور علی نواز کراچی میں ہی ہیں اور ڈیفنس میں ہی رہتے ہیں۔ دو اور دوست حیدرآباد میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ اسے ہر ایک کے بارے میں ساری خبریں تھیں۔

میں نے پوچھا یار کوئی شکار پور میں بھی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ شکار پور میں ہر ایک کا گھر ہے، مگر وہاں ہے کوئی بھی نہیں۔

دوسرے دن سائیں کے گھر جانا ہوا۔ وہ کلفٹن کے ایک پرانے بنگلے میں رہتے تھے اور صرف سندھی یا انگلش میں بات کرتے۔ سائیں بہت تپاک سے ملے تھے۔ نوکروں سے بھرے گھر میں ہم دونوں کو بہت عزت سے بڑے کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔ حال پوچھا اور کہا کہ اگر مجھے واپس آنا ہے تو نوکری تو مل ہی جائے گی۔ اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ نوکری اگر نہیں ہے تو پیدا کی جائے گی۔ شکار پور کے ڈومیسائل کے ساتھ نوکری نہیں ملے گی تو کب ملے گی۔

میں نے حیرانی سے پوچھا کہ اگر نوکری نہیں ہے اور اگر نوکریوں پر پابندی ہے تو یہ کام کیسے ہوگا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی۔ سائیں مسکرائے۔ مجھے ایسے دیکھا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ ستار بھی آہستہ سے ہنس دیا تھا۔

سائیں اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ ایک دوسرا بڑا کمرا تھا جس کے بیچ میں ایک گول میز تھی، چند کرسیاں اور دیواروں پر چارٹ لگے ہوئے تھے۔ ان چارٹوں پر سندھ میں اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والوں کی ساری تفصیل موجود تھی۔ کس کا کب تقرر ہوا ہے اور کون کب ریٹائر ہو رہا ہے۔ سائیں دھیرے سے مسکرائے تھے اور کہا تھا بلکہ میرے پاس تو یہ بھی اطلاع موجود ہے کہ سندھ کا کون سا آدمی دنیا میں کہاں ہے جو کسی بھی وقت ان پوسٹوں پر آسکتا ہے مثلاً تمہارا نام بھی میرے پاس ہونا چاہیے۔

یہ کہہ کر انہوں نے الماری کی دراز کھولی۔ تم نے 1989ء میں پاس کیا تھا ٹھیک ہے نا۔ انہوں نے صفحے پر نظر ڈالی تھی جہاں میرا نام لکھا ہوا تھا، پوسٹ گریجویٹ فزیشن۔ ساتھ میں شکاگو کا ایڈریس بھی تھا۔ یہ اچھی بات ہے کہ تم آرہے ہو۔ دیکھو اس لسٹ میں بہت سارے نام ہیں جو انگلینڈ، امریکا اور کینیڈا میں موجود ہیں۔

میں نے غور سے دیکھا۔ تقریباً سارے ناموں کے آگے مختلف قسم کے کمنٹس لکھے ہوئے تھے۔ مگر مجھے نوکری کیسے ملے گی؟ میں نے پوچھا تھا۔ دیوار پر لگے ایک چارٹ پر سائیں نے ہاتھ رکھ دیا تھا، تم کو یہاں نوکری ملے گی۔ کراچی میں ڈاؤ میڈیکل کالج میں۔

میں نے قریب جا کر دیکھا مگر یہاں تو کسی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سائیں نے مسکرا کر کہا۔

"اس وقت نواب شاہ اور لاڑکانہ کے میڈیکل کالجوں میں جگہ ہے ان میں سے کسی ایک جگہ پر تمہارا ایڈہاک تقرر ہو جائے گا اور تم جوائن کر لینا۔ ایک ہفتہ کام کرنے کے بعد تین چار مہینوں کی چھٹی لے کر واپس چلے جانا۔ امریکا سے آنے کے لیے بھی تو وقت چاہیے ہوگا۔ جب تمہارے آنے کا وقت ہوگا تو جن صاحب کا نام لکھا ہوا ہے ان کا کراچی سے لاڑکانہ ٹرانسفر ہو جائے گا۔ یہ یا تو چلے جائیں گے جس کا کم ہی امکان ہے یا استعفادے دیں گے جو فوراً قبول کر لیا جائے گا۔ ان کو ابھی ریٹائر ہونے میں آٹھ سال کا عرصہ لگے گا اور اگر یہ استعفا دینے پر تیار نہیں ہوئے تو ان کے خلاف ایک مہم چلوادی جائے گی جس کے دوران یہ مشورہ بھی دیا جائے گا کہ یہ لمبی چھٹیوں پر چلے جائیں۔ انہیں کچھ تو کرنا ہی پڑے گا اور تمہارا راستہ صاف ہو جائے گا۔ ستار ان کی درخواست وغیرہ کاغذات کے ساتھ مجھے پہنچا دو تو میں مناسب کارروائی کے لیے دے دوں گا۔" سائیں نے کچھ سوچ کر بڑے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔ نوکر نے دروازے پر آکر اطلاع دی تھی کہ کھانا تیار ہے۔ کھانے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہی تھیں مگر میں سوچ رہا تھا، مسلسل سوچ رہا تھا کہ کراچی میں اس قسم کی نوکری کا کیا فائدہ جس کی بنیاد ہی ناانصافی پر ہو۔ اس سے تو اچھا ہے کہ میں نواب شاہ میں جا کر اپنا کچھ سیٹ اپ بنا لوں۔ ماں باپ، اپنی زمین مکان کے پاس بھی رہوں گا اور کسی قسم کی ناانصافی کا بوجھ بھی نہیں ہوگا۔ میں سوچتا رہا اتنے میں ستار نے کہا کہ اب چلنا چاہیے۔

راستے میں، میں نے ستار سے کہا تھا کہ یار یہ بات تو صحیح نہیں، ایک قابل آدمی اپنی جگہ مناسب کام کر رہا ہے۔ میں کس طرح سے زبردستی اس کی جگہ لے لوں۔

ستار نے مجھے عجیب طرح سے دیکھا تھا۔ ''یار تم بھی عجیب بات کر رہے ہو۔ ساری دنیا کا نظام ایسے ہی چلتا ہے جس کی حکومت ہوتی ہے اس کی مرضی کے لوگوں کا تقرر بھی ہوتا ہے۔ پھر تم تو قابل ہو۔ تمہارے پاس اصلی ڈگری ہے۔ تمہیں کاہے کا ڈر ہے۔ اب یہی وقت ہے کہ فائدہ اٹھایا جائے اگر فائدہ نہیں اٹھائیں گے تو کل پچھتائیں گے۔''

میں نے کہا کہ میں سوچتا ہوں، شکارپور سے ہو کر آتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا۔ شکارپور میں ہی اپنا ایک سینٹر بناؤں گا وہیں رہوں گا۔ سب خوش ہوں گے اور رضیہ بھی اسی میں زیادہ خوش ہوگی۔

دو دن کے بعد میں شکارپور چلا گیا۔ یہ وہ شکارپور تو نہیں تھا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ جہاں میں نے جوانی کی شامیں گزاری تھیں، جسے چھوڑ کر شکاگو گیا تھا۔ شہر کی ہر سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ شہر کا ہر نالا ابل رہا تھا۔ ہندوؤں کی بنائی ہوئی کشادہ عمارتوں میں بے ڈھنگے طریقے سے ترمیم کی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ شکارپور کی میونسپل کمیٹی کا وجود ہی نہیں ہے۔ پہلے میں آتا تھا تو جلدی سے چلا جاتا تھا۔ اتنی فرصت نہیں ہوتی تھی کہ چیزوں کو غور سے دیکھوں لیکن اس دفعہ کوئی اور بات تھی مجھے یہاں رہنا تھا مگر وہاں رہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی نیا اسکول کھلا تھا نہ کوئی نیا کالج، نہ کوئی کھیل کا میدان بنا تھا۔ نہ کسی نئی لائبریری کا قیام عمل میں آیا تھا اور نہ ہی کوئی اسپتال بنا تھا۔ شہر کے پرانے دروازے ختم ہو چکے تھے۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک پرانا ائرفورس کا جہاز بے ڈھنگے ستونوں پر لٹکا ہوا کسی چمگادڑ کی طرح شہر کی حالت زار پر ماتم کر رہا تھا۔

ستار نے تو مجھے بتایا تھا کہ کوٹا سسٹم کی وجہ سے شکارپور کے بہت سے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں مگر مجھے وہاں کوئی بھی تربیت یافتہ، سند یافتہ سرجن، فزیشن یا کوئی دوسرا ماہر نہیں ملا تھا۔ کہاں ہیں یہ لوگ؟ مجھے جلد ہی جواب مل گیا تھا۔ وہ سب لوگ کراچی میں رہتے ہیں۔ شکارپور کی گندی گلیوں سے دور، ابلتے ہوئے گٹروں سے پرے، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے بنگلوں میں۔ کلفٹن کے فلیٹوں میں اور سرکاری رہائش گاہوں میں۔

مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اس شہر کا یہ حال ہے جہاں کے وڈیرے اور زمیندار ہر حکومت کے وزیر اور سندھ کے وزیراعلیٰ رہے ہیں۔

میں نے اپنے بارے میں سوچا، اپنے بچوں کے بارے میں سوچا، رضیہ کے بارے میں سوچا۔ میں اور رضیہ تو یہاں بہت خوش ہوں گے مگر بچوں کو وہ تعلیم نہیں ملے گی جو اکیسویں صدی میں کام کرنے والوں کو ملنی چاہیے۔ میں اپنا سینٹر بنا کر علاقے کے اتنے مریض دیکھوں گا کہ گزارے سے کہیں زیادہ پیسے کما لوں گا مگر بچوں کو شکارپور تو وہ بھی نہیں دے سکے گا جو مجھے ملا تھا۔ میں نے محنت سے اچھے نمبر لیے تھے۔ بغیر سفارش کے لیاقت میڈیکل کالج میں امتحان پاس کیے تھے۔ امریکن امتحان پاس کر کے امریکا جا کر بھی بہت عزت سے رہ رہا ہوں۔ میرے بچوں کو مجھے ان سب چیزوں سے زیادہ دینا چاہیے جو میرے باپ نے مجھے دیا تھا۔ شکارپور میں انہیں کیا دے سکوں گا۔ شاید کراچی میں گرامر اسکول میں پڑھ لیں گے۔ ڈیفنس سوسائٹی میں شاید وہ سب کچھ تو نہیں مگر کچھ تو ملے گا۔ شکارپور سے بہتر ملے گا مگر کراچی کی نوکری کسی آدمی کو ہٹا کر مجھے اس کی جگہ ملے گی،

اسے بلیک میل کیا جائے گا، اس کا ٹرانسفر کرا کے مجھے نوکری دلوائی جائے گی۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے امریکا میں یہ ٹریننگ نہیں ملی تھی۔ مجھے شکا گو میں نوکری دی گئی تھی، گورے کو نوکری نہیں دی گئی تھی۔ میں زیادہ قابل تھا، میں زیادہ اچھا تھا۔

میں نے کافی دیر تک رضیہ سے فون پر بات کی، نہ کچھ اس کی سمجھ میں آیا نہ میری سمجھ میں آیا تھا۔

دو دن بعد میں واپس کراچی پہنچ گیا اور ستار سے اپنے خدشات کا ذکر کیا۔ وہ ہنسا اور اس نے کہا کہ تم تو یار کتابوں کی باتیں کرتے ہو۔ بے وقوف، شکار پور میں کیوں کام... گے۔ تمہارے بچوں کا ڈومیسائل ہوگا شکار پور کا، تمہارے کام ہوں گے شکار پور کے نام پر لیکن تم کراچی میں کام کرو گے اور شکار پور سے مریض تمہارے پاس یہاں بھی آئیں گے اور مجھے پتا ہے کہ تم کراچی میں اتنا کماؤ گے کہ عیش کرو گے عیش اور ساتھ میں گورنمنٹ کی نوکری بھی ہوگی۔ اس نے کہا کہ چلو سائیں کے پاس چلو تمہارا تقریباً سارا کام ہو گیا ہوگا۔

میں نے کہا۔ ”یار مگر میں نے تو کوئی درخواست دی ہی نہیں تھی۔“ وہ پھر زور سے ہنسا اور بولا۔

”تم سائیں کو سمجھتے نہیں ہو۔ ارے تمہارے شکار پور جانے کے بعد انہوں نے مجھے بلایا تھا۔ تمہاری تفصیلات تو میرے پاس تھیں ہی، اس کی بنیاد پر میں نے تمہارے نام سے درخواست لکھی تھی۔ اس کی ایک کاپی اس فائل میں ہے۔“ اس نے ایک فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”اس کے بعد تمہاری اچھی سی سمری بنی تھی۔ اس پر بعد میں ہنگامی بنیادوں پر تمہارا تقرر نواب شاہ میڈیکل کالج میں کرا دیا گیا ہے کیونکہ وہاں پر ایک پروفیسر کی فوری ضرورت ہے۔“ وہ مسکرایا پھر مجھے آنکھ مار کر بولا۔ ”اب دوسرے مرحلے پر اس کراچی والے کا ٹرانسفر لاڑکانہ کرا دیں گے کیونکہ وہاں بھی ضرورت ہے۔ اس کے بعد جو ہوگا وہ تو تم کو سائیں بتا ہی چکے ہیں۔“

میرے اندر، بہت اندر جیسے ایک آگ سی لگ گئی تھی۔ میں نے کہا ستار تم کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا سندھ میں بھٹائی اور سچل سرمست پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں، کیا اب صرف سائیں جیسے لوگ ہی رہ گئے ہیں جو صرف سندھی اور انگلش میں بات کرتے ہیں۔

اس نے مجھے بیچ میں ہی روک دیا تھا۔ ”یار تم بالکل امریکن ہو گئے ہو، بھائی وہ دنیا اور ہے یہ دنیا اور ہے تم کیوں

کیا آپ جانتے ہیں

☆ سلطان ابراہیم غزنوی ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآن لکھتا تھا۔

☆ سونے کے تاروں سے قرآن مجید لاہور میں لکھا گیا تھا۔

☆ پنجابی زبان میں سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ حافظ محمد لکھوی نے کیا تھا۔

☆ حرم شریف کے اندر دنیا کی چھ زبانوں کی گھڑیاں لگی ہوئی ہیں۔

☆ درختوں میں سب سے پہلے کھجور کا درخت پیدا ہوا تھا۔

☆ انارکلی کا اصلی نام نادرہ بیگم تھا۔

☆ رکشا جاپان نے ایجاد کیا تھا۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ سگریٹ نوشی امریکا میں ہوتی ہے۔

مرسلہ۔ زبیر حسین شیخ، ڈیرہ مراد جمالی

انمول موتی

✄ تین چیزیں انسانوں کو ایک بار ملتی ہیں۔

والدین، حسن، جوانی

✄ تین چیزیں خلوص دل سے کرنی چاہئیں۔

رحم، کرم، دعا

✄ تین چیزیں کسی کا انتظار نہیں کرتیں۔

وقت، موت، گاہک

✄ تین چیزیں ہر ایک کی جدا جدا ہوتی ہیں۔

صورت، سیرت، قسمت

✄ تین چیزیں، بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیتی ہیں۔

زن، زر، زمین

✄ تین چیزیں پردہ چاہتی ہیں۔

کھانا، دولت، عورت

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

بھول جاتے ہو۔ جب پاکستان بنا تھا تو ہم کیا تھے۔ بڑی مشکل سے جدوجہد کرکے ہم لوگ آگے بڑھے ہیں۔ یہ سائیں جیسے لوگوں کا احسان ہے جو مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ بہت کچھ حاصل کیا ہے اور بہت کچھ حاصل کرلیں گے۔ ارے ہم اپنا حق مانگ رہے ہیں۔" وہ سنجیدہ تھا... مگر اس دوران میں نے شکاگو واپس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میرے اندر جیسے اطمینان کی ایک لہر سی اٹھ گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"نہیں ایک بات بتاتا ہوں تم یہ جاکر اپنے اس سائیں کو بھی بتادینا۔ پانچ سو سال پہلے جب انگریزوں نے شکاگو پر قبضہ کیا تھا تو ریڈ انڈین کو مارنے پر لوگوں کو انعام ملا کرتا تھا۔ پانچ ہزار سال سے وہاں رہنے والے پالیو اور کاما کاما قبائلیوں کو مار مار کر وہاں سے بھگادیا گیا تھا۔ افریقہ سے پکڑ کر سیاہ فام افریقیوں کو لائے تھے، انہیں غلام بنایا تھا اور ان کی جانوروں کی طرح خرید وفروخت ہوتی تھی۔ وہ جنگل کا قانون تھا۔ وہ طاقت کا جابرانہ تسلط تھا۔ جہالت کے بے سروپا اصول تھے۔ وقت کو بدلنا پڑا۔ سفید آبادی کو چار سو سال بعد سہی ریڈ انڈین سے معافی مانگنی پڑی۔ شہر میں آگ لگ گئی، تمام شہر جل گیا۔ انہوں نے مل کر شہر کو دوبارہ بنالیا۔ زندگی آگے کی طرف بڑھی پیچھے نہیں گئی۔ انیسویں صدی میں سولہویں صدی کے اصولوں پر انصاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی کیونکہ زندگی آگے بڑھتی ہے، پیچھے نہیں جاتی ہے۔ تاریخ چکروں کا نام نہیں ہے، کسی دائرے کی طرح نہیں ہے جو گھوم گھوم کر ایک ہی عمل کو دہراتی ہے، یہ تو ایک اسپرنگ کی طرح ہے جو ماضی کے دائروں کے مکمل ہونے سے قبل ان پر دائرہ بناتی ہے اور آگے بڑھتی ہے، اوپر جاتی ہے۔ تم لوگ جو بات کر رہے ہو، اس سے تو ذہانت کا خاتمہ کر رہے ہو ایک ایسی فوج تیار کر رہے ہو جسے ڈومیسائل کی ضرورت ہے۔ میں شکاگو میں رہتا ہوں۔ میرے بچے گھر میں پاکستانی زبان بولتے ہیں۔ اسکول میں انگلش میں پڑھتے ہیں اور میرا بیٹا علیحدہ زبان کے طور پر فرنچ بھی سیکھ رہا ہے۔ شاید ایک دن وہ سندھی، اردو، فرنچ سب کچھ بھول جائے گا مگر وہ نفرت کی کسی زبان سے بات نہیں کرے گا۔ وہ کالج میں بہت اچھا ہے، اسے شکاگو میں یونیورسٹی میں داخلے کے لیے شکارپور کے ڈومیسائل کی ضرورت نہیں ہے۔ جب میں شکاگو ندی کے اوپر کافی پیتا ہوں اور چلتے ہوئے شکاگو کے اوپر بننے والی بلڈنگوں کو دیکھتا ہوں، ٹائم اسکوائر کے پاس سے گزرنے والی گاڑیوں، بسوں، ریل کے ڈبوں کو دیکھ کر مجھے احساس کمتری نہیں ہوتا ہے، مجھے تھوڑا غرور سا ہوتا ہے۔ حالانکہ میں اس ترقی میں شامل نہیں تھا۔ میں نے شکاگو کی آگ نہیں بجھائی تھی، شکاگو ندی پر بننے والے پلوں کے لیے گارا مٹی نہیں جمع کیا تھا، شہر کے باغ، میوزیم، ڈراموں کے مرکز، اخبار کے دفتر، ججوں کے چیمبر، عیسائیوں، یہودیوں، مسلمانوں، ہندوؤں، بودھوں کی عبادت گاہوں کا نقشہ نہیں بنایا تھا مگر پھر بھی یہ سب لگتا ہے جیسے میرے ہیں۔ میرے اپنے۔ ہر ایک محبت کا دروازہ کھول کر کھڑا ہے۔ مجھے وہاں رہنے کے لیے کسی کا تبادلہ کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل کی غلطی کو آج کی غلطی سے درست نہیں کیا جاسکتا۔ تمہارے اور تمہارے سائیں کے اصول سب کچھ ختم کردیں گے اور جب سب کچھ ختم ہو رہا ہوگا تو ڈومیسائل کا یہ کاغذ، ہیلتھ سیکریٹری کی سمری، چیف سیکریٹری کی سمری، تقرر نامہ اور چیف منسٹر کا حکم کچھ بھی اس آگ کو نہیں بجھا سکیں گے اور یہ آگ ایسی آگ ہوگی جس میں نئے شکاگو کی طرح نیا کراچی یا نیا شکارپور نہیں بن سکے گا۔ میں جانتے بوجھتے اس گڑھے میں نہیں گروں گا۔ آج میں کسی وجہ سے ایک مجبوری سے یا شاید اپنی خود غرضی کی وجہ سے شکارپور واپس نہیں جا رہا ہوں۔ وہاں نہیں جا رہا ہوں جہاں لوگوں کو میری ضرورت ہے مگر میں کل شکارپور کے نام پر خیرات بھی نہیں لوں گا۔ میں واپس جا رہا ہوں شکاگو پھر کبھی نہ آنے کے لیے۔ ڈومیسائل، سمری اور کوٹا سسٹم پر فیصلے ہوتے ہیں جب نفرت کی بنیاد پر سفر شروع ہوتا ہے اور جب دوسروں کی ناانصافی کو مثال بنایا جاتا ہے تو پھر سچل سرمست اور لطیف بھٹائی پیدا ہونا بند ہوجاتے ہیں پھر صرف ''سائیں'' جیسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ دور دور تک اور ''سائیں'' ہی پیدا ہوتے رہیں گے۔"

ستار مجھے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی۔ اس کا تعجب اور حیرت کرنا تو میری سمجھ میں آگیا تھا مگر اس حیرت کو رحم میں بدلتا دیکھ کر مجھے بھی افسوس ہوا تھا۔

کبھی کبھی بہار میں جب شکاگو پھولوں سے مہک رہا ہوتا ہے اور تازہ تازہ سبز پتوں سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے اور میں اور رضیہ شکاگو ندی کے کنارے کافی پی رہے ہوتے ہیں تو شکارپور اسی شدت کے ساتھ یاد آتا ہے۔ ایک صاف سی خوب صورت سی تصویر، وہی سوندھی سوندھی مٹی، وہی شام کا نکھار اور صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، اجرک یا رلی کی گرمی، پھر یہ تصویر دھندلی ہوجاتی ہے اور اس دھند میں ستار آجاتا ہے، میرا بچپن کا دوست بھولا بھالا اور اس کے پیچھے ایک سایہ سا آتا ہے، سائیں کا سایہ اور تصویر اندھیرے میں کھوجاتی ہے۔

حاصل

فاروق انجم

بعض اوقات لمحے بھر کی بھول انسان کو تمام عمر بہت کچھ یاد رکھنے پر مجبور کردیتی ہے۔ اسے بھی ہر وہ پل ڈنک مارتا تھا جس میں اس کا نفس اسے ایک شیطانی کھیل کھیلنے پر اکساتا رہا اور وہ انتہائی تابعداری سے اس پر عمل پیرا رہا مگر... کب تک... کھیل کوئی بھی ہو ایک دن ختم ہو ہی جاتا ہے۔ البتہ کچھ کھیل ایسے ہوتے ہیں جن کے اختتام پر تھکن سے چُور جب انسان اپنے دامن میں حاصل جمع پونجی دیکھتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اس کی ساری سعی تو لاحاصل رہی۔

شیطان کی شرارتی چالوں کو بے نقاب کرتی عبرت انگیز روداد

میری شادی کو دو سال ہو گئے تھے اور ابھی میری کوئی اولاد نہیں تھی۔ چھ ماہ قبل میری کمپنی نے میرا تبادلہ لاہور جیسے بڑے شہر میں کردیا اور مجھے اپنی بیوی سعدیہ کے ساتھ اس بڑے شہر میں منتقل ہونا پڑا۔ کمپنی کی طرف سے مجھے ایک پانچ منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر واقع فلیٹ میں رہائش ملی تھی۔ وہ علاقہ بڑا خوبصورت تھا اور اس عمارت میں رہنے والے زیادہ تر سرکاری اور پرائیویٹ کمپنیز میں ملازمین تھے، یہ پڑھا لکھا اور مہذب حلقہ تھا۔



ہم اس جگہ آکر بہت خوش تھے۔ ہم ایک مشترکہ خاندان سے اُٹھ کر یہاں آئے تھے مگر یہاں آکر گویا ہماری تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اب ہم اپنی مرضی کے مالک تھے، جب دل چاہتا رات کو گھومنے اور باہر کھانا کھانے کے لیے نکل جاتے تھے۔ چھٹی والے دن ہم دیر تک سوتے رہتے تھے۔ کوئی روک ٹوک اور مداخلت نہیں تھی۔

اس شہر میں آئے ہمیں ابھی تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ سعدیہ کی دوستی ثنا سے ہوگئی۔ ثنا اسی عمارت کی پہلی منزل کے ایک فلیٹ میں اپنے شوہر خلیل کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ اس کا شوہر اپنا کاروبار کرتا تھا۔ ان کی شادی کو تین ماہ ہوئے تھے۔ خلیل اور ثنا کا تعلق بہاولپور جیسے دور دراز شہر سے تھا۔ خلیل نے اس شہر میں پہلے کاروبار شروع کیا تھا اور جب اس کا کاروبار چل نکلا تو اس نے اپنے شہر جا کر شادی کی اور ایک ہفتے بعد ہی وہ اپنی نئی دلہن کو لے کر یہاں آگیا۔ ہماری طرح ان کے بھی اس شہر میں کوئی عزیز رشتے دار نہیں رہتے تھے۔

سعدیہ کی اچانک ثنا سے ملاقات ہوئی تھی اور دونوں ہی کیونکہ اکیلے پن کا شکار تھیں اس لیے ان کی دوستی کو... بے تکلفی میں بدلنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ پہلے تو... وہ گھنٹوں اپنے موبائل فون پر ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔ پھر اچانک ان کی فون پر باتیں ختم ہوگئیں اور انہوں نے ایک دوسرے کو دن اور رات میسج کرنے شروع کردے۔ وہ ہر بات ایک دوسرے کو میسج کے ذریعے بتاتی تھیں۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ کھانا پکاتے، صفائی کرتے، ٹی وی دیکھتے، موبائل فون سے میسج ہو رہے ہیں۔ میں نے سعدیہ سے پوچھا۔

''پہلے تم فون پر گھنٹوں باتیں کرتی تھیں اور اب تم لوگوں نے بات کرنا تقریباً چھوڑ ہی دیا ہے اور اس کی جگہ میسج کرتی رہتی ہو اس کی کیا وجہ ہے؟''

سعدیہ نے مسکرا کر بتایا۔ ''میسج کرنا بات کرنے سے بہتر ہے۔ اس طرح کوئی دوسرا ڈسٹرب بھی نہیں ہوتا اور ہم بھی فون کو کان سے لگائے پابند ہو کر بات کرنے میں ہی مصروف نہیں ہوتے ہیں۔ ہم دونوں نے طے کیا ہے کہ بس ہم کال کے بجائے ایک دوسرے کو میسج ہی کریں گے اور بات تب ہی ہوگی جب ہم ایک دوسرے سے ملا کریں گے۔ ویسے میسج کرنے کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔'' سعدیہ کہہ کر مسکرائی۔

دونوں کی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ سعدیہ مجھے بتاتی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے اپنے مسائل پر بھی بات کر لیتے ہیں۔ جس سے ہمیں ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی حل بھی مل جاتا ہے۔

سعدیہ اچھی دوست کے مل جانے پر بہت خوش تھی۔ مجھے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ سعدیہ کو بھی کہیں دل لگانے کا موقع مل گیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی اگر وہ میسج پڑھتی اور سینڈ کرتی تو بھی میں اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا۔

ایک صبح اس نے بتایا کہ آج دوپہر کے بعد اس نے ثنا کو چائے پر بلایا ہے۔ میں نے دفتر جانے سے پہلے کھانے پینے کا سامان لاکر اس کے حوالے کردیا تھا۔

اتفاق کی بات تھی کہ اس دن میرے باس نے اپنا ایک ذاتی کام میرے ذمے لگایا اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ کام ہو جائے تو تم چھٹی کر کے گھر چلے جانا۔ مجھے اندازہ تھا کہ دراصل میرے باس نے اپنا کام کرانے کے لیے مجھے ایک لالچ دیا تھا۔ جس سے میں نے فائدہ اُٹھایا اور ان کا کام کرتے ہی واپس فلیٹ میں آگیا۔

فلیٹ کے دروازے کی چابی میرے پاس بھی ہوتی تھی اس لیے مجھے بیل دینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ جیسے ہی میں دروازہ کھول کر اندر گیا، میں ٹھٹک کر اسی جگہ رک گیا۔ میری خیرہ نگاہیں جیسے حرکت کرنا بھول گئی تھیں۔ سعدیہ کی دوست اجازت لے کر جارہی تھی اور سعدیہ اس کے ساتھ دروازے تک آئی ہوئی تھی اور خواتین اپنی عادت کے مطابق الوداعی باتیں کررہی تھیں۔

میری نظر جو اچانک ثنا پر پڑی تو میں مبہوت سا رہ گیا۔ مجھے لگتا تھا جیسے وہ آسمان سے اُتری کوئی حور ہو۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس کے برابر میں کھڑی میری بیوی مجھے عام شکل وصورت کی عورت دکھائی دے رہی تھی۔ ثنا کے مقابلے میں سعدیہ تو کچھ بھی نہیں تھی۔ میں تو ثنا کے حسن میں کھو گیا تھا اور جب اس نے اپنی غزالی آنکھوں سے ایک نظر میری طرف دیکھا تھا تو مجھے لگا جیسے اس سے خوبصورت کوئی اور آنکھ ہو ہی نہیں سکتی۔

اچانک سعدیہ نے میرا تعارف کرایا۔ ''یہ میرے شوہر فراز ہیں۔ اور یہ ثنا ہے۔''

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا اور میں اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ اندر جا کر جیسے مجھے یاد ہی نہ رہا ہو کہ میں کمرے میں کیوں آیا ہوں اور چپ چاپ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

میں نے جب سے ثنا کو دیکھا تھا اس کے حسن کے حصار میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اب ہر دم مجھے اسی کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اس دن پہلی بار میں نے سعدیہ کی غیر موجودگی میں اس کا موبائل فون اُٹھایا اور دونوں کے میسج پڑھنے لگا۔ دونوں نے دن بھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں ایک دوسرے کو لکھ کر بتائی تھیں۔

وہ رات بھی تصور میں ثنا کی صورت دیکھتے ہوئے گزر گئی۔ صبح ناشتے کی میز پر سعدیہ نے خود ہی اس کا ذکر چھیڑا تو میں نے پوچھا۔

''آج کل گھنٹے گھنٹے کے پیکیج ہوتے ہیں تم دونوں بات کر لیا کرو۔''

''نہیں...... ہم دونوں کو میسج کرنے میں ہی مزہ آتا ہے، ایک گھنٹے کے پیکیج میں ہمیں پابند ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی بات ہمیں یاد آتی ہے ہم فوراً میسج کر دیتے ہیں۔ ہم نے طے کیا ہے کہ روبرو ملنے سے ہی بات ہوگی بس۔ میسج کرنے سے کسی دوسرے کو یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ ہم ایک دوسرے کو کیا کہہ رہے ہیں۔''

بہر حال کچھ بھی تھا ثنا میرے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ مجھے سعدیہ بہت ہی عام سی عورت لگنے لگی تھی۔ مجھے احساسِ کمتری ہونے لگی تھی کہ میری بیوی ثنا جیسی کیوں نہیں ہے۔ سارا دن آفس میں کام کے دوران بھی میں ثنا کے شوہر کی قسمت پر ناز کرتا رہا اور یہ سوچ جانے میرے دماغ میں کیسے آگئی کہ کسی طرح ثنا اگر میری بیوی بن جائے تو میں سعدیہ کو چھوڑ دوں۔ اس کے بعد یہ خیال مجھے ایسے بے چین کرنے لگا جیسے کوئی کسی کو وقفے وقفے سے سوئی چبھوتا ہو۔

تقریباً تین بجے کے قریب مجھے سعدیہ کے گھر والوں کی طرف سے فون آیا کہ اس کی امی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے اور اس وقت وہ اسپتال میں ہیں۔ سعدیہ کیونکہ ان کی سب سے چھوٹی اولاد تھی اس لیے اس کی امی کو سعدیہ سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔

میں نے اسی وقت باس سے چھٹی لی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اپنا رخ مارکیٹ کی طرف موڑ لیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں فلیٹ میں پہنچا اور سعدیہ کو اس کی امی کے بارے میں بتا کر اسے فوراً تیار ہونے کے لیے کہہ دیا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوئی۔ اس دوران میں... بیڈ روم میں ہی موجود رہا۔ جب وہ اپنی پیکنگ کے بعد میری طرف متوجہ ہوئی تو اس نے پوچھا۔

''تم نہیں چلو گے؟''

''فی الحال تو تم ہی جا رہی ہو۔ مجھے آفس سے چھٹی نہیں ملی۔ ایک آدھ دن میں، میں بھی پہنچتا ہوں۔''

میں سعدیہ کو لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ٹکٹ لیا اور سعدیہ کو اس کی سیٹ پر بٹھا دیا۔ ٹرین چلنے ہی والی تھی کہ میں نے سعدیہ سے کہا۔

''دیکھو میں نے تمہارے موبائل فون میں سم بدل دی ہے۔ اس کے اندر میں نے اپنا اور تمہارے گھر والوں کے نمبر سیو کر دیے ہیں اور تمہارا نیا نمبر تمہارے بھائی کو بھی دے دیا ہے۔''

''تم نے ایسا کیوں کیا فراز؟'' میری بات سن کر وہ حیران ہوئی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم اطمینان سے امی کی تیمارداری کرو۔ ان سے باتیں کرو اور اپنا زیادہ وقت ثنا کے ساتھ میسج کرتے ہوئے نہ گزارو۔ دیکھو مجھے غلط مت سمجھنا میں نے تمہاری امی کے لیے یہ سب کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''فراز...... مجھے تو ثنا کا نمبر بھی یاد نہیں ہے، بے چاری پریشان ہوگی۔'' سعدیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''تم فکر نہیں کرو ایک دو دن میں واپس آجاؤ گی پھر دل کھول کر باتیں کرنا۔ فی الحال تم امی کا خیال رکھنا۔'' میں نے کہا اور ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سعدیہ کو میری سم تبدیل کرنے کی حرکت بڑی عجیب سی لگی تھی لیکن وہ تذبذب میں کچھ کہہ بھی نہ پا رہی تھی۔ ٹرین نے رفتار پکڑنا شروع کر دی اور پھر ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔

☆☆☆

آفس سے آتے ہی میں نے سب سے پہلے سعدیہ کی سم اپنے موبائل فون میں ڈالی تو کچھ دیر کے بعد ہی یکے بعد دیگرے کئی میسج آگئے جو ثنا نے موبائل فون بند ہونے پر کیے تھے۔

میں نے ایک ایک میسج پڑھا۔ اس نے بار بار پوچھا تھا کہ میں جواب کیوں نہیں دے رہی ہوں پھر میں نے ایک میسج کیا۔

''میرا موبائل فون خراب ہو گیا تھا۔ فراز واپس آئے ہیں تو میں نے ان کو اپنا موبائل فون ٹھیک کرنے کے لیے دیا ہے اور ان کا موبائل فون لے کر سم ڈالی ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد ہی اس کا جواب آیا۔ ''شکر ہے

میں تو پریشان ہو گئی تھی۔"

"مجھے تو خود بہت بے چینی تھی۔" میں نے لکھا۔

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے لکھا۔

"بتاؤ۔" میں نے مختصر پیغام بھیجا۔ کیونکہ میں اس سے قبل دونوں کے میسج سعدیہ کے موبائل فون پر پڑھ چکا تھا اس لیے میں سعدیہ کے انداز میں ہی لکھ رہا تھا۔

"کئی دن سے سوچ رہی تھی کہ میں تم سے اس بارے میں بات کروں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"کیا پریشانی ہے، مجھے بتاؤ۔"

"میرا شوہر خلیل بہت شکی مزاج ہے۔ اس دن جب میں تمہاری طرف چائے پر آئی تھی تو اس کا رویہ عجیب ہو گیا تھا۔ وہ مجھے ایسے طنز مار رہا ہے جیسے میں تم سے نہیں بلکہ اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے گئی تھی۔" اس کا آیا ہوا میسج میں نے پڑھا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد لکھا۔

"یہ تو بہت بری بات ہے۔"

"میں بہت اذیت میں ہوں۔ اس کے جملے مجھے کھا رہے ہیں۔"

"تمہارا شوہر بہت کم ظرف ہے۔" میں نے لکھا۔

"میں نے کبھی بتایا نہیں کہ جب وہ واپس آتا ہے تو ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا ہے جیسے وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ میرے بعد کوئی آیا تو نہیں تھا۔"

"ایسا کمینہ ہے وہ۔" میں نے لکھ کر سینڈ کیا اور ساتھ ہی دوسرا جملہ لکھ دیا۔ "سوری ثنا میں نے غصے میں خلیل کو کمینہ کہہ دیا۔"

"تم نے ٹھیک کہا ہے۔ وہ ایسا ہی کمینہ ہے۔ چار ماہ کے اس بندھن میں، میں نے کیا کچھ برداشت کیا ہے تم نہیں جانتی ہو۔"

"مجھے تو لگتا تھا کہ تم بہت سکھی ہو۔" میں اس کے بارے میں جان کر حیران ہو رہا تھا۔

"ایک بات اور بتاؤں؟" اس نے لکھا تو میں جاننے کے لیے بے چین ہو گیا۔

"ہاں ہاں بتاؤ۔"

اس کے بعد اس کا میسج نہیں آیا اور میں بے چینی سے اس کے میسج کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے بے چینی تھی کہ وہ کیا بتانا چاہتی ہے۔ پندرہ منٹ گزر گئے تھے۔ بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔ میں کمرے میں ٹہلتے ہوئے میسج آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے اور نہ منہ ہاتھ... دھویا تھا۔

میں نے پھر میسج کیا۔ "کیا ہوا...... کہاں چلی گئی ہو......"

دو منٹ کے بعد اس کا میسج آیا۔ "دودھ والا آ گیا تھا۔"

"تم مجھے کچھ بتانے والی تھیں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"خلیل تشدد پسند بھی ہے۔ وہ مجھ پر دو بار تشدد کر چکا ہے......" اس نے انکشاف کیا۔ میں حیران ہوا۔ اتنی خوبصورت لڑکی پر کوئی ہاتھ کیسے اُٹھا سکتا ہے۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ تمہارا شوہر ایسا بھی کر سکتا ہے۔ فراز تو اتنے اچھے ہیں کہ ان کا بس چلے تو وہ مجھے زمین پر پیر نہ رکھنے دیں۔" میں نے لگے ہاتھ اپنی تعریف میں بھی جملہ کہہ دیا۔

اس کے میسج نے مجھے بلیوں اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے لکھا تھا۔ "تم خوش نصیب ہو تمہیں اچھا اور ہینڈسم شوہر ملا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن مجھے تمہاری بہت فکر ہو گئی ہے۔" میں نے لکھا تو اس..... کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ایسا سعدیہ اور ثنا کے درمیان ہوتا رہتا تھا۔

میں نے جب دیکھا کہ ابھی کوئی میسج نہیں آ رہا ہے تو میں باتھ روم چلا گیا اور منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کیے۔ اس دوران اس کا ایک میسج آ چکا تھا۔ میں نے پڑھا۔

"ابھی خلیل کی کال آئی ہے۔ حکم دیا ہے کہ میں دال چاول بناؤں۔ میں نے کہا کہ چاول نہیں ہیں تو مجھے گالیاں دینے لگا اور فون بند کر دیا۔"

"اوہ خدایا...... تم یہ سب برداشت کیسے کر رہی ہو؟" میں نے فوراً لکھا۔

اس کے بعد پھر خاموشی ہو گئی اور بیس منٹ کے بعد جب میں اپنے لیے چائے بنا رہا تھا تو مجھے اس کا میسج موصول ہوا۔ اس نے لکھا تھا۔

"میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اس لیے برداشت کر رہی ہوں۔"

میں سوچنے لگا کہ اس کا کیا جواب دوں۔ میں ڈھائی گھنٹے سے وقفے وقفے سے اس کے ساتھ موبائل فون پر میسج کر رہا تھا اور مجھے وقت گزرنے کا احساس تک نہیں رہا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ سعدیہ خیریت سے پہنچ گئی ہے کہ نہیں۔ میں نے کچھ لکھنے سے پہلے سعدیہ کو فون کیا تو

اس نے بتایا کہ وہ ابھی ریلوے اسٹیشن پر ہی ہے اور اس کا بھائی اسے لینے آیا ہوا ہے۔ ساتھ ہی اس نے مجھ سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں اسے ثنا کا نمبر بھیج دوں۔

میں نے جھوٹی تسلی دے کر فون بند کر دیا اور ثنا کو میسج بھیجا۔ ''تمہاری جگہ میں ہوتی تو اسے اب تک چھوڑ بھی چکی ہوتی۔ ایسے شخص کے ساتھ میں بغاوت پر اتر آتی جو بیوی پر تشدد کرتا ہے۔ آج تم مجھے ایک کمزور عورت لگی ہو۔''

میرے اس میسج نے جادو سا اثر کیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ میں ایک کمزور عورت بن گئی ہوں۔ حالانکہ میں کالج میں ایسی نہیں تھی۔''

مجھے اس نے اپنے ایک ایسے راز سے آگاہ کر دیا تھا جس کا شاید مجھے کبھی پتا نہ چلتا۔ اس لیے میں سعدیہ بن کر اسے بھڑکانا چاہتا تھا۔ مجھے موقع مل گیا تھا کہ میں کسی طرح سے ثنا کا گھر برباد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ کیونکہ میرے دل میں اسے دیکھتے ہی کھوٹ پیدا ہو گیا تھا اور سعدیہ کو میں اس کے مقابلے میں کمتر سمجھنے لگا تھا اور اسے چاہنے کی خواہش نے انگڑائی لی تھی۔ شاید اس وقت کوئی میری شکل دیکھتا تو اسے لگتا کہ یہ فراز کی شکل نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ کوئی اور ہی کھڑا ہے۔

''سچ تو یہ ہے کہ یہ جانتے ہی مجھے افسوس سا ہونے لگا ہے کہ میں ایک ایسی لڑکی کی دوست ہوں جو چپ چاپ تشدد سہہ رہی ہے اور اس کی دہلیز سے چمٹ کر بیٹھی ہے۔ ایک کمزور عورت سے دوستی کرنے پر مجھے شرمندگی ہو رہی ہے......''

میں نے میسج لکھ کر سوچا کہ مجھے یہ بھیج دینا چاہیے یا نہیں۔ پھر میں نے وہ میسج بھیج ہی دیا اور اس کے بعد مجھے اس کا میسج نہیں آیا۔ میں نے رات کا کھانا بھی کھالیا۔ سونے کے لیے بستر پر بھی لیٹ گیا۔ آدھی رات تک میں بستر پر کروٹیں لیتا رہا اور بار بار اپنا موبائل فون دیکھتا رہا۔ میں نے سوچا کہ شاید مجھے ایسا نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ یکدم مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اگر میں آہستہ آہستہ بھڑکاتا تو ٹھیک رہتا۔

میں نے رات ڈھائی بجے اسے میسج کیا۔ ''کیا ہوا......؟''

میں جواب کے انتظار میں سو گیا۔ صبح اُٹھتے ہی سب سے پہلے موبائل فون اُٹھا کر دیکھا تو اس کا ایک میسج موجود تھا۔ میں نے جلدی سے پڑھا۔ لکھا تھا۔

''شکریہ تم نے مجھے ہمت دی اور میرے اندر وہی کالج والی ثنا لوٹ آئی۔ کچھ نہ پکانے پر اس نے مجھ پر ہاتھ اُٹھانا چاہا تو میں نے اس کا ہاتھ روک کر اسے غصے سے بہت کچھ کہہ دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ وہ چپ ہو گیا اور میں الگ کمرے میں چلی گئی۔''

مجھے لگا جیسے مجھے کامیابی کی پہلی سیڑھی مل گئی ہو۔ میں پرجوش ہو گیا۔ اب میں سوچنے لگا کہ اب کیا ایسا لکھوں کہ وہ میرے قریب آ جائے۔ سعدیہ کی طرف سے کوئی ایسی تحریر کہ ثنا میرے قریب آنے پر مجبور ہو جائے۔ میں سوچنے لگا۔ اسی سوچ بچار میں، میں آفس کے لیے تیار بھی ہوتا رہا۔ اپنے لیے ناشتا بھی تیار کرتا رہا۔ سعدیہ کا فون آ گیا اور وہ میرے کپڑوں، اور ناشتے کے بارے میں پوچھنے لگی۔ پھر بتایا کہ اب امی کی طبیعت بہتر ہے۔ بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ شاید آج اسپتال سے چھٹی ہو جائے۔ بہت سی باتوں کے بعد سعدیہ نے پھر مجھ سے ثنا کا موبائل نمبر مانگا تو میں نے کہا کہ میں ناشتا کرنے کے بعد بھیجتا ہوں۔

میں ابھی سوچ رہا تھا کہ میں ثنا کو کیا لکھوں۔ جس سے دونوں میں علیحدگی ہو جائے اور پھر میں چکر چلا کر اسے... اپنالوں۔ اس کے لیے اگر مجھے سعدیہ کو بھی چھوڑنا پڑا تو میں چھوڑ دوں گا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا۔

اچانک مجھے ثنا کا میسج آیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''عجیب بات ہو گئی ہے۔ رات جو میرے دل میں آیا میں نے بول دیا تھا اور الگ کمرے میں سوئی تھی۔ صبح خلیل میرے پاس آیا اور اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگ لی۔ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح لگ رہا تھا جو معافی مانگتے ہوئے روتا بھی ہے۔''

میں نے یہ پڑھا تو میرے تن بدن میں بے چینی دوڑ گئی۔ میری تدبیر تو اُلٹی ہو گئی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک اگر رعب ڈالتا جائے اور دوسرا سہتا جائے تو پہلے کو اور بھی زیادہ رعب ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے اور اگر ایک بار دوسرا سامنے آنکھیں نکال کر کھڑا ہو جائے تو پہلے کا کھوکھلا رعب جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ خلیل اپنی بیوی کو کھوکھلے رعب میں رکھنے کے لیے ایسا کر رہا تھا اور وہ دبتی جا رہی تھی اب جو اس نے اپنی آنکھیں دکھائیں تو وہ یکدم سیدھا ہو گیا تھا۔

میں نے لکھا۔ ''یہ اس کا مکر ہے۔ تم فلیٹ چھوڑ دو۔''

دوسرے ہی لمحے سوال آیا۔ ''تو پھر کہاں جاؤں؟''

''میرے پاس آ جاؤ۔'' میں نے لکھنے میں دیر نہیں لگائی۔

''لیکن وہ منت سماجت کر رہا ہے۔ مجھ سے معافی مانگ رہا ہے۔'' اس نے لکھا۔

''یہ اس کی چال ہے۔ تم پر وہ اور بھی تشدد کرے گا۔ تم ابھی میرے پاس آجاؤ۔'' میں نے اپنی طرف سے زور دیا۔

''وہ کپڑے بدل رہا ہے۔'' کچھ دیر کے بعد اس نے لکھا۔

''اُسے یہ کہہ کر فلیٹ سے نکل آؤ کہ تم اسے چھوڑ کر جا رہی ہو۔'' میں نے مزید بھڑکایا۔

''لیکن ...... سعدیہ میرا خیال ہے کہ اسے ایک موقع دینا چاہیے۔'' اس نے لکھا۔

''یہ تمہاری بے وقوفی ہوگی۔ ساری زندگی اگر مار کھانی ہے تو بیٹھ کر کھاتی رہو۔ تمہیں خلیل جیسے جلاد کی نہیں بلکہ فراز جیسے ایک نرم اور حساس دل رکھنے والے انسان کی ضرورت ہے۔'' میں نے لکھ دیا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی اور پھر اس کا میسج آیا۔ ''فراز صاحب نے تمہیں کبھی کچھ نہیں کہا؟''

جانے اس نے یہ سوال کیوں کیا تھا۔ مجھے موقع مل گیا۔ ''وہ کھلے دل کا مالک ہے۔ مجھے ہر طرح کی آزادی ہے۔ اگر تم اس جلاد سے چھٹکارا بھی چاہو گی تو فراز تمہاری پوری مدد کرے گا۔''

میرا میسج جانے کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے ایک اور میسج کیا۔ ''بزدل عورت ...... چھوڑو اس جلاد کو اور میرے پاس آجاؤ۔''

مجھے آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ ثنا نے بھی کوئی میسج نہیں کیا تھا اور میں اس کے انتظار میں بے چین تھا۔ مجھے لگا کہ میں اب آفس چلا جاؤں۔ میرے لیے چھٹی کرنا مشکل تھا کیونکہ آج آفس میں بہت کام تھا۔

ابھی میں آفس پہنچا ہی تھا کہ مجھے ثنا کا میسج آگیا۔ ''خلیل میری منت سماجت کر کے چلا گیا ہے اور اب میں اکیلی ہوں۔ سوچ رہی ہوں کہ خلیل کو معاف کر دوں۔''

میں نے اپنی سیٹ پر جاتے ہی اسے لکھا۔ ''اگر تم ایسا کرو گی تو ساری زندگی پچھتاؤ گی اور تم سوچ لو۔ ابھی نہیں تو تم رات کو اس کے آتے ہی میرے پاس آجانا۔''

''میں سوچتی ہوں۔'' اس نے مجھے لکھ کر بھیجا۔

میں سارا دن کام بھی کرتا رہا اور موبائل فون بھی دیکھتا رہا۔ دن بھر میں اس کے اور بھی میسج آئے تھے۔ جس میں اس نے یہی لکھا تھا کہ وہ پریشان ہے اور سوچ رہی ہے کہ وہ کیا کرے۔ جبکہ میں اسے زور دیتا رہا کہ وہ اسے ہرگز معاف نہ کرے ورنہ ..... نقصان ہوگا۔

ان ہی باتوں میں دن گزر گیا اور میں سیدھا اپنے فلیٹ میں پہنچ گیا۔ رات کے کھانے تک میں اسے یہی کہتا رہا کہ وہ اس کے آتے ہی میری طرف آجائے۔ ثنا تذبذب کا شکار تھی اور اس کا ذہن اس طرف مائل تھا کہ وہ خلیل کو معاف کر دے۔ اسے لگ رہا ہے کہ وہ سدھر گیا ہے۔ جبکہ میرے لیے یہ بات ہضم کرنا مشکل تھا۔ اب تو میری بے چینی اتنی بڑھ گئی تھی کہ میں چاہتا تھا کہ وہ ایک بار میرے پاس آجائے .... اس کے بعد میں ایسا کھیل رچانے کے لیے بھی تیار تھا کہ جس سے اس کا گھر بچنے کی ایک فیصد بھی اُمید باقی نہ رہے۔ میں اس کے لیے دیوانہ ہی کیا بلکہ کچھ جنونی سا ہو گیا تھا۔ اگر ان دونوں کی صلح ہو جاتی .... تو میرے لیے یہ بڑی ناکامی ہوتی اور پھر جو کھیل میں کھیل رہا تھا، اس کی حقیقت سعدیہ پر بھی کھل جاتی اور سعدیہ پر حقیقت کھلنے سے پہلے میں بہت کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہو چکا تھا۔ اس لیے چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح ثنا ایک بار میرے فلیٹ میں آجائے۔

اس بے چینی اور جنونی کیفیت میں سعدیہ کا فون آگیا۔ اس نے سب سے پہلے تو یہ شکوہ کیا کہ میں نے اسے ایک بار بھی فون کر کے نہیں پوچھا پھر اس نے بتایا کہ امی گھر آگئی ہیں اور وہ بالکل ٹھیک ہیں۔

میں اس سے زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اور اپنے دوست کا بہانہ کر دیا کہ وہ آیا ہوا ہے اس لیے میں بعد میں فون کرتا ہوں۔

فون بند کرتے ہی میں نے ثنا کو میسج کیا۔ ''تم کیا کر رہی ہو؟''

اس کا جواب آیا۔ ''صبح سے خلیل مجھے معذرت کے میسج کر رہا ہے۔ اس وقت بھی اس کا سوری سے بھرا میسج پڑھ کر اُداس بیٹھی ہوں۔ اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو گیا ہے۔''

ثنا کا میسج پڑھ کر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اسے فوراً لکھا۔ ''خلیل بھائی کب تک واپس آتے ہیں؟''

''بس وہ آنے ہی والے ہیں۔''

''اس کے آنے سے پہلے تم ایک بار میرے فلیٹ میں آکر مجھے ملو۔ انکار نہیں کرنا، ابھی آؤ۔ میری بات سن کر چلی جانا۔''

اس نے کچھ دیر کے بعد لکھا۔ ''اوکے...... میں

"آرہی ہوں۔"

میں اور بھی زیادہ بے چین ہوگیا۔ میں ایک پل کے لیے بھی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ پا رہا تھا۔ میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ اس وقت میرا دل چاہا کہ میں ابھی جا کر خلیل کا سر پھوڑ آؤں جب مجھے ثنا کا میسج ملا۔

"خلیل آگیا ہے۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی ہے۔ اور فیصلہ کیا ہے کہ میں اس سے کوئی بات نہیں کروں گی۔ وہ کھانے کا سامان لے کر آیا ہے۔ میں الگ کمرے میں رہوں گی۔"

"تم ابھی میری طرف کیوں نہیں آجاتیں؟"

"تم میری دوست ہو اور مجھے تم پر بھروسا ہے۔ میرا اس شہر میں تمہارے سوا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے۔ تمہارے مشورے پر عمل کرنے کی وجہ سے خلیل راہ راست پر آیا ہے۔ اب وہ آچکا ہے اس لیے میں اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلوں گی۔"

میں نے اس کا میسج پڑھ کر کچھ سوچا اور پھر لکھا۔ "لیکن تم وعدہ کرو کہ تم اس سے بات نہیں کروگی۔"

"میں بالکل بھی بات نہیں کروں گی اور میں دوسرے کمرے میں ہوں اور دروازہ اندر سے لاک ہے۔"

اس کا پیغام پڑھ کر مجھے کچھ تسلی ہوئی لیکن میری.... بے چینی کسی صورت بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں نے اسے ایک مشورہ دیا۔ "تم ایسا کرنا کہ صبح ہوتے ہی میری طرف آجانا۔ تمہیں فلیٹ میں نہ پا کر وہ پریشان ہوگا۔ یقیناً وہ تمہیں تلاش کرتا ہوا میری طرف آئے گا اور پھر میں تم دونوں کو کچھ شرائط اور سمجھانے کے بعد صلح کرادوں گی...... کیسا؟"

میرا میسج پڑھ کر ثنا نے فوراً لکھا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے...... یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ میں ایسا ہی کروں گی...... خلیل کو ہم دونوں کی دوستی کا پتا ہے۔"

میں بہت خوش ہوا کہ میں نے ثنا کو اپنے فلیٹ میں آنے پر راضی کرلیا تھا۔

رات بھر مجھے ثنا کی طرف سے میسج آتے رہے کہ اس کے فلیٹ میں کیا ہورہا ہے۔ اس نے بتایا کہ خلیل نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح سے میں کمرے کا دروازہ کھول دوں۔ پھر اس نے کھانا کھانے کا بھی اصرار کیا۔ بار بار معذرت بھی کی اور اپنی غلطی کا احساس ہونے کا بھی کہا لیکن اس نے نہ تو دروازہ کھولا اور نہ ہی کوئی بات کی۔

میں اسے مسلسل کہتا رہا کہ تم نے بالکل ٹھیک کیا ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ تھی کہ ثنا کا دل پگھل چکا تھا اور اگر وہ اپنی ضد پر قائم تھی تو وہ محض میرے بار بار کہنے پر تھی۔ میرے حوصلہ دینے سے وہ اس سے بات نہیں کر رہی تھی۔

وہ رات میں ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ مجھے بے چینی سے صبح ہونے کا انتظار تھا۔

جیسے تیسے رات گزر گئی اور میں سویرے ہی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سات بجے کے قریب مجھے اس کا میسج آیا۔

''میں تمہاری طرف آ رہی ہوں۔''

میں نے جلدی سے بیڈ کی چادر ٹھیک کی۔ سونے کا لباس تبدیل کیا، منہ ہاتھ دھو کر کنگھی کی اور اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے آنے میں بیس منٹ لگ گئے۔

میرے فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے اطمینان سے دروازہ کھولا اور وہ سامنے کھڑی تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ اس کا حسن میک اپ سے عاری بھی لاجواب تھا۔ ایسا حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بال بہت گھنے تھے اور وہ میرے سامنے ایسے کھڑی تھی جیسے کوئی مورتی ہو۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، میں نے فوراً دروازہ چھوڑ کر کہا۔ ''اندر آ جائیے پلیز۔''

جیسے ہی اس کے پیر میرے فلیٹ کے اندر پڑے مجھے لگا جیسے ستارے جھلملا اُٹھے ہوں۔ میں اسے لاؤنج میں لے گیا۔

''جی وہ سعدیہ کہاں ہیں؟'' اس نے اپنی غزالی آنکھوں سے دائیں بائیں دیکھا۔

''ابھی پانچ منٹ پہلے وہ فلیٹ سے گئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''فلیٹ سے گئی ہیں؟'' اسے حیرت ہوئی۔

''دراصل اس کی امی کی طبیعت اچانک رات کو بگڑ گئی تھی۔ مجھے اس کے بھائی نے اطلاع کی تھی اور بتایا کہ وہ سعدیہ کو لینے آ رہا ہے۔ میں نے سعدیہ کو نہیں بتایا تھا تاکہ وہ ساری رات بے چین نہ رہے۔ ابھی اس کا بھائی آیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔''

''لیکن ابھی تو......'' وہ سوچنے لگی۔

''آپ کی کوئی بات ہوئی تھی سعدیہ سے؟'' میری نگاہیں اس کے حسن پر تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، سعدیہ کے نمبر پر ایک اجنبی کال آ گئی۔ میں نے نمبر دیکھا اور فون کو کان سے لگا کر کچھ آگے چلا گیا اور آہستہ سے کہا۔ ''ہیلو......''

دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی۔ ''جی...... یہ سعدیہ کا نمبر ہے؟'' وہ جھجکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ خلیل ہے۔ مجھے اسی کی کال کا انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ثنا کو فلیٹ میں نہ پا کر وہ سعدیہ کے نمبر پر کال ضرور کرے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

میں نے فوراً گھبرائے ہوئے سے انداز میں کہا۔ ''جی نہیں یہ کسی سعدیہ کا نمبر نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہی میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا یہ جملہ خلیل کے دل و دماغ پر دیکھو کہاں تک اثر کرے گا۔

میں ثنا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ تشریف رکھیں میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں۔''

''شکریہ میں چلتی ہوں۔''

''سعدیہ بتا رہی تھی کہ آپ کا شوہر بہت سخت مزاج ہے اور آپ پر تشدد بھی کرتا ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا تو وہ گھبرا سی گئی۔ جیسے اسے یہ اچھا نہ لگا ہو کہ سعدیہ نے یہ بات مجھ سے کیوں کی۔

''گھبرائیں نہیں، میں آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ آپ جیسی خوبصورت لڑکی پر ہاتھ اُٹھانے کا تصور کرنے والا ابھی دنیا میں پاگل کوئی نہ ہوگا۔'' میری بات سن کر ثنا مزید گھبرا گئی تھی جبکہ میں سب کچھ نظر انداز کر کے بس صرف ثنا کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک تیز بیل ہوئی اور میں چونکا۔ ہمارا دودھ والا اسی طرح بیل دیتا تھا۔ اس وقت اس کی آمد مجھے بہت ناگوار گزری اور میں نے غصے سے دروازہ کھولا تو سامنے ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے میرے کندھوں کے اوپر سے میرے عقب میں دیکھا۔ جہاں ثنا کھڑی تھی۔ وہ مجھے ایک طرف دھکیل کر آگے بڑھا اور اندر جاتے ہی اس نے غصے سے کہا۔

''تم اپنی سہیلی کا بہانہ کر کے اس شخص سے باتیں کرتی تھیں۔ مجھے بے وقوف بناتی تھیں کہ تمہاری دوست سعدیہ ہے۔ یہ سعدیہ ہے؟ جس سے تم صبح سویرے اُٹھ کر ملنے چلی آئی ہو اور اس کی خاطر تم مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں ہو۔'' وہ غصے سے بول رہا تھا۔ میں چپ چاپ ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ کیونکہ یہی تو میری منصوبہ بندی کا حصہ تھا۔ میں تو اس سے بھی بڑھ کر چاہتا تھا کہ اس غصے اور غیرت میں وہ ابھی اسے طلاق دے کر چلا جائے۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو......'' وہ حیرت زدہ انداز میں بولی۔

''اب بھی میں غلط سمجھ رہا ہوں۔ تم دونوں کو رنگے ہاتھ پکڑا ہے میں نے۔ تم نے میری عزت کا جنازہ نکال

دیا ہے اور میں تجھے......'' وہ پاگل ہو رہا تھا اور وہ اس نہج پر پہنچ چکا تھا جہاں وہ ثنا کو اپنی زندگی سے نکالنے والا تھا۔ الفاظ اس کے منہ میں آ گئے تھے اور میں اس وقت ایک شیطان کے روپ میں پاس کھڑا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا۔ میری اور ثنا کی نگاہیں ایک ساتھ دروازے کی طرف چلی گئیں۔ میں بری طرح سے چونک گیا۔ کیونکہ سعدیہ دروازے میں اپنے بھائی کے ساتھ کھڑی تھی اور اسے دیکھتے ہی ثنا نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''یہ ہے سعدیہ......''

خلیل کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے اور اس نے گھوم کر سعدیہ کی طرف دیکھا۔ سعدیہ حیرت سے ہم سب کی طرف دیکھ رہی تھی جبکہ میری پریشانی کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

''کیا ہوا؟'' سعدیہ نے آگے بڑھتے ہوئے متحیر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ثنا اس کی طرف بڑھی اور بولی۔ ''یہ خلیل ہے۔ میرا شوہر۔ اسے بتاؤ کہ تم سعدیہ ہو۔ میری دوست۔''

''ہاں میں سعدیہ ہوں اس کی دوست مگر ہوا کیا ہے؟'' سعدیہ کی حیرت کم نہیں ہوئی تھی۔

''انہیں بتاؤ کہ تم نے ہی مجھے میسج کر کے صبح اپنی طرف بلایا تھا نا...؟ تم ہم دونوں کی صلح کرانا چاہتی تھیں۔'' ثنا کی یہ بات سن کر سعدیہ کی حیرت میں دو چند اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ثنا کی طرف دیکھا ... پھر میری طرف دیکھا تو میں سوچنے لگا میں اب اس بگڑے ہوئے کھیل کو کیسے سنبھالوں۔ سعدیہ کی اچانک آمد نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔ میرے لیے اتنی جلدی سوچنا مشکل تھا۔

اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا ثنا نے سعدیہ سے ایک اور سوال کر دیا۔ ''تمہاری امی کی طبیعت رات خراب ہو گئی تھی اور تم ابھی کچھ دیر پہلے ہی نکلی تھیں، واپس کیوں آ گئیں......خیر تو ہے؟''

اس سوال نے سعدیہ کی آنکھوں میں اور بھی سوال بھر دیے۔ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ اچانک میرے موبائل فون کی ٹون بجی۔ مجھے کہیں سے میسج آیا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو سعدیہ کے نمبر پر ایک خالی میسج تھا جو ابھی مجھے ثنا نے بھیجا تھا۔ ثنا نے فوراً سعدیہ سے پوچھا۔

''سعدیہ! تمہارا موبائل فون کہاں ہے؟'' ثنا نے پوچھا۔

''موبائل فون میرے پاس ہے لیکن سم کارڈ فراز کے پاس ہے۔ میں آج نہیں بلکہ پرسوں امی کی طرف گئی تھی اور ابھی ابھی واپس آ رہی ہوں۔'' سعدیہ نے جس انداز میں کہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ معاملہ سمجھ گئی ہے اور ایسا ہی ہوا۔ ثنا نے ہم دونوں کے درمیان جو پیغامات کا سلسلہ چلا تھا وہ پہلے سعدیہ کو اور پھر خلیل کو پڑھایا۔ سب کچھ صاف ہو چکا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا تھا اس کی حقیقت کھل چکی تھی۔ اب یہ واضح ہو گیا تھا کہ میں سعدیہ بن کر ثنا سے موبائل فون کے ذریعے پیغامات کی صورت میں بات کر رہا تھا۔ خلیل بہت تیز تھا اس نے تو یہ تک کہہ دیا کہ میرا ارادہ ان کا گھر برباد کر کے ثنا کو اپنانے کا تھا۔ اس نے کچھ ایسے جملے مجھے کہے کہ میں پانی پانی ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ثنا کو لے کر چلا گیا۔

پہلی بار میں اپنی بیوی کے ساتھ آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔ وہ شیطانیت جو اچانک میرے اوپر سوار ہوئی تھی وہ ندامت بن کر میری پلکوں کا بوجھ بنی ہوئی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ مجھے تو اچانک اس وقت ہوش آیا جب سعدیہ اپنا سامان پیک کر کے نیچے لے آئی اور اپنے بھائی سے بولی۔

''چلو عامر چلیں۔ مجھے اس کالے دل والے انسان کے ساتھ زندگی بسر نہیں کرنی۔''

میں چونکا۔ اس کی طرف بڑھا تاکہ اسے روک سکوں لیکن سعدیہ نے میری طرف آنکھیں نکال کر غصے سے دیکھا اور اپنی شہادت کی اُنگلی کھڑی کر کے مجھے اسی جگہ رکے رہنے کا اشارہ کیا اور میں اسی جگہ رک گیا۔ میری ہمت ہی نہیں ہوئی کہ میں ایک پیر بھی اُٹھا سکوں۔ کیونکہ جو کچھ میں کر رہا تھا تب شیطان نے یہ بات میرے دماغ سے کوسوں دور رکھی تھی کہ میں نے بربادی کا راستہ چن لیا ہے، اور اب جبکہ میں برباد ہو چکا تھا تو وہ جنون اور دھن جانے کہاں غائب ہو چکی تھی جس نے مجھے مضطرب کیا ہوا تھا اور میں اندھا دھند اس کھیل کو کسی نتیجے کی پروا کیے بغیر کھیل رہا تھا۔

میں اپنی بربادی کی راکھ پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ سب کر کے مجھے کیا حاصل ہوا؟

بیسویں قسط



محی الدین نواب

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی متی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہو گئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا، محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جج تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفادے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہو گئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہو گیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہو گیا۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہو گیا کہ مرینہ ماروی کو جام تمارو کے چودھری کے پاس لے جا رہی ہے لہٰذا اس نے مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے... ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرا لیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے گئے۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ ماروی کا علاج ہوا مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانی۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بو بو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ گئی۔ مراد مرینہ کے زیرِ اثر آ چکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ رابعہ خاتون نے مراد کے بچے کو ماروی کے ہاں پہنچا دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TMET آفیسر بن گئی تھی مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹمنی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آ گیا۔ مراد نے اس کی بھی سرجری کروا کے اسے اپنا چہرہ دے دیا۔ اب بوتا عبداللہ مراد بن گیا تھا۔ دشمن مراد کو بوتا دیکھ کر چکرا گئے۔ ماروی کی یادداشت واپس آ گئی تھی۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ٹمنی سن کے بیٹے ایمان سے ہو گئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی تمام باتیں بتا دیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ لندن ایئرپورٹ پر میکی پر حملہ ہوا اور اس کا ایک بیٹا مارا گیا۔ مارنے والے نے اپنا نام مراد بتایا۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد

نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا۔ مراد کے لیے مرینہ ناگزیر ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ رہنا اس کی مجبوری تھی۔ مرینہ نے سرجری کے ذریعے اپنا چہرہ بدل لیا تھا۔ میکی کی بیٹی مراد کے دھوکے میں ایمان علی کے پیچھے پڑگئی۔ ایمان نے اسے انڈیا آنے کو کہا۔ اب مراد بھی انڈیا پہنچنے والا تھا۔ ماسٹر نے اسے میکی کے بیٹے اور بیٹی کو مارنے کا مشن سونپا تھا۔ ادھر ماری نے مراد کی خفیہ فون کال سن لی۔ وہ دیوانی سی ہو گئی اور اس نے اسی وقت پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا۔ مراد نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی تاہم وہ نہ رکی۔ وہ پاکستان آکر چاچی چاچا کے ساتھ غائب ہو گئی۔ مراد بھی پاکستان آگیا۔ محبوب اور مراد میں ٹھن گئی۔ تاہم وہ ماروی کا پتا نہ لگا سکے۔ مراد پاگلوں کی طرح ماروی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے سمیرا کو اعتماد میں لے لیا اور اپنے مشن پر انڈیا کے لیے روانہ ہو گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جہاز رن وے پر دوڑتا ہوا فضا میں بلند ہو گیا۔ وہ اپنی روٹھی ہوئی شریک حیات کو منانے آیا تھا اس کی صورت بھی دیکھ نہیں پایا تھا۔ اس کے بہت قریب آکر دور ہو رہا تھا۔

”بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے“

وہ اپنی غلطیوں کے باعث اپنی آبرو ہلکی کر چکا تھا۔ بڑی ناکامی اور نامرادی سے عارضی طور پر میدان ہار کر جا رہا تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ اسے ہارتے ہوئے بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ماروی سے... محروم ہو رہا ہے۔

اس نے پچھتاوے کی ’ندامت کی شدت سے آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھیں بند کرنے سے کچھ نظر نہیں آتا۔ خود سے چھپ کر سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔

جہاز کے محدود ماحول میں ذہن کو بھٹکنے والا سکون تھا۔ وہ طیارہ اسے فساد پھیلانے والی زمین سے دور لے آیا تھا۔ وہاں کے پرسکون ماحول میں وہ سوچ رہا تھا۔ یہ حقیقت سامنے آرہی تھی کہ ماروی کو کھو کر خسارے میں ہے اور مزید نقصان اٹھانے کے لیے آگے مرینہ کی طرف جا رہا ہے۔

بشریٰ کی باتیں دماغ میں گونج رہی تھیں۔ ”وہ تمہیں اپنا بھائی مانتی تھی۔ اب نہیں مانتی۔ تمہارا ضمیر اتنا مردہ ہو گیا ہے کہ تم نے ایک بازاری عورت کی خاطر بچپن کی محبت پر تھوک دیا ہے۔ میں تم سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں، ماروی پر سوکن نہ لاؤ۔ مرینہ سے نکاح نہ پڑھاؤ۔“

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ التجا کرو، نصیحت کرو تو وہ کسی گمراہ پر کبھی اثر نہیں کرتی۔ اس کے باوجود بات اگر تلوار کی دھار ہو تو وہ کلیجا چیر کر رکھ دیتی ہے۔

بشریٰ کی یہ بات دل کو لگی کہ کسی بھی مشن پر مرینہ کا ساتھ ضروری نہیں ہے۔ اب سے پہلے اس نے تمام جنگیں تنہا لڑی ہیں۔ مرینہ کبھی ساتھ نہیں رہی۔ یہ بات بھی دل کو لگی کہ وہ مرد میدان ہے اور مرد کی شان یہی ہے کہ وہ تنہا اپنے بل پر لڑتا ہے۔ عورت کے کاندھے پر بندوق رکھ کر نہیں چلاتا۔

جہاز کے اس پرسکون ماحول میں ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ بشریٰ نے یہ سچی اور کھری بات کہی تھی۔ ”اے مرد مجاہد! تمہارے اندر ایمان ہے تو مرینہ ضروری نہیں ہے۔ یہ تمہارے اندر چھپی ہوئی ہوس پرستی ہے۔ عورت بدل بدل کر مزے لوٹنے کے لیے دین کا سہارا لے رہے ہو کہ گناہ سے بچنے کے لیے شادی کرو گے۔“

جہاز چار ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا اور مراد کے ایمان پرور خیالات اس سے بھی زیادہ نامعلوم بلندیوں پر تھے۔

وہ تسلیم کر رہا تھا کہ غلطی پر ہے۔ سچائی یہ تھی کہ مرینہ نے ایسے جنسی کھیل کی لت لگائی تھی، جسے ماروی جیسی شریف زادیاں نہیں جانتیں۔

مرینہ بھی شاید کسی ایسے ہی ادارے کی سند یافتہ تھی۔ جہاں یہ ہوس پرستی کے ہنر سکھائے جاتے تھے۔ اس نے مراد کی تنہائی میں ایسے ایسے گل کھلائے تھے کہ وہ انہیں بھلا نہیں سکتا تھا۔ اکثر تنہائی میں وہی ہوس ناک ہتھکنڈے مرینہ کو پکارتے رہتے تھے۔ وہ لاشعوری طور پر اسے پالینے کے لیے مچلتا رہتا تھا۔

اب احساسات عجیب سے ہو گئے تھے۔ اسے ماروی کے ساتھ ازدواجی لمحات گزارتے وقت یوں لگتا تھا جیسے وہ بلیک اینڈ وائٹ ماحول میں ہے۔ ان لمحات میں مرینہ کی رنگین فلم ہوس کی اسکرین پر چلنے لگتی تھی۔ وہ بظاہر مرینہ کے ساتھ گناہ گار نہیں بننا چاہتا تھا لیکن لاشعوری طور پر اس کے اندر کھچڑی پکتی رہتی تھی۔

خواہشات کی تکمیل کے لیے کئی راستے کھل جاتے ہیں۔ اسے بھی راستہ مل گیا۔ آخر ذہن میں یہ بات آئی کہ اس سے نکاح پڑھوا کر ہی ہوس پوری کی جاسکتی ہے۔ اس نے دین کا سہارا لیا کہ جس عورت کے ساتھ دن رات رہ کر کام کرنا ضروری ہے اور اس کی قربت سے گناہ کی ترغیب ہو رہی ہے تو اس سے نکاح پڑھوا لیا جائے۔

اب بشریٰ نے دینی احکامات کے اس اہم پہلو پر توجہ دلائی تھی کہ نامحرم عورت کے ساتھ کسی مشن پر نہیں جانا چاہیے۔ وہ اب سے پہلے بھی اس عورت کے بغیر کامیابیاں حاصل کرتا رہا ہے۔

اور وہ تسلیم کررہا تھا کہ محض مرینہ کو حاصل کرنے کے لیے وہ کسی بھی مشن میں اسے ضروری کہہ رہا ہے۔ اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہا ہے اور دینی احکامات کو غلط طریقے سے بیساکھی بنارہا ہے۔

اس نے سر جھکا کر دل ہی دل میں کہا۔ ”یا اللہ......! میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا۔ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھوں گا۔ پاک صاف رہا کروں گا۔ کبھی گناہ کے راستے پر نہیں جاؤں گا اور میرے معبود! میں نے تیری مہربانیاں دیکھی ہیں۔ تُو نے مجھے ایسے ایسے .... وقت گناہوں سے بچنے کا حوصلہ دیا ہے، جبکہ شیطانی طلب سے بچنا ناممکن ہوتا ہے۔

”اے میرے معبود! کوئی معجزہ کردے۔ مجھے مرینہ سے بچالے۔ اس کی ہوس اس کی طلب مجھے پاگل کردیتی ہے۔ یہ صاف نظر آرہا ہے کہ صرف ماروی کے ساتھ ازدواجی مسرتیں حاصل نہیں کرسکوں گا۔ مرینہ کی طلب میرے اندر چیختی رہے گی۔

”بے شک مجبوری کی حالت میں دوسری شادی کی جاسکتی ہے لیکن محض ہوس پوری کرنے کے لیے ماروی پر ظلم کروں گا تو ایک محبت کرنے والی شریف زادی سے سراسر ناانصافی ہوگی۔ وہ مرجائے گی لیکن کسی سوکن کو تسلیم نہیں کرے گی۔

”وہ مجھ سے علیحدگی اختیار کرچکی ہے۔ کہیں روپوش رہنے کا مطلب یہی ہے کہ نہ اپنا منہ دکھانا چاہتی ہے نہ میرا منہ کبھی دیکھے گی۔ اصولاً مجھے پہلی بیوی کے کھانے، کپڑے اور رہائش کے انتظامات کیے بغیر دوسری شادی نہیں کرنی چاہیے۔

”آئندہ وہ کیسے زندگی گزارے گی؟ میرے ساتھ رہے گی یا طلاق لے گی؟ اس کا فیصلہ معلوم کرنا میرا فرض ہے۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچا۔ ’طلاق......؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ وہ میرے بچپن کی محبت ہے۔ میں نے بڑی جدوجہد کے بعد اسے حاصل کیا ہے۔‘

پھر اس کی سوچ نے ایمان داری سے کہا۔ ”وہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہے گی۔ تب میں کیا کروں گا؟ میں اسے آزاد نہیں کروں گا۔ اسے اپنی مرضی سے کسی اور کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے نہیں دوں گا۔ میں کیا کروں؟ میرا دل نہیں مانے گا اور یہ اس کے ساتھ واقعی ناانصافی ہوگی۔ خدا ناراض ہوگا۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سیدھی سی بات یہی تھی کہ ہمیشہ ماروی کے ساتھ رہنے کے لیے مرینہ سے دور ہونا پڑے گا اور اگر مرینہ کی طلب چیختی رہے گی، اسے گناہ کی طرف پکارے گی تو اسے منکوحہ بنانا لازمی ہوگا۔

اسے دو میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا تھا۔

اور یہ فیصلہ بہت ہی مشکل تھا کہ کس کے ساتھ رہنا ہے اور کسے چھوڑنا ہے؟ اور فیصلہ دہلی ائرپورٹ پہنچنے سے پہلے کرنا تھا۔ مرینہ سے یہ طے پایا تھا کہ وہ اس سے دو روز پہلے دہلی پہنچے گی اور نکاح پڑھوانے کے انتظامات کرے گی اور وہ ایسا کرچکی ہوگی۔

وہ تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ اس پروگرام کے مطابق وہاں نکاح خوانی کے انتظامات ہوچکے ہیں۔ آج ہی شام تک وہ اس کی منکوحہ بننے والی ہے۔

وہ جہاز کی آرام دہ سیٹ پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ اب اس کا ایمان اس کی دین داری کہہ رہی تھی کہ صرف ماروی اس کی شریکِ حیات ہے۔ وہ ماروی کے ساتھ رہے۔ اس کی مرضی کے خلاف اس پر سوکن نہ لائے۔

یا پھر اسے طلاق دے دے۔ ماروی کو نکاح کے حبسِ بے جا میں نہ رکھے۔ اسے دینی اور دنیاوی قوانین کے مطابق آزاد کردے پھر مرینہ کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارے۔

وہ دہلی پہنچ گیا۔ امیگریشن کاؤنٹر سے گزرنے کے بعد وہ ہال میں آیا۔ وہاں سے اپنا سامان ٹرالی میں رکھ کر باہر جانے لگا۔ اس نے ٹرالی کے ہینڈل کو سختی سے گرفت میں رکھ لیا۔ وہ اپنا دل مضبوط کرچکا تھا۔

باہر وزیٹرز لابی میں سب ہی اس کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ مرینہ، ثلاثہ کے بہروپ میں تھی۔ اس کے ساتھ ایمان علی اور ڈاکٹر ٹمپی سن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ جگنی بائی کو ماں کہتا تھا۔ وہ بھی بیٹے کو گلے لگانے آئی تھی۔ وہ سب لگیج ہال سے باہر آنے والے مسافروں کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ مراد کا موجودہ نام سکندر شاہ ہے لیکن اس کا چہرہ نیا اور انجانا تھا۔ مراد کو خود ان کے پاس جا کر کہنا تھا کہ وہی مراد علی منگی ہے۔

اس نے یہی نہیں کیا۔ اپنے مستحکم فیصلے کے مطابق اپنا تعارف نہیں کرایا۔ سامان کی ٹرالی دھکیلتا ہوا تمام براتیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا عمارت سے باہر آگیا۔ ایک ٹیکسی

میں بیٹھ کر کسی ہوٹل کی طرف جانے لگا۔

وہ چاروں وہاں کھڑے تنہا آنے والے مسافروں کو بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی ان کے پاس آکر نہیں رُک رہا تھا۔ سب ہی ان کے آس پاس سے گزرتے جا رہے تھے۔ ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

آخر اس جہاز کا آخری مسافر بھی گزر گیا۔ وہ استقبال کے لیے آنے والے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے پھر مرینہ نے حیرانی سے کہا۔ ''یہ کہاں رہ گیا ہے؟ تمام مسافر جا چکے ہیں۔''

اس نے فون پر نمبر پنچ کیے۔ معلوم ہوا کہ اس نے فون کو بند رکھا ہے۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''اس نے کراچی ائرپورٹ سے فون کیا تھا کہ اسی فلائٹ سے آرہا ہے۔''

ڈاکٹر ٹمینی سن نے کہا۔ ''مجھے بھی فون پر یہی کہا تھا۔''

جگنی بائی نے پوچھا۔ ''کیا فون اٹینڈ نہیں کر رہا ہے؟''

''اس نے فون کا سوئچ آف کر رکھا ہے۔''

ایمان علی نے کہا۔ ''وہ میرا یار ہے۔ اس نے کہا تھا کہ میں نے تلِ ابیب میں اس کی خاطر گولی کھائی تھی۔ اب وہ یہاں آکر میرے کام آئے گا۔ شملہ میں رہ کر مجھے سیکیورٹی دیتا رہے گا۔''

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''وہ سچا ہے۔ زبان کا دھنی ہے۔ ضرور آئے گا۔ معلوم ہوتا ہے، کسی پرابلم میں پھنس گیا ہے۔''

جگنی بائی نے کہا۔ ''جیسی بھی پرابلم ہو، وہ فون پر تو بول سکتا ہے۔ اس نے فون کیوں بند کیا ہے؟''

پھر اس نے کچھ سوچ کر سر ہلایا۔ ''میرا بیٹا زبان کا پکا ہے۔ وہ ضرور آیا ہوگا۔''

مرینہ نے کہا۔ ''آیا ہے تو یہاں نظر کیوں نہیں آیا؟ ہم اس کا نیا چہرہ نہیں پہچانتے۔ وہ تو ہم سب کو پہچانتا ہے؟''

جگنی بائی نے کہا۔ ''اس کی کوئی مجبوری ہے۔ اس لیے یہاں ہم سے ملاقات نہیں کی ہے۔ ہے بھگوان۔۔۔! کوئی گمبھیر معاملہ ہے، اسی لیے فون کو بھی بند رکھا ہے۔''

ڈاکٹر ٹمینی سن نے کہا۔ ''ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔ وہ خود کال کرے گا اور ہمارے پاس آئے گا۔''

وہ سب وہاں سے جانے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ مراد ان کے گھر ملنے آئے گا۔ مرینہ تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کی اچانک روپوشی کھٹک رہی تھی۔ سوکن بننے والی کا دماغ کہہ رہا تھا کہ ماروی نے اسے روک لیا ہے۔

اسی نے اس فلائٹ سے آنے نہیں دیا ہے جبکہ ماسٹر کا کام عشق و محبت سے زیادہ اہم ہے۔ اسے ہر حال میں یہاں پہنچنا تھا۔ اگر ماروی کی آغوش میں پگھل گیا ہے، تب بھی ماسٹر کے کام سے یہاں آنا ہی ہوگا۔ ابھی نہیں آیا ہے لیکن آج یا کل کسی دوسری فلائٹ سے اسے آنا ہی پڑے گا۔

وہ اس پہلو سے بھی سوچ رہی تھی کہ ماروی نے اس کا فون اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ اسے کہیں کال کرنے نہیں دے رہی ہے۔ اسی لیے وہ ابھی رابطہ نہیں کر رہا ہے۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ وہ آچکا ہے۔ کسی وجہ سے چھپ رہا ہے۔

وہ جاتے جاتے رک گئی۔ ایمان علی سے بولی۔ ''ہمیں اس فلائٹ میں آنے والوں کے نام معلوم ہو سکتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی ایمان علی تیزی سے چلتا ہوا انفارمیشن آفس میں گیا۔ پھر واپس آکر بولا۔ ''مسافروں کی فہرست میں سکندر شاہ کا نام ہے، وہ اسی فلائٹ سے آیا ہے۔''

وہ سب حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جگنی بائی نے کہا۔ ''پھر تو وہ ہمارے سامنے سے گزر کر گیا ہے۔ تعجب ہے، اس نے ہم سے بات بھی نہیں کی؟''

مرینہ تلملا رہی تھی۔ مٹھیاں بھینچ کر کسمساتی ہوئی بولی۔ ''کیوں اجنبی بن کر چلا گیا ہے؟ وہ مجھ سے چھپ کر کیوں گیا ہے؟''

وہ اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ''وہ جائے گا کہاں؟ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔''

اس کے خیال کے مطابق وہ کسی ہوٹل میں رہائش کے لیے گیا ہوگا۔ وہ اپنے نئے چہرے کے ساتھ سب ہی کے لیے اجنبی تھا۔

وہ کار اسٹارٹ کر کے تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی سوچنے لگی۔ 'یہاں وہ نئے چہرے کے باعث اجنبی ہے۔ اس سے کسی کی دوستی نہیں ہے۔ کسی سے دور کے تعلقات بھی نہیں ہیں۔ وہ کسی کے گھر نہیں جائے گا۔ ضرور اپنے معیار کے مطابق کسی اچھے ہوٹل میں گیا ہوگا۔'

مراد بھی خوب سمجھتا تھا کہ مرینہ کا ذہن کس وقت کیا سوچتا ہے اور کیا کرتا ہے؟ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر دہلی شہر سے باہر آگیا۔ وہاں کی ایک چھوٹی سی بستی میں ایک چھوٹے سے ہوٹل کے کمرے میں عارضی طور پر ٹھکانا بنا لیا۔

اسے پورا یقین تھا کہ مرینہ اتنی دور تک نہیں سوچے گی۔ وہ دہلی کے بڑے ہوٹلوں میں اسے ڈھونڈتی پھرے گی۔ جب تھک ہار کر شہر کے باہر ہوٹلوں میں آئے گی، تب تک وہ دوسری جگہ جا چکا ہوگا۔

اس نے ماسٹر کو فون پر مخاطب کیا پھر کہا۔ ''میں آپ کے حکم کے مطابق دہلی پہنچ گیا ہوں۔ کل یہاں سے شملہ جا کر آپ کا کام کروں گا۔ لیکن مرینہ سے دور رہوں گا۔''

ماسٹر نے پوچھا۔ ''کیا اس سے جھگڑا ہو گیا ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ماروی اور مرینہ کے درمیان اُلجھ گیا ہوں۔ اگر اسی طرح اُلجھتا رہا تو حاضر دماغی سے کام نہیں کر سکوں گا۔ میری شامت آجائے گی۔ میں آسانی سے دشمنوں کے ہاتھوں مارا جاؤں گا۔''

''مراد! میں تمہیں یہی سمجھاتا رہتا ہوں۔ جنگجو مردوں کی تاریخ کہتی ہے جس نے بھی عورتوں کو اپنی اہم ضرورت بنایا' وہ دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ میری مانو' عورتوں کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا کرو۔''

''میں ماروی کو کبھی ٹشو پیپر نہیں سمجھ سکوں گا اور میری ہوس بڑی شدت سے مرینہ کو مانگتی ہے۔ مجھے دونوں میں سے کسی ایک کو اپنانا ہوگا اور دوسری کو چھوڑنا ہوگا۔''

وہ ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ ''میں یہ فیصلہ کرنے تک مرینہ سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے یہاں آکر اس سے ملاقات نہیں کی ہے۔ دہلی کے مضافات میں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چھپا ہوا ہوں۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوگی۔''

''میرا دستِ راست چھپت راؤ دہلی میں ہے۔ تمہارے لیے ہتھیاروں اور شوٹرز کے انتظامات کر چکا ہے۔ وہ شملہ میں تمہارے ساتھ رہے گا۔ کیا اس کا فون نمبر تمہارے پاس ہے؟ وہ تمہارے تمام نئے مسائل ابھی حل کرے گا۔''

''آپ اس کا نمبر Send کریں۔''

''ابھی کرتا ہوں۔ یہ بتاؤ' شملہ میں مرینہ سے دور رہ کر دشمنوں سے نمٹ سکو گے؟''

''میں آج تک مرینہ کے بغیر ہی میدان مارتا آیا ہوں۔ ایک بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہے کہ وہ صرف میری ہوس پرستی کے لیے ضروری ہے۔''

''وہ تمہیں وہاں نہ پا کر مجھے فون کرے گی۔''

''آپ اسے فون کریں اور یہ ظاہر کریں کہ آپ بھی میری گمشدگی سے پریشان ہیں۔ ابھی وہ میرے بغیر شملہ جائے۔ جب تک میری کوئی خبر نہیں ملے گی، تب تک وہ تنہا میڈونا کو ٹارگٹ بنا کر اس کے باپ کی نیندیں اُڑاتی رہے۔''

''ہاں، اسے یہی سمجھانا ہوگا۔ میں ابھی اس سے بات کروں گا۔ یہ بتاؤ' وہاں اس سے چھپ کر رہ سکو گے؟''

''ماسٹر...! آنکھ مچولی تو کھیلنی ہی ہوگی۔ وہ جھنجلا جائے گی۔ میں اس سے بہت بڑی وعدہ خلافی کر رہا ہوں۔ شادی کا وعدہ کر کے اس سے منہ پھیر رہا ہوں۔ اس کی انسلٹ کر رہا ہوں۔ وہ میری دشمن بن جائے گی۔''

وہ بڑی بے بسی سے بولا۔ ''میں مانتا ہوں کہ غلطی میری ہے مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟ آگے جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔''

''او گاڈ...! تم نے تو مجھے بھی اُلجھا دیا ہے۔ یہ بتاؤ' شملہ میں حاضر دماغ رہ سکو گے؟''

''آپ میری فکر نہ کریں۔ میں حاضر دماغ بھی رہوں گا اور آپ کے دشمن کی کمر بھی توڑ کر آؤں گا۔''

اس سے رابطہ ختم ہو گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد چھپت راؤ نے کال کی۔ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''مراد! میرے آئیڈیل! تم یہاں ہو؟ ابھی ماسٹر نے بتایا ہے اور تمہارا یہ نمبر دیا۔ فوراً بتاؤ کہاں ہو، میں آرہا ہوں۔''

مراد نے اپنا موجودہ پتا بتایا۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر پہنچ گیا اسے گلے لگا کر بولا۔ ''تم اُس بلا سے چھپنے اتنی دور آئے ہو۔ چلو اب میرے بنگلے میں رہو گے۔''

''کیا ماسٹر نے یہ نہیں بتایا ہے کہ کل ہی مجھے شملہ جانا ہے؟''

''ہاں، مجھے حکم دیا ہے کہ وہاں تمہارے ساتھ رہا کروں۔ تمہیں یہاں سے وہاں تک ضرورت کے مطابق اسلحہ اور شوٹرز ملتے رہیں گے۔''

پھر اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''شملہ میں ایک مسلم فیملی سے میری جان پہچان ہے۔ میں نے ان سے بات کی ہے۔ وہاں تم ان کے فیملی ممبر بن کر رہ سکو گے۔ مرینہ کو اور میکی براؤن کے آدمیوں کو تم پر شبہ نہیں ہوگا۔''

وہ مراد کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''یار! یہ ہوتا کیا ہے؟ کبھی مرینہ سے دوستی ہوتی ہے' کبھی دشمنی؟ اب پھر اتنی زبردست شوٹر اور فائٹر سے دور بھاگ رہے ہو؟''

مراد نے اپنی اٹیچی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے نکلو' راستے میں بتاؤں گا۔''

اس نے مراد کے ہاتھ سے اٹیچی لے لی۔ پھر وہ دونوں اس ہوٹل کے کمرے سے نکل آئے۔ اُدھر مرینہ' ایمان علی' ڈاکٹر اور جگنی باکی اپنی اپنی گاڑیوں میں دوڑ لگا رہے تھے۔ چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں سکندر شاہ کو تلاش کر رہے تھے اور مایوس ہو رہے تھے۔ اس کا سایہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

مرینہ جھنجلا رہی تھی۔ شام کو مغرب کی نماز کے بعد نکاح پڑھایا جانے والا تھا۔ تمام انتظامات ہو چکے تھے۔ ایسے میں وہ منہ چھپا کر یہ تاثر دے رہا تھا کہ اسے نکاح قبول نہیں ہے۔

گویا وہ دلہن کو رد کر رہا تھا۔ یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ

اسے ٹھکرا رہا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ایک دلہن بننے والی کی توہین ہو رہی تھی اور وہ اپنی توہین محسوس کر کے تلملا رہی تھی۔

ایسے وقت ماسٹر نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ ''مرینہ! یہ مراد کو کیا ہو گیا ہے؟ اس نے فون کا سوئچ آف کیوں کیا ہے؟ کیا وہ دہلی پہنچ گیا ہے؟''

وہ بولی۔ ''میں ابھی آپ سے پوچھنے ہی والی تھی کہ مراد کے اچانک روپوش ہونے میں کیا حکمت عملی ہے؟ اگر کسی پلاننگ کے تحت ایسا کر رہا ہے تو مجھ سے کیوں چھپ رہا ہے؟''

ماسٹر نے کہا۔ ''مجھے غصہ آ رہا ہے' وہ مجھ سے بھی چھپ رہا ہے۔ دہلی میں میرے آدمی اس کی تلاش میں نکل پڑے ہیں اور سنو! اس کا پتا ٹھکانا معلوم ہو یا نہ ہو، وہ واپس آئے یا نہ آئے، میرے دشمن کی بیٹی کو شملہ سے اپاہج ہو کر جانا ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے' وہ گم ہو جانے کے بعد شملہ میں ملے گا؟ کیا آپ کا کام کرے گا؟''

''گاڈ نوز بیٹر۔ میں تو موجودہ حالات میں صرف تم پر بھروسا کر رہا ہوں۔ تم اس مشن کی ذمے داریاں سنبھالو گی۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ میڈونا پرسوں صبح تک شملہ پہنچے گی۔ میں چاہتا ہوں' تم کل شام تک وہاں چلی جاؤ۔''

''آپ اطمینان رکھیں۔ میں کل جاؤں گی۔ اس مشن میں مراد کا ساتھ ہو یا نہ ہو، میں کامیابی حاصل کروں گی۔''

''تھینکس گاڈ۔ تمہیں اس لیے بھی جانا ہے کہ مراد یہاں چھپنے کے باوجود وہاں مل سکتا ہے۔''

''ہاں، میں اسی اُمید سے وہاں جاؤں گی۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ ماسٹر کو اطمینان ہو گیا۔ اس کا کام رکنے والا نہیں تھا۔ مراد اور مرینہ ایک دوسرے سے اجنبی ہو کر اور دور رہ کر بھی شملہ میں اسی کے لیے کام کرنے والے تھے۔

مراد صرف مرینہ سے چھپ کر رہنا چاہتا تھا۔ وہ چمپت راؤ کے بنگلے میں آ گیا تھا۔ اس نے سم بدل کر ڈاکٹر ٹمی سن کو فون پر مخاطب کیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

مراد نے کہا۔ ''اگر آپ اس وقت تنہا ہیں اور آپ کے آس پاس کوئی نہیں ہے تو میں اپنا تعارف کراؤں گا۔''

ڈاکٹر لیٹا ہوا تھا۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''میں اپنے بیڈروم میں تنہا ہوں۔ بولو تم کون ہو۔''

''ڈیڈی! میں آپ کا بیٹا مراد ہوں۔''

مراد نے اپنی آواز اور لب و لہجے میں کہا تو ڈاکٹر نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟ میں اپنے بیٹے کی سلامتی کے لیے پریشان ہوں۔ تمہاری آواز سن کر دل کو اطمینان ہو رہا ہے۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کی دعاؤں سے بخیریت ہوں۔ شملہ میں ایمان علی پر ایک ذرا بھی آنچ نہیں آئے گی۔ ویسے آپ کو ایک بار پھر تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ پلیز میرے چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی کر دیں۔''

''یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ابھی آ جاؤ۔''

''نو ڈیڈ! میں نہیں چاہتا کہ مرینہ کو میرے متعلق کچھ معلوم ہو۔ آپ کو سرجری کے سامان کے ساتھ یہاں آنا ہوگا۔''

''ابھی آؤں گا۔ اپنا پتا بتاؤ۔''

اس نے چمپت راؤ کی کوٹھی کا ایڈریس بتا کر کہا۔ ''ہوشیاری سے آئیں۔ مرینہ میری بُو سونگھتی پھر رہی ہو گی۔ اسے ذرا بھی شبہ ہوگا تو آپ کا پیچھا کرتی ہوئی یہاں آ جائے گی۔''

''اطمینان رکھو۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ جگنی بائی کے ساتھ تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔''

وہ آدھے گھنٹے کے بعد ہی مراد کے پاس آ گیا۔ اسے آئینے کے سامنے بٹھا کر اس کے چہرے پر ایک لوشن لگاتے ہوئے بولا۔ ''مرینہ سے کیوں چھپ رہے ہو جبکہ ایک گھنٹے بعد اس سے نکاح پڑھوانے والے تھے؟''

وہ اپنی مجبوری بتانے لگا۔ ڈاکٹر نے اس کی رُوداد سن کر کہا۔ ''تم جس طرح خطرات سے کھیلتے رہتے ہو' اس کے پیش نظر تمہیں عورتوں کے معاملات میں نہیں الجھنا چاہیے۔''

''میں کیا کروں؟ نجات کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔ دو میں سے کسی ایک کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور مجھے کس کے ساتھ رہنا چاہیے اور کسے چھوڑنا چاہیے' یہ مشکل فیصلہ کرنے تک مرینہ سے دور رہنا چاہتا ہوں۔''

''جیسی زندگی تم گزار رہے ہو' اس کے مطابق مرینہ بہترین لائف پارٹنر ثابت ہوگی اور ماروی کے متعلق سنا ہے کہ وہ بہت ہی نیک اور سیدھی سادی سی لڑکی ہے۔ دنیا والوں کی ہیرا پھیری نہیں جانتی۔ ایسی لڑکیاں بہترین گھریلو وائف ثابت ہوتی ہیں۔ جبکہ تم گھریلو زندگی گزارنے والے شوہر بن ہی نہیں سکتے۔''

اس نے ماروی سے ہمدردی کی۔ ''تعجب ہے' کیا سوچ کر تم نے اس سے شادی کی تھی؟ اب ایسی شریف زادی کو چھوڑنے کا فیصلہ کرو گے تو سراسر اس پر ظلم کرو گے۔''

''میں آخری سانس تک اسے چھوڑنا نہیں چاہتا مگر کیا

کروں، وہ ایک سوکن کو برداشت کرنا نہیں چاہتی۔ سوکن لانے سے پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔''

''میں تمہیں ایک سیدھی سی، اچھی اور سچی بات سمجھاتا ہوں۔ اپنی عقل سے بھی سمجھو۔ تم ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے ہاتھ میں پھول لے کر زندگی نہیں گزار سکو گے۔ تمہاری آخری سانسوں تک بندوق تمہارا مقدر بن گئی ہے۔''

''یہی تو میری بدنصیبی ہے۔''

''بدنصیبی کا علاج مشکل نہیں ہے۔ پھول کو کسی اور گلدان میں جانے دو۔ ایک بار دل مضبوط کر کے ماروی کو چھوڑ دو۔ اس شریف زادی کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے آزاد کر دو۔''

وہ چپ رہا۔ جواباً کچھ نہ بولا لیکن اندر یہ ضد اور ہٹ دھرمی تھی کہ اسے رقیب کے پاس جانے کے لیے آزاد نہیں کرے گا۔

اس نے موضوع بدل کر کہا۔ ''ایمان علی ماتاجی کی بیٹی ورشا سے عشق کر رہا تھا۔ اچانک ہی اسے چھوڑ کر میڈونا کی طرف جا رہا ہے۔ کیا ماتاجی برا نہیں مان رہی ہیں؟''

''نہیں۔ جگنی بائی علم نجوم کو بہت مانتی ہیں۔ انہوں نے اپنے خاندان کے ایک جیوتشی مہاراج سے ورشا اور ایمان علی کی جنم کنڈلی نکلوائی تھی۔ ورشا کی کنڈلی نے بتایا ہے کہ ایمان علی سے اس کے ستارے نہیں ملتے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ رہے گی تو مصیبتوں میں گرفتار ہوتی رہے گی۔''

''کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ جیوتشی کی بات درست ہوتی۔ کیا ماتاجی پیش گوئی کو یونہی مان لیتی ہیں؟''

''وہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ ورشا پہلی بار ایمان علی کے ساتھ وقت گزارنے کسی سہیلی کے گھر گئی تھی۔ اسی دن وہ سہیلی مر گئی۔ پھر دوسرے دن اس کے ساتھ وقت گزار کر گھر آ رہی تھی تو ایک گاڑی سے ٹکرا گئی۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ ابھی تک اسپتال میں ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''ایمان علی فون پر میڈونا سے باتیں کرتا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ وہ شملہ کب پہنچ رہی ہے؟''

''میڈونا کل صبح دس بجے کی فلائٹ سے یہاں پہنچے گی۔ یہاں سے وہ شملہ جائے گی۔ ایمان نے بھی اسی فلائٹ میں ایک سیٹ حاصل کر لی ہے۔''

''اور مرینہ کب جا رہی ہے؟''

''اس نے اپنے اور تمہارے لیے جیکسن ائر لائن کی ایک فلائٹ میں دو سیٹیں حاصل کی ہیں۔ کل دوپہر کو یہاں سے تمہارے بغیر جائے گی۔''

رات کے دس بجے تک چہرہ تبدیل ہو گیا۔ مراد نے اپنے سامنے آئینے میں ایک خوبرو اجنبی جوان کو دیکھا پھر مسکرا کر کہا۔ ''یہ آپ نے کیا کیا ہے؟ میں بھی کہنا بھول گیا کہ مجھے ہینڈسم نہ بنائیں۔ عورتیں پیچھے پڑ جاتی ہیں۔''

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ''ابھی تم دو ہی عورتوں سے پریشان ہو اور پریشان ہوتے رہو گے تو پکے ہو جاؤ گے۔ ان سے نمٹنا آ جائے گا۔ او کے، اب میں جا رہا ہوں۔ کل صبح سے میرا بیٹا تمہارے حوالے ہے۔ اسے شملہ سے سلامت واپس لاؤ گے۔''

''انشاءاللہ۔ میں اسے ہر ممکن سیکیورٹی دوں گا۔''

وہ اپنا سامان اٹھا کر چلا گیا۔ چمپت راؤ دوسرے کمرے میں بیٹھا پی رہا تھا۔ اس نے آ کر مراد کو دیکھا پھر کہا۔ ''یار! تم بھی کیسے کیسے رنگ بدلتے رہتے ہو۔ اس بار تو تم اتنے سندر اتنے چھیل چھبیلے بن گئے ہو کہ عورتیں دیکھتے ہی پٹاپٹ مرنے لگیں گی۔''

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ چمپت راؤ نے کہا۔ ''تمہارے نئے چہرے کی آئی ڈی، پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات بنوانے ہوں گے۔''

پھر وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہمیں کل تک شملہ پہنچنا ہے۔ بھاری رشوتیں دے کر کام بنانا ہوگا۔''

وہ کیمرا لا کر اس کی تصویریں اتارتے ہوئے بولا۔ ''میں دھرم داس جی کو تصویریں دے کر جاؤں گا۔ وہ ہمارے شملہ سے واپس آنے تک تمہارے تمام اہم کاغذات تیار کرا لیں گے۔''

''کیا جہاز میں سیٹیں مل گئیں؟''

''نہیں۔ ہم صبح چھ بجے کی ٹرین سے جائیں گے۔ ٹرین سے جانا اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے آدمی بہت زیادہ اسلحہ چھپا کر لے جا رہے ہیں۔''

''اسلحہ پکڑا گیا تو ہم بھی پکڑے جائیں گے۔''

''ہم اپنے آدمیوں سے دور رہیں گے۔ انہیں اسمگلنگ کا تجربہ ہے۔ ہم شملہ پہنچ کر جس قسم کا اسلحہ چاہیں گے، وہ ملتا رہے گا۔''

دوسرے دن میدانِ جنگ کے سپاہی شملہ کی طرف روانہ ہونے لگے۔ مراد صبح چھ بجے ٹرین ہمالین کوئین سے روانہ ہوا۔ اس کے چار گھنٹے بعد ایمان علی ائرپورٹ آیا۔ وہاں میڈونا اسے دیکھ کر خوشی سے چیخ پڑی۔ ایمان نے دونوں بازو پھیلائے تو وہ دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ

گئی۔

یہ دلوں کی دھڑکنیں تیز کردینے والے لمحات تھے۔

لیکن ایمان علی معشوقہ کے آگے پیچھے بنے کئے مشٹنڈے گارڈز کو دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ سب نیلے رنگ کی وردی میں تھے۔ وہ اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔ ایمان علی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''کیا یہ اسی طرح کباب میں ہڈیاں بنتے رہیں گے؟''

وہ بولی۔ ''مجبوری ہے' میرے پاپا کا حکم ہے۔ یہ سائے کی طرح شملہ میں بھی آگے پیچھے رہیں گے۔ ابھی یہاں صرف چار ہیں۔ شملہ میں تو جیسے فوج پہنچی ہوئی ہے۔''

''لیکن یہ کیسے گارڈز ہیں۔ ان کے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔''

''جہاز میں اسلحہ ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ شملہ پہنچتے ہی یہ سب مسلح ہو جائیں گے۔''

''یہ خالی ہاتھ ہیں۔ ابھی تمہیں کس کروں گا تو یہ مجھے گولی نہیں مار سکیں گے۔''

''کیا تم ڈرتے ہو؟''

''ڈرتا نہیں، تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔ یہ نہیں چاہتا کہ تم شادی سے پہلے بیوہ ہو جاؤ۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ کس کرو۔ میں تڑپ رہی ہوں۔''

وہ دوسرے ہی لمحے میں سلگتے ہوئے لبوں تک پہنچ گیا۔ انڈیا میں سرعام ایسی جذباتی جرأت مندی کی اجازت نہیں ہے۔ صرف ائرپورٹ اور سی پورٹ پر غیر ملکیوں کو چھوٹ دے دی جاتی ہے۔

میڈونا غیر ملکی یہودی تھی۔ دور کھڑے ہوئے قانون کے محافظوں نے خاموشی سے اس منظر کو دیکھا۔ اس کے چاروں باڈی گارڈز بھی ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

☆☆☆

بلّا آئندہ بھی مراد علی منگی بن کر میکانو رابرٹ سے پلے کرنے والا تھا۔

ماسٹر نے اس کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر مراد سے مشورہ کرنے کے بعد اجازت دی تھی کہ وہ مراد بن کر ڈی ڈی ٹی کے بگ باس میکانو رابرٹ کے لیے کام کر سکتا ہے۔

ماسٹر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میکانو رابرٹ کے ذاتی خفیہ معاملات کیا ہیں اور وہ اپنے معاملات میں مراد (بلّے) کو کس حد تک رازدار بنانے والا ہے۔

ماسٹر نے مراد سے کہا تھا۔ ''تم آج کل مرینہ کو اپنے لیے بہت ضروری سمجھ رہے ہو۔ جس کا نتیجہ دیکھ رہے ہو۔ ماروی تم سے بدظن ہو گئی ہے۔ تم بہت زیادہ ٹینشن میں ہو۔''

مراد نے کہا تھا۔ ''واقعی ماروی نے مجھ سے دور ہو کر سمجھا دیا ہے کہ مرینہ کے باعث اسے ہارنے والا ہوں۔''

پھر ماسٹر نے کہا تھا۔ ''آگے کیا ہونے والا ہے، یہ تم سمجھو۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن تمہیں یہ سمجھا دوں کہ بلّے اور میکانو کے موجودہ معاملے میں مرینہ کو رازدار نہ بنانا۔ اسے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ مراد بن کر میکانو رابرٹ سے پلے کر رہا ہے۔''

اس نے وعدہ کیا تھا۔ ''میں آپ کا یہ مشورہ یاد رکھوں گا۔ مرینہ کو رازدار نہیں بناؤں گا۔ ویسے بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس سے دور ہو گیا ہوں۔ یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ ماروی کو جیتنے کے لیے مرینہ کو ہار جاؤں گا۔ اس سے بات بھی نہیں کروں گا۔''

دوسری طرف میکانو رابرٹ بھی بہت محتاط تھا۔ اس کی تنظیم ڈی ڈی ٹریڈرز کے دو اور پارٹنر تھے۔ ایک تو وہی لندن شاپنگ پلازا کا مالک جیمس ہارورڈ تھا جو بلّے سے ٹکرا کر بری طرح مات کھا چکا تھا۔

میکانو کا دوسرا پارٹنر ایک انڈین کرمنل راکیش راؤ تھا۔ ان تینوں پارٹنرز کے درمیان میکانو رابرٹ بگ باس کہلاتا تھا۔ اس نے اپنے دونوں قابلِ اعتماد پارٹنرز کو بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ مراد علی منگی سے ملاقات کرنے والا ہے اور ہر قیمت پر اس کی خدمات حاصل کرنے والا ہے۔

اس نے جیمس ہارورڈ سے کہا تھا کہ وہ مراد کے پیر بھائی بلال احمد کو دوست بنا رہا ہے۔ لہٰذا آئندہ اس سے دشمنی نہ کرے۔ بلال احمد بھی زبردست فائٹر، شوٹر اور پلان میکر ہے۔ وقتِ ضرورت اس سے کام لیا جائے گا۔

میکانو اپنے قابلِ اعتماد لوگوں سے بھی چھپنے کے لیے عارضی میک اپ کے ذریعے چہرہ بدل کر لندن پہنچ گیا۔ اس نے فون کے ذریعے بلّے سے کہا۔ ''میں یہاں آگیا ہوں۔ ایسٹ بورن کے سی ویو ہوٹل کے روم نمبر دو سو سات میں ہوں۔ کیا ابھی ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''میں دوپہر دو بجے تک پہنچ رہا ہوں۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''میں بھی چلوں گی۔''

وہ بولا۔ ''تجھے سمجھایا ہے کہ مراد بن کر میکانو رابرٹ سے ملتا رہوں گا اور مراد کبھی کسی عورت کے ساتھ نہیں رہتا۔ پھر تجھے ساتھ کیسے لے جاؤں؟''

''مراد بھائی کے ساتھ مرینہ رہتی ہے' یہ تمام دشمن جانتے ہیں۔ ابھی اندر کی یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ مراد بھائی مرینہ سے دور ہو گئے ہیں۔ ابھی تیرے ساتھ رہوں

گی تو میکانو رابرٹ یہی سمجھے گا کہ مرینہ تیرے ساتھ ہے۔''

وہ ایک انگلی دکھاتے ہوئے بولی۔ ''تو مراد علی منگی بن رہا ہے تو مجھے مرینہ بن کر رہنے دے۔ باتیں نہ بنا۔''

بلّا سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ ''ابھی ایک عرصے تک دشمن یہی سمجھتے رہیں گے کہ مراد اور مرینہ کا ساتھ ہمیشہ کی طرح ہے۔ بکی میرے ساتھ مرینہ بن کر رہ سکتی ہے۔ میرے معاملات میں ساتھ رہ کر ٹریننگ حاصل کرتی رہے گی تو مرینہ سے بھی زیادہ آندھی طوفان بن جائے گی۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''کتنی دیر سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ کچھ بولنے والا ہے مگر بولتا نہیں ہے۔ میں تیرا انکار نہیں سنوں گی۔''

وہ بڑے پیار سے مسکرانے لگا۔ وہ دونوں بانہیں پھیلا کر بولی۔ ''ہائے میں قربان! تو میری بات مان رہا ہے۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کچھ لیے دیے بغیر کام نہیں بنتا۔ رشوت دے گی تو مان لوں گا۔''

وہ لپک کر آئی اور اس کی دھڑکنوں سے لگ کر رشوت دینے لگی۔ رشوت ہوتی ہی ایسی ہے کہ منہ بند کر دیتی ہے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے ساری دنیا کو بھول گئے۔ پھر بلّے نے کہا۔ ''تو میری آغوش میں بشریٰ ہے۔ آغوش سے باہر آئندہ مرینہ بن کر رہے گی۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا مجھے مرینہ کی بول چال اور اس کے اسٹائل کی نقل کرنی ہوگی؟''

''کوئی ضروری نہیں ہے مرینہ جب بھیس بدلتی ہے تو اسٹائل بھی بدل دیتی ہے۔ ابھی تیرے موجودہ روپ میں یہی سمجھا جائے گا کہ مرینہ ایک ایشیائی عورت بن گئی ہے اور ہم دشمنوں پر ظاہر نہیں ہونے دیں گے کہ تو مرینہ ہے اور میں مراد ہوں۔''

میکانو رابرٹ پچپن برس کا ایک قد آور صحت مند برطانوی تھا۔ صحت ایسی تھی کہ بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچنے کے باوجود ٹھوس جوان مرد دکھائی دیتا تھا۔

وہ برطانیہ چھوڑ کر افریقا کے شہر کاکوٹا میں ایک عام آدمی کی طرح ہیروں کی کان میں مزدوری کرنے آیا تھا۔ اس کی سوچ بچپن سے مجرمانہ تھی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق دن رات بڑی ہیرا پھیری سے جدوجہد کرتا ہوا کوٹا ڈائمنڈ مائنز میں اڑتیس پرسنٹ کا شیئر ہولڈر بن گیا تھا۔

اس نے اسی شہر میں ایک کلومیٹر کے رقبے پر ایک عالیشان محل بنایا تھا۔ محل کے اندر جدید الیکٹرونک سسٹم سے حفاظتی انتظامات کیے تھے۔ محل کے احاطے کے اندر اور باہر دن رات مسلح گارڈز ڈیوٹی پر مستعد رہا کرتے تھے۔ وہ جہاں جاتا تھا' اس کے آگے پیچھے درجنوں گن بردار گاڑیوں میں ساتھ چلتے تھے۔

وہ زندگی میں پہلی بار سیکیورٹی کے بغیر مراد سے ملنے کے لیے بھیس بدل کر اپنے محل سے باہر نکلا۔ اسے اپنے طور پر یقین تھا کہ وہ بڑی رازداری سے لندن جا رہا ہے لیکن اس نے اپنی سیکیورٹی کے لیے محل میں جس طرح جدید حفاظتی انتظامات کیے تھے' اس کے نتیجے میں وہ خود اپنے محافظوں سے چھپ نہیں سکتا تھا۔

اس کے ایک قابلِ اعتماد دستِ راست کا نام بوگاٹا تھا۔ وہ اپنے باس کی خفیہ معروفیات کو بڑی خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے نئے بھیس میں پہچان رہا تھا۔ وہ بھی محل سے نکل کر اس کا تعاقب کرتا ہوا لندن پہنچ گیا تھا۔

وہ حیران تھا کہ اس کے باس نے پہلی بار اسے اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟ تنہا خطرات مول لے کر کہاں جا رہا ہے؟ کیوں جا رہا ہے؟

بوگاٹا نے سی ویو ہوٹل میں پہنچ کر دور سے دیکھا۔ یہ معلوم کیا تھا کہ باس میکانو ایک کمرا کرائے پر لے کر لفٹ کے ذریعے اوپر پانچویں فلور پر گیا تھا۔

ایسے وقت بشریٰ جینز اور جیکٹ پہنے ہوٹل کی لابی میں موجود تھی۔ پلاننگ کے مطابق دور ہی دور سے بلّے کی نگرانی کرنے آئی تھی۔ اس نے بوگاٹا کو اور بوگاٹا نے اس کو وہاں دیکھا تھا۔ دونوں یہ جان نہیں سکتے تھے کہ ان کا تعلق بلّے اور میکانو سے ہے۔

اُدھر ہوٹل کے کمرے میں بلّے اور میکانو نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ بلّے سے گلے لگ کر بولا۔ ''ایک عرصے کے بعد میری یہ مراد پوری ہو رہی ہے۔ میں مراد علی منگی کو اپنے سینے سے لگا رہا ہوں۔''

بلّے نے کہا۔ ''یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ تمہاری گرم جوشی کہہ رہی ہے کہ مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہو اور ہمیشہ میری قدر کرتے رہو گے۔''

انہوں نے الگ ہو کر ایک دوسرے کے ہاتھ کو مضبوطی سے جکڑ کر مصافحہ کیا۔ میکانو نے کہا۔ ''آنے والا وقت بتائے گا۔ میں تمہیں ڈی ڈی ٹی تنظیم میں ایک شہزادے کی طرح رکھوں گا اور تمہاری تمام مہنگی ضروریات پوری کرتا رہوں گا۔''

وہ دونوں صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ بلّے نے کہا۔ ''سب سے پہلے یہ بتاؤ کیا تنہا ہو؟ کیا تمہارا کوئی قابلِ

اعتماد اسسٹنٹ آس پاس نہیں ہے؟''
وہ پورے یقین سے بولا۔ ''میں نے اپنے قابلِ اعتماد دستِ راست پر بھی اعتماد نہیں کیا ہے۔ تم سے وعدہ کیا تھا کہ ہماری ملاقات کا علم کسی کو نہیں ہوگا۔ یہاں میں بالکل تنہا ہوں۔ میرا خیال ہے تم نے بھی کسی کو راز دار نہیں بنایا ہے۔''
''میری ایک ہی راز دار مرینہ ہے۔ وہ مختلف بھیس میں دور ہی دور سے میری نگرانی کرتی ہے۔''
وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔ ''آہا مرینہ...! کیا بات ہے۔ جرائم کی دنیا میں تم دونوں کا بہت چرچا ہے۔''
بلے نے تصور کی آنکھوں سے بشریٰ کو دیکھا پھر کہا۔ ''وہ سرپھری ہے۔ اگر تمہاری لاعلمی میں کوئی چھپ کر نگرانی کر رہا ہوگا تو اس کی شامت آجائے گی۔''
میکا نورابرٹ نے کہا۔ ''وہاں چرچ میں تم نے خود کو بلال احمد کہا تھا اور جو عورت تمہارے ساتھ تھی کیا وہ واقعی تمہاری وائف تھی؟''
وہ بولا۔ ''نہیں۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ میں اپنی ماروی کا دیوانہ ہوں لیکن وہ گھر گرہستی والی عورت ہے۔ جرائم کی دنیا میں صرف مرینہ میرے ساتھ رہتی ہے۔''
''ہاں، یہ سب ہی جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم مرینہ کے پیچھے رہ کر اسے سیکیورٹی دیتے ہو۔ وہ تمہارے لیے لڑتی ہے۔ جس دن وہ گرفت میں آئے گی، اس دن تمہیں بھی آسانی سے گرفتار کرلیا جائے گا۔''
''یہ ہمارے دشمنوں کا خیال ہے۔ ہم مرجائیں گے لیکن گرفتاری نہیں دیں گے۔''
''تم دونوں اپنے ذاتی معاملات میں بہت محتاط ہو۔''
''تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ میں کیوں تمہارے لیے ضروری ہوں؟''
''مجھے ایک بے باک' دلیر' حاضر دماغ' ذہین پلان میکر' وفادار اور راز دار بن کر رہنے والے محافظ کی ضرورت ہے اور وہ تم......صرف تم ہو سکتے ہو۔''
''تمہارے مسائل کیا ہیں؟''
''میں اپنے بدترین اور پیچیدہ مسائل سے نمٹ لیتا ہوں لیکن سی آئی اے اور انٹرپول کے دو خطرناک افسران کے سامنے بے بس ہو گیا ہوں۔ وہ قانون کی بالادستی قائم رکھنے والے ادارے کے افسران ہیں۔ میں ان کے خلاف کچھ کر نہیں پاتا ہوں اور وہ میری مجبوریوں سے کھیل رہے ہیں۔''
بلے نے پوچھا۔ ''قصہ کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''میرے ڈائمنڈ مائن سے ایسے ہیرے نکالے جاتے ہیں' جو بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ میرے پاس ایسے قیمتی ہیروں کا ذخیرہ ہے۔ میں ہر ماہ لاکھوں ڈالرز کماتا رہتا ہوں پھر بھی ذخیرہ کم نہیں ہوتا لیکن چھ ماہ پہلے اچانک کم ہو گیا۔''
وہ صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''جینیفر میری بہت ہی حسین بیوی تھی۔ ہمارے جیسے خطرناک اور سنگدل لوگوں پر بھی حسن کا داؤ چل جاتا ہے۔ کیا بتاؤں کہ وہ اپنے جادوئی بدن سے اور دل فریب اداؤں سے کیسے سحر زدہ کردیتی تھی۔''
وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں حسن کے چٹخارے کو سمجھتا ہوں۔ آگے بولو۔''
''میں اس کے ہاتھوں سے پیتا تھا اور یہ راز اگل دیتا تھا کہ میں نے ہیروں کا ذخیرہ محل کے تہ خانے میں رکھا ہے اور اس کا چور دروازہ کن نمبروں سے کھلتا ہے۔''
بلا مسکرانے لگا۔ وہ ندامت سے بولا۔ ''تنہائی کے رنگین لمحات میں ہم صرف چند منٹوں تک عورت پر حاوی رہتے ہیں۔ ورنہ ہماری لاعلمی میں وہی ہمارے اعصاب پر اور ہمارے ذہن پر سوار رہتی ہے۔''
وہ اپنی تین انگلیاں دکھاتے ہوئے بولا۔ ''میرے تین جوان بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ میں نے کبھی انہیں راز دار نہیں بنایا۔ وہ کمبخت جینی اس تہ خانے تک پہنچ گئی۔ میں اکثر کئی دنوں کے لیے محل سے اور اپنے شہر سے دور چلا جاتا تھا۔ ایسے وقت وہ تہ خانے میں جا کر بہت ہی چمکتے ہوئے اور جگمگاتے ہوئے پتھر وہاں رکھتی تھی اور ان کے بدلے اصلی ہیرے اٹھا کر لے جاتی تھی۔''
بلے نے مسکرا کر کہا۔ ''واہ...! کیا خوب چالبازی دکھا رہی تھی۔''
وہ ناگواری سے بولا۔ ''وہ بڑی چالاکی سے فریب دے رہی تھی۔ میں دو چار بار تہ خانے میں گیا۔ پھر دور سے ان جگمگاتے پتھروں کو دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ وہ اصلی ہیروں کے ڈھیر میں نقلی نہیں لگ رہے تھے۔''
وہ شکست خوردہ سا ہو کر بولا۔ ''ایک بار وہ میرے ساتھ سوئٹزرلینڈ گئی۔ میرے ساتھ ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ میں کسی ضرورت سے باہر گیا تھا پھر واپس آیا تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے فون پر پوچھا۔ ''کہاں ہو؟'' اس کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اپنے یار کی آغوش میں ہوں۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کیوں مذاق کررہی ہو؟ بولو کہاں ہو؟ میں آرہا ہوں۔''

تب مجھے دلی صدمہ ہوا جب دوسری طرف سے ایک مرد کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''ابے کیوں کباب میں ہڈی بننے آئے گا؟ پورے دس مہینے تک میری بیوی کی جوانی سے کھیلتا رہا۔ کمبخت راز ہی نہیں اگلتا تھا۔ آخر جینی نے اگلوالیا۔''

میں چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گیا۔ چشم زدن میں جینی اور اس کے شوہر کی چالبازی سمجھ میں آگئی۔ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ ''ہم اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں ہیں۔ میں ایک گھنٹے بعد تجھ سے ملاقات کروں گا۔ تُو جرائم کی دنیا کا خطرناک کھلاڑی ہے لیکن میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا جانتا ہے کیوں؟''

پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میرا نام ہارپر ولیم ہے۔ میں انٹرنیشنل سی آئی اے کا چیف آفیسر ہوں۔ ہمیشہ بھری ہوئی بندوقوں کے سائے میں رہتا ہوں اور میرے ہاتھوں میں قانون کی دودھاری تلوار رہتی ہے۔''

''یہ سنتے ہی میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ ایک بہت ہی مضبوط قانونی ادارے کا اعلیٰ افسر تھا۔ میں خطرناک مجرموں سے ٹکراتا ہوں۔ قانون سے ٹکرانے کے لیے سوبار سوچنا پڑتا ہے۔ اس نے چیلنج کرنے کے بعد فون بند کردیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ انٹرنیشنل سی آئی اے کے افسران دنیا کے کسی بھی ملک میں جاکر قانون کے نام پر غیر قانونی کھیل کھیلتے ہیں۔ جینی بہت مضبوط شخص کی گود میں کھیلنے والی عورت ہے۔

''مجھے اچھی طرح سوچنا سمجھنا تھا کہ میں اس چیف آفیسر ہارپر ولیم کے خلاف کچھ کر بھی سکوں گا یا نہیں؟ ایک گھنٹے کے بعد ہوٹل کے میٹنگ ہال میں اس سے ملاقات ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھ کر بولا۔ ''پہلے ان کاغذات پر ایک نظر ڈالو۔''

''اس نے وہ فائل میری طرف بڑھائی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہی معلوم ہوگیا کہ وہ میرے خفیہ کاغذات کی فوٹو کاپیاں ہیں۔ جینی میرے سیف سے چرا کرلے گئی تھی۔

وہ بولا۔ ''اصل کاغذات میرے سیف میں ہیں۔ یہ دستاویزات جس دن عدالت میں پہنچیں گی، اسی دن تمہیں گیس چیمبر میں سزائے موت کا حکم سنادیا جائے گا۔''

بے شک میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''تمہاری بے انتہا دولت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ تم ان ہیروں پر سانپ بن کر بیٹھے ہو۔ سیکیورٹی کے ایسے سخت انتظامات ہیں کہ ایک چیونٹی بھی اس تہ خانے میں نہیں پہنچ سکے گی لیکن میری چھمک چھلو جینی پہنچ گئی۔''

وہ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرے اندازے کے مطابق وہ بیس کروڑ کے ہیرے وہاں سے لے آئی ہے پھر بھی اس کا بیان ہے کہ تمہارا خزانہ کم نہیں ہوا ہے۔''

وہ بول رہا تھا اور میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ ایسے وقت ایک شخص ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ہارپر نے کہا۔ ''یہ میرا جگری یار انٹرپول کا زونل آفیسر گروور فرانسس ہے۔''

گروور نے کہا۔ ''ویل میکانو! تمہارے ایک بیٹے والٹر میکانو نے ایک یہودی پیشوا کو قتل کیا۔ اس کی بیٹی سے منہ کالا کیا۔ پھر یہاں سے فرار ہوگیا کیونکہ اس کے خلاف ٹھوس ثبوت مل گئے تھے۔ تم اپنی دولت سے اور ذرائع سے اسے بچا نہیں سکتے تھے۔ وہ ساؤتھ کوریا میں چھپا ہوا ہے۔ میں اسی علاقے کا زونل آفیسر ہوں۔ تمہارا بیٹا میری حراست میں ہے۔ میں تم سے پوچھنے آیا ہوں' کیا اسے عدالت میں پہنچادوں؟''

میں نے بے بسی سے کہا۔ ''میں اس کی سلامتی کے لیے منہ مانگی رقم دوں گا۔''

وہ بولا۔ ''ہم ایک بار رقم لے کر دونوں باپ بیٹے کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔''

ہارپر نے کہا۔ ''ہیروں کی کان میں تمہارا اڑتیس پرسنٹ کا شیئر ہے۔ ہمیں دس پرسنٹ دیا کرو۔ ہم دوست بن کر رہا کریں گے۔ دشمنی نہیں کریں گے۔''

''جینی' ہارپر اور گروور یہ تینوں ایسے دشمن ہیں کہ جب تک زندہ رہیں گے مجھ سے دس پرسنٹ حاصل کرتے رہیں گے اور میں بُری طرح شکنجے میں آگیا ہوں۔ کروڑوں ڈالرز کے ہیرے ان کے حوالے کرتا رہوں گا۔''

بلّے نے کہا۔ ''تعجب ہے' کیا تمہارے شوٹرز انہیں ہلاک نہیں کرسکتے؟''

''انٹرپول اور سی آئی اے کے وہ دونوں افسران اپنے دشمنوں سے لڑنا اور اپنی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔ وہ اب تک میرے بارہ شوٹرز کو ہلاک کرچکے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں انہیں ہلاک کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ ثابت نہیں کرسکتے کہ وہ میرے ہی شوٹرز تھے جو مارے گئے۔''

میکانو نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ''انہوں نے کہہ دیا ہے کہ میری درپردہ دشمنی کو سمجھ رہے ہیں۔ اگر اب کوئی شوٹر

ان کی طرف آئے گا تو وہ اپنا مطالبہ بڑھا دیں گے۔ دس کی جگہ بارہ پرسنٹ لیتے رہیں گے۔"

وہ بلّے کی طرف جھک کر بولا۔ "اب کوئی شوٹر جائے گا اور ناکام رہے گا تو میں بارہ پرسنٹ کا نقصان اٹھاؤں گا۔ ایک تم ہی ہو' جو ان کے مقابلے میں ناکام نہیں رہو گے۔"

بلّے نے کہا۔ "ان کی ہلاکت کے بعد تمہارے کاغذات عدالت میں کوئی پہنچائے گا تو پھر کیا ہوگا؟"

وہ تمام کاغذات ہارپر کے سیف میں ہیں۔ میرے دو محافظ اس کے ملازم بنے ہوئے ہیں۔ میری ایک جاسوس عورت اس کے گھر میں ملازمہ ہے۔ وہ جلد ہی کسی طرح وہ کاغذات وہاں سے نکال لائیں گے۔ اگر یہ کام تم بھی کر سکو تو میں اس کی پیمنٹ الگ سے تمہیں دس لاکھ پاؤنڈز ادا کروں گا۔"

"ہارپر کہاں رہتا ہے؟"

"وہیں تمہارے قریب ہی اسکاٹ لینڈ میں ہے۔ انٹرپول کا زونل آفیسر گرودر چھٹیوں پر آیا ہوا ہے۔ وہ ہارپر کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اگلے ماہ کی دس تاریخ کو وہ اپنا شیئر لینے کے لیے میرے پاس کاٹو ٹاسٹی آئیں گے۔"

بلّا سوچنے لگا۔ پچیس دنوں کے بعد دس تاریخ آنے والی تھی اور مجھے تین دنوں میں پاکستان جانا ہے۔'

میکانو نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

اس نے کہا۔ "دس تاریخ بہت دور ہے۔ اس سے پہلے تم جینی، ہارپر اور گرودر کی معروفیات سے آگاہ کرتے رہو گے تو میں ان میں سے ایک آدھ کو کہیں دبوچ لوں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "میں ہر روز ان کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہوں گا اور وہ معلومات تمہیں پہنچاتا رہوں گا۔"

ہوٹل کے وزیٹنگ ہال میں بشریٰ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں لفٹ اور زینے کی طرف تھیں۔ یہ توجہ سے دیکھ رہی تھی کہ کون پانچویں فلور تک جا رہا ہے اور آ رہا ہے؟

اس نے بوگاٹا کو دو بار اوپر جاتے اور نیچے آتے دیکھا تھا۔ وہ نیگرو یوں آنے جانے کے باعث اسے کھٹکنے لگا۔ وہ لفٹ سے گراؤنڈ فلور میں آنے کے بعد بالکونی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ بڑی توجہ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بوگاٹا بالکونی کی ایک دیوار کے پیچھے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس دیوار کے پاس گئی پھر رک گئی۔ دیوار کے پیچھے اس کے لباس کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ بشریٰ ذرا قریب ہو کر دیوار سے لگ کر سننے لگی۔ وہ بول رہا تھا۔ "میں بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ میکانو اس اجنبی کے ساتھ ابھی تک کمرے میں ہے۔ یقیناً اس کے ساتھ کوئی لمبی ڈیلنگ ہو رہی ہوگی۔"

وہ ذرا چپ ہو کر دوسری طرف کی باتیں سننے کے بعد بولا۔ "جب وہ اجنبی کمرے سے باہر آئے گا۔ آپ کے آدمی اسے ٹریپ کریں گے تب ہی اس کی اصلیت معلوم ہوگی کہ وہ کون ہے۔ ویسے وہ بہت اہم شخص ہوگا۔ تب ہی میکانو اس سے ملنے افریقا سے یہاں چھپ کر آیا ہے۔"

بشریٰ سن رہی تھی اور اس کا ذہن چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ بلا دشمنوں کی نظروں میں آ گیا ہے۔ ابھی وہ ہوٹل سے باہر جانے میں ذرا بھی دیر کرے گا تو مشکل میں پڑ جائے گا۔

وہ بالکونی سے دور ہو کر وزیٹرز لابی میں آئی۔ وہاں سے اس نے بلّے کو کال کی۔ اس نے میکانو سے باتیں کرنے کے دوران میں ننھی سی اسکرین پر اس کے نمبر پڑھے پھر اسے کان سے لگا کر بولا۔ "ہاں کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔ "خطرہ ہے۔ یہاں بالکونی میں ایک نیگرو ہے۔ یہ جانتا ہے کہ میکانو ایک اجنبی سے کمرے میں باتیں کر رہا ہے۔ یہ نیگرو فون پر کسی سے بول رہا تھا۔ وہ دشمن معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تم کون ہو؟ کمرے سے باہر آؤ گے تو تمہیں گھیر لیا جائے گا۔"

بلّے نے کہا۔ "میں تھوڑی دیر بعد تمہیں کال کروں گا۔ اس نیگرو پر نظر رکھو۔ اسے کہیں گم نہ ہونے دو۔"

وہ فون بند کر کے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مسٹر میکانو! سوری ٹو سے... تم رازداری سے نہیں آئے ہو۔ یہاں ایک نیگرو ہمارے خلاف مخبری کر رہا ہے۔"

بلّے نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر کوریڈور میں دیکھا۔ میکانو نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں حیران ہوں۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بڑی رازداری سے آیا ہوں۔ کیا تم جا رہے ہو؟"

"ہاں، ابھی تم دیکھو گے کہ میری موت بن کر آنے والوں کے لیے میں کس طرح موت بنتا ہوں۔"

وہ کوریڈور میں آ کر دوڑتا ہوا ایمرجنسی زینے کی طرف گیا۔ پھر چھلانگیں لگاتا ہوا' زینے سے اترتا ہوا ہوٹل کے پچھلے حصے سے باہر آ گیا۔ بشریٰ نے وقت سے پہلے ہی اسے محتاط کر دیا تھا۔ اسے گھیرنے والے ابھی نہیں آئے تھے۔ کسی وقت بھی وہاں پہنچنے والے تھے۔ اس سے پہلے ہی بشریٰ نے اسے ہوشیار کر دیا تھا۔

میکا نو رابرٹ اپنے اس نیگرو دستِ راست بوگا ٹا پر اندھا اعتماد کرتا تھا اور یہ اندھا پن اسے ڈبونے والا تھا۔ وہ حقیقتاً چینی اور انٹرنیشنل سی آئی اے کے افسر ہارپر ولیم کے لیے کام کر رہا تھا۔ درپردہ ان کا نمک خوار تھا۔ اس وقت بالکونی میں ہارپر ہی سے باتیں کر رہا تھا اور اب وہ سی آئی اے کا افسر اپنے شوٹرز کے ساتھ تیزی سے ہوٹل کی طرف چلا آرہا تھا۔

بوگا ٹا بالکونی سے چلتا ہوا ایک سمت جانے لگا، بشریٰ اس کے پیچھے ہوگئی۔ بلّے نے تاکید کی تھی کہ اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی ٹوائلٹ کے اندر آگئی۔ بوگا ٹا نے پلٹ کر ایک عورت کو حیرانی سے دیکھا پھر کہا۔ ''یہ لیڈیز نہیں جینٹس ٹوائلٹ ہے۔''

وہ بولی۔ ''لیڈیز ٹوائلٹ ہو یا جینٹس، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ موت کہیں بھی آجاتی ہے۔''

یہ سنتے ہی بوگا ٹا نے خطرے کو بھانپ لیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ اسے نشانے پر رکھ کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے...؟

بشریٰ پہلے سے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس کے لباس کے اندر سائلنسر لگے ہوئے ریوالور نے ایک ساعت کی دیر نہیں کی۔ ایک گولی نے چپ چاپ آ کر بوگا ٹا کے ہاتھ سے ریوالور کو گرا دیا۔

وہ زخمی ہاتھ کو تھام کر پیچھے ہٹ کر کراہتے ہوئے بولا۔ ''کون ہو تم؟''

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ''وقت برباد نہ کرو فوراً بتاؤ کہ...''

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ رنگ ٹون چیخنے لگی تھی۔ وہ فون بوگا ٹا کی جیب میں تھا۔ بشریٰ نے کہا۔ ''فون اٹینڈ کرو۔ خبردار! یہ نہ کہنا کہ گن پوائنٹ پر ہو۔''

اس کا ایک ہاتھ زخمی تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے فون کو نکالا۔ بشریٰ نے فون کو چھین کر اس کے والیوم کو فل کیا پھر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولا۔ ''یس مسٹر ہارپر! اس سے پہلے کہ تم کچھ بولو...''

اس نے بشریٰ کو غافل سمجھ کر اچانک اسے دھکا دیا۔ وہ ایک عورت کو گرا کر اس سے گن چھین سکتا تھا لیکن گولی چل گئی اس کے دیدے پھیل گئے۔ وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ بشریٰ فوراً ٹوائلٹ سے باہر آگئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی شور اٹھا کہ ٹوائلٹ میں ایک نیگرو کی لاش پڑی ہے۔ فوراً ہی پولیس سے رابطہ کیا گیا۔ ہارپر بھی اپنے شوٹرز کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ سن سٹی میں ٹریننگ کے دوران بشریٰ کو یہ بتایا گیا تھا کہ ایسے وقت سب سے پہلے اپنے ہتھیار کو چھپانا چاہیے۔ چھپانے کی جگہ نہ ہو تو اسے کہیں پھینک کر خالی ہاتھ ہو جانا چاہیے۔ وزیٹرز لابی میں پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک گملے کے پیچھے اپنی گن چھپا دی۔

ہوٹل کی سیکیورٹی نے باہر جانے کے دروازے بند کر دیے تھے۔ اندر رہنے والوں کو معذرت کے ساتھ چیک کیا جا رہا تھا۔ ایسے وقت بلّے نے فون پر پوچھا۔ ''تو کہاں ہے؟ میں ہوٹل کے باہر انتظار کر رہا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''میں نہیں آسکتی۔ دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ یہاں سب ہی کی تلاشی لی جارہی ہے۔''

''کیوں تلاشی لی جارہی ہے؟''

وہ بولی۔ ''میں نے اس دشمن نیگرو کو گولی ماردی ہے۔''

''کیا...؟'' وہ چیختے ہوئے اچھل پڑا۔ پریشان ہو کر بولا۔ ''اری او پاگل کی بچی! اسے گولی کیوں ماری...؟ تیرے پاس اسلحہ ہے۔ پکڑی جائے گی۔''

''کیوں چیخ رہا ہے؟ میں نے اسلحہ چھپا دیا ہے۔''

''اسے مارنا کیا ضروری تھا؟''

''مجھے بھی عقل ہے۔ میں گولی نہیں چلانا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے دھکا مارا تو خود ہی چل گئی۔ وہ حرام موت مرنا چاہتا تھا، مر گیا۔ میں کیا کروں؟''

وہ ہوٹل کے باہر اپنی کار میں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ پولیس کے مسلح سپاہی بھی آگئے تھے۔ کسی کو ہوٹل سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جارہی تھی۔ پریشانی یہ تھی کہ اس کی بلّی بھی وہاں پھنسی ہوئی تھی۔

ایک پولیس افسر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ ہوٹل میں کیوں آئی ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میرے بوائے فرینڈ نے مجھے لنچ کے لیے انوائٹ کیا تھا۔ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔''

وہ افسر دوسرے وزیٹر کے پاس جا کر اس کی تلاشی لینے لگا۔ اس سے سوالات کرنے لگا۔ بشریٰ نے فون پر کہا۔ ''بلّے! میں نے پولیس افسر سے کہا ہے کہ یہاں لنچ کے لیے اپنے بوائے فرینڈ کا انتظار کر رہی ہوں۔ تُو آجا۔''

بلّے نے سوچا جو نیگرو مجھے پہچانتا تھا اور میکانو کے ساتھ دیکھ چکا تھا، وہ مر چکا ہے۔ اب مجھ پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔ اس نے بشریٰ سے کہا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

اس نے میکانو سے فون پر کہا۔ ''میں ہوٹل میں واپس آرہا ہوں۔ تم میرے قریب نہیں آؤ گے۔ اجنبی بن کر

رہو گے۔''

میکانو نے کہا۔ ''مراد... ! یہاں جو نیگرو مارا گیا ہے، وہ میرا بہت ہی قابلِ اعتماد دستِ راست تھا۔ میں حیران ہوں کہ وہ افریقا سے اچانک یہاں لندن کیوں آیا تھا؟''

بلّے نے کہا۔ ''جس پر تم اندھا اعتماد کررہے تھے، وہ ہمارے خلاف مخبری کررہا تھا۔ مجھے گھیرنے کے لیے دشمنوں کو کال کررہا تھا۔ جاؤ اور حقیقت معلوم کرو۔''

''تعجب ہے۔ میرا یہ دستِ راست بہت ہی وفادار تھا۔ مجھے تمہارے منہ سے سن کر بھی یقین نہیں آرہا ہے۔''

''وہ وفادار تم سے چھپ کر تمہارے پیچھے اس ہوٹل میں کیوں آیا تھا؟ میں تم سے کہہ چکا تھا کہ جو بھی ہماری خفیہ ملاقات کا بھید معلوم کرنے آئے گا، وہ مارا جائے گا۔ تم اپنے وفادار سے دھوکا کھاؤ۔ مرینہ دھوکا کھانے والی نہیں ہے۔ اسی نے تمہارے نام نہاد وفادار کو جہنم میں پہنچایا ہے۔''

میکانو پریشان ہوکر اس کی باتیں سن رہا تھا۔ بلّے نے کہا۔ ''آج ہماری دوستی کا پہلا دن ہے۔ آج میں نے ایک بہروپیے غدار سے تمہیں نجات دلائی ہے۔''

وہ فون بند کرکے کار سے باہر آیا۔ اب ہوٹل میں جانے والوں کو روکا نہیں جارہا تھا۔ وہ اندر آیا تو بشریٰ تیزی سے چلتی ہوئی آکر اس سے لپٹ گئی۔ پولیس افسر نے یہی سمجھا کہ اس کا بوائے فرینڈ لنچ کے لیے آگیا ہے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی دھڑکنوں سے لگے ہوئے تھے۔ بلّے نے اس کے کان میں کہا۔ ''بشریٰ... ! اُدھر دیکھو۔ میکانو کے سامنے جو شخص کھڑا ہوا ہے' وہی ہار پر وہلیم ہے۔ اسے پہچان لو۔''

بشریٰ ادھر دیکھنے لگی۔ اس وقت ہار پر کہہ رہا تھا۔ ''مسٹر میکانو! تم بڑی رازداری سے یہاں آئے تھے۔ وہ شخص کہاں ہے' جس سے خفیہ ڈیلنگ کررہے تھے؟''

میکانو نے کہا۔ ''اوّل تو کسی سے خفیہ ڈیلنگ نہیں ہورہی تھی۔ پھر یہ کہ میرے ذاتی معاملات میں تمہیں بولنا نہیں چاہیے۔''

''تم جس شخص سے باتیں کررہے تھے' وہ ضرور کوئی ٹارگٹ کلر تھا۔ تم اسے میرے خلاف استعمال کررہے ہو۔ تمہیں معلوم ہوگیا تھا کہ بوگاٹا تمہارا نہیں میرا وفادار تھا۔ ابھی تمہارے اس ٹارگٹ کلر نے بوگاٹا کو گولی ماری ہے۔''

''میں نے کسی ٹارگٹ کلر سے کوئی ڈیلنگ نہیں کی ہے۔ تم خوامخواہ شبہ کررہے ہو۔''

''ہم نے وارننگ دی تھی کہ ہمارے خلاف شوٹرز کی خدمات حاصل کروگے تو ہم اپنا مطالبہ بڑھا دیں گے۔ آئندہ ہم بارہ پرسنٹ لیا کریں گے۔ یہی تمہاری سزا ہے۔''

میکانو رابرٹ نے پریشان ہوکر دور کھڑے ہوئے مراد (بلّے) کو دیکھا پھر بڑے اعتماد سے سوچا۔ 'یہی مراد مجھے ہار پر سے نجات دلائے گا۔ اس کی عورت مرینہ تو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے۔ میری آستین میں چھپے ہوئے سانپ کو مارنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کی۔'

اس نے بشریٰ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بلّے کے ساتھ لنچ کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف جارہی تھی۔

☆☆☆

دوپہر کے دو بجے جیکسن ائرلائن کی فلائٹ سے مرینہ کو جانا تھا۔ وہ مراد کو ڈھونڈنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ ہوتا تو دونوں میاں بیوی بن کر شملہ کے ایک کاٹیج میں رہتے۔ کوئی ان پر کسی طرح کا شبہ نہ کرتا۔ اب وہ ایک مرد کے بغیر تنہا جاتی تو انٹیلی جنس والے طرح طرح کے سوالات کرتے کہ وہ کون ہے؟ کیا کرتی ہے؟ تنہا پہاڑی علاقے میں کیوں آئی ہے؟

ماسٹر کے کئی شوٹرز ان کے ساتھ جارہے تھے۔ اس نے اپنے ساتھ ایک پتی دیو کا لیبل لگانے کے لیے ایک دولت مند کو اپنا پتی بنالیا تھا۔ وہ دولت مند جرائم کے حوالے سے ماسٹر کا محتاج... اور احسان مند بھی تھا۔ اس کے حکم سے مرینہ کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے شملہ جارہا تھا۔

مرینہ کا موجودہ نام رنجنا تھا اور اس کا موجودہ بنا پتی شوہر دیوراج ایک فلم پروڈیوس کرنے سے پہلے شملہ میں لوکیشن مارکس کرنے آیا تھا۔ اس سلسلے میں رنجنا اور دیوراج کے پاس ٹھوس قانونی کاغذات موجود تھے۔

مراد ٹرین میں چمپت راؤ کے ساتھ تھا۔ اوپری برتھ پر بیٹھا ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں مسافر بھرے ہوئے تھے۔ بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے کھڑے ہوئے تھے۔ چمپت راؤ نے سیٹیں ریزرو کرائی تھیں۔ وہ آرام سے سفر کررہے تھے۔

وہ نماز سے فارغ ہوکر برتھ سے نیچے آیا تو اس کی سیٹ پر ایک جوان عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی گود میں بچہ تھا۔ اس نے بچے کو ایک چھوٹی سی گدڑی میں لپیٹ کر سینے سے لگا رکھا تھا۔ چمپت راؤ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مراد سے کہا۔ ''تم یہاں بیٹھو۔''

مراد نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''نہیں تم بیٹھو میں کھڑا رہوں گا۔ جب تھک جاؤں گا تو تمہاری سیٹ پر

بیٹھوں گا۔“

اس عورت نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”شا چاہتی ہوں۔ آپ میرے لیے کشت اٹھا رہے ہیں۔“

وہ اٹھ رہی تھی لیکن ٹرین کی تیز رفتاری کے باعث اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ پھر اسی سیٹ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ مراد نے کہا۔ ”تم میری چنتا نہ کرو۔ بچے کے ساتھ آرام سے بیٹھو۔“

اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے سر کو جھکا لیا۔ وہاں آس پاس کی سیٹوں پر دو عورتیں اپنے مردوں اور بچوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک خاتون نے اس سے پوچھا۔ ”تم اکیلی ہو؟“

بچے کی ماں نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ اس کمپارٹمنٹ میں اور بھی عورتیں تھیں۔ وہ بڑے تجسس سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ایک عورت نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس کا باپ کہاں ہے؟“

وہ بڑے سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”نہیں ہے... مر گیا۔“

اس کے لہجے سے پتا چل رہا تھا کہ اسے مرنے والے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ تاہم اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ تھوڑی دیر تک سب چپ رہیں لیکن عورتوں سے چپ نہیں رہا جاتا۔ ایک خاتون نے پوچھا۔ ”میکے جا رہی ہو؟“

اس نے اوپر سے نیچے سر ہلایا۔ وہ باتیں کرنے سے کترا رہی تھی۔ مراد کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ ٹرین تقریباً آدھے گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد کسی اسٹیشن پر رکنے لگی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مراد سے بولی۔ ”کیا آپ میرے بچے کو تھوڑی دیر کے لیے گود میں لے کر یہاں بیٹھیں گے؟ میں ابھی ٹوائلٹ سے آجاؤں گی۔“

وہ بچے کو بازوؤں میں لے کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ ٹوائلٹ کی طرف جاتے ہوئے مسافروں کی بھیڑ میں گم ہوگئی۔ مراد کو ان لمحات میں ماروی دکھائی دی۔ اس نے بھی اس کے بیٹے شہزاد کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ مراد نے بے اختیار اس بچے کو سینے سے لگا لیا۔

بچہ نیند میں کسمسانے لگا۔ وہ چیپت راؤ سے بولا۔ ”میں نے پہلے کبھی کسی بچے کو گود میں نہیں لیا۔ مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ عورتیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہی ہیں۔“

چیپت راؤ مسکرانے لگا۔ دس منٹ کے بعد ٹرین چل پڑی۔ بچے کو شاید محسوس ہوگیا تھا کہ وہ ماں کی گود میں نہیں

ہے۔ وہ ذرا کسمسانے کے بعد رونے لگا۔ مراد نے پریشان ہوکر کہا۔ ''کہاں رہ گئی ہے اس کی ماں؟''

چمپت راؤ نے کہا۔ ''میں جاکر ٹوائلٹ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں۔ وہ جلدی باہر آئے گی۔''

وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ بچہ رو رہا تھا۔ مراد اسے بازوؤں کے جھولے میں جھلاتے ہوئے اسے بہلانے اور چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسے ہی وقت اس نے کچھ محسوس کیا۔ بچے کی گدڑی میں کچھ سخت چیزیں محسوس ہو رہی تھیں۔

اس نے ایک ہاتھ گدڑی کے اندر ڈال کر ٹٹولا تو وہ چیزیں اس کے ہاتھ میں آگئیں۔ اس نے بڑی حیرانی سے دیکھے بغیر سمجھ لیا کہ ایک ماں نے اپنے بچے کی گدڑی میں موت کا سامان چھپا رکھا تھا۔ وہ بلٹس بچے کو چبھ رہے تھے۔ اسی لیے وہ رو رہا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ بچے کی گدڑی میں لعل نہیں موت چھپی ہوئی ہے۔ وہاں بیٹھی ہوئی عورتوں نے منہ پھیر لیے تھے۔ وہ پرائے بچے کو گود میں لے کر اسے چپ کرانا نہیں چاہتی تھیں۔ مراد نے بڑی رازداری سے ان بلٹس کو وہاں سے نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ بچہ یکلخت چپ ہوگیا تھا۔ اسے آرام آگیا تھا۔

چمپت راؤ بھیڑ کو چیرتا ہوا واپس آیا، وہ پریشان تھا۔ اس نے کہا۔ ''وہ ٹوائلٹ میں نہیں ہے۔ میں نے اس کمپارٹمنٹ کے آخری سرے تک جاکر دیکھا ہے۔ وہ نظر نہیں آرہی ہے۔''

مراد نے بچے کو دیکھا اور تعجب سے کہا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ وہ کہاں جائے گی؟''

''میرا خیال ہے، وہ پچھلے اسٹیشن پر اتر گئی ہے۔ اپنے بچے کو ہمارے متھے مار گئی ہے۔''

یہ بات تمام مسافر سن رہے تھے۔ تمام خواتین کی دلچسپی بڑھ گئی۔ ایک ماں اپنے بچے کو چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ سب ہی طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ ایک تو گاڑی کا شور تھا پھر یہ کہ لوگ اتنی اونچی آوازوں میں بول رہے تھے کہ کمپارٹمنٹ کو مچھلی بازار بنا دیا تھا۔

مراد چمپت راؤ کی طرف جھک کر بول رہا تھا۔ ''کیا یقین کرو گے؟ اس بچے کی ماں کے پاس اسلحہ ہے۔ اس نے اس گدڑی میں بلٹس چھپا کر رکھے تھے۔''

چمپت راؤ نے حیرانی سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، اس نے اپنے لباس میں چھوٹے سائز کی ہینڈ گن چھپا رکھی ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''اور وہ کسی ایسے پرابلم میں ہے کہ بچے کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ یہاں واپس نہیں آئے گی۔''

''نہیں مراد، وہ ماں ہے۔ بچے کو نہیں چھوڑے گی۔ واپس آئے گی۔ شاید اس کے دشمن اسی ٹرین میں ہیں۔ وہ اسی ٹرین میں ان سے نمٹنے کہیں گئی ہے۔''

ایسے وقت بچہ رونے لگا۔ کئی عورتیں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس بچے کو دیکھنے ادھر آئی تھیں۔ ایک عورت نے کہا۔ ''بچہ دودھ کے لیے رو رہا ہے۔ ماں کا خون سفید ہوگیا تھا۔ پچھلے اسٹیشن پر اتر گئی ہے اور گاڑی آگے بھاگتی جارہی ہے۔''

دوسری عورت نے مراد سے پوچھا۔ ''اے بھائی...! اس بچے کا کیا کرو گے؟''

چمپت راؤ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں کسی طرح ایک کمپارٹمنٹ سے دوسرے کمپارٹمنٹ میں جاؤں گا۔ دیکھوں گا، وہ کہاں ہے؟ پتا نہیں کیا کر رہی ہوگی؟''

مراد نے کہا۔ ''جو کرنا ہے' وہ اب تک کر چکی ہوگی۔ ہوسکتا ہے دشمنوں نے اسے مار کر پھینک دیا ہو۔''

وہ عورتوں اور مردوں کو ہٹاتا ہوا جانے لگا۔ ایک عورت نے کہا۔ ''میں تو اسے اکیلی دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ پاپ کی گٹھڑی اٹھا کر آئی ہے۔ اب دیکھو' سب کے سامنے پھینک کر چلی گئی۔''

دوسری عورت نے کہا۔ ''کتنی چالاکی سے گئی ہے' کوئی اسے پکڑ نہیں سکے گا۔''

تیسری نے کہا۔ ''کیسے پکڑے گا' ہم جتنی تیزی سے آگے جارہے ہیں، وہ اتنی ہی تیزی سے پیچھے گم ہوتی جارہی ہے۔''

مراد اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ دونوں ہاتھوں کے جھولے میں اسے جھلاتے ہوئے پچکار رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اسے کیسے چپ کرائے۔ اس نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب باتیں بنارہی ہیں، کوئی تو اس بچے کو چپ کرائے۔ آپ مائیں ہیں۔ بہنیں ہیں' مجھ سے زیادہ جانتی ہیں کہ بچے کو کس طرح بہلایا جاتا ہے۔ اسے کسی طرح چپ کراؤ۔''

ایک عورت نے کہا۔ ''ہم مائیں بہنیں ہیں' مگر پاپ کی گٹھڑی کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔''

دوسری نے کہا۔ ''چھی چھی۔ کیا جانے یہ پاپ ایک کا ہے یا دس کا۔ مجھے تو دور سے گھن آتی ہے۔''

ایک اور نے کہا۔ ''اے دیدی...! ایک کا ہو یا دس کا پاپ تو پھر پاپ ہی ہوتا ہے۔ وہ جب تک آکر دودھ نہیں پلائے گی، یہ چپ نہیں ہوگا۔''

ایک بوڑھے نے کہا۔ ''بھگوان کے لیے۔ باتیں نہ بناؤ' پن کماؤ۔ کوئی تو اس معصوم کو دودھ پلائے۔''

بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ اب تھکے ہوئے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر رو رہا تھا۔ ایسے وقت دور سے ایک عورت نے چیخ کر کہا۔ ''ہٹو دور ہٹو۔ وہ انسان کا بچہ ہے۔ تماشا نہیں ہے کہ بھیڑ لگا رہی ہو۔''

وہ بھیڑ کو چیرتی ہوئی مراد کے پاس آئی۔ پھر مراد سے بچے کو لے کر سب کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اس بچے نے پاپ کیا ہے؟ یہ تو معصوم ہے۔ اسے دودھ پلا کر پن کما سکتی ہو۔ اپنا نہ سہی' فیڈر سے پلا سکتی ہو۔''

وہ بچے کو لے کر مراد کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہ نادان بچہ ہماری تمہاری چھاتی سے لگے گا تو ماں سمجھ کر چپ ہو جائے گا۔''

اس نے بچے کو سینے سے لگا کر ساڑی کے آنچل سے ڈھانپ لیا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ بھوکا معصوم چپ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب کو چپ لگ گئی۔ وہ عورت جیسے آسمان سے اتر کر آئی تھی، ایک بے سہارا بے ماں کے بچے کو ممتا دے رہی تھی۔ کچھ عورتوں نے شرمندگی محسوس کی۔ اکثریت ایسی عورتوں کی تھی جو ناگواری سے منہ بنا کر اپنی سیٹوں کی طرف جا رہی تھیں۔

مراد نے اس خاتون کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''آپ مہان ہیں۔ دیوی کا اوتار ہیں۔ پلیز اسے کچھ دیر تک سنبھالیں۔ ہمارا سامان یہاں رکھا ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ بس تھوڑی دیر کے لیے اس کی ماں کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ شاید وہ اسی ٹرین میں کہیں ہو گی۔''

خاتون نے کہا۔ ''جب بچے کو چھوڑ دیا ہے تو ماں بھاگ گئی ہے۔ اس ٹرین میں نہیں ہو گی۔ تم ڈھونڈنے جاؤ مگر اگلے اسٹیشن پر میرے پتی دیو مجھے لینے آئیں گے۔ پھر تو میں مجبور ہو جاؤں گی۔ اسے یہاں چھوڑ جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے' میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ بھی تیزی سے بھیڑ کو چیرتا ہوا جانے لگا۔ چمپت راؤ کمپارٹمنٹ کے ایک دروازے کی طرف گیا تھا۔ وہ دوسرے دروازے کی طرف آ گیا۔ اسے کھول کر باہر دیکھنے لگا۔

ٹرین کی ایک بوگی دوسری بوگی سے اس طرح جڑی ہوئی نہیں تھی کہ وہ چلتی گاڑی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا۔ وہ دروازہ کھول کر دونوں طرف کے ہینڈل پکڑ کر تقریباً آدھا باہر نکل آیا۔ ٹرین کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز کے ساتھ تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔

اس نے دیکھا دور دوسرے دروازے پر چمپت راؤ بھی باہر لٹکا ہوا یہ دیکھ رہا تھا کہ وہاں سے دوسری بوگی میں کس طرح جا سکتا ہے، یہی مراد معلوم کرنا چاہتا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے ان کے سر کے بال اور کپڑے لہرا رہے تھے۔ ایسے ہی وقت انہوں نے فائر کی گونجتی ہوئی آواز سنی۔ دونوں نے فوراً ہی چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

فائر کی دوسری آواز کے ساتھ ہی ایک چیخ سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے میں کوئی چھت پر سے گرتا ہوا چمپت راؤ کے قریب سے گزرتا ہوا زمین پر پہنچا تھا۔ اس کی لاش نشیب میں لڑھکتی جا رہی تھی۔ کئی مسافر کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھ رہے تھے۔

اب باہر ایک وسیع و عریض دریا تھا۔ ٹرین پل پر سے گزر رہی تھی، ٹرین کا شور ایسا تھا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ ٹرین کی چھت پر واقعی قیامت آئی ہوئی تھی۔ پھر تڑاتڑ گولیاں چل رہی تھیں۔ وہ دونوں دروازے سے لٹکے ہوئے تڑپ رہے تھے۔ اوپر جانے کی ایک سیڑھی بوگی کے پیچھے ہوتی ہے۔ لیکن وہ ان کی پہنچ سے دور تھی۔ ٹرین دریا کے پل سے گزر چکی تھی۔ آؤٹر سگنل سے پتا چل رہا تھا کہ اگلا اسٹیشن آ رہا ہے۔

اسی وقت پھر ایک شخص چیخیں مارتا ہوا، چھت کی بلندی سے زمین کی پستی میں گیا۔

ٹرین کی رفتار سست ہو رہی تھی۔ ایک اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر رفتار کم ہوتے ہوتے گاڑی تھم گئی۔ وہ دونوں پلیٹ فارم پر کود کر ذرا دور ہو کر چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھت پر کوئی نہیں تھا۔

وہ ٹرین کی دو مختلف سمتوں میں دوڑتے ہوئے ہر بوگی کے آخر میں رکتے ہوئے دیکھنے لگے۔ جو اوپر تھے' وہ سیڑھیوں کے ذریعے نیچے آ سکتے تھے۔ لیکن ہر بوگی کی پچھلی سیڑھیاں خالی تھیں۔ ٹرین کے آخری دو سروں کی سمت دوڑنے تک وہ اُترنے والی اُتر کر جا چکی تھی۔

پھر وہ آخری سروں تک جا کر واپس ہر کمپارٹمنٹ کی کھڑکیوں سے جھانک کر اندر دیکھنے لگے۔ آخر اپنے ہی کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کے پاس آ کر ٹھٹک گئے۔ وہ اندر تھی۔ اپنے بچے کو سینے سے لگائے چمپت راؤ کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

وہاں مرد اور عورتیں اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔ وہ چپ تھی، کھڑکی کے باہر مراد اور چمپت راؤ کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک گھریلو عورت کا ایسا بھولپن تھا جیسے ہتھیار پکڑنا جانتی ہی نہ ہو۔ ایک ذرا شبہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی

جان کی بازی لگا کر لہو اچھالتی ہوئی واپس اپنے بچے کے پاس آئی ہے۔

پھر وہ لوگوں کی طرف منہ کر کے بولی۔ ”کیوں سوالات کر رہے ہو؟ میں اپنے بچے کو چھوڑ کر گئی تھی۔ تمہیں کیا تکلیف ہے؟ واپس بچے کے پاس آ گئی۔ اب کیا پریشانی ہے؟ جاؤ یہاں سے۔ میرا سر نہ کھاؤ۔“

وہ سب بڑبڑاتے ہوئے جانے لگے۔ جس عورت نے بچے کو دودھ پلایا تھا، وہ اپنے پتی کے ساتھ کھڑکی کے پاس آئی۔ قریب ہی بیٹھی ہوئی ایک عورت نے اس سے کہا۔ ”ہماری اس دیدی نے تمہارے بھوکے بچے کو دودھ پلایا تھا۔“

اس دودھ پلانے والی کی گود میں بھی ایک بچہ تھا۔ جنگجو ماں نے اسے دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑے پھر سر کو جھکا لیا۔ دودھ پلانے والی نے کھڑکی کے اندر ہاتھ لا کر اس کے سر پر رکھا پھر کہا۔ ”میں تمہارا پتا نہیں جانتی۔ بھگوان سے تمہارے اور بچے کی سکھ شانتی کے لیے پرارتھنا کروں گی۔“

مراد نے چمپت راؤ سے کہا۔ ”انہوں نے اس روتے بلکتے بچے کو دودھ پلایا تھا۔“

چمپت راؤ نے اس کے آگے جھک کر پاؤں چھو لیے۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”اے بھائی! یہ کیا کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”آپ ماں درگا کا اوتار ہیں۔ ماں جگدمبے آپ کا بھلا کریں گی۔“

وہ ٹرین میں بیٹھی ہوئی بچے کو سینے سے لگائے چمپت راؤ کو بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے دودھ پلانے والی کے پاؤں کو چھوا تھا۔ یہ دل کو چھونے والی بات تھی۔ مراد نے کہا۔ ”تم بھوکی ہوگی۔ ہم کچھ کھانے پینے کے لیے لاتے ہیں۔“

وہ دونوں کھانے پینے کی چیزیں خریدنے گئے۔ واپس کمپارٹمنٹ میں آئے تو ٹرین چل پڑی۔ ان کے قریب بیٹھے ہوئے کئی مسافر اس اسٹیشن پر اتر گئے تھے۔ انہیں ایک سیٹ خالی مل گئی۔ وہ اس کے دائیں بائیں آ کر بیٹھ گئے۔ چمپت راؤ نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”پہلے درگا بھاسکر کہلاتی تھی۔ اب اس کمینے بھاسکر کا نام ہٹا دیا ہے۔ اب صرف درگا ہوں۔“

انہوں نے برتھ پر جگہ بنا کر اس کے سامنے پوریاں اور بھاجی رکھی۔ مضبوط شاپر میں چائے اور ڈسپوزیبل گلاس لے کر آئے تھے۔ پانی کی بوتل بھی تھی۔ وہ پتا نہیں کن حالات سے گزر رہی تھی اور کب سے بھوکی تھی۔ جلدی جلدی لقمے چبا کر کھانے لگی۔ کبھی کبھی لقمہ حلق میں پھنستا تھا۔ چمپت راؤ اسے پانی کا گلاس دیتا تھا۔ وہ مسکراتی تھی پھر دو گھونٹ پی لیتی تھی۔

وہ بڑی لگاوٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ مراد درگا کے پیچھے بیٹھا کھا رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ چمپت راؤ اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ اس نے اچانک ہی پوچھا۔ ”وہ کتنے تھے؟“

وہ لقمہ منہ تک لاتے لاتے رک گئی پھر پوچھا۔ ”کون؟“

چمپت راؤ نے کہا۔ ”وہی جو اس ٹرین کی چھت پر تھے۔“

درگا نے ذرا چونک کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ میں کیا جانوں، اس کی چھت پر کون تھے اور کتنے تھے؟“

وہ بولا۔ ”پلیز... ہمیں اپنا سمجھو۔ ہم آگے چل کر تمہارے بہت کام آئیں گے۔ ہم جانتے ہیں، تم نے اپنے لباس میں چھوٹے سائز کی گن چھپا رکھی ہے۔“

وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ سر ہلا کر کچھ کہنے والی تھی، اس سے پہلے مراد نے پیچھے سے کہا۔ ”بچے کی گدڑی میں بلٹس رکھے ہوئے تھے۔ وہ اب میری جیب میں ہیں۔“

اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ پھر لقمہ منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ جواباً کچھ نہ بولی۔ وہ دونوں انتظار کر رہے تھے۔ اس کے حلق میں پھر لقمہ پھنس گیا۔ چمپت راؤ نے اس کی طرف گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ تو بولو......؟“

وہ ایک گھونٹ پی کر اسے گلاس دیتے ہوئے بولی۔ ”ہم سب کو اپنی مصیبتوں سے خود لڑنا پڑتا ہے۔ کوئی کسی کی مصیبت میں کام نہیں آتا۔ میں خود نہیں چاہتی کہ کسی کو اپنے دکھ میں شریک کروں۔“

چمپت راؤ نے کہا۔ ”ابھی تمہارے ساتھ جو ہو چکا ہے، اس کے بعد میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔“

”میرے ساتھ دو قدم نہیں چل سکو گے۔ کہیں سے ایک گولی آئے گی اور تمہارا رام نام ست ہو جائے گا۔“

مراد نے پیچھے سے کہا۔ ”بندوق کی گولی کیا چیز ہے۔ ہم تو ہواؤں کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ ہم پر بھروسا کرو۔ آگ اور بارود سے کھیلنا ہمارا پیشہ بن گیا ہے۔“

درگا نے مراد کو ایک ذرا اعتماد سے دیکھا۔ چمپت راؤ نے کہا۔ ”ایک بات صاف صاف کہتا ہوں، تم میرے دل میں آ کر بیٹھ گئی ہو۔ میرے لیے تم جو بھی سوچو پر یہ سن لو کہ تمہیں اپنی جنگ لڑنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی پھر بولی۔ ”کیا سچ بول رہے ہو؟ میرے چاروں طرف گولیاں چلتی

رہیں گی۔ تب بھی چھوڑ کر نہیں بھاگو گے؟''

''میں گولیاں چلانے والوں کے لیے موت بن جاؤں گا۔''

''کیسے بنو گے؟ تمہارے پاس تو ایک چھری بھی نہیں ہے۔''

اس نے بچا ہوا کھانا کھڑکی کے باہر پھینکا۔ ایک گلاس میں چائے انڈیل کر اسے پینے کو دی پھر کہا۔ ''چائے پیو۔ ابھی آ کر بتاؤں گا کہ ہم کیا ہیں؟''

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مراد سے بولا۔ ''چلو عادل! اپنا سامان لانا ہی ہوگا۔''

مراد کا موجودہ نام عادل نواز تھا۔ دہلی میں دھرم داس اسی نام سے اس کی آئی ڈی، پاسپورٹ اور دوسرے اہم کاغذات تیار کرا رہا تھا۔ وہ دونوں وہاں سے چلتے ہوئے کمپارٹمنٹ کے آخری سرے میں آئے۔ وہاں آمنے سامنے کی تمام سیٹوں پر ان کے آٹھ شوٹرز بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب دھوتی کرتے اور گاندھی کیپ میں سیدھے سادے شریف آدمی بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو بیٹھنے کی جگہ دی۔

چمپت راؤ نے پوچھا۔ ''مال آگیا؟''

ایک نے کہا۔ ''ہاں جی! دو اسٹیشن پہلے ہی آگیا تھا۔''

اس نے کہا۔ ''لاؤ نکالو ہمیں ضرورت ہے۔''

انہوں نے سیٹوں کے نیچے سے دو بڑے چرمی بیگ نکال کر ان کے آگے کر دیے۔ ایک نے اس کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''دونوں بیگ میں ایک ایک شاٹ گن ہے۔ یہ دو سو راؤنڈ تک نان اسٹاپ رہ سکتی ہے۔''

مراد اور چمپت راؤ ایک ایک بیگ کھول کر اندر جھانک کر دیکھنے لگے۔ ان کے ماتحت شوٹر نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک پستول دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ 101-phantoms ابھی انٹرنیشنل مارکیٹ میں آئی ہے، دو سو گولیاں چلانے کے بعد بھی گرم اور ناکارہ نہیں ہوتی۔ فریش رہتی ہے۔''

پھر وہ ایک ننھا سا پستول دکھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ Baby eagle ڈبل ایکشن اور سنگل ایکشن والا ہے۔ اسے کہیں بھی آسانی سے چھپا کر لے جا سکتے ہیں۔''

چمپت راؤ نے کہا۔ ''یہ درگا کے کام آئے گی۔''

اس نے ماتحتوں سے کہا۔ ''تم لوگ کالکا اسٹیشن پر ہمارے ساتھ ایک بچے والی عورت کو دیکھو گے۔ وہ انجانے دشمنوں میں گھری ہوئی ہے۔ تم سب مسافروں کو تاڑتے رہو گے۔ دشمنوں کی موومنٹس سے انہیں پہچاننے کی کوششیں کرتے رہو گے۔''

وہ وہاں سے اٹھ گئے۔ اپنے اپنے بیگ اٹھا کر درگا کے آس پاس آ کر بیٹھ گئے۔ اس نے بچے کو اوپری برتھ پر سلا دیا تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں گئے تھے؟''

چمپت راؤ نے اپنا بیگ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''اسے کھول کر دیکھو۔''

اس نے کھول کر دیکھا تو حیرت سے منہ کھل گیا۔ اس نے پہلی بار بڑے اعتماد سے چمپت راؤ کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ''ہم ہتھیاروں کے معاملے میں پرانے پاپی ہیں۔ یہ ہمارے لیے کھلونوں سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ اب بولو۔ ہم پر بھروسا کرو گی؟''

وہ سر ہلا کر بولی۔ ''مجھے ایسا لگ رہا ہے' ماں جگدمبے نے میری سہاتا کے لیے تم دونوں کو بھیجا ہے۔ میں بھروسا کروں گی۔''

''تو پھر بتاؤ' تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''میرے اور قریب ہو جاؤ۔ میں نہیں چاہتی دوسرے مسافر میری باتیں سنیں۔''

وہ دونوں کھسک کر اس کے قریب ہو گئے۔ اپنے سروں کو اس کی طرف جھکا لیا تاکہ وہ کانوں میں بول سکے۔ اس نے کہا۔ ''میں نے مجرموں کی دنیا میں پرورش پائی ہے۔ میرے پتا جی انڈر ورلڈ کے ایک باپو تھے۔''

اس نے وضاحت کی۔ ''جو ہمارے سربراہ ہوتے ہیں، ہم انہیں باپو کہتے ہیں۔ میں نے کرمنل سائیکالوجی میں ایم اے کیا ہے۔ مجھے کئی طرح کے قدیم اور جدید ہتھیار استعمال کرنے میں مہارت حاصل ہو گئی ہے۔ میں دنیا کی خطرناک تنظیموں کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔

''مہاراشٹر کے انڈر گراؤنڈ کا ایک باپو جے بھاسکر مجھ پر عاشق ہو گیا تھا۔ وہ بدمعاشوں کا بدمعاش بہت ہی ظالم اور بے رحم ہے۔ کسی کی بھی زندگی یوں چھین لیتا ہے جیسے وہی بھگوان ہے۔ وہی پیدا کرتا ہے اور وہی جب چاہتا ہے مار ڈالتا ہے۔ بڑے بڑے خطرناک مجرم اس کے آگے گھٹنے ٹیکتے ہیں اور قانون کے رکھوالے اسے مائی باپ کہہ کر ہاتھ جوڑتے ہیں۔

''پتا جی نے میری شادی اس سے کرا دی۔ وہ پچاس برس کا تھا اور میں بیس برس کی ہوں۔ اس نے بس ہوس پوری کرنے کے لیے اور ایک بیٹے کا باپ بننے کے لیے مجھ سے شادی کی تھی۔ وہ بیوی سے محبت کرنا اور پتی دیو بن کر

رہنا نہیں جانتا تھا۔ دن رات ڈرگ اسمگلنگ کے معاملات میں مصروف رہتا تھا۔

”میرا ایک بھائی ہے وکرم پانڈے۔ اس نے جے جے بھاسکر کی مدد سے پتا جی کی ہتھیا کی اور ان کی جگہ انڈر گراؤنڈ کا باپو بن گیا۔ پتا جی میرے نام کروڑوں روپے کی جائداد لکھ کر گئے ہیں۔ بھائی مجھ سے کہتا تھا کہ وہ جائداد اس کے نام لکھ دوں اور کچھ اپنے گزارے کے لیے رکھ لوں۔

جے جے بھاسکر نے میرے بھائی وکرم پانڈے سے کہا۔ ”تم میرے وفادار ہو۔ اس لیے درگا کی جائداد سے تمہیں کچھ دوں گا۔ ورنہ وہ مرے گی تو سب کچھ میرے نام ہو جائے گا۔ ان دونوں نے مجھے مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔ ایسے ہی وقت میرے پاؤں بھاری ہو گئے۔ بھاسکر ایک بیٹا حاصل کرنے کے لیے کتنی ہی عورتوں سے منہ کالا کرتا رہتا تھا۔ اب تک چھ عورتوں نے بیٹیاں پیدا کی تھیں۔ کسی نے بیٹا نہیں جنا تھا اور وہ پچاس برس کی عمر میں ایک وارث کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔

اس نے پانڈے سے کہا۔ ”اپنی بہن کو بچہ پیدا کرنے دے۔ شاید میرے نصیب سے بیٹا ہو جائے۔ پھر میں بیٹا اپنے پاس رکھ کر ماں کو بھگوان کے پاس بھیج دوں گا۔

”میں ان کی سازشوں سے واقف تھی۔ یہ سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میری زچگی ایک بہت مہنگے میٹرنٹی ہوم میں ہوئی تھی۔ میں نے زچگی سے فارغ ہوتے ہی حوصلہ کیا اور بیٹے کو لے کر اسی رات وہاں سے فرار ہو گئی۔

”میرا بھائی اور میرا پتی دونوں ہی مجھے تلاش کرنے لگے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں بچہ پیدا کرتے ہی چلنے پھرنے اور بھاگنے کے قابل ہو جاؤں گی۔

”میں ایک مندر میں جا کر چھپ گئی۔ پجاری نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور مندر کے تہ خانے کا خفیہ دروازہ کھول دیا۔ میں وہاں ایک مہینے تک محفوظ رہی۔ اچھا کھاتی پیتی اور جان بناتی رہی۔ ایک مناسب وقت کا انتظار کرتی رہی۔

”شملہ میں میرا ایک کاٹیج ہے۔ بھاسکر اور پانڈے کو میری اس جائداد کا علم نہیں ہے۔ میں نے ارادہ کیا کہ وہاں جا کر گرمیوں کے تین چار مہینے گزاروں گی۔ مندر کے باہر دشمن کے آدمی اب تک مجھے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ بچہ کبھی کبھی رونے لگتا تھا تو اس کی آواز تہ خانے سے باہر جاتی تھی۔ میں اندیشوں میں گھر جاتی تھی۔ کسی دن پکڑی جا سکتی تھی۔

”میں نے ایک بے بی ایگل پستول چھپا رکھا تھا۔ اس کا میگزین بھرا ہوا تھا۔ باقی چھ بلٹس فاضل تھے۔ میں پچھلی رات تین بجے بچے کو لے کر تہ خانے سے نکل آئی۔ ماں درگا کے آگے ڈنڈوت کیا۔ اپنے اور بچے کی رکھشا کے لیے پرارتھنا کی۔ پھر وہاں سے چھپتی چھپاتی اسی ٹرین میں آ گئی۔

یہاں ایک کمپارٹمنٹ میں بھاسکر کے آدمیوں نے مجھے دیکھ لیا۔ جب ٹرین چل پڑی تو میں نے اپنے فون پر بھاسکر کے نمبر پڑھے۔ بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ اس نے غراتے ہوئے پوچھا۔ ”ایک مہینے سے کس یار کے پاس تھی؟ اب کہاں جا رہی ہے؟ کیا نہیں جانتی کہ میں یم دُوت ہوں۔ شریر سے آتما نکالنے کے لیے کہیں بھی پہنچ جاؤں گا۔“

میں نے کہا۔ ”اور میں درگا ہوں۔ تیرا سرو ناش کر دوں گی۔“

”کیوں جوانی میں مرنا چاہتی ہے۔ چپ چاپ چلی آ۔ بیٹا میرے حوالے کر دے۔ پھر میں تیری موت نہیں بنوں گا۔ تجھے آزاد چھوڑ دوں گا۔“

”میں نے بیٹے کو نو مہینے تک اپنے لہو میں پالا ہے۔ اسے اپنا دودھ پلا رہی ہوں۔ تیرے نصیب میں بیٹا نہیں ہے۔ میں مرتے دم تک اسے تیرے حوالے نہیں کروں گی۔“

”تو پھر مر۔ اس ٹرین میں کوئی تیری ارتھی اٹھانے بھی نہیں آئے گا۔ تو وہاں سے آگے ایک اسٹیشن تک بھی نہیں جا سکے گی۔“

”اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ مجھے اپنا آخری وقت دکھائی دے رہا تھا۔ سب سے زیادہ اپنے بچے کی فکر تھی۔ میں آخری سانس تک لڑنے والی عورت ہوں۔ لیکن بچے کو گود میں لے کر گولیوں کی بوچھاڑ میں نہیں رہ سکتی تھی۔ ہماری لڑائی میں یہ معصوم بھی مارا جاتا۔

میں اس کمپارٹمنٹ سے اُتر کر پلیٹ فارم پر چلتی ہوئی دوسرے کسی کمپارٹمنٹ کی طرف جانے لگی۔ میرے پیچھے بھاسکر کے ایک آدمی نے آتے ہوئے کہا۔ ”مالکن! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ باپو کی بات مان لیں۔ ہمیں گولیاں چلانے پر مجبور نہ کریں۔ ہم نے آپ کا بھی نمک کھایا ہے۔“

میں نے تیزی سے چلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اور یہ بتاؤ' تم لوگ کتنے ہو؟“

”یہاں ہم تین ہیں مگر آگے باپو کی فوج آتی رہے گی۔ آپ کو کالکا یا شملہ تک جانے نہیں دیں گے۔ آپ اپنی جان بچائیں۔ بچے کو ہمیں دے کر کہیں بھی جا کر زندہ رہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ میں کیسی

شوٹر ہوں؟ جاؤ اپنی چتا کرو۔ بھاسکر سے بولو ایک اکیلی عورت سے مردانگی نہ دکھائے۔ بچہ اسے سپنے میں بھی نہیں ملے گا۔''

''میں اس کمپارٹمنٹ میں آگئی۔ یہاں تمہاری سیٹ خالی دیکھ کر بیٹھ گئی۔ سوچنے لگی اس ٹرین میں صرف تین دشمن ہیں۔ وہ مسافروں کی بھیڑ میں مجھے گولی نہیں مار رہے ہیں۔ موقع کی تاک میں ہیں۔ بھاسکر بیٹے کو حاصل کرنے کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ اپنے کتوں کو حکم دے گا تو وہ بھیڑ میں گولیاں چلاتے ہوئے میری ہتھیا کر کے بچے کو لے جائیں گے۔ اس سے پہلے ہی مجھے اس بھیڑ سے دور جا کر ان سے نمٹنا چاہیے اور دور جانے کے لیے میں ٹرین کی چھت پر چلی گئی۔

''مجھے یقین تھا کہ وہ بچے کو تم لوگوں کے پاس سے اٹھا کر نہیں لے جائیں گے۔ مجھے مار کر فرار ہو جائیں گے تو قانون کے رکھوالے خود بچے کو اس کے باپ کے پاس پہنچا دیں گے۔''

مراد اور چمپت راؤ توجہ سے اس کی روداد سن رہے تھے۔ وہ بتا رہی تھی کہ وہ تینوں کس طرح اس کا پیچھا کرتے ہوئے ٹرین کی چھت پر گئے تھے اور وہ کس طرح دو بوگیوں کی درمیانی سیڑھی پر کھڑی رہی، کبھی ابھر کر ان کی طرف فائر کرتی تھی۔ کبھی سیڑھی پر بیٹھ کر چھپ جاتی تھی۔

مراد اور چمپت راؤ اس کی فائٹنگ تکنیک کو چشم تصور سے دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ اس نے تیز رفتار ٹرین میں اپنی جان جوکھم میں ڈال کر کتنی دلیری سے تینوں کو جہنم میں پہنچایا ہے۔

وہ ذرا چپ رہنے کے بعد بولی۔ ''آگے اور درندے آئیں گے۔ میں جب تک بچے کو بھاسکر کے حوالے نہیں کروں، وہ مجھے جینے نہیں دے گا۔ میں شملہ کے کاٹیج میں جا کر چھپ کر رہنا چاہتی تھی۔ اب یہ دشمن وہاں تک میرا پیچھا کرتے رہیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''ہم پہلے ہی ایک جنگ لڑنے شملہ جا رہے ہیں۔ اب تمہاری جنگ بھی لڑیں گے۔ یہ بتاؤ کیا تم بھاسکر کے تمام شوٹرز کو پہچانتی ہو؟''

''نہیں۔ میں صرف مہاراشٹر کے چند ٹارگٹ کلرز کو جانتی ہوں۔ آگے مجھ سے ٹکرانے والے اجنبی ہوں گے۔ لیکن ان سب کی ایک پہچان ہے۔''

وہ اپنا ایک انگوٹھا دکھاتے ہوئے بولی۔ ''بھاسکر کی غلامی کرنے والے جتنے بھی شوٹرز ہیں، وہ اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں پیتل کا چھلا پہنتے ہیں تاکہ بھیس بدلنے کے بعد بھی اپنے ساتھیوں کو پہچان سکیں۔ پھر یہ کہ چھلا اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ جے جے بھاسکر کے غلام ہیں۔''

چمپت راؤ نے کہا۔ ''پھر تو ہم آسانی سے تمہارے دشمنوں کو پہچانتے رہیں گے۔''

وہ کالکا پہنچ گئے۔ وہ براڈ گیج ریل گاڑی کا آخری اسٹیشن ہے۔ وہاں سے شملہ تک پہاڑ کی بلندیوں پر نیرو گیج ریل گاڑی چلتی ہے۔ یہ بچوں کے کھلونے جیسی چھوٹے سائز کی ٹرین ہوتی ہے۔ ایسی دھیمی رفتار سے چلتی ہے کہ مسافر چلتی ٹرین سے اتر کر اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے پھر اس پر سوار ہو سکتے ہیں۔ جگہ جگہ پہاڑوں کو کھود کر سرنگیں بنائی گئی ہیں۔ یہ نیرو گیج ٹرین ایک سو دو سرنگوں سے گزرتی ہوئی ساڑھے چار گھنٹے میں شملہ پہنچتی ہے۔

وہ تینوں اپنا سامان اٹھا کر چھوٹی سی ٹرین میں اس طرح آئے کہ درگا اپنے بچے کو لے کر تنہا ایک کمپارٹمنٹ میں آگئی۔ بعد میں چمپت راؤ اس کے قریب آکر اس سے لاتعلق ہو کر بیٹھ گیا۔ مراد وہیں درگا کے پیچھے ایک سیٹ پر آگیا۔

ٹرین کی روانگی تک انہیں تین دشمن نظر آئے۔ ان میں سے ہر ایک کے بائیں انگوٹھے میں پیتل کے چھلے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک شوٹر درگا کے سامنے والی سیٹ پر چمپت راؤ کے برابر آکر بیٹھ گیا۔ اس وقت ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے چل پڑی تھی۔

شوٹر نے درگا کی طرف جھک کر کہا۔ ''مالکن! میں نے سمجھایا تھا کہ باپو سے نہ ٹکرائیں۔ بچے کو ان کے حوالے کر دیں۔ لیکن آپ نے وہاں ہمارے تین شوٹرز کو مار ڈالا۔ باپو نے ہمیں پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ آپ بہت خطرناک ہیں۔ اب ہم پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں۔ میں آپ کو ہتھیار نکالنے نہیں دوں گا۔''

وہ دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر دیکھو میرے دو آدمی کھڑے ہیں۔ آپ ان سے دس فٹ کی دوری پر ہیں۔ ان کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔''

مراد نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں دو دشمن نظر آئے۔ وہ درگا سے کہہ رہا تھا۔ ''آگے یہ ٹرین سرنگ کے گہرے اندھیرے سے گزرنے والی ہے۔ اس اندھیرے کے بعد تم کبھی جیون کا اجالا نہیں دیکھ سکو گی۔ کسی مسافر کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ یہاں کیا ہو چکا ہے۔''

مراد اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلتا ہوا دروازے کی طرف ٹوائلٹ کے پاس آگیا۔ وہاں کھڑکی پر جھک کر دوسرے

دروازے کے باہر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین ایک لمبے موڑ پر گھومتی ہوئی جانے لگی۔

آگے ایک سرنگ کا دہانہ دکھائی دے رہا تھا۔ مراد نے فوراً ہی ٹوائلٹ کے اندر جا کر لباس کے اندر سے ہینڈ گن نکالی۔ دوسری جیب سے سائلنسر نکال کر اسے گن سے منسلک کیا۔ ایک ہاتھ میں پنسل ٹارچ لی۔ پھر جب ٹوائلٹ سے نکلا تو ٹرین سرنگ میں داخل ہو چکی تھی۔ اندر باہر ہر سو گہری تاریکی چھا گئی تھی۔

ادھر دشمنوں کے ہاتھوں میں بھی ننھی ٹارچیں تھیں۔ انہوں نے جیسے ہی ٹارچ کو درگا کی طرف روشن کیا، اس نے دونوں کی سمت گولیاں چلا دیں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ درگا کی حفاظت کرنے والے اس تاریکی میں پیدا ہو جائیں گے۔ وہ لاعلمی میں مارے گئے۔ دونوں کی لاشیں دروازے کے پاس گریں۔ مراد نے دروازہ کھول کر انہیں باہر پھینک دیا۔

دوسری طرف چمپت راؤ اس شوٹرز کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ شوٹر نے درگا سے کہا تھا کہ جب ٹرین سرنگ سے گزرے گی تو اس کا آخری وقت آئے گا۔ پھر تاریکی میں مسافروں کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کس نے اسے قتل کیا ہے؟ کون اس کے بچے کو لے گیا ہے؟

لاعلمی میں اس کی بھی شامت آگئی۔ چمپت راؤ نے سرنگ کی تاریکی میں داخل ہوتے ہی ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کی۔ سائلنسر لگے ہوئے گن کو اس کی پسلی سے لگا کر ٹریگر کو دبا دیا۔

پھچاک کی آواز کے ساتھ وہ مردہ ہو کر آگے کی طرف جھکتا ہوا گرنے لگا۔ چمپت راؤ نے اسے سنبھال لیا۔ اسے گرفت میں لے کر کھینچتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا۔ اسی وقت مراد بھی آگیا۔ دونوں نے اسے پکڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

سرنگ کے اندر تاریکی میں ٹرین کی رننگ صرف دو منٹ کی تھی۔ انہوں نے ایک سو بیس سیکنڈ میں تین دشمنوں کا صفایا کر دیا۔ جب ٹرین سرنگ سے باہر دن کے اجالے میں آئی تو چمپت راؤ اور مراد اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ تمام مسافر یا تو خاموش بیٹھے ہوئے تھے یا پھر ایک دوسرے سے بول رہے تھے۔ اس بات سے بے خبر تھے کہ اس کمپارٹمنٹ میں کیا ہو چکا ہے؟

درگا نے اپنے فون پر جے جے بھاسکر کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے غرا کر پوچھا۔ ''تو ابھی تک زندہ ہے؟''

وہ سرد لہجے میں بولی۔ ''مجھے چتا کی سیج پر سلانے سے پہلے نہیں مروں گی۔ میں مہا کالی کا اوتار ہوں۔ تیرے تین کتوں کو براڈ گیج میں مارا اور تین کو ابھی نیرو گیج میں سلا دیا ہے۔''

وہ بڑے فخر سے بول رہی تھی۔ ''تو میرے آگے اپنے کتنے وفاداروں کی بلی چڑھائے گا۔ بے چاروں پر رحم کر۔ خود میرے سامنے آ۔ مرد کا بچہ ہے تو آخری فیصلہ کر۔ آخری مقابلہ ہوگا۔ پھر تو ہوگا یا میں رہوں گی۔''

اس نے کوئی جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔ مراد نے اپنی جگہ سے چمپت راؤ کے پاس آ کر کہا۔ ''تم درگا کے پاس رہو۔ مجھے دوسری بوگیوں میں جا کر معلوم کرنا چاہیے کہ کتنے کتے کہاں کہاں ہیں۔ وہ اِدھر آتے رہیں گے' میں ان سے نمٹتا بھی رہوں گا اور تمہیں فون پر بتاتا بھی رہوں گا۔''

وہ دروازہ کھول کر کمپارٹمنٹ سے باہر ایک پائدان پر آ گیا۔ ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ وہ بھی ٹرین سے اتر کر اس کے ساتھ دوڑتا ہوا تھوڑی دور تک گیا۔ پھر دوسری بوگی کے کمپارٹمنٹ میں چڑھ گیا۔

وہاں چڑھتے ہی جو شخص دروازے پر کھڑا نظر آیا، اس کے انگوٹھے میں پیتل کا چھلا چمک رہا تھا۔ وہ فون کو کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔ ''ماں قسم باپو! ہم نہیں جانتے' وہ تینوں کب اور کیسے مارے گئے۔ یہاں پوری ٹرین میں کسی کو خبر نہیں ہے۔''

وہ تھوڑی دیر چپ رہ کر باپو بھاسکر کی باتیں سنتا رہا پھر بولا۔ ''ہاں! ایسا ہی معلوم پڑتا ہے۔ وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس نے دو چار گن چلانے والوں کو خرید لیا ہے۔ ہم معلوم کریں گے کہ اس کے ساتھ کتنے کتے ہیں۔''

وہ آگے نہ بول سکا۔ موت اس سے لپٹ گئی۔ سائلنسر کے منہ سے نکلی ہوئی گولی بے آواز تھی۔ اس کے دیدے پھیل گئے۔ وہ فون پر بھونکنے کے قابل نہ رہا۔ مراد نے اس کا فون لے کر لاش کو آہستگی سے چھوڑ دیا۔ وہ ٹرین کے باہر پتھریلی زمین پر گر کر دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ کھڑکیوں سے جھانکنے والوں نے شور مچایا۔ ''ارے وہ دیکھو کوئی ٹرین سے گر گیا ہے۔''

کسی نے کہا۔ ''مر گیا ہے۔ میں نے خون دیکھا ہے۔''

آخری ڈبے کے گارڈ نے بھی دیکھا۔ اس نے ٹرین کو رکوایا۔ لوگ ٹرین سے اُتر کر ادھر جانے لگے۔ وہ بھی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ جے جے بھاسکر غصے سے کہہ رہا تھا۔ ''ارے کتے! چپ کیوں ہو گیا۔ بولتا کیوں نہیں؟ کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔ کیا تیری

ماں مرگئی ہے؟''

مراد نے کہا۔ ''ابھی تو درگا کے پیچھے تیری ماں مر رہی ہے۔ اس فون پر جس سے بول رہا تھا' وہ بھی نرک میں چلا گیا ہے۔ اپنا فون مجھے دے گیا ہے۔''

وہ گرجنے کے انداز میں بولا۔ ''کون ہے بے تو......؟''

''کتنی پیاری' کتے کی زبان بولتا ہے۔ آخر کب تک دور سے بھونکتا رہے گا؟ ایک عورت کو مارنے کے لیے دوسروں کو نہ بھیج' خود آجا۔ تیری آن بان شان کے مطابق تیرا کریا کرم ہوگا۔''

''جس دن میں آگیا نا، تیرا پاجامہ بھیگ جائے گا۔''

''اور جس دن میرا نام تجھے معلوم ہوگیا نا' اس دن ٹوائلٹ کا ہو کر رہ جائے گا۔ باہر نہیں نکلے گا۔ تیری شامت آگئی ہے۔ اس وقت درگا کے ساتھ آرمس اینڈ ایمونیشنز کا یہ انٹرنیشنل کھلاڑی ہے۔ تو اس کے بچے کو کبھی چھو بھی نہیں سکے گا۔''

جے جے بھاسکر ہاتھی جیسے ڈیل ڈول کا قدآور شخص تھا۔ پچاس برس کی عمر میں بھرپور جوان دکھائی دیتا تھا۔ بہت ہی خطرناک فائٹر کہلاتا تھا۔ مراد کی باتیں سن کر اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے کچھ سوچا پھر پوچھا۔ ''کیا کہا تو نے؟ تو ہتھیاروں کا انٹرنیشنل کھلاڑی ہے؟''

''ہاں، سامنے آ تجھے یقین ہو جائے گا۔''

''میں پہلے فون پر یقین کرنا چاہتا ہوں کہ تو وہی ہے، جو میں سوچ رہا ہوں۔''

''تو کیا سوچ رہا ہے؟''

''تو میری بات کا جواب دے۔ کیا تو وہی ہے جو کراچی' جے پور' دہلی' تل ابیب' لندن اور سن سٹی میں لاشیں گراتا رہا ہے؟''

مراد چونک گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پہچانا جائے۔ بھاسکر نے پوچھا۔ ''چپ کیوں ہے؟ جواب دے۔ کیا تو وہی ہے' جسے دنیا جہاں کے کرمنل 'ماروی کا دیوانہ' کہتے ہیں؟''

مراد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے فوراً ہی فون کا سوئچ آف کر کے اسے دور پھینک دیا۔

ہائے ماروی! تیرے پیار کی جادوگری کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ دیوانے کو میدانِ جنگ میں لا کر بے نقاب کرتی ہے۔

حالانکہ اس نے ماروی کا نام نہیں لیا تھا لیکن دشمن نے ایشیا سے یورپ تک اس کی تمام وارداتوں کا ذکر کرتے ہوئے اسے پہچاننے کے لیے ماروی کا حوالہ دے دیا تھا۔

وہ درگا اور چمپت راؤ کے پاس آگیا پھر بولا۔ ''گڑبڑ ہوگئی ہے۔ یہ بھید کھلنے والا ہے کہ مراد علی منگی کالکا اور شملہ کے درمیان ٹرین میں سفر کر رہا ہے۔''

چمپت راؤ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ اچانک یہ بھید کیسے کھل رہا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''درگا کا ایک دشمن دوسرے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑا فون پر بھاسکر سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے پیتل کے چھلّے سے اسے پہچان لیا۔ وہ بھاسکر سے کہہ رہا تھا کہ درگا اکیلی فائٹ نہیں کر رہی ہے۔ اس نے بھی ضرور دو چار شوٹرز کو کرائے پر حاصل کیا ہے۔''

درگا نے کہا۔ ''تم دونوں نے جیسی مہارت سے دشمنوں کو نرک میں پہنچایا ہے، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اب میں اکیلی نہیں رہی۔ جان پر کھیلنے والے مجھے مل گئے ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''میں نے.... فون پر باتیں کرنے والے سے چپک کر ایک گولی ٹھونک دی۔ اس کا فون لے کر اسے ٹرین کے باہر پھینک دیا۔ فون کو کان سے لگا کر بھاسکر کی باتیں سنیں۔ وہ اپنی اونچی حیثیت اور طاقت سے مجھے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بھی جوش میں آکر کہہ دیا کہ وہ بچے کو چھو بھی نہیں سکے گا۔ درگا کے ساتھ ہتھیاروں کا ایک انٹرنیشنل کھلاڑی ہے۔ اس کی شامت آگئی ہے اور اس کا ایک بھی آدمی یہاں سے زندہ نہیں جائے گا۔''

وہ پریشان ہو کر اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں یہ بات سن کر اسے مجھ پر کیوں شبہ ہوا۔ اس نے پوچھا۔ کیا تم وہی ہو جس نے کراچی' جے پور' دہلی' تل ابیب' لندن اور سن سٹی میں لاشیں گرائی ہیں؟ کیا تم وہی ہو جسے دنیا جہاں کے کرمنل ماروی کا دیوانہ کہتے ہیں؟ یہ کمبخت تمام دشمن مجھے ماروی کے نام سے جانتے ہیں۔

''اچانک ایسا انکشاف ہو رہا تھا کہ میں بوکھلا گیا۔ میں نے فون کا سوئچ آف کر کے اسے پھینک دیا۔ یہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے جواباً سختی سے کہنا چاہیے تھا کہ میں لاشیں گرانے والا خطرناک شوٹر اور ماروی کا دیوانہ نہیں ہوں۔ میں نے خاموش رہ کر فون بند کر کے اس کے شبے کو یقین میں بدل دیا ہے۔''

چمپت راؤ نے سر ہلا کر کہا۔ ''یہ تم سے بڑی بھول ہوئی ہے۔ یہ خبر میکی براؤن اور دوسرے دشمنوں تک پہنچے گی کہ تم انڈیا میں ہو اور اس ٹرین میں سفر کر رہے ہو۔''

''مجھے اس ٹرین میں نہیں رہنا چاہیے۔ شملہ پہنچنے کا دوسرا راستہ بتاؤ۔''

''ہم اگلے اسٹیشن پر اُتر جائیں گے۔ وہاں سے شاید ٹیکسی مل جائے۔ ورنہ لانگ روٹ کی بس ضرور ملے گی۔''

مراد نے کہا۔ ''پتا نہیں ٹرین میں ابھی اور کتنے دشمن ہیں۔ درگا ہمارے ساتھ جاتی ہوئی دکھائی دے گی تو دشمن بھی ٹرین چھوڑ کر پیچھا کریں گے اور فون پر بھاسکر کو بتائیں گے کہ درگا نے دو آدمیوں کے ساتھ ٹرین چھوڑ دی ہے۔ بائی روڈ جارہی ہے۔''

فکر اور پریشانی میں مبتلا کر دینے والے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ وہ سوچنے اور اُلجھنے لگے۔ درگا ان کے ساتھ دیکھی جاتی تو دور تک دشمنوں کو معلوم ہو جاتا کہ اس کے ساتھ دو فائٹر ہیں اور ان میں سے ایک مراد علی منگی ہے۔

وہ سوچنے لگے کیا کیا جائے؟ پھر مراد نے کہا۔ ''صرف ایک ہی راستہ ہے۔ میں یہاں سے تنہا جاؤں گا۔''

چمپت راؤ نے کہا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ تمہارے لیے یہ جگہ نئی ہے۔ انجانے راستے ہیں۔''

''تو کیا ہوا؟ ہم اکثر انجانے ملکوں میں اور انجانے شہروں میں جایا کرتے ہیں۔ یہاں میرا خیال ہے' انجانے راستوں پر انجانے دشمن نہیں ہوں گے۔''

وہ اپنا بیگ اٹھا کر بولا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ ٹوائلٹ میں آ گیا۔ اس نے پستول بے بی ایگل کو لباس میں چھپایا۔ ہینڈ گن ٹائن ون ون کو کر بیلٹ میں پھنسایا۔ جرائم کی دنیا میں ٹائن ون ون سب سے زیادہ استعمال ہو رہی ہے۔ اس کی کارکردگی بے مثال ہے۔ یہ ہمہ صفت کارکردگی دکھاتی ہے۔ لاکھوں راؤنڈ چلانے کے بعد بھی قابل استعمال رہتی ہے اور سوگز کے فاصلے سے بھی اپنے شکار کو مار گراتی ہے۔

اس نے پتلون اور جیکٹ کی جیبوں میں جتنے بلٹس آئے، اتنے ٹھونس لیے۔ پھر بیگ لے کر چمپت راؤ کے پاس آ کر بولا۔ ''میں نے ضرورت کے مطابق اسلحہ اور بلٹس رکھ لیے ہیں۔ یہ بیگ تم اپنے پاس رکھو۔ شملہ میں ملاقات ہوگی۔''

چمپت راؤ نے درگا کو مراد کی مختصر سی ہسٹری بتائی تھی۔ وہ اسے بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھ رہی تھی۔ اسٹیشن پر گاڑی رک رہی تھی۔ وہ اپنا بیگ اٹھا کر جانے لگا تو وہ بولی۔ ''بھائی! آئی لو یو۔''

وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میری کوئی بہن نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہ بھائی کبھی تم پر آنچ نہیں آنے دے گا۔ یہ عارضی جدائی ہے۔ ہم شملہ میں ملیں گے۔''

وہ ٹرین سے اُتر کر پلیٹ فارم پر آیا۔ وہ ایک ویران سا ملی اسٹیشن تھا۔ چند مسافر عورتیں اور مرد اُتر کر جارہے تھے۔ وہ بھی ان کی بھیڑ میں اسٹیشن سے باہر آ گیا۔

وہ پہاڑی علاقہ اس کے لیے انجانی جگہ تھی۔ حالات نے اسے انجانے اور پیچیدہ راستوں سے گزرنا سکھا دیا تھا۔ اس اسٹیشن کے اطراف ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ چند عورتیں اور مرد آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ٹرین جارہی تھی۔ بچے اس کے پیچھے دوڑتے جارہے تھے۔

وہاں ایک مسافر بس کھڑی ہوئی تھی۔ رکشا اور ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھیں۔ کنڈیکٹر شملہ جانے کی آوازیں لگا رہا تھا۔ وہ شانے سے بیگ لٹکائے بس کے اندر آ گیا۔ مسافر زیادہ نہیں تھے۔ غریب عورتیں اور مرد زیادہ نظر آرہے تھے۔ اسے ایک کھڑکی کے پاس جگہ مل گئی۔

بس وہاں سے چل پڑی۔ مسافروں کے درمیان گانے بجانے والوں کی ایک ٹولی تھی۔ ایک شخص کے پاس ہارمونیم اور دوسرے کے پاس ڈھولک تھی۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا' ایک جوان لڑکی اور ایک جوان عورت تھی۔ وہ اسٹریٹ سنگر تھے۔ گرمی کے موسم میں ہر سال شملہ جا کر سڑکوں پر گاتے بجاتے اور ناچتے ہوئے پیسے کماتے تھے۔

کھڑکی کے باہر خوب صورت پہاڑی مناظر میں ایسی دلکشی تھی کہ مراد سحر زدہ سا ہو گیا تھا۔ اونچے نیچے اور پیچیدہ راستوں پر بس اپنی مخصوص رفتار سے جارہی تھی۔ اندر مسافروں کے درمیان شور برپا ہوا تو مراد نے کھڑکی سے پلٹ کر دیکھا۔ بس کا کنڈیکٹر گانے بجانے والوں سے کہہ رہا تھا۔ ''پورا کرایہ نہیں دو گے تو ابھی گاڑی سے اتار دوں گا۔ پھر پیدل یہاں سے شملہ جاؤ گے۔''

ایک عورت نے کہا۔ ''ہم سب اپنا پورا کرایہ دے رہے ہیں۔ بس یہ بوڑھے بابا کا کرایہ نہیں ہے۔ یہ تمہارے باپ سمان ہیں۔ ان کا کرایہ نہیں لو گے تو تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

''نقصان ہوگا۔ اگر ہم بوڑھوں کو باپ' بوڑھیوں کو ماں اور جوانوں کو بہن بھائی سمجھتے رہیں گے تو ہمیں بھی تمہاری طرح ناچنے گانے کے لیے سڑکوں پر آنا ہوگا۔''

وہ ڈھولک والے کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''چلو کرایہ نکالو۔ نہیں تو میں گاڑی رکواتا ہوں۔''

وہ پریشان ہو کر آپس میں بولنے لگے۔ بوڑھے بابا نے اپنے لوگوں سے کہا۔ ''میرے پاس ایک روپیا ہے۔''

ہارمونیم والے نے کہا۔ ''میرے پاس ڈھائی روپے ہیں۔ منجو تیرے پاس کیا ہے؟''

اس کے پاس بیٹھی ہوئی جوان عورت کا نام منجو تھا۔ وہ

بولی۔ "میرے پاس ہے تو بسی پر شملہ پہنچ کر روٹیاں کھانی ہیں۔ کناری! تیرے پاس کچھ ہے؟"

جوان لڑکی کا نام کناری تھا۔ وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "مجھے دیتا کون ہے کہ میرے پاس جمع پونجی ہوگی۔ مجھے تو بس نچاتے ہیں اور پیٹ بھر کے کھانے کو دیتے ہیں۔"

دوسرے شخص نے اپنی ڈھولک پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس ہے تو بسی پر نشے کے لیے جروری ہے۔ سُر میں بجانے کے لیے ذرا سُر میں رہنا پڑتا ہے۔"

ہارمونیم والے نے کہا۔ "پڑیاں نہ ہو تو سُر نہیں نکلتے۔"

کنڈیکٹر ان سب کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈھولک والے کی طرف جھک کر پوچھا۔ "دم مارو دم ہے؟"

ڈھولکی نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ کنڈیکٹر نے پوچھا۔ "دو بھری ہوئی سگریٹ ہیں؟"

ڈھولکی نے اپنی ڈھولک پر ایک تھاپ مارتے ہوئے کہا۔ "ہیں۔ کرایہ چھوڑ دو گے تو دوں گا۔"

"ایک نہیں دو سگریٹ۔"

"چلو دیا۔"

کنڈیکٹر نے دور ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "گرو جی! دو بھری ہوئی سگریٹ ہیں۔ کرایہ نہیں ہے۔ بے چارہ بوڑھا بابا ہے۔ کیا بولتے ہو؟"

ڈرائیور نے کہا۔ "دم لے لے۔ بابے کو جانے دے۔ دینے لینے سے ہی ایک دوسرے کا بھلا ہوتا ہے۔"

اس بات پر چند مسافر ہنسنے لگے۔ اسی وقت ڈرائیور نے زوردار بریک کے ساتھ گاڑی روک دی۔ سامنے سڑک پر تین بدمعاش رائفلیں تانے کھڑے تھے۔

مراد کے مقدر میں یہی لکھا تھا۔ بندوق والوں سے اور جرائم پیشہ لوگوں سے سامنا ہوتا رہتا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے بیگ میں ہاتھ ڈال کر اسلحہ اور بلٹس کے پیکٹس کو سیٹ کے نیچے چھپا دیا پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے گولیاں چلنے سے پہلے ہی بس کو روک کر اپنی اور لاکھوں روپے کی بس کی سلامتی چاہی تھی۔ بس کے رُکتے ہی وہ تینوں اندر آگئے۔ ان میں سے دو آگے پیچھے کے حصوں میں گئے۔ تیسرا درمیانی حصے میں رہ کر بولا۔ "جس کے پاس جو مال ہے نکال کر باہر رکھو۔ جلدی کرو۔"

وہ تینوں ایک ایک مسافر کو اس کی سیٹ سے اٹھا کر تلاشی لے رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "آج ہمارے بھیرو دادا کا جنم دن ہے۔ ہم کو جیادہ سے جیادہ مال لے کے جانا ہے۔"

ایک نے مراد کے سینے پر رائفل کی نال رکھ دی۔ پھر کہا۔ "تُو پڑھا لکھا بابو ہے۔ تیرے پاس تو بڑا مال ہوگا؟"

دوسری طرف سے ایک ڈاکو نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "یہاں تو سب ہی کنگال ہیں۔"

مراد نے بڑی خاموشی اور شرافت سے اپنا بیگ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے بیگ لے کر اس کی زپ کھول کر مراد کا ایک لباس نکال کر سیٹ پر پھینکا۔ دوسری بار ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو نوٹوں کی گڈیاں نکل آئیں۔ اس کے دیدے حیرت سے پھیل گئے۔ پھر وہ خوشی سے نعرہ لگاتے ہوئے نوٹوں والا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے چلایا۔ "وہ مارا۔"

اس کے دونوں ساتھی ڈھیر سارے نوٹ دیکھتے ہی حیرت سے اُچھل پڑے پھر دوڑتے ہوئے مراد کے پاس آگئے۔ بیگ سے نوٹوں کی تین گڈیاں نکلی تھیں۔ ایک نے خوشی سے ناچتے ہوئے کہا۔ "آج تو مزہ آگیا۔ بھیرو دادا ہمیں انعام دے گا۔ آج خوب موج مستی ہوگی۔"

دوسرے نے پوچھا۔ "اے... ! یہ کتنے ہوں گے؟"

مراد نے کہا۔ "میں گنتی نہیں کرتا۔ بے حساب کماتا ہوں۔ ویسے یہ ایک لاکھ ہوں گے۔"

تینوں نے بیک وقت خوشی سے نعرہ لگایا۔ "جے بھوانی... ہمارے باپ نے بھی کبھی ایک لاکھ روپے نہیں دیکھے تھے۔"

ایک نے کہا۔ "ہم دیکھ رہے ہیں اور لے جارہے ہیں۔"

تیسرے نے کہا۔ "ارے ان ناچنے گانے والوں کو لے چلو۔ رات کو دارو کا مجا آجائے گا۔"

اس نے بندوق کا دستہ ڈھولک پر مارتے ہوئے کہا۔ "اے چلو! اپنی عورتوں کے ساتھ باہر نکلو۔"

جوان عورت نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کہا۔ "ہم پر دیا کرو۔ ہم پاپی پیٹ کی کھاتر شملہ جارہے ہیں۔"

"پیٹ وہاں بھی بھرے گا۔ بھیرو دادا مستی کرے گا اور اچھے پیسے دے گا۔"

بوڑھے بابا نے کہا۔ "یہ میری دونوں بیٹیاں ہیں۔ ہم عجت دار ہیں۔ بیٹیوں سے شریر (جسم) کا دھندا نہیں کراتے ہیں۔ بھگوان کے لیے ہم کو عجت سے جانے دو۔"

وہ عزت والے ہوتے تو ان کی عزت کرتے۔ ایک نے سامنے بیٹھے ہوئے ڈھولک والے کو رائفل کے کندے سے ایک ضرب لگائی پھر کہا۔ "چلتے ہو یا یہاں مرتے ہو؟"

مزید مار کھانے سے پہلے وہ سب سہم کر اٹھ گئے۔ اپنا سامان اٹھا کر بس سے باہر جانے لگے۔ پھر وہ ڈاکو بھی

اُتر گئے۔ ایک نے بس کی باڈی پر رائفل کا کندا مارتے ہوئے کہا۔ ''چلو بھاگو۔ جاؤ یہاں سے......''

ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ اس کا انجن ذرا شور مچاتے ہوئے بیدار ہوا پھر سو گیا۔ وہ ڈاکو ان گانے والوں کے ساتھ جا رہے تھے۔ پلٹ کر نہیں دیکھ رہے تھے۔ مراد بھی گاڑی سے اُتر گیا۔ اس بار بس اسٹارٹ ہو کر آگے چلی گئی۔

وہ بڑے اطمینان سے ان سے فاصلہ رکھ کر چلنے لگا۔ وہاں بس میں اپنی گن نکالتا اور ان سے مقابلہ کرتا تو آگے بستیوں میں جا کر شملہ پہنچتے پہنچتے یہ بات پھیلتی چلی جاتی کہ کوئی ہتھیار والا بس میں سفر کرتا آ رہا ہے۔

پھر یہ خیال بھی تھا کہ دشمن کے کارندے اُدھر ٹرین میں اسے نہ پا کر ان راستوں میں اسے تلاش کرنے آ رہے ہوں گے۔ اس لیے وہ اپنے پاس اسلحے کی نمائش نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک ڈاکو نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا پھر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ''وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔''

وہ سب رُک گئے۔ ان کے درمیان پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ مراد کے چلتے رہنے کے باعث کم ہو رہا تھا۔ ایک نے پوچھا۔ ''اے تم ہمارے پیچھے کیوں آ رہے ہو؟''

وہ اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگوں نے ٹھیک سے تلاشی نہیں لی۔ اس میں دس ہزار روپے اور ہیں۔''

''ہائیں......!'' وہ خوش ہو گئے۔ ان کی رائفلوں کی نالیں جھکی ہوئی تھیں۔ مراد نے کہا۔ ''یہ ہیں دس ہزار......''

اس نے گن نکالتے ہی تڑاتڑ دو گولیاں چلائیں۔ اچانک ملنے والی دولت مہنگی پڑ گئی۔ وہ اپنی گنیں سیدھی کرنے سے پہلے ہی زمین پر گر کر ٹھنڈے پڑ گئے۔

تیسرا اُن عورتوں کے پیچھے تھا۔ مراد اس پر گولی چلاتا تو کسی عورت کو لگ سکتی تھی۔

وہ جوان لڑکی کو ڈھال بنا کر مراد کی طرف فائر کرتا ہوا ایک چٹان کے پیچھے چلا گیا۔ مراد بھی دوڑتا ہوا ایک بڑے پتھر کے پیچھے آ گیا۔ وہاں سے دو چار بار فائرنگ کا تبادلہ ہوا پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ چٹان کے پیچھے گم ہو گیا تھا۔ شاید پیچھے کہیں چھپنے کی یا محاذ آرائی کی جگہ ہوگی یا اسے بھاگنے کا راستہ مل گیا ہوگا۔

گانے بجانے والے فائرنگ سے بچنے کے لیے زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ سہم کر لیٹ گئے۔ ایسے وقت اس جوان لڑکی نے لیٹے ہی لیٹے مراد کو ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ دشمن اوپر چڑھ رہا ہے۔

مراد نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پہلے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر اسے لباس کی جھلک نظر آ گئی۔ دشمن کا ارادہ سمجھ میں آ گیا۔ وہ چٹان کی بلندی پر جانے کے بعد راستے بدلنے والا تھا۔ اُدھر کہیں سے مراد کے پیچھے آ کر اسے گولی مارنے والا تھا۔

مراد نے دونوں ہاتھوں سے گن کو تھام کر بلندی کی طرف دھیان رکھا۔ پھر وہ جیسے ہی اوپر پہنچ کر نظر آیا، اس نے گولی چلا دی۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ بلندی سے گرتا ہوا اس کے قریب زمین پر آن گرا۔ گرتے وقت چٹان سے ٹکرا کر اس کا سر پھٹ گیا تھا۔

وہاں تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ ان غریبوں اور کمزوروں کو آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک شہری بابو نے انہیں بندوق والے ڈاکوؤں سے نجات دلائی ہے۔

وہ اب تک مراد کو بے وقوف اور بزدل سمجھتے رہے تھے۔ اس نے لاکھوں روپے چپ چاپ ان کے حوالے کر دیے تھے اور وہ تنہا کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا لیکن اچانک ہی وہ ملک الموت بن گیا تھا۔ وہ حیران تھے' ایک اکیلے نے تین درندوں کو مار گرایا تھا۔

مراد نے مرنے والوں کے لباس سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر ہارمونیم اور ڈھولک والوں سے کہا۔ ''فوراً اٹھو اور ان کی لاشیں گھسیٹ کر کھائی میں پھینکو۔''

وہ سنتے ہی وہاں سے اٹھ کر حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ مراد نے اوپر سے گرنے والے آخری ڈاکو کو بھی گھسیٹ کر اسے کھائی کی طرف لڑھکا دیا پھر ان سے کہا۔ ''یہ ضروری تھا۔ اگر ان کی لاشیں یہاں پڑی رہتیں تو گشتی پولیس والے انکوائری کرتے ہوئے ہم تک پہنچ جاتے۔ اب ہم کسی کی پکڑ میں نہیں آئیں گے۔''

پھر اس نے پوچھا۔ ''آگے کہیں سے گاڑی ملے گی؟''

بوڑھے نے کہا۔ ''آگے پھلوا گاؤں ہے۔ وہاں سے گاڑیاں گزرتی رہتی ہیں۔''

جوان عورت نے مراد کے بیگ کو دیکھ کر کہا۔ ''آپ بہت دھنوان ہیں۔ اتنا دھن لے کر اکیلے جا رہے ہیں۔ ڈر نہیں لگتا؟''

وہ اپنی گن دکھاتے ہوئے بولا۔ ''میں صرف دھن نہیں رکھتا۔ لٹیروں کی موت کا سامان بھی رکھتا ہوں۔''

وہ سب آگے چلتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ مراد

نے جوان لڑکی سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''کناری...''

وہ بولا۔ ''کناری! تم مجھے اشارہ نہ کرتیں تو میں آخری ڈاکو کو دیکھ نہ پاتا۔ تم موقع کو سمجھنے والی ذہین لڑکی ہو۔ میں تمہیں پانچ ہزار روپے انعام دوں گا۔''

وہ سب خوشی سے کھل گئے۔ چلتے چلتے رک گئے۔ پانچ ہزار روپے ان کے لیے خواب جیسے تھے۔ ڈھولکی نے اپنی ڈھولک پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''بابوجی! آپ نے تو شملہ پہنچنے سے پہلے ہی ہمارے وارے نیارے کردیے۔''

مراد نے کہا۔ ''آگے چلتے رہو اور میری باتیں سنتے رہو۔''

وہ پھر آگے بڑھنے لگے۔ اس نے کہا۔ ''میرے بہت سے دشمن ہیں۔ وہ مجھے صورت سے نہیں پہچانتے ہیں۔ لیکن میرے پاس ہتھیار دیکھ کر یقین ہوجائے گا کہ انہیں میری ہی تلاش ہے۔''

بوڑھے نے کہا۔ ''ہتھیار تو تم چھپا کر رکھتے ہو۔ وہ نہیں دیکھ سکیں گے۔''

''جب قریب آکر تلاشی لیں گے تو میں پکڑا جاؤں گا پھر وہ کچھ نہیں پوچھیں گے فوراً مجھے گولی ماردیں گے۔''

جوان عورت نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''دیّا رے دیا۔ ہم تم کو مرنے نہیں دیں گے۔''

کناری نے چلتے چلتے پاس آکر اس کے بازو کو تھام کر کہا۔ ''میں تم کو بھیا بولوں؟''

مراد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''تم میری بہت اچھی بہن ہو۔ تم نے لڑتے وقت میری مدد کی ہے۔ میں تمہیں بھائی کا اتنا پیار دوں گا کہ تم مجھے کبھی بھول نہیں پاؤ گی۔''

''پھر تو یہ بہن تمہارے لیے جان لڑادے گی۔ آنے دو دشمنوں کو۔ وہ کتنے ہوں گے؟''

''میری بہنا! صرف جوش اور جذبے سے جان نہیں بچتی۔ تدبیر کرنی ہوتی ہے۔ اگر یہ ہتھیار میرے پاس نہ رہیں، کہیں چھپے رہیں اور ٹھیک ضرورت کے وقت مجھے مل جائیں تو میں دشمنوں کی لاشیں گرادوں گا۔ پھر یہ کہ جب تلاشی لینے والوں کو میرے پاس ہتھیار نہیں ملیں گے تو مجھے دشمن نہیں سمجھیں گے۔ میری تلاش میں دوسری طرف بھٹکتے رہیں گے۔''

جوان عورت نے کہا۔ ''ایک ہتھیار کو چھپانا کیا مشکل ہے۔ میں چھپا کر رکھوں گی۔''

مراد نے کہا۔ ''ایک بڑی گن ہے ایک چھوٹی گن ہے اور ساتھ ستر بلٹس ہیں۔''

ہارمونیم ماسٹر نے کہا۔ ''کیا دشمن ہماری بھی تلاشی لیں گے؟''

''اگر مجھ سے دور ذرا الگ رہو گے تو تم صرف گانے بجانے والے سمجھے جاؤ گے۔''

کناری نے کہا۔ ''پھر تو ٹھیک ہے بھیا! ہم تم سے دور دور رہیں گے۔ تمہاری سب چیزیں چھپا کر رکھیں گے۔''

''معلوم تو ہو کیسے چھپائیں گے، کہاں چھپائیں گے؟ ان تمام نوٹوں کی گڈیوں کو بھی کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے۔''

وہ پھر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ایک نے کہا۔ ''میں ہارمونیم کے اندر چھپا سکتا ہوں۔''

ڈھولکی نے کہا۔ ''میں ڈھولک کے اندر چھپالوں گا۔ مشکل یہ ہوگی کہ ہم نہ بجا سکیں گے، نہ ناچ گا سکیں گے۔''

بوڑھے بابا نے کہا۔ ''جب تک یہ سب کچھ چھپا رہے گا، گانا بجانا نہیں ہوگا۔ ہم سے گانے کو کہا جائے گا تو کہہ دیں گے کہ ہارمونیم اور ڈھولک میں خرابی ہے۔ شملہ میں اس کی مرمت کرائیں گے تب یہ ساز بجا سکیں گے۔''

بوڑھے بابا نے عقل کی بات کہی تھی۔ وہ سب اس پر عمل کرنے لگے۔ چلتے چلتے رک کر زمین پر بیٹھ گئے۔ ایک نے ہارمونیم کے پردے کو تھوڑا سا چاک کیا پھر اس کے اندر نوٹوں کی گڈیاں اور ایک گن نائن ون ون ٹھونس دی۔ کچھ بلٹس بھی بھر دیے۔ ڈھولکی نے پستول بے بی ایگل کو تمام بلٹس کے ساتھ ڈھولک کے اندر رکھ لیا اور ایک بڑا سا کپڑا ٹھونس دیا تاکہ ہلنے ہلانے سے کوئی آواز پیدا نہ ہوسکے۔

یوں احتیاطی تدابیر پر عمل کرکے اطمینان ہوا۔ مراد اگرچہ ہتھیار کے بغیر نہتا ہوگیا تھا لیکن مطمئن تھا۔ کوئی اس پر جنگجو ہونے کا شبہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے بیگ میں جو کاغذات تھے ان سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ ایک سیاح ہے اور سیر و سیاحت کی غرض سے شملہ جارہا ہے۔

آگے پھلوا گاؤں تھا۔ مراد ان سے الگ ہوکر پہلے وہاں پہنچ گیا۔ گانے بجانے والے آدھے گھنٹے بعد وہاں آئے اور ایک ڈھابے میں بیٹھ کر کھانے پینے لگے۔

شملہ سے آنے جانے والی بسیں وہاں سے گزر رہی تھیں۔ وہاں کچھ غیر ملکی بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں میکی براؤن کے دو شوٹرز بھی تھے۔ وہ شملہ سے مراد کو ہر ٹیکسی اور بس میں تلاش کرتے آئے تھے۔

ان کے بدن پر نیلے رنگ کی وردی تھی۔ ان کے شانوں سے گنیں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ خود کو فاریسٹ پولیس والے ظاہر کررہے تھے اور وہاں ایک ایک فرد کی تلاشی لے

رہے تھے۔

کناری اور اس کی بہن منجو کے علاوہ وہاں اور کئی عورتیں تھیں۔ وہ دونوں ان کی تلاشی لینے آئے تو ایک عورت نے کہا۔ ''خبردار! ہم کو ہاتھ نہ لگانا۔''

دوسری عورت نے کہا۔ ''کیا اپنی ماں، بہن کو بھی ہاتھ لگاتے ہو؟ تلاشی لینا ہے تو اپنی کسی عورت کو ساتھ لاؤ۔''

کئی مرد اعتراض کرنے لگے تو وہ دونوں عورتوں سے دور ہو گئے۔ لیکن کئی عورتوں کے پھیلے ہوئے گھاگھروں کو بار بار دیکھنے لگے۔ وہ ایسے گھیردار تھے کہ ان کے اندر بڑے سائز کی گنیں اور بلٹس کے پاکٹس چھپائے جا سکتے تھے لیکن ان عورتوں کے ساتھ جو مرد تھے، وہ دبلے پتلے یا چھوٹے قد کے تھے۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ بھی کسی ہتھیار کو ہاتھ بھی لگاتے ہوں گے۔ ان پر مراد ہونے کا شبہ نہیں ہو رہا تھا۔

وہ مراد کے پاس آ گئے۔ ایک نے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟ کہاں سے آ رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟''

وہ بس پر سوار ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ بس جہاں جا رہی ہے وہاں جا رہا ہوں۔ باقی باتیں میرے کاغذات پڑھ کر معلوم کر لو۔''

وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ گانے بجانے والے بھی بس میں آ کر پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے تھے۔ جب بس چلنے لگی تو دونوں شوٹرز باہر آ گئے۔ وہ دشمن مطمئن ہو گئے تھے۔ وہاں دوسری آنے والی گاڑیوں میں مراد کا انتظار کرنے لگے۔

مراد نے پلٹ کر اپنے نئے چاہنے والے ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ سب مسکرانے لگے۔

☆☆☆

مرینہ اپنے یار کے لیے باؤلی ہو رہی تھی۔ اس کی تلاش میں پاگل ہو رہی تھی۔ ویسے پاگل ہونے کی بات ہی تھی۔ اس لیے کہ وہ شام کو نکاح پڑھانے کی بات کہہ کر اچانک ہی کچھ کہے سنے بغیر غائب ہو گیا تھا۔ یہ واقعی شاک پہنچانے اور پاگل کر دینے والا رویہ تھا۔ اس کی گمشدگی کہہ رہی تھی کہ وہ کبھی ماروی کے طلسم سے آزاد نہیں ہو سکے گا۔ وہ پھر اس کی آغوش میں اسیر ہو گیا ہے اور وہ اپنے یار کو اس کی طرف آنے نہیں دے گی۔

وہ جھنجلا کر سوچ رہی تھی۔ 'نہ آتا ہے، نہ آئے... فون پر دو باتیں تو کر سکتا ہے۔ اپنی مجبوریاں تو بیان کر سکتا ہے۔ صاف صاف کہہ سکتا ہے کہ اس سے شادی نہیں کرے گا،

'نہ کرے شادی... دوستی تو برقرار رکھ سکتا ہے...'

اسے یقین تھا کہ وہ ماسٹر کو بوبو کا مشن پورا کرنے کے لیے شملہ ضرور آئے گا۔ یہ یقین نہ ہوتا تو وہ ماسٹر کا کام کرنے کے لیے کبھی اِدھر نہ آتی۔ یار کو تلاش کرنے کسی دوسری سمت بھٹکتی رہ جاتی۔

اس وقت وہ ایک نامی گرامی فلم پروڈیوسر دیوراج کی دھرم پتنی بن کر آئی تھی۔ دیوراج جیسے ارب پتی فلمسازوں کی کمائی کمبئی میں بڑی مشکل سے محفوظ رہتی ہے۔ انڈر ورلڈ کے خطرناک گروہ ان سے تگڑا کمیشن وصول کرتے رہتے ہیں۔

ایک انڈر ورلڈ کا سربراہ 'ماسٹر کو بوبو' کا احسان مند رہا کرتا تھا۔ وہ ماسٹر کی سفارش پر دیوراج کو سیکیورٹی دیتا تھا اور اس ارب پتی کو کروڑوں روپے کے نقصانات سے بچاتا رہتا تھا۔ ایسے احسان کے بدلے دیوراج ماسٹر کے حکم سے مرینہ کو اپنی دھرم پتنی بنا کر شملہ لے آیا تھا۔ وہاں اس کا نام رنجنا تھا۔ کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی دھرم پتنی ایک خطرناک گن فائٹر مرینہ ہے۔

ایک دولت مند معزز خاندان کی بیوی اپنے پاس ہتھیار نہیں رکھتی لیکن دیوراج کے پاس لائسنس یافتہ گن اور بُلٹس کے پیکٹس تھے۔ وہ مرینہ کے استعمال میں آنے والے تھے۔ وہ بھرپور تیاریوں کے ساتھ آئی تھی لیکن اسے اپنی آغوش میں تیار رکھنے والا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

دیوراج نے کہا۔ ''تم بہت حسین ہو، تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ لندن میں میٹ آفیسر رہ چکی ہو اور وہاں سے یہاں تک درجنوں لاشیں گرا چکی ہو۔ اس ہندوستانی عورت کے روپ میں تو بالکل ہی سیدھی سادی گائے دکھائی دیتی ہو۔''

وہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ ''ہاں میں آئینہ دیکھتی ہوں تو ہندوستانی عورت کا روپ بہت ہی سندر لگتا ہے۔ میں اناڑی نہیں ہوں۔ سمجھتی ہوں کہ تمہاری رال ٹپکتی رہتی ہے۔''

''ہاں، میں تمہیں دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر مچلتا رہتا ہوں لیکن ماسٹر نے جو سب سے پہلی وارننگ دی ہے وہ یہی ہے کہ میں تمہیں چھونے کی غلطی کبھی نہ کروں۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔ ''اور جیسا کہ تم جانتی ہو، میں ماسٹر کا پُرانا... فرمانبردار ہوں۔ اس لیے تم مجھے ہلاک تو نہیں کرو گی لیکن اپاہج بنا کر چھوڑ دو گی... یہ...... یہ ماسٹر نے کہا ہے۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''تمہاری بہتری اور سلامتی اسی طرح رہے گی۔ تم مجھ سے فاصلہ رکھا کرو گے۔''

پھر وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں ناراض

کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا لیکن یہ پوچھنا چاہتا ہوں' کیا ہماری دوستی ہوسکتی ہے؟ کسی بھی شرط پر۔ کسی بھی قیمت پر؟''

''ہم ابھی دوست ہیں۔ دشمن تو نہیں ہیں؟''

''میرا مطلب ہے، کیا کسی بھی قیمت پر۔ میری آدھی دولت لے کر مجھ سے محبت کروگی؟''

''محبت تو میں نے صرف ایک ہی جیالے سے کی ہے۔ صرف وہی مجھے ہاتھ لگا سکتا ہے۔ میری تمام راتیں اسی کے لیے ہیں۔''

وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ وہ بھی ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ''اسی ہرجائی کی تلاش میں یہاں بھٹکنے آئی ہوں۔ صبح سے رات ہوگئی ہے۔ کہیں اس کی جھلک دکھائی نہیں دے رہی ہے۔''

''تم تو شاید کسی خطرناک مشن پر آئی ہو اور اپنے کسی چاہنے والے کی بات کررہی ہو؟''

''میرا یار دلدار بھی اسی مشن کا اہم حصہ ہے۔ میں سیر ہوں' وہ سوا سیر ہے۔ میرے حواس پر چھا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے، آج یا کل کہیں نہ کہیں مجھ سے ٹکرائے گا۔''

''اس کا نام اور حلیہ بتاؤ۔ میں بھی اسے تلاش کروں گا۔''

''وہ اپنا نام اور حلیہ بدل چکا ہے۔ اپنا چہرہ بدل چکا ہے۔ میں اسے صورت سے پہچان نہیں پاؤں گی۔''

''پھر کیسے پہچانو گی؟''

''وہ اپنی آواز اور بولنے کا انداز بدل چکا ہوگا۔ بہت استاد ہے۔ اپنے طور طریقے بھی بدل چکا ہوگا۔ صرف اس کے وے آف ایکشن سے پہچان سکوں گی۔''

وہ خلا میں تکتی ہوئی اسے دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اتنا چاہتی ہوں کہ وہ کہیں دشمنوں سے ٹکرائے اور میں وہاں پہنچ جاؤں۔ میں اس کے جھپٹنے' پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کی تکنیک کو خوب جانتی ہوں۔ اسے پلک جھپکتے ہی پہچان لوں گی۔''

دیوراج اس وقت ایک ڈائننگ ٹیبل پر اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے درمیان کینڈل لائٹس روشن تھیں۔ آس پاس کی میزوں پر بھی موم بتی کی دھیمی رومانٹک روشنی میں محبت کرنے والے کچھ کھا پی رہے تھے اور بڑے پیار سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

مرینہ بھی کینڈل لائٹ کے اس پار دھیمی دھیمی سی چھپی چھپی سی جھلک رہی تھی۔ دل اس کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ وہ خود کو سمجھا رہا تھا۔ ''نادان! یہ اپنے جیسے جاں باز موت کے کھلاڑی پر مرتی ہے۔ تو مفت میں مارا جائے گا۔''

''یہ جو سرخ لباس میں نظر آرہی ہے یہ نہ طاقت سے حاصل ہوگی نہ آنسو بہانے سے ملے گی اور نہ ہی مال و دولت لٹانے سے حاصل ہوگی۔ بہتر ہے پیٹ بھر کر کھالے اور گھر جاکر سلامتی سے سوجا۔ دوسرے دن زندہ اٹھے گا۔''

وہ ہوٹل سے باہر آگئے۔ اس وقت وہ شملہ کے سب سے مہنگے علاقے مال روڈ پر تھے۔ وہاں مہنگے ہوٹل' مہنگی دکانیں' مہنگے کلبز اور مہنگی تفریحات صرف امیر کبیر عیاش لوگوں کے لیے ہیں۔ وہ وہاں سے پیدل اپنے رہائشی ہوٹل چیسلی کی طرف جانے لگے۔ وہ ہوٹل بس یونہی تاریخی اہمیت کا حامل کہلاتا تھا۔ وہاں کبھی مہاراجہ کپور تھلا آکر قیام کیا کرتا تھا۔

مرینہ نے چلتے چلتے پوچھا۔ ''کیا تم شراب نہیں پیتے؟''

''رات کو ڈنر سے پہلے دو پیگ لیتا ہوں۔ پھر سونے سے پہلے اتنی پیتا ہوں کہ ہوش نہیں رہتا۔ صبح آنکھ کھلتی ہے۔''

''آج کیوں نہیں پی؟''

اس نے بڑی حسرت سے اسے دیکھا پھر کہا۔ ''ایک ہی گھونٹ میں تم آکاش کی اپسرا دکھائی دوگی۔ دوسرے گھونٹ میں تمہارا ہاتھ پکڑنے کی ہمت پیدا ہوگی۔ آہ! میں کل صبح اپنے بستر پر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''اچھا ہے۔ محتاط رہنا چاہیے۔''

''میں ہوٹل پہنچ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد خوب پیوں گا۔'' وہ چلتے چلتے اسے دیکھ کر بولا۔ ''کیا ظالم شے ہے۔''

''کون میں؟''

''عورت حسین ہو اور ظالم ہو تو اس پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ میں تمہیں نہیں شراب کو ظالم کہہ رہا ہوں۔ اس کے بغیر نیند نہیں آتی۔ آج یہ مہربان ہوگی۔ تم سے دور مجھے سُلا دے گی۔''

وہ دونوں چلتے چلتے ٹھٹک گئے۔ سڑک کے کنارے دکانیں بند تھیں۔ ادھر دور تک تاریکی تھی۔ دو شخص آگے پیچھے دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ آگے والا اچانک بیٹھ گیا۔ پیچھے والا فوراً رک نہ سکا۔ اس کے اوپر سے گزرتا ہوا سامنے زمین پر آکر گر پڑا۔

بیٹھنے والے نے بڑی چالاکی دکھائی تھی۔ فوراً ہی اٹھ کر اس کے منہ پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ دیوراج لڑائی جھگڑے سے گھبراتا تھا۔ مرینہ کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''چلو یہاں سے۔''

وہ بڑی توجہ سے اس قد آور شخص کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دور

نیم تاریکی میں مراد لگ رہا تھا۔ اس کے لڑنے کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ اپنے مقابل کو حملہ کرنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی اپنے داؤ پیچ استعمال کر رہا تھا۔

دیوراج نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ''یہاں بھی خون خرابا ہوگا۔ بھاگ چلو۔''

وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بولی۔ ''تم جاؤ۔ میں ہوٹل میں آجاؤں گی۔''

وہ اس فائٹر کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا کہ وہ اس کا مراد ہے۔ وہ اتنی دیر میں غالب آچکا تھا۔ اپنے مخالف کو نیم مردہ کر کے وہاں سے بھاگ رہا تھا۔ مرینہ نے اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے آواز دی۔ ''اے رک جاؤ...''

اس نے دوڑتے دوڑتے ایک ذرا سر گھما کر اسے دیکھا پھر بھاگتا ہوا ایک گلی میں مڑ گیا۔ وہ پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ بڑی تلاش کے بعد وہ نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔

وہ اس گلی میں آئی تو وہاں ویرانی اور رات کی خاموشی تھی۔ اس نے کان لگا کر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنی پھر اس طرف دوڑ پڑی۔ وہ ایک گلی کے بعد دوسری گلی میں مڑ گیا تھا۔ پھر تیسری گلی میں آتے ہی ایک جھٹکے سے رک گیا۔

وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے' ٹانگیں پھیلائے کھڑی تھی۔ اس کے رکتے ہی بولی۔ ''میں نے کہا تھا رک جاؤ۔ مجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے مراد......؟''

''مراد......؟'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ''م' میں مراد نہیں ہوں۔ تم لوگ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟''

وہ اس کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ بڑی تلاش کے بعد سامنا ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہارے پیچھے اور کون لوگ ہیں؟''

''وہ تین بندوق والے تھے۔ میں نے پہلے کبھی انہیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں مراد علی منگی ہوں۔''

''او گاڈ! وہ میکی براؤن کے شوٹرز ہوں گے۔ انہوں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ اس بار تم نے جلدی میں صحیح سرجری نہیں کرائی ہے۔ تمہارے چہرے کی آؤٹ لائن' سر کے بال' قد اور جسامت دور ہی سے کہہ دیتی ہے کہ تم مراد ہو۔''

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ''میں مراد نہیں ہوں۔''

''بکواس مت کرو۔ تم مجھ سے چھپ نہیں سکو گے۔ فوراً یہاں سے چلو۔ وہ تین اشخاص تھے۔ تم نے ایک کو مار گرایا ہے۔ باقی دو کے ساتھ اور کتنے ہی تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔''

''میں ان دونوں کو بھی ٹھنڈا کر چکا ہوں۔ میرے پیچھے اب کوئی نہیں ہے۔''

مرینہ نے کہا۔ ''میری جان! ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ تم نہتے ہو اور تم نے تینوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ ایسا جیالا تو صرف میرا مراد ہی ہو سکتا ہے۔''

وہ اس کے قریب ہو کر بولی۔ ''یہ خبر دشمنوں تک پہنچی ہوگی کہ ایک نہتے نے ان شوٹرز کو جہنم میں پہنچایا ہے تو وہ پورے یقین سے کہیں گے کہ مراد علی منگی شملہ پہنچ گیا ہے۔''

وہ اس کا بازو تھام کر بولی۔ ''چلو میرے ساتھ......''

وہ بازو چھڑا کر بولا۔ ''نہیں۔ میں اپنے ہوٹل جاؤں گا۔''

''کس ہوٹل میں رہتے ہو؟''

''تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ کون ہو تم؟ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو؟''

''تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں کون ہوں؟ جبکہ مجھے نئے روپ میں بھی پہچان گئے ہو۔ اب تم کسی طرح کا بھی ناٹک کر کے مجھ سے پیچھا نہیں چھڑا سکو گے۔''

وہ ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''ادھر روشنی میں چلو۔ مجھے دیکھو اور بولو کہ کیسا غضب ناک حسن ہے۔''

''یہاں بھی روشنی ہے۔ میں تمہیں دیر سے دیکھ رہا ہوں۔''

وہ اپنے دل کی جگہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''تم پر دل آگیا ہے۔ لیکن تم ان دشمنوں جیسی ہو۔ میں تم سے دور ہی رہوں گا۔''

''کیوں بن رہے ہو مراد؟ کیا میں تمہارے مزاج کو نہیں سمجھتی ہوں' عورتیں کتنی ہی حسین ہوں' تم ان سے کتراتے ہو۔ مجھ سے بھی کترا کر منہ چھپا کر یہاں آئے ہو۔''

وہ ایک طرف جانے لگا۔ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں اچانک کیا ہوگیا ہے؟ تم دہلی پہنچتے ہی مجھ سے نکاح پڑھوانے والے تھے۔ یہ بار بار کہتے رہتے ہو کہ میں گولیوں کی بوچھاڑ میں اور پھولوں کی سیج پر ہر جگہ تمہاری اہم ضرورت ہوں۔''

وہ چلتے چلتے پیار سے دھکا دیتے ہوئے بولی۔ ''یاد ہے' تم نے یہ خوش کرنے والی بات کہی تھی کہ ماروی وہ جادو نہیں جگاتی' جو میں جگاتی ہوں۔ تم اپنی زبان سے کئی بار کہہ چکے ہو کہ میرے بغیر نہیں رہ سکو گے۔ پھر اچانک اپنی زبان سے کیوں پھر گئے؟ کیوں مجھ سے چھپ کر مجھ سے دور رہنا چاہتے ہو؟''

''تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ تم جو کہہ رہی

ہو، ایسا میں نے کچھ نہیں کہا ہے۔'' وہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لا جواب ہو۔ تمہارے پھسلتے ہوئے حسن وشباب پر تو دن رات پھسلنے کو تیار ہوں۔ پھر کیا بے وقوف ہوں کہ تم سے شادی سے انکار کروں گا اور تم سے منہ چھپاؤں گا؟'' وہ ایک گلی میں مڑتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اب دل آنے کے باوجود کتراؤں گا۔ آئندہ دور ہی دور سے تمہاری حقیقت معلوم کروں گا۔ تیار رہنا' اگر تم میرے لیے خطرناک نہ ہوئیں تو تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔''

''تم اچھی طرح جانتے ہو' دنیا کے لیے خطرناک ہوں۔ تمہارے لیے پھولوں بھری شاخ ہوں۔ ابھی اٹھا کر لے چلو۔''

یہ سنتے ہی وہ اس سے لپٹ گیا۔ محبت سے نہیں' مجبوری سے لپٹ کر اسے اٹھاتے ہوئے دوڑتے ہوئے ایک مکان کی تاریک دیوار سے آ کر لگ گیا۔ ایسے ہی وقت ایک گولی سنسناتی ہوئی مرینہ کے کان کے قریب سے گزر گئی تھی۔

اس نے دیوار سے آ کر لگتے ہی لباس کے اندر سے گن نکال لی۔ گھور کر تاریکی میں دیکھنے لگی۔ اس نے فائرنگ کی سمت کا اندازہ کرلیا تھا۔ وہ سامنے ایک مکان کے پیچھے تھا اور شوٹنگ کے لیے سائلنسر استعمال کررہا تھا۔

مرینہ کی گن سے دھما کا خیز آواز گونجنے والی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دشمنوں کے علاوہ پولیس والے بھی چلے آئیں۔ ایسے وقت حکمتِ عملی یہی ہوتی تھی کہ فائرنگ کے بغیر ہی اس ایک گولی چلانے والے پر قابو پالے۔

اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''تم یہیں رہو۔ نہتے ہو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ اسے پیچھے سے جا کر دبوچ لوں گی۔''

وہ زمین پر چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتی ہوئی ایک سمت جانے لگی۔ اسے تاریکی میں شکار کھیلنا آتا تھا۔ وہ رینگتی ہوئی دوسری گلی میں آئی۔ وہاں سے اٹھ کر پنجوں کے بل' کبھی چلتی ہوئی کبھی دوڑتی ہوئی اس مکان کے پچھلے حصے میں پہنچ گئی' جہاں وہ شوٹر چھپا ہوا ان کی تاک میں کھڑا تھا۔

وہ تنہا تھا۔ اپنے مطلوبہ مراد کو گولی مارے بغیر وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ پھر اس نے ایک عورت (مرینہ) کو اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے خیال میں وہ دونوں ایک مکان کے تاریک سائے میں چھپے ہوئے تھے۔

وہ اسی دھوکے میں مارا گیا۔ مرینہ اس کے پیچھے پہنچ گئی۔ اس نے گن کے دستے سے اس کے سر پر ایک زوردار ضرب لگائی۔ ایسا ہاتھ پڑا تھا کہ اس کی کھوپڑی ہل کر رہ گئی۔ آنکھوں کے سامنے قمقمے جلنے بجھنے لگے۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی مرینہ نے اس کی سائلنسر لگی ہوئی گن چھین لی۔ وہ زمین پر تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ مرینہ نے اسی کی گن سے اس کے جسم میں دو گولیاں اتار کر اسے تکلیف سے نجات دے دی۔

وہ پھر اسی راستے سے پنجوں کے بل دوڑتی ہوئی آنے لگی۔ یہ اندیشہ تھا کہ اور بھی شوٹرز کہیں چھپے ہوں گے۔ لیکن کہیں سے کسی نے گولی نہیں چلائی۔ وہ واپس اس مکان کے پاس آ کر رک گئی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔

شاید کسی وجہ سے جگہ بدل کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ اس نے تاریکی میں ادھر ادھر جا کر آواز دی۔ ''کہاں ہو تم؟''

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے دشمن کو ختم کردیا ہے۔ اب کوئی نہیں ہے۔ آجاؤ۔''

اس کے چاروں طرف خاموشی رہی۔ جواب کیسے ملتا؟ وہ اس کی آواز سے دور کہیں چلا گیا تھا۔ وہ دیر تک اور دور تک تلاش کرتے رہنے کے بعد جھنجلا گئی۔ وہ پھر منہ چھپانے کے لیے گم ہوگیا تھا۔ کیا اس لیے جان چھڑا رہا تھا کہ اسے منکوحہ نہ بنانا پڑے؟

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر بڑبڑائی۔ ''بلا سے نکاح نہ پڑھائے۔ ساتھ تو رہ سکتا ہے۔''

وہ جھنجلاتی ہوئی اپنے رہائشی ہوٹل کی طرف جانے لگی۔

اس سے کھل کر باتیں کرنے اور یہ پوچھنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ اچانک اس سے دور کیوں بھاگ رہا ہے؟ کوئی تو وجہ ہوگی۔

وہ وجہ کیا بتاتا؟ وہ تو خود کو مراد تسلیم نہیں کررہا تھا۔

اگر مراد نہیں تھا تو ایک حسین عورت کو چھوڑ کر کیوں گیا تھا؟ جبکہ کہہ رہا تھا کہ اس پر دل آگیا ہے۔ اس کے ساتھ دن رات گزارنا چاہتا ہے۔ وہ اس کے سامنے محض باتیں بنا رہا تھا۔

اس کے مراد ہونے کا ثبوت یہی تھا کہ وہ مرینہ سے کترا رہا تھا اور یہ ثبوت بھی کم نہیں تھا کہ اس نے تنہا خالی ہاتھ رہ کر تین شوٹرز کو ہلاک کیا تھا۔ پھر اس سے لپٹ کر اس کے لیے ڈھال بن گیا تھا۔ اسے گولی کی زد میں آنے سے بچایا تھا۔ اتنا پھرتیلا تو بس وہی ایک مراد علی منگی ہی ہوسکتا تھا۔ وہ اسے پاکر کھوچکی تھی۔ یہ ارادہ کررہی تھی کہ وہ نظروں میں آچکا ہے۔ اسے اب دور سے بھی پہچان لے گی۔ کل تمام دن اسے تلاش کرے گی۔

☆☆☆

مراد شام ہونے سے پہلے ہی شملہ پہنچ گیا۔ وہ گانے بجانے والے بس سے اُتر کر تبت بازار کی سمت جارہے تھے۔ وہاں ان کے ایک گرودیو کا استھان تھا۔ انہوں نے وہاں ایک بوڑھے بابا سے سات سُروں کا سبق حاصل کیا تھا۔ اس لیے اسے گرودیو کہتے تھے۔ پھر گرمیوں کے چار مہینے تک وہ ناچنے گانے اور کمانے کے لیے آتے تو انہیں گرودیو کے استھان میں رہنے کی جگہ مل جاتی تھی۔

مراد ان کے پیچھے فاصلہ رکھ کر چلنے لگا۔ اس کی ایک شاٹ گن، ایک پستول اور بلٹس ان کے ہارمونیم اور ڈھولک میں چھپا کر رکھے گئے تھے۔ ہزاروں روپے بھی ان کے پاس تھے۔ یہ سب کچھ لینے کے لیے وہ بھی گرودیو کے استھان میں آگیا۔

گرودیو نے اس سے کہا۔ ''میرے دل میں اور میرے استھان میں بہت جگہ ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو یہاں رہو۔ یہاں کسی کا کوئی دشمن قدم نہیں رکھتا ہے۔ جو دشمن ہیں، وہ بھی میرے سامنے ادب سے سر جھکاتے ہیں۔''

''آپ کی مہربانی ہے، گرو مہاراج! کبھی مجھ پر مصیبت آئے گی تو آپ کی پناہ میں ضرور آؤں گا۔''

اس نے ہتھیاروں اور بلٹس کو لباس اور سفری بیگ میں چھپایا۔ اپنی بہن کناری کو دس ہزار اور اس کے بوڑھے باپ کو پانچ ہزار دیے۔ پھر وہاں سے رہائش کے لیے ایک ہوٹل میں آگیا۔ ایسے وقت چمپت راؤ نے فون پر پوچھا۔ ''کہاں ہو؟''

''میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ لکڑ بازار کے ایک ہوٹل جمنا میں کمرا نمبر بائیس میں ہوں۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''واہ! کیا اتفاق ہے۔ میں بھی اسی ہوٹل کے کمرا نمبر ساٹھ میں ہوں۔ ابھی آرہا ہوں۔''

پانچ منٹ کے بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھول کر چمپت راؤ سے کہا۔ ''نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ تم بیٹھو۔ ہم تھوڑی دیر بعد باتیں کریں گے۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مراد نماز پڑھنے لگا۔ مغرب کی نماز مختصر تھی لیکن سوچیں زیادہ تھیں۔ دعائیں طویل تھیں۔ ''یا اللہ...! میں یہاں ہوں اور میرا دل ماروی کے پاس بھٹک رہا ہے۔ وہ مجھ سے ناراض ہے، میں نے اس کا دل دکھایا ہے۔ اس کی ناراضگی دور کر دے میرے معبود...! میں اسے پھر سے جیتنے کے لیے مرینہ سے کترا رہا ہوں۔ یا اللہ! میری یہ محبت، یہ سچائی میری ماروی تک پہنچ جائے۔ آئندہ مرینہ جیسی کوئی بھی عورت میرے لیے کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو، میں نہ اس کے ساتھ رہ کر کام کروں گا اور نہ ہی کسی کے قریب جاؤں گا۔ میرے معبود! مجھے توفیق دے۔ حوصلہ اور سلامتی دے۔ میں یہاں کا کام جلد سے جلد نمٹا کر ماروی کی تلاش میں جاؤں گا۔''

وہ دعائیں مانگنے کے بعد نماز کی جگہ سے اٹھ کر چمپت راؤ کے پاس آیا پھر بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر بولا۔ ''یہاں تمہارے آدمی پہلے سے پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کی رپورٹ کیا ہے؟''

چمپت راؤ نے کہا۔ ''میرے دستِ راست نے بتایا ہے کہ میڈونا اور ایمان علی آج صبح کی فلائٹ سے یہاں آئے ہیں۔ وائلڈ فلاور ہال کے قریب ایک کاٹیج میں ان کی رہائش ہے۔ وہیں آس پاس کے دو کاٹیجز میں کئی سیکیورٹی گارڈز رہا کریں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''یہ اندازہ تھا کہ میکی براؤن اپنی بیٹی کی حفاظت کے لیے سخت انتظامات کرے گا۔''

''وہ تو ضرور کرے گا۔ یہ اطلاع ملی ہے کہ کل میڈونا اور ایمان علی اسکیٹنگ کے لیے کفٹری جائیں گے۔ وہاں بھی دور تک مسلح گارڈز ان کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ وہ کئی میلوں تک پھیلا ہوا اسکیٹنگ کے لیے گراؤنڈ ہے۔''

''ہم دیکھیں گے کہ گارڈز کتنی دور تک اس کی نگرانی کر سکیں گے؟ بائی دا وے تمہاری دُرگا کہاں ہے؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اتنی جلدی اسے میری دُرگا نہ کہو۔ اس کے دل میں کیا ہے، پہلے یہ تو معلوم ہو۔''

''اس کے دل کا حال مجھ سے پوچھو۔ میں عشق کے میدان کا پرانا کھلاڑی ہوں۔ وہ یقیناً تمہارے ساتھ اس ہوٹل میں ہے اور شاید تم دونوں ایک ہی کمرے میں ہو۔''

''ہاں، یہ تو مجبوری ہے۔ اگر وہ تنہا ایک کمرے میں ہوتی تو دس طرح کی انکوائریاں ہوتیں کہ وہ کون ہے؟ تنہا ایک گود کے بچے کے ساتھ کہاں سے آئی ہے؟''

مراد نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''یہ خبر اس کے سابقہ دشمن شوہر جے جے بھاسکر تک پہنچ جائے گی کہ ایک اکیلی عورت یہاں ہوٹل میں ہے۔ یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں، بھاسکر کے شوٹرز اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

مراد نے مزید کہا۔ ''میں مجبوریاں سمجھ رہا ہوں۔ ابھی وہ ایک دھرم پتنی بن کر تمہارے ساتھ اس کمرے میں ہوگی؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ مراد نے مسکرا کر کہا۔ ''کوئی دوسرا رشتہ بھی جوڑا جاسکتا تھا۔''

''ہاں یار...! جانے انجانے میں یہی ہو رہا ہے، جو

دل اندر سے کہہ رہا ہے۔"

"جانے انجانے میں کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ تمہاری طرح اس کا دل بھی یہی کہہ رہا ہے کہ یہ رشتہ بن رہا ہے تو بننے دو۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ دل سے تمہاری ہو گئی ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "سچ بول رہے ہو؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ کیسے مرد ہو؟ اس کے اندر کی صاف صاف بات اگلواؤ۔"

"میں یہی سوچ رہا تھا۔ آج ہم کمرے میں تنہا ہوں گے۔ اس سے کس طرح محبت ظاہر کروں؟ وہ اپنے دل کی بات زبان پر کیسے لائے گی؟ میں اس معاملے میں بالکل گدھا ہوں۔"

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پھر تو سمجھو کام ہو گیا۔ عورتیں گدھے جیسے مرد کو فوراً پسند کرتی ہیں۔"

چمپت راؤ نے بھی ہنستے ہوئے پوچھا۔ "کیا آج اکیلے میں اس کا ہاتھ پکڑ لوں؟"

"وہ بندوق نہیں ہے کہ پکڑ لو گے۔ ایک ذرا دل جیتنے کی بات ہوتی ہے۔ پہلے بچے کے ذریعے ماں کے قریب جاؤ۔"

"یعنی کیسے جاؤں؟ یار ٹھیک سے سمجھاؤ؟"

مراد نے سمجھایا۔ "وہ اپنے بچے کو چومتی ہے نا...؟"

"ہاں چومتی ہے۔"

"جس وقت وہ بچے کے ایک گال کو چومے، اسی لمحے میں تم بچے کے دوسرے گال پر اپنے ہونٹ رکھ دو۔ اگرچہ وہ دو عدد بوسے بچے کے لیے ہوں گے لیکن تم دونوں کے ہونٹ ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو جائیں گے۔"

"کیا زبردست آئیڈیا ہے۔ یار...! میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔"

"آگے سنو...! تم دونوں کے بوسے کے درمیان بچہ ہوگا۔ تم بچے کو چپ چاپ ذرا سا ہلاؤ گے تو وہ درمیان سے سرک جائے گا۔ یوں ایک جھٹکے سے تم دونوں کے لب ایک دوسرے سے..."

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آگے سمجھ لو کیا ہوگا۔"

"یار...! میرے اندر ابھی سے دھماکے ہو رہے ہیں۔"

"تو پھر بھگوان کا نام لے کر میرا نسخہ آزماؤ۔ دُرگا کو ایک پوری جوانی گزارنے کے لیے تمہارے جیسے جنگجو مرد کی ضرورت ہے۔ اور اگر مرد ہو تو پھر ہمت کرو۔ وہ تمہیں گولی نہیں مارے گی۔"

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے جاتا ہوں۔ میرے لیے پرارتھنا کرو۔"

"کیا پرارتھنا کروں کہ وہ کہیں تمہاری آبرو نہ لوٹ لے؟"

وہ جھینپ کر ہنستا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کا کمرا دوسرے فلور پر تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آیا تو اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دو شخص ہاتھوں میں گنیں لیے کھڑے تھے۔ دُرگا بچے کو گود میں لیے ان سے کہہ رہی تھی۔ "جب میں کہہ رہی ہوں کہ یہاں اپنے پتی دیو کے ساتھ ہوں تو..."

وہ کہتے کہتے چمپت راؤ کو دیکھ کر رک گئی پھر بولی۔ "یہ لو تمہارا باپ آ گیا ہے۔"

چمپت راؤ نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کون ہو تم لوگ...... میری پتنی کو پریشان کیوں کر رہے ہو؟"

اس نے کوئی جواب سننے سے پہلے دُرگا سے کہا۔ "اندر جاؤ' دروازہ بند کرو۔"

وہ چمپت راؤ کو اُن گن والوں کے پاس تنہا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے دروازے کو بند کرتے ہی بچے کو بیڈ پر لٹایا۔ اپنی گن نکال کر اسے چیک کیا۔ پھر اسے ساڑی میں چھپا کر فون پر مراد سے کہا۔ "بھائی! اوپر آؤ۔ دو مسلح دشمن آئے ہیں۔ تمہارا یار اکیلا ہے۔"

مراد فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "بس ابھی آیا۔"

وہ فون بند کرتے ہی دروازے کے پاس آ گئی۔ کان لگا کر توجہ سے سننے لگی۔ کچھ سنائی نہیں دیا۔ باہر خاموشی تھی۔ کسی کے بولنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس نے پوری طرح مستعد ہو کر گن کو ساڑی سے نکالتے ہی دروازے کو کھولا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ چمپت راؤ کو گن پوائنٹ پر لے جا رہے تھے۔ اس نے باہر آ کر دیکھا۔ وہ دشمن اسے نشانے پر رکھ کر سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ ایسے وقت نیچے سے مراد آیا۔ دُرگا نے اسے دیکھا تو جیسے غیبی طاقت اسے حاصل ہو گئی۔ اس نے فوراً ہی ایک دشمن کا نشانہ لے کر گولی چلائی۔ دوسرے کو مراد نے اُڑا دیا۔ پھر وہ تینوں دوڑتے ہوئے اوپر کمرے میں آ گئے۔ دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

فائرنگ کی آوازوں نے پورے ہوٹل میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ چمپت راؤ نے فون پر نمبر پنچ کیے پھر ماتحتوں سے پوچھا۔ "کہاں ہو تم لوگ...؟"

جواب ملا۔ "ہم ہوٹل میں گھس آئے ہیں۔ فوراً بتائیں۔ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"باہر کھڑکی کے نیچے آؤ۔ ہمارے تمام ہتھیار لے جاؤ۔ یہاں تلاشی لی جائے گی۔"

مراد، دُرگا اور چمپت راؤ نے فوراً ہی اپنے اپنے ہتھیار اور بلٹس ایک شاپر میں ڈالے۔ کمرے کی لائٹس آف کیں پھر چمپت راؤ نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ نیچے اس کے دو ماتحت کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ہتھیاروں سے بھرا شاپر ان کی طرف پھینکا۔ وہ اسے کیچ کر کے وہاں سے لے گئے۔

ایک پولیس افسر سپاہیوں کے ساتھ آ گیا تھا۔ ہوٹل والے بیان دے رہے تھے کہ پہلے دو گن مین ہوٹل کے اندر آئے تھے۔ انہوں نے تھوڑی دیر بعد فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اور کئی گن مین ہوٹل میں آ گئے تھے پھر وہاں سے بھاگ گئے تھے۔

دراصل بعد میں آنے والے گن مین چمپت راؤ کے ماتحت تھے اور اس کے حکم سے واپس چلے گئے تھے۔ ہوٹل کے تمام کمروں کے دروازے کھل گئے تھے۔ سب ہی پریشان تھے۔ ان تینوں نے بھی ہتھیاروں سے محروم ہونے کے بعد کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ پولیس والے سرسری طور پر کمروں کی تلاشی لے رہے تھے اور وہاں رہنے والوں کو تسلیاں دے رہے تھے کہ اب کوئی دہشت گرد ادھر نہیں آئے گا۔

پولیس کے جانے کے بعد مراد نے کہا۔ ''یہاں ہم پر کسی نے شبہ نہیں کیا ہے۔ لیکن بھاسکر تک اطلاع پہنچ رہی ہوگی۔ اسے معلوم ہو رہا ہوگا کہ اس کے دو شوٹرز ہوٹل جمنا میں مارے گئے ہیں۔''

دُرگا نے کہا۔ ''وہ کمینہ ضرور سوچے گا کہ اس کے آدمیوں کو میں نے ہی یہاں مارا ہے۔ اس کے آدمی پھر یہاں آئیں گے۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''وہ اپنے بیٹے کو حاصل کرنے کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ یہاں خود آ سکتا ہے۔ مجھے دیکھ لے گا تو بچے کو چھین کر مجھے بھی زبردستی لے جانا چاہے گا۔''

چمپت راؤ نے کہا۔ ''تم ایک ننھے بچے کے ساتھ پہچان بن گئی ہو۔ پھر تم نے یہاں تک میرے ساتھ ٹرین میں سفر کیا ہے۔ وہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھتے آ رہے ہیں۔ ہم جہاں بھی ساتھ رہیں گے، وہ ہمیں پہچان لیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''فوراً اپنا سامان اٹھاؤ۔ میرے ساتھ چلو۔ دُرگا کی فکر نہ کرو۔ یہ گرودیو کے استھان میں محفوظ رہے گی اور اب تم بھی اس سے دور رہو گے۔''

وہ تینوں اپنے اپنے کمروں سے سامان اٹھا کر اس ہوٹل سے نکل آئے۔ ماتحتوں سے فون پر کہہ دیا کہ وہ دور سے ان کی نگرانی کرتے رہیں۔ مراد نے چمپت راؤ سے پوچھا۔ ''وہ دونوں شوٹرز تم سے کیا کہہ رہے تھے؟ تمہیں کہاں لے جا رہے تھے؟''

اس نے کہا۔ ''پہلے تو وہ مطمئن ہو گئے تھے کہ میں اور دُرگا پتی پتنی ہیں۔ پھر میری شامت آ گئی۔''

وہ اپنے کان کے نیچے ہاتھ لے جا کر بولا۔ ''میرا.. یہ زخم کا نشان اکثر میری پہچان بن جاتا ہے۔ ایک نے اس نشان کو دیکھتے ہی کہا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ بھاسکر جی کی پتنی کے ساتھ جو شخص ہے' اس کے بائیں کان کے نیچے زخم کا نشان ہے۔''

''ہوٹل کے باہر بھاسکر کا ایک خاص آدمی کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے مجھے لے جا رہے تھے۔ میں مطمئن تھا کہ باہر میرے بھی مسلح ماتحت موجود ہیں۔ اس سے پہلے ہی نیچے سے تم اور اوپر سے دُرگا نے آ کر ان کا کام تمام کر دیا۔''

مراد نے کہا۔ ''تم صرف دُرگا کے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی خطرہ بن گئے ہو۔ ابھی یہاں سے الگ ہو جاؤ۔ ہمارا فون کے ذریعے رابطہ رہے گا۔''

وہ تینوں چلتے چلتے رک گئے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو بڑی محبت اور بڑے دکھ سے دیکھا۔ وہ بچھڑنا نہیں چاہتے تھے۔ دُرگا نے اس کے بازو کو تھام کر کہا۔ ''میں کسی بھی مصیبت کے اندھیرے میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی۔ لیکن بچے کی سلامتی کے لیے مجبور ہو رہی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''بے شک' ہر حال میں بچے کی سلامتی کو ترجیح دی جائے گی۔ ہم جلد ہی ملیں گے۔''

اس نے دُرگا کا ہاتھ تھاما تو وہ یکلخت قریب ہو کر اس کی دھڑکنوں سے لگ گئی۔ بڑی بے قراری سے بولی۔ ''میں عورت ہوں مگر پتھر ہوں۔ مجھے رونا نہیں آتا۔ پہلی بار میرا دل تم سے بچھڑتے ہوئے رو رہا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ جاتے جاتے کچھ مانگ رہا ہوں' دو گی؟''

''جو چاہو' مجھ سے لے لو۔ انکار نہیں کروں گی۔''

وہ دوسرے ہی لمحے میں اس کے لبوں پر اُتر گیا۔ دو سانسیں گڈمڈ ہونے لگیں۔ مراد نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اسے ماروی یاد آنے لگی۔ اس کے چاروں طرف پھول کھلنے لگے۔ لیکن بارود سے کھیلنے والوں کو چوکنا رہنا پڑتا ہے۔

اس نے تھوڑی دیر بعد ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''بس کرو...... پولیس والے آ جائیں گے۔''

چند لمحوں کے بعد چمپت راؤ نے اس کے شانے پر

ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”دوست! تیرا شکریہ۔ آج پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ یہ زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ دُرگا تیرے حوالے ہے۔ میں جا رہا ہوں۔“

وہ دُرگا کو پیار سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ مراد اسے لے کر گرودیو کے استھان میں پہنچا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہاں سب جاگ رہے تھے۔ ہارمونیم اور ڈھولک کی مرمت کرنے کے بعد گانے اور ناچنے کی ریہرسل کر رہے تھے۔

کناری، مراد کو دیکھتے ہی خوشی سے دوڑتی ہوئی آکر اس سے لگ گئی۔ مراد نے گرودیو کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”مہاراج! میری ایک بہن کناری آپ کے پاس ہے۔ یہ دوسری بہن دُرگا ہے۔ دشمن اس کے پیچھے ہیں۔ اسے چھپ کر رہنا ہوگا۔ میں اسے آپ کی پناہ میں لے آیا ہوں۔“

درگا نے سر جھکا کر گرودیو کے پاؤں چھو لیے۔ انہوں نے کہا۔ ”میرے آشرم میں بہت ساری بیٹیاں آتی رہتی ہیں۔ یہاں میری بیٹی بن کر رہو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

مراد نے کناری سے اور اس کی بہن منجو سے کہا۔ ”یہ یہاں تمہاری بیوہ بہن بن کر رہے گی اور جب تک ساتھ رہے گی، تب تک تم سب کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات پوری کرنے کے لیے تمہیں اچھی خاصی رقم ملتی رہے گی۔ دوست ہوں یا دشمن سب ہی کو یقین ہونا چاہیے کہ یہ تمہاری سگی بہن ہے۔“

بڑی بہن منجو نے بچے کو دُرگا سے لے کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم تو اسے کلیجے سے لگا کر رکھیں گے۔“

کناری نے دُرگا سے لپٹ کر کہا۔ ”یہ میری بڑی دیدی ہیں، ہمیں ایک ہی ماں نے جنا ہے۔ ہم سگی بہنیں ہیں۔“

کناری کے بوڑھے باپ نے دُرگا کے سر پر ہاتھ رکھ کر مراد سے کہا۔ ”جب سے تم ہماری زندگی میں آئے ہو، ہمارے دلدّر دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم یہاں چار مہینوں میں جتنا کما کر لے جاتے ہیں، اس سے زیادہ تم نے ایک ہی دن میں دے دیا تھا۔ اب ہمارے کھانے پینے اور دوسری ضرورتیں بھی پوری کرنے والے ہو۔ خوش رہو بیٹے! یہ بوڑھا تمہارے لیے پرارتھنا کرتا ہے کہ بھگوان تمہاری سب سے بڑی منوکامنا پوری کرے۔“

اس کی دعا سنتے ہی نگاہوں کے سامنے ماروی آگئی۔ وہی اس کی پہلی اور آخری منوکامنا تھی۔ بوڑھے بابا نے بھگوان سے اس کے لیے دعا مانگی۔ وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے بولا۔ ”یا اللہ! یا میرے معبود! آمین...“

پھر اس نے دُرگا سے کہا۔ ”جب تک میں نہ کہوں، اس آشرم کی چار دیواری سے باہر نہ نکلو۔ کھڑکی سے بھی نہ جھانکو۔ کوئی تمہیں نہیں دیکھے گا تو محفوظ رہو گی۔“

وہ اپنا ٹھکانا بنانے کے لیے گرودیو کے استھان سے چلا آیا۔

دوسری طرف بھاسکر غصے سے تلملا رہا تھا۔ دُرگا اس کے ہاتھ آتے آتے پھسل رہی تھی۔ وہ دہلی سے شملہ تک براڈ گیج ٹرین سے لے کر نیرو گیج ٹرین تک اس کے سات شوٹرز کو موت کے گھاٹ اتار چکی تھی۔ بعد میں اسے مراد کی فون کال سے معلوم ہوا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اسلحے کا ایک انٹرنیشنل کھلاڑی ہے۔

جے جے بھاسکر سمجھ گیا کہ وہ مراد علی منگی ہی ہوگا۔ اس نے میکی براؤن سے رابطہ کیا تھا اور مراد کے متعلق مزید معلومات حاصل کی تھیں۔ میکی کے لیے بھی وہ لمحۂ فکریہ تھا۔ وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ مراد نیرو گیج ٹرین کے ذریعے شملہ پہنچ رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”مسٹر بھاسکر! میں نے اپنی بیٹی کے اطراف ایسے سخت حفاظتی انتظامات کیے ہیں کہ وہ کسی بھی بہروپ میں قریب آئے گا تو حرام موت مارا جائے گا۔“

پھر وہ گالیاں دیتے ہوئے بولا۔ ”ایسا لگتا ہے۔ گاڈ سے زندہ رہنے کا ٹھیکا لے کر آیا ہے۔ پاکستان، ہندوستان، یو کے اور سن سٹی میں میرے درجنوں شوٹرز کو ہلاک کر چکا ہے۔“

بھاسکر نے کہا۔ ”میں اس کے بارے میں سنتا آرہا ہوں، وہ بہت ہی خطرناک کلر ہے۔“

میکی نے کہا۔ ”میں بیٹی کو سمجھاتا ہوں، وہاں سے واپس آجائے لیکن وہ پورے یقین سے کہتی ہے کہ وہ دشمن عورتوں کی عزت کرتا ہے اور کبھی کسی عورت کو نقصان نہیں پہنچاتا۔“

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”بیٹی کی یہ بات میں بھی مانتا ہوں۔ وہ دشمن اسے ہلاک نہیں کرے گا۔ پھر بھی دشمن تو دشمن ہی ہوتا ہے۔ کوئی نقصان ضرور پہنچائے گا۔“

بھاسکر نے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ اب میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ شملہ میں میرے بارہ شوٹرز ہیں۔ وہ کسی نہ کسی کی گولی سے ضرور مارا جائے گا۔“

وہ ٹرینوں میں اپنے سات شوٹرز کی ہلاکت کا تماشا دیکھنے کے باوجود یہ دعویٰ کر رہا تھا کہ مراد اس کے کسی گن مین کے ہاتھ سے نہیں بچے گا۔ اس کا یہ دعویٰ پھر باطل ہوا، جب اس کے دو گن مین ہوٹل میں مارے گئے۔ تب اس نے میکی براؤن سے پھر فون پر کہا۔ ”میرے آدمی دُرگا کو

اور میرے بیٹے کو تلاش کر رہے ہیں۔ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے ہوٹل جمنا میں گئے تھے۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کمینہ وہاں موجود ہوگا۔''

اس نے گالیاں دے کر کہا۔''میرے دو آدمی مارے گئے ہیں۔ میں اسے شملہ سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔''

میکی نے کہا۔''پھر تو مراد وہاں موجود ہے۔ اس ہوٹل کو فوراً گھیر لو۔ میں بھی اپنے آدمی وہاں بھیج رہا ہوں۔''

''وہاں اب کچھ نہیں ہے۔ پولیس انکوائری ہو چکی ہے۔ ہوٹل کے کمروں کی اور لوگوں کی تلاشیاں لی جا چکی ہیں۔ وہاں مراد کا سایہ بھی کسی کو نظر نہیں آیا۔ ہوٹل کے مالک نے بتایا کہ کچھ مسلح افراد ہوٹل میں آئے تھے پھر چلے گئے۔ ان کی بندوقوں کے سامنے کوئی کچھ بول نہ سکا۔ ویسے ان میں مراد جیسے قدوقامت کا کوئی شخص نہیں تھا۔''

میکی وہاں نہیں تھا۔ وہ فون کے ذریعے سب سے رابطہ رکھتا تھا۔ اس نے بھاسکر سے کہا۔''وہ واردات کر کے فرار ہونا اور چھپنا جانتا ہے۔ پھر یہ کہ کسی نئے بہروپ میں... ہوگا۔ ایک بار شناخت ہو جائے تو پھر چھپ نہیں سکے گا۔''

بھاسکر نے کہا۔''دُرگا کے ساتھ رہنے والے کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے بائیں کان کے نیچے زخم کا نشان ہے۔''

میکی نے کہا۔''مراد کی ایسی کوئی پہچان نہیں ہے۔ دُرگا کے ساتھ وہ کوئی دوسرا آدمی ہوگا۔''

''کوئی بات نہیں۔ وہ دوسرا ہی گرفت میں آجائے تو دُرگا اور میرا بیٹا مجھے مل جائے گا اور مراد بھی ہاتھ آسکتا ہے۔''

''درست کہتے ہو۔ ہمیں ایک پہچان معلوم ہو گئی ہے۔ میں اپنے تمام شوٹرز کو اس کی یہ پہچان بتاؤں گا۔''

یوں انہیں اس حد تک اطمینان ہوا کہ چمپت راؤ ان کی گرفت میں آئے گا تو وہ اس کے ذریعے دُرگا اور مراد تک ضرور پہنچیں گے۔

☆☆☆

ماسٹر کو بوبو کے سامنے شطرنج کی جو بساط بچھی رہتی تھی، اس پر کئی مہرے تھے۔ ان میں سب سے اہم مہرہ بادشاہ ہوتا ہے اور وہ شہ دینے والا شہ زور بادشاہ مراد علی منگی تھا۔ اس کے دم سے ماسٹر کی شطرنجی جنگ جاری تھی۔

اب بلال احمد عرف بلا دوسرا اہم مہرہ بن گیا تھا۔ وہ پہلی ہی واردات میں میکی کے ایک بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار کر ماسٹر کی آنکھ کا تارا بن گیا تھا۔ پھر وہ.... میکی کو اور دہشت زدہ کرنے کے لیے اسٹیڈیم کے باہر اس کی گاڑیوں کو تباہ کر چکا تھا۔

اس کے بعد ماسٹر کو ایک اور چونکا دینے والی بات معلوم ہوئی کہ بلے کی وائف بشریٰ نے میکی کے دوسرے اور آخری بیٹے کو گولی ماری ہے۔ مرینہ کے بعد ایک عورت کا یہ بہت ہی حیران کرنے اور چونکا دینے والا کارنامہ تھا۔ اگرچہ دشمن کا بیٹا بچ گیا تھا۔ صرف زخمی ہوا تھا۔ تاہم بشریٰ کی دلیری نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ خطرات سے کھیلنا جانتی ہے۔

ماسٹر نے بلے سے کہا۔''میں تمہاری وائف کو ایک لاکھ ڈالرز انعام کے طور پر دے رہا ہوں‘ اس نے میرے دشمن کے بیٹے کو مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

وہ خوش ہو کر بول رہا تھا۔''اور یہ بات اطمینان کا باعث ہے کہ تمہاری وائف مرینہ کی طرح فائٹر ہے، ماروی کی طرح پرابلم بننے والی بیوی نہیں ہے۔''

بلے نے کہا تھا۔''یس ماسٹر! میری وائف نے سن سٹی میں رہ کر جو ٹریننگ حاصل کی ہے، اس پر عمل کر رہی ہے۔ میں بھی مطمئن ہوں۔ وہ ایک گھریلو عورت کی طرح کوئی پرابلم نہیں بنے گی۔ میں اسے اور ٹریننگ دے رہا ہوں۔''

پھر بشریٰ نے میڈونا کو اوندھے منہ گرا کر ماسٹر کو اور زیادہ خوش کر دیا تھا اور زیادہ اس کی حمایت حاصل کر لی تھی۔ اس نے کہا۔''بلے! تمہاری عورت دشمنوں کے لیے خطرے کی گھنٹی بننے والی ہے۔ اس کی ٹریننگ پر توجہ دیتے رہو۔ میں اس کے اخراجات کے لیے ماہانہ پچاس ہزار ڈالرز دیا کروں گا۔''

بشریٰ نے سنا تو خوش ہوگئی۔ بلے کے گلے لگ کر بولی۔''اس کا مطلب ہے‘ ماسٹر نے مجھے بھی اپنے گینگ میں ایک فائٹر بنا لیا ہے۔ میں تیرے ساتھ تمام وارداتوں میں شریک رہا کروں گی۔''

وہ بولا۔''ہاں جہاں میں ضروری سمجھوں گا‘ وہاں ساتھ لے کر جایا کروں گا۔''

''میں ہر جگہ ہر لمحہ تیرے لیے ضروری ہوں۔ یہ مت بھول کہ تیری گھر والی بھی ہوں۔ موت ایک بار پیچھا چھوڑ دیتی ہے بیویاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔''

وہ بولا۔''تو میرے لیے مصیبت بننے والی ہے۔ ماسٹر تجھے سر پر چڑھا رہا ہے۔''

''میں کام ایسا کر رہی ہوں۔ وہ کامیاب ہونے والوں کی قدر کرتا ہے۔ تو دیکھ لینا۔ وہ تیری طرح اور مراد بھائی کی طرح ایک دن مجھ پر بھی بھروسا اور فخر کرنے لگے گا۔''

وہ پارہ صفت تھی۔ ہمیشہ حرکت میں رہنا چاہتی تھی۔ اسے مرد ذات پر بھروسا نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات گھسی ہوئی تھی کہ مرینہ جیسی بن کر رہے گی تو بلا ہمیشہ اس سے بندھا رہے گا۔ مراد بھائی کی طرح دوسری طرف نہیں لُڑھکے گا۔

بلا بے شک کارنامے انجام دے رہا تھا۔ ماسٹر کی اجازت سے مراد بن کر ڈبل گیم کھیل رہا تھا۔ میکانو رابرٹ کے ذاتی خفیہ معاملات میں اس کا رازدار بن گیا تھا۔ وہ بڑی کامیابی سے اپنا کھیل کھیل رہا تھا۔

میکانو رابرٹ، مراد کو اپنا دوست اور گن فائٹر بنانے کے لیے سب سے چھپ کر لندن آیا تھا۔ لیکن لاکھ جتن کے باوجود اس سے ہونے والی ملاقات خفیہ نہ رہ سکی تھی۔

میکانو کا قابلِ اعتماد محافظ بوگاٹا آستین کا سانپ نکلا تھا۔ وہ کی ویو ہوٹل میں پہنچ کر بلّے کو وہاں دیکھ کر میکانو کے دشمن ہارپر کو اطلاع دے چکا تھا کہ اس کا بگ باس وہاں کسی اجنبی سے ملنے کے لیے بھیس بدل کر آیا ہے۔

بلّے اور میکانو کی لاعلمی میں بھید کھلنے والا تھا۔ دشمن اس ہوٹل میں بلّے کو گھیرنے والے تھے۔ یہ حقیقت معلوم کرنے والے تھے کہ بھیس بدل کر آنے والا مراد علی منگی ہے یا کوئی اور ہے؟ ایسے وقت بشریٰ نے پھر ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر بلّے کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔

وہ فوراً ہی گرفت میں آنے سے پہلے اس ہوٹل سے چلا گیا تھا۔ بشریٰ آستین کے سانپ کو چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اس نے ہوٹل کے ٹوائلٹ میں پہنچ کر بوگاٹا کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

ماسٹر نے حیرت سے اور مسرت سے فون پر کہا۔ ”ویلڈن بشریٰ......! میں پہلی بار تم سے براہِ راست بول رہا ہوں۔ تم نے بڑی ذہانت اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا ہے۔ بے شک بہت چوکنّی رہتی ہو۔ شاباش...!“

وہ خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔ ”تم نے بلّے کو گرفت میں آنے سے پہلے ہی اسے ہوٹل سے نکال دیا تھا۔ بوگاٹا نے بلّے کی صورت دیکھی تھی۔ اس پہچاننے والے کو تم نے جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ اب کوئی نہیں جان سکے گا کہ بلّا وہاں میکانو سے ملاقات کرنے گیا تھا۔“

ماسٹر نے پھر بلّے سے کہا۔ ”تم بہت لکی ہو۔ تمہاری وائف تم سے کچھ کم نہیں ہے۔ اسے تمام وارداتوں میں ساتھ رکھا کرو۔ یہ زیادہ سے زیادہ تجربات حاصل کرتی رہے گی۔“

وہ اس لیے بھی خوش تھا کہ بلّا مراد بن کر میکانو رابرٹ کا اعتماد حاصل کر چکا تھا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ اس کے اندرونی ذاتی معاملات تک پہنچ گیا تھا۔

ماسٹر کو یہ معلوم ہوا تھا کہ میکانو ہیروں کا ذخیرہ کہاں چھپا کر رکھتا ہے اور اس کی بے وفا بیوی جینیفر کس چور راستے سے اس تہ خانے تک پہنچتی تھی۔

یہ معلوم بھی ہوا تھا کہ جینیفر، انٹرنیشنل سی آئی اے کے چیف ولیم ہارپر اور انٹرپول کے زونل افسر گرو ور فرانسس کا ایک گروہ ہے۔ وہ تینوں میکانو رابرٹ کو بڑی مکاری سے بلیک میل کر رہے ہیں اور ہر ماہ کی دس تاریخ کو اس کے کاروباری منافع سے دس پرسنٹ شیئر حاصل کرتے رہتے ہیں۔

میکانو کی ایک کمزوری یہ تھی کہ اس کے بیٹے والٹر میکانو نے ایک یہودی پیشوا کی بیٹی کی آبرو لوٹی تھی اور پیشوا کو قتل کر کے فرار ہوا تھا اور مشرقِ بعید کے کسی ملک میں روپوش رہنے چلا گیا تھا۔

یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ انٹرپول کے گرو ور کی نظروں میں آ گیا تھا۔ وہ جب چاہتا، اس کے بیٹے کو عدالت میں پہنچا کر سزائے موت دلا سکتا تھا۔

میکانو اپنے بیٹے کو زندہ رکھنے کے لیے بھی ان کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا تھا۔ میکانو کی ایک داشتہ ولیم ہارپر کے گھر میں گورنس کی حیثیت سے رہتی تھی۔ اسے اپنی داشتہ سے کوئی کام لینا نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بلّے سے کہا تھا کہ کسی طرح وہ تمام کاغذات وہاں سے نکال لائے۔ اس کا ایکسٹرا معاوضہ دے گا۔

ہارپر اسکاٹ لینڈ میں رہتا تھا۔ جینیفر اس کے ساتھ دن رات رہتی تھی اور انٹرپول کا گرو ور فرانسس ان کے پاس چھٹیاں گزارنے آیا ہوا تھا۔ وہ اگلے ماہ کی دس تاریخ کو اپنا دس پرسنٹ شیئر لینے کے لیے کوٹاسٹی جانے والے تھے۔

ماسٹر نے بلّے سے کہا۔ ”ان خفیہ کاغذات میں میکانو رابرٹ کی جان ہے۔ اس کی یہ کمزوری میں اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتا ہوں۔ تم کسی طرح ہارپر کے سیف سے وہ تمام کاغذات لے آؤ۔

”اس کی دوسری کمزوری اس کا قاتل بیٹا والٹر میکانو ساؤتھ کوریا میں چھپا ہوا ہے۔ اسے انٹرپول کے گرو ور کے شکنجے سے نکال کر میرے شکنجے میں پہنچا دو۔“

ماسٹر نے مزید کہا۔ ”ہیروں کی کان سے جو منافع وہ حاصل کرتا ہے، اس کا بارہ پرسنٹ میں لیا کروں گا۔“

ادھر میکانو رابرٹ یہ دیکھ کر مطمئن تھا کہ مراد (بلّے)

نے پہلی ہی ملاقات میں اسے آستین کے ایک سانپ سے نجات دلائی تھی۔
بوگاٹا ایک عرصے سے اس کا قابل اعتماد دست راست تھا۔ یہ بشریٰ کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ اس نے اسے موت کے گھاٹ اتار کر بہت بڑا انکشاف کیا تھا۔ یہ میکانو کے لیے بہت اہم معلومات تھیں کہ وہ دشمن ولیم ہارپر کے لیے کام کررہا تھا۔
اب بشریٰ اور بلا، ولیم ہارپر کے پیچھے پڑ گئے تھے۔اس مقصد کے لیے اسکاٹ لینڈ آگئے تھے۔ولیم ہارپر اپنی نام نہاد بیوی جینیفر کے ساتھ رہتا تھا۔
وہی جینیفر جو دوغلی تھی۔ اِدھر ولیم ہارپر کی بیوی تھی اور اُدھر میکانو کی بھی شریکِ حیات تھی۔ میکانو کے ایک خفیہ تہ خانے سے کروڑوں ڈالرز کے ہیرے اور خفیہ کاغذات چرا کر لے گئی تھی۔
وہ پکی حرافہ تھی۔ بیک وقت دو شوہروں کی بیوی بن کر رہتی تھی۔ پھر ان کے گروہ کا تیسرا اہم فرد انٹرپول کا گروور فرانسس تھا۔ وہ بھی اپنے دوست ولیم ہارپر کی غیر موجودگی اور لاعلمی میں جینیفر کے کوے چاٹتا تھا۔
جینیفر اپنا گیم اس طرح کھیلتی رہی کہ ایک طرف ہیروں کے تاجر میکانو کی وفاشعار بیوی کہلاتی رہی، اسے فریب دیتی رہی۔ ذخیرے سے ہیرے چُرا کر دوسرے شوہر ہارپر کے پاس لاتی رہی اور چوری کا مال محفوظ رکھنے کے لیے سی آئی اے کے اس افسر کی گود میں کھیلتی رہی۔
اس کی مکاری یہ تھی کہ جتنا چرا کر لاتی تھی اس کے آدھے کا آدھا ولیم ہارپر اور گروور فرانسس کو دیتی تھی۔ باقی مال چھپالیا کرتی تھی۔ اس طرح ان دو بڑے قانون کے رکھوالوں کی پناہ میں محفوظ رہ کر انہیں بھی اُلّو بناتی رہتی تھی۔
جہاں چوری اور بے ایمانی ہوتی ہے، وہاں محبت اور سلامتی نہیں رہتی۔ وہ تینوں ایک دوسرے کے تعاون سے خوب مال کمارہے تھے لیکن درپردہ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔
گروور فرانسس کو اندیشہ تھا کہ ولیم ہارپر اسے ہلاک کرسکتا ہے۔ وہ مرجائے گا تو ایک حصے دار کم ہوجائے گا۔ ہارپر کا اور جینیفر کا شیئر اور منافع بڑھ جائے گا۔
یہی اندیشہ ولیم ہارپر کو بھی تھا کہ انٹرپول کا گروور کسی بھی ملک میں کسی بھی ماتحت کے ذریعے اسے قتل کراسکتا ہے۔
جینیفر عورت تھی، کمزور تھی۔ وہ دو مرد بھی اس کا گلا دبوچ لیتے تو وہ پھڑپھڑا کے مرجاتی۔ لاکھوں ڈالرز کے ہیرے اور کاکوٹا مائنز سے حاصل ہونے والا منافع دنیا ہی میں رہ جاتا۔ وہ تینوں آپس میں رازدار بلیک میلر تھے اور تینوں ہی ایک دوسرے سے خوفزدہ اور محتاط رہتے تھے۔ موت ایک راستے سے نہیں، کئی راستوں سے، کئی حیلے بہانوں سے آتی ہے۔ اب بشریٰ اور بلا ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ باقاعدہ پلاننگ کے مطابق وہ اور ان کے ماتحت دن رات ان تینوں کی نگرانی کررہے تھے۔
میکانو کی ایک داشتہ کا نام جون ایملی تھا۔ وہ ولیم ہارپر کے بنگلے میں گورنس کی حیثیت سے ملازمت کررہی تھی۔ ان تینوں کی باتیں سنتی رہتی تھی، ان کی مصروفیات دیکھتی رہتی تھی اور وہ تمام رپورٹ فون کے ذریعے میکانو رابرٹ کو پہنچاتی رہتی تھی۔
یوں بشریٰ اور بلا ان تینوں کے اندرونی معاملات کو بڑی حد تک سمجھ رہے تھے۔ میکانو نے فون کے ذریعے اپنی داشتہ ایملی کی دوستی بشریٰ سے کرائی تھی۔
بشریٰ نے ایملی سے پوچھا۔ "مجھے اس مکان کا اندرونی نقشہ سمجھاؤ۔ یہ بتاؤ وہ سیف کہاں ہے جہاں خفیہ کاغذات چھپا کر رکھے گئے ہیں؟"
اس نے فون پر بتایا کہ اس مکان کے کن حصوں سے گزر کر اس الماری اور سیف تک پہنچا جاسکتا ہے لیکن اسے کھولنا ممکن نہیں ہے۔ وہ آہنی سیف ہے۔ صرف چابیوں سے ہی نہیں، خفیہ نمبروں کے ذریعے بھی مقفل رہتا ہے۔
ایملی نے بتایا کہ جینیفر اور ہارپر کبھی پیار و محبت سے رہتے ہیں اور کبھی خفیہ کاغذات کے بارے میں جینیفر اس سے جھگڑتی ہے۔ گروور بھی یہی شکایت کرتا ہے کہ بلیک میلنگ کے اس اہم مواد کو تینوں پارٹنرز کے پاس رہنا چاہیے لیکن ہارپر ان اہم دستاویزات کی ہوا بھی انہیں لگنے نہیں دیتا دیتا۔
ان ہی دنوں ہارپر کو اپنی ڈیوٹی کے سلسلے میں ایک کیس کو نمٹانے کے لیے اٹلی کے شہر روم جانا پڑا۔ اس کی عدم موجودگی میں گروور نے آکر جینیفر کو پیار سے آغوش میں بھرلیا۔
چوری چھپے گناہوں کے کھیل میں مزہ بھی آتا تھا اور وہ ہارپر کے خلاف باتیں بھی کرتے تھے۔ بار بار اس آہنی سیف کو جاکر دیکھتے تھے۔ اسے کسی جتن سے کھول نہیں سکتے تھے... تب جینیفر نے کہا۔ "سیدھی سی بات سمجھ میں آتی ہے۔ ہم اس کی موت کے بعد ہی اسے توڑ سکیں گے۔ کبھی کھول نہیں سکیں گے۔ سیف کے خفیہ میکنزم کو اور مخصوص

نمبروں کو ہی جاتا ہے۔"
گرو ور نے کہا۔ "وہ خود غرض اور کمینہ ہے۔ میکا لو کو بلیک میل کرنے والی اہم کمزوری صرف اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ ہمارا مطالبہ بھی پورا نہیں کرے گا۔ تم درست کہتی ہو۔ اس کی موت سے ہی ہمیں فائدہ پہنچے گا۔"
اس نے فون کے ذریعے اپنے خاص ماتحتوں کو حکم دیا کہ ولیم ہارپر کو اٹلی سے زندہ واپس نہیں آنا چاہیے۔ ایملی نے بشریٰ کو فون کے ذریعے ان کے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ بشریٰ نے اس سے کہا۔ "جیسے ہی ہارپر کی ہلاکت کی اطلاع ملے اسی وقت مجھے کال کرو۔ میں انتظار کروں گی۔"
بلے نے کہا۔ "جب جینیفر اور گرو ور کو ہارپر کی ہلاکت کی اطلاع ملے گی، تب ہی گرو ور مطمئن ہو کر اس سیف کو توڑے گا۔ ہماری کامیابی کے لیے راستہ ہموار ہو رہا ہے۔"
وہ دونوں ایملی کی فون کال کا انتظار کرنے لگے۔ وہ کبھی کبھی ہارپر کی رہائش گاہ کی طرف جاتے تھے۔ ایملی فون پر انہیں بتاتی تھی کہ گرو ور وہاں جینیفر کے ساتھ موجود ہے یا وہ دونوں کہیں لنچ یا ڈنر کے لیے گئے ہیں۔
اس وقت بھی بشریٰ اور بلا... کار میں ولیم ہارپر کے بنگلے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔"
بشریٰ نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ آگے پیچھے اور دائیں بائیں کئی گاڑیاں تھیں۔ بلے نے کہا۔ "وہ دو ہیں۔ موٹر سائیکل پر ہیں۔"
وہ پھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "آگے پیچھے کئی موٹر سائیکلیں ہیں۔ تمہیں کس پر شبہ ہے؟"
"وہ دونوں براؤن لیدر جیکٹ میں ہیں۔ جب ہم اپنے اپارٹمنٹ سے نکل رہے تھے، تب میں نے انہیں دیکھا تھا۔ اب پھر انہیں ایک گھنٹے سے دیکھ رہا ہوں۔ تیار رہو، میں گاڑی ایسے راستے پر لے جا رہا ہوں، جہاں کم سے کم ٹریفک ہو گا۔"
اس نے اپنی کار دوسرے راستے پر موڑ دی پھر راستہ بدلتے ہوئے کسی ویران علاقے کی طرف جانے لگا۔ بشریٰ نے گن نکال لی تھی۔ بلے کی گن اس کی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ گاڑیاں کم سے کم ہوتی جا رہی تھیں اور وہ دونوں موٹر سائیکل والے مسلسل تعاقب میں دکھائی دے رہے تھے۔
بشریٰ نے کہا۔ "یہ علاقہ بالکل ہی ویران نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، وہ گولیاں چلائیں گے؟"

کتر نیں

- فقط ایک "اللہ" ہی ہے جو ایک سجدے اور ندامت کے اظہار پر ہی انسان کو اپنا بنا لیتا ہے ورنہ یہ حضرت انسان تو جان لے کر بھی راضی نہیں ہوتے۔
- کسی کی عزتِ نفس کو روند کر آپ کی انا کو شاید وقتی تسکین ضرور مل جائے مگر روح کو سکون نہیں ملے گا۔
- یہ ناممکن ہے کہ جو اللہ پاک نے آپ کے لیے لکھ دیا ہو، وہ کسی اور کے پاس چلا جائے۔
- کبھی کبھی کسی چیز کی قدر اور احساس کے لیے ضروری ہے کہ کچھ وقت اس کے بغیر رہا جائے۔
- گناہ گار کی عاجزی عبادت گزار کے غرور سے بہتر ہے۔
- اللہ کی قربت کا بہترین راستہ عاجزی ہے۔
- ایک میٹھا بول اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑوی،
اورنگی ٹاؤن، کراچی

وہ بولا۔ "لندن کی سڑکوں پر فائرنگ ممکن ہی نہیں ہے۔ پولیس کی گشتی گاڑیاں چشم زدن میں گھیر لیتی ہیں۔"
وہ عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "پھر بھی سوچو کہ یہ جان پر کھیل جانے کو آئے ہیں تو اپنے لیے خطرہ مول لے کر ضرور ہم پر فائر کریں گے۔"
اب ان کی گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ رفتار بڑھا کر قریب آنا چاہتے تھے۔ بلے نے کہا۔ "تم دیکھ رہی ہو، ان کے ہاتھوں میں گن نہیں ہے۔ تم گولی چلانے میں پہل نہ کرنا۔"
"وہ قریب آتے ہی اچانک گن نکالیں گے۔"
"مجھے ایسا نہیں لگ رہا ہے۔ پھر بھی محتاط رہو۔ انہیں ذرا اور قریب آنے دو۔"
وہ بشریٰ کی کھڑکی کی سمت سے آہستہ آہستہ قریب آنے لگے۔ اس نے گن چھپا کر تھام رکھی تھی۔ انگلی ٹریگر پر تیار تھی۔ پھر ذرا ڈھیلی پڑ گئی۔ آنے والے نہتے تھے۔ بائیک چلانے والا ہاتھ کے اشارے سے انہیں گاڑی

روکنے کو کہہ رہا تھا۔

بلے نے ونڈ اسکرین کے پار دور کھڑی ہوئی پولیس موبائل کار کو دیکھا۔ آنے والے نے سوچ سمجھ کر ہی وہاں رکنے کو کہا تھا۔ یعنی دشمنی کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس نے کار کی رفتار کو سست کرتے ہوئے سڑک کے کنارے اسے روک دی۔

آنے والے نے کہا۔ ''السلام علیکم۔'' بشریٰ اور بلے نے سلام کا جواب دیا۔ آنے والے نے کہا۔ ''ہم آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

بلے نے ذرا سوچا پھر کہا۔ ''بشریٰ! تم پیچھے چلی جاؤ۔''

وہ کار کے اندر جھک کر پچھلی سیٹ پر آ گئی۔ بائیک والا اگلی سیٹ پر آ کر بولا۔ ''شکریہ، میرا نام نظام بن عظیم ہے اور میرے ساتھی کا نام قدرت اللہ ہے۔ ہم لبنانی ہیں۔''

بلے نے کہا۔ ''ہم اپنا نام ابھی نہیں بتائیں گے۔ پہلے ہم سے ملاقات کا مقصد بتاؤ؟''

نظام بن عظیم نے کہا۔ ''ہم نے تمہیں ایسٹ بورن کے ہوٹل میں دیکھا تھا۔ تم نے وہاں میکانو رابرٹ سے ملاقات کی تھی۔''

بلے نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم ہمارے معاملات میں دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟''

''ہم نے تمہارے بارے میں معلوم کیا ہے، تم مسلمان ہو اور پاکستانی ہو۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں، کیا تم میکانو رابرٹ کی اسلام دشمنی سے واقف ہو؟''

بشریٰ اور بلے کے لیے یہ نئی اطلاع تھی۔ انہوں نے چونک کر نظام بن عظیم کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ''اگر تم جانتے ہو اور تم اس دشمن اسلام کا ساتھ دے رہے ہو تو پھر ہماری دشمنی تمہیں مہنگی پڑے گی۔ ہم ابھی نہتے ہیں۔ تمہیں وارننگ دے کر چلے جائیں گے۔ اس کے بعد مجاہدین آج یا کل تمہیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔''

بلے نے کہا۔ ''میں میکانو کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ایک مجرمانہ تنظیم ڈی ڈی ٹی یعنی ڈیرنگ ڈائمنڈ ٹریڈرز کا سربراہ ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ ہمارے دین کا دشمن ہے تو خدا کی قسم اس سے بات بھی نہ کرتا۔''

بشریٰ نے پوچھا۔ ''پلیز یہ بتاؤ، وہ کس طرح ہمارے دین سے دشمنی کر رہا ہے۔''

وہ بولا۔ ''مسلمانوں کے خلاف اُن کا ایک ادارہ ہے۔ اس کا نام ڈبلیو اے ایم یعنی وار اگینسٹ مسلم ہے۔ میکانو رابرٹ اس ادارے کا ایک اعلیٰ عہدیدار ہے۔ اس ادارے سے قرآن مجید پر اور دینی احکامات پر گمراہ کن تنقید اور تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔ اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹی وی اور دستاویزی فلموں کے ذریعے مجاہدین کو تخریب کار اور دہشت گرد ثابت کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میکانو اس ادارے کو لاکھوں ڈالرز کی مالی امداد فراہم کرتا رہتا ہے۔''

بلے نے ندامت سے کہا۔ ''یا خدا... ! یہ لاعلمی میں کیا ہو رہا تھا، ہم اپنے ذلیل دشمن سے بے خبر تھے۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ ہیروں کا تاجر ہے۔ ڈی ڈی ٹی کا سربراہ ہے اور جرائم کے حوالے سے ہتھیاروں کا بہت بڑا اسپلائر ہے۔''

نظام بن عظیم نے کہا۔ ''جن ممالک میں مسلمانوں کے خلاف تحریک چلائی جاتی ہے اور ان کے خلاف جنگ جاری رکھی جاتی ہے، وہاں میکانو کا بیٹا والٹر میکانو ہتھیار سپلائی کرتا تھا۔ آج کل افریقا سے فرار ہو کر کسی ملک میں جا کر روپوش ہو گیا ہے۔''

بشریٰ اور بلا جانتے تھے کہ والٹر میکانو کوریا میں گرو ور فرائکس کا قیدی بنا ہوا ہے۔

نظام بن عظیم نے کہا۔ ''تم دونوں سی آئی اے کے چیف ولیم ہارپر کے بنگلے کی طرف گئے۔ صبح سے اب تک وہاں کے دو چکر لگا چکے ہو۔ یہ چکر کیا ہے؟''

بلے نے اسے بتایا کہ میکانو اور ہارپر کے درمیان کیا دشمنی ہے اور آج گرو ور کے ماتحت ہارپر کو کوٹھی میں قتل کرنے والے ہیں اور شاید اس کا کام تمام کر چکے ہوں گے۔

بشریٰ نے کہا۔ ''بلے! یہ کمبخت میکانو ہم مسلمانوں کے خلاف لاکھوں ڈالرز ڈبلیو اے ایم کے ادارے کو دیتا ہے۔ اب ہم وہاں سے حاصل ہونے والے کروڑوں ڈالرز کے ہیرے اپنے مجاہدین کو ہتھیار خریدنے کے لیے دیں گے۔''

بلے نے تائید میں سر ہلا کر نظام بن عظیم سے کہا۔ ''آج کسی وقت ہارپر کے آہنی سیف کو توڑا جائے گا۔ اس میں اہم کاغذات اور لاکھوں، کروڑوں ڈالرز کے ہیرے ہوں گے۔ اگر مجاہدین ہمارا ساتھ دیں گے تو وہ تمام ہیرے ہم ان کے لیے چھوڑ دیں گے۔ صرف کاغذات لے جائیں گے۔''

وہ خوش ہو کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ہم اتنی بڑی امداد کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ آئندہ تم جس ملک میں بھی جاؤ گے، وہاں تمہاری سیکیورٹی کے لیے ہمارے ساتھی جان کی بازی لگاتے رہیں گے۔''

بشریٰ اور بلے نے خوش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ انہیں مجرمانہ زندگی گزارتے گزارتے اچانک نیکیاں کمانے

اور ایمان کی طرف لوٹ آنے کا راستہ مل رہا تھا۔

بلے نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام بلال احمد ہے، یہ میری وائف بشریٰ ہے۔''

ایسے ہی وقت ایملی نے فون پر کہا۔ ''ہیلو۔ اس وقت جینیفر خوشی سے ناچ رہی ہے۔ ابھی اٹلی کے شہر روم سے اطلاع ملی ہے کہ ولیم ہارپر کو گولی ماردی گئی ہے۔ گروور آہنی سیف کو توڑنے کا سامان لینے گیا ہے۔ وہ کسی لاک بریکر کو لے کر آئے گا۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''تھینک یو ایملی! ہم ابھی آرہے ہیں۔''

وہ فون بند کرکے بلے سے بولی۔ ''فوراً ہارپر کے بنگلے میں چلو۔ وہ حرام موت مرچکا ہے۔ ایملی کہہ رہی ہے کہ گروور کسی لاک بریکر کو لانے گیا ہے۔''

بلے نے کار اسٹارٹ کرکے اسے واپسی کے لیے موڑتے ہوئے کہا۔ ''نظام! اپنے ساتھی سے بولو، ہمارے پیچھے آئے۔ وہ آہنی تجوری ٹوٹنے والی ہے۔''

اس نے اپنے ساتھی کو بائیک پر آنے کے لیے کہا۔ پھر فون کے ذریعے دوسرے مجاہدین سے باتیں کرنے لگا۔

بشریٰ اور بلا تنہا وہاں جاکر جینیفر اور گروور سے نمٹ سکتے تھے۔ لیکن انہیں اللہ کا بھیجا ہوا اسلامی لشکر مل رہا تھا۔ اسے اچانک ہی بے پناہ طاقت حاصل ہوگئی تھی۔

ادھر گروور فرانسس ایک لاک بریکر کو لے آیا تھا۔ وہ مختلف اوزار کے ذریعے آہنی تجوری کو توڑ رہا تھا۔ گروور کے دو مسلح ماتحت بنگلے کے باہر ڈیوٹی پر تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ جو بھی کررہے ہیں، اس سے دنیا والے بے خبر ہیں۔ کوئی ان کے راستے میں حائل ہونے نہیں آئے گا۔

تجوری کھل گئی۔ جیسے دل میں بھرا ہوا غبار نکلتا ہے اسی طرح تجوری سے چمکتے دمکتے ہیرے نکل پڑے تھے۔ جینیفر خوشی کے مارے تجوری سے لپٹ گئی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ تمام ہیرے سمیٹ کر اپنے پیٹ میں چھپالیتی۔

سیف کے ایک خانے میں فائلیں، بڑے لفافے اور ویڈیو فلمیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سب میکانو رابرٹ کے شیطانی کارناموں کے ٹھوس ثبوت پیش کرنے والی تھیں۔

گروور نے لاک بریکر سے کہا۔ ''تم نے ہمیں مالا مال کردیا ہے۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ انعام ملنا چاہیے۔''

وہ خوش ہوگیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں سہم گیا۔ گروور نے گن سے نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''افسوس تم اتنی بڑی چوری کے چشم دید گواہ ہو اور تمہاری پیشانی پر یہ نہیں لکھا ہوا کہ ہمارے رازدار بن کر رہو گے۔ ویسے بھی کسی رازدار کو زندہ چھوڑنا سراسر حماقت ہے اور ہم احمق نہیں ہیں۔''

اس نے اسے گولی ماردی۔ جینیفر نے اس یار کے بازو سے لگ کر ایملی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مائی ڈیئر...! یہ بھی چشم دید گواہ ہے اسے بھی اُڑادو۔''

وہ بولا۔ ''ہاں۔ نہ کسی گواہ کو اور نہ کسی حصے دار کو رہنا چاہیے۔ ہمارے بارہ پرسنٹ کا ایک حصے دار ولیم ہارپر کم ہوگیا۔ تم بھی کم ہوجاؤ گی تو ساری کی ساری آمدنی میری ہوگی۔''

جینیفر سہم کر پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اتنی دولت حاصل کرنے کا ذریعہ میں ہی ہوں۔ یہ سب کچھ میں ہی کما کر لاتی رہی ہوں۔ آئندہ بھی تمہارے لیے کماتی رہوں گی۔''

''درست کہتی ہو لیکن آئندہ میکانو جیسا کوئی اُلو نہیں پھنسے گا۔ تم ایک نہیں تین تین مردوں کو بھگتاتی رہی ہو۔ تمہاری جوانی کے تمام کس بل ڈھیلے پڑگئے ہیں۔ تم میں اب رہ ہی کیا گیا ہے؟ کئی مردوں سے کھیلنے والی عورت وفادار نہیں ہوتی۔''

اس نے ٹریگر کو دبایا۔ گولی سیدھی سینے میں پیوست ہوئی۔ اس کے دیدے پھیل گئے۔ وہ تجوری سے ٹکراتی ہوئی زمیں بوس ہوگئی۔

ہائے ری ہوس دولت...! ہائے ری حسرت زندگی...! وہ اپنی زندگی میں تقریباً پچاس کروڑ کے ہیرے حاصل کرچکی تھی۔ وہ اپنی جوانی کے تمام تیر چلا کر تمام شیطانی کمائی چھوڑ کر چلی گئی۔

ایملی بُری طرح سہمی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بولی۔ ''مجھے نہ مارو، میں تمہاری وفادار بن کر رہوں گی۔ میں جینیفر کی طرح بے شرم اور بدچلن نہیں ہوں۔''

وہ بڑی سفاکی سے بولا۔ ''میں انٹرپول کا بندہ ہوں۔ بہت دور کی خبر رکھتا ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ تم بھی میکانو کی داشتہ تھیں۔ میں کسی رازدار کو پالنے کی حماقت نہیں کروں گا۔''

یہ کہتے ہی اس نے نشانہ لیا۔ لیکن گولی نہ چلاسکا۔ ایک گولی اس کے ہاتھ میں آکر لگی۔ بلے نے اس کی گن گرادی تھی۔ ایملی خوشی سے چیختی ہوئی دوڑتی ہوئی جاکر بشریٰ سے لپٹ گئی۔

بشریٰ نے اسے ایک طرف ہٹا کر گروور سے کہا۔ ''تم لوگوں نے دولت کی ہوس میں ایک دوسرے کو کتے کی طرح کاٹ کھایا ہے۔ میکانو بھی کتا ہے تمہارے بعد وہ بھی جائے گا۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے گن کو تھام کر گرو ور کا نشانہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''بلے! کہاں ماروں؟''

وہ بولا۔ ''تو ابھی تک صحیح نشانہ نہیں لگا پاتی۔ ٹھیک اس کی ناف میں گولی گھسا دے۔''

اس نے جم کر نشانہ لیا۔ پھر ٹریگر کو دبایا تو گولی ناف کے کچھ زیادہ ہی نیچے جا کر لگی۔ گرو ور اس جگہ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اُچھل کر صوفے پر گر کر تڑپنے لگا۔

وہاں کھڑے ہوئے مجاہدین ہنسنے لگے۔ بلے نے ڈانٹ کر کہا۔ ''کیا کرتی ہے؟ یہ اپنی عورت کے پاس کیسے جائے گا؟''

وہ بولی۔ ''ہاتھ ہل گیا تھا۔ اب بول کہاں ماروں؟''

''پیشانی میں سوراخ کر دے۔''

اس بار اس نے اچھی طرح جم کے نشانہ لیا۔ گولی نے پیشانی میں سوراخ کر دیا۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ وہ صوفے سے لڑھک کر فرش پر پہنچ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔

مجاہدین تجوری کے پاس آگئے۔ وہاں سے ہیرے نکال کر ایک بیگ میں ڈالنے لگے۔ بلے نے وہ تمام دستاویزی ثبوت اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میکا نو مجھے لاعلمی میں استعمال کر رہا تھا۔ اب میں اسے اسلام دشمنی کا مزہ چکھاؤں گا۔''

نظام بن عظیم نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''تم پہلی ہی ملاقات میں ہماری بہت بڑی طاقت بن گئے ہو۔''

دونوں کے ہاتھ گرم جوشی سے مصافحے کے لیے مل گئے۔

☆☆☆

انسان کی زندگی میں عقل ہے تو سلامتی ہے۔ ورنہ شامت پر شامت آتی رہتی ہے۔ چمپت راؤ گردن کے صرف ایک زخم کے نشان کے باعث گرفت میں آنے والا تھا لیکن اس نے ذہانت سے کام لے کر اپنا بچاؤ کیا۔

جب گردن کی ہڈی کسی حادثے میں تڑخ جاتی ہے یا کسی وجہ سے ہڈی کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہوتی ہے تو مریض کو نیک کالر پہننے کے لیے دیا جاتا ہے۔ چمپت راؤ نے نیک کالر پہن لیا تھا۔ کان کے نیچے کا زخم اس کالر میں پوری طرح چھپ گیا تھا۔ اب وہ آسانی سے پہچان میں آنے والا نہیں تھا۔

جنوری اور فروری میں کلثری کے مقام پر برف جمی رہتی ہے۔ وہاں اسکیٹنگ کے مقابلے ہوتے ہیں۔ کلثری اسکیٹنگ کے لیے قدرتی برفانی میدان ہے۔ وہاں جوان عورتیں اور مرد سیکڑوں کی تعداد میں تختہ رانی کی مہارت دکھانے آتے ہیں۔ بڑا ہی دلچسپ کھیل ہوتا ہے۔ میلوں دور تک کھلاڑی نشیب و فراز سے گزرتے وقت نگاہوں سے کبھی اوجھل ہوتے ہیں، کبھی نظر آنے لگتے ہیں۔

میڈونا اور ایمان علی اسکیٹنگ کے تمام سامان کے ساتھ میدان میں آگئے تھے۔ چھ مسلح گارڈز بھی ان کے آس پاس رہ کر اسکیٹنگ کا مظاہرہ کرنے والے تھے۔

میڈونا نے ایمان علی کی گردن میں بانہیں ڈال کر پوچھا۔ ''میرے ساتھ دوڑ لگاؤ گے؟ آخری فلیگ تک جا سکو گے؟''

وہ اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر بولا۔ ''بے شک۔ تم دیکھ لینا' میں تم سے آگے نکل جاؤں گا۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''مانتی ہوں' تم اِنڈور محبت کے کھلاڑی ہو۔ لیکن یہ آؤٹ ڈور ہے، تمہیں آگے نکلنے نہیں دوں گی۔''

وہ اس سے لگی ہوئی بول رہی تھی اور اس پر قربان ہو رہی تھی۔ جیسا آئیڈیل اس کے ذہن میں تھا' ایمان علی اس سے بھی سوا تھا۔ اسے صرف تن سے نہیں من سے بھی جیت چکا تھا۔

وہاں مراد اور چمپت راؤ بھی اپنے ماتحتوں کے ساتھ موجود تھے۔ چمپت راؤ نے نیک کالر پہنا ہوا تھا۔ ایسے مریض اسکیٹ نہیں کر سکتے۔ وہ تماشائی کی حیثیت سے وہاں آیا تھا۔ وہ اور مراد باقاعدہ پلاننگ کر چکے تھے کہ انہیں کرنا کیا ہے؟ پھر پلاننگ پر عمل کرنے کا وقت آگیا۔ میڈونا اور ایمان علی نے فلیگ نمبر وَن سے اسٹارٹ لیا۔ وہاں سے اِسٹکس کے ذریعے آگے جانے لگے۔ ان کے آس پاس مسلح گارڈز فاصلہ رکھ کر چلنے لگے۔ ان کے پیچھے چمپت راؤ کے مسلح ماتحت بھی دوڑ لگانے لگے۔ ان سب کے پیچھے مراد تھا۔

اس نے ان لمحات میں میکی براؤن کو فون پر مخاطب کیا۔ بہت ہی سرد لہجے میں بولا۔ ''ہیلو میکی! تو مجھے آواز سے پہچان لے۔ تھوڑی دیر بعد میرے کام سے بھی پہچانے گا۔''

وہ یکلخت چونک کر بولا۔ ''تت...... تم...؟''

''تجھے یہ خبر سنا رہا ہوں کہ تیری بیٹی گئی۔ میں اس کے پیچھے اسکیٹ کرنے جا رہا ہوں۔''

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میکی براؤن اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



وصیت

ابراہیم جمالی

نیکی کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ وہ بھی اپنے نیک اعمال بھول چکا تھا کہ اچانک ایک بھولی بسری نیکی نے اس کے دروازے پر چپکے سے دستک دے ڈالی اور پھر... وہ گزرے ہوئے لمحات مکمل زیروزبر اور پیش کے ہمراہ ہاتھ باندھے اس کے آگے کھڑے ہو گئے جب کہ ان لمحوں کی قدروقیمت سے وہ بالکل بے خبر تھا لیکن... نیکی کبھی نہیں بھولتی کہ کس نے اسے کس طرح ادا کیا۔

تنہائی کا عذاب جھیلنے والے ایک شخص کی محبتوں کا اظہار

صبح ناشتے کے لیے کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔ میں اٹھنے لگا تو سیما نے کہا۔ ”آپ چائے پیجیے، میں جا کر دیکھتی ہوں۔“

اس نے دروازہ کھولا تو پوسٹ مین نے سیما کو ایک لفافہ دے کر دستخط کرنے کا کہا۔

”کس کا خط ہے؟“ میں نے بیٹھے بیٹھے ہی پوچھا۔

سیما حیرت سے لفافے کو الٹ پلٹ کے دیکھ رہی تھی۔ ”کسی وکیل کا ہے...... لفافے پر بھیجنے والے کا نام ”جان مارٹن ایڈووکیٹ“ لکھا ہے۔“

یہ سنتے ہی میں نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا۔ میں

انگلینڈ میں قانونی طور پر آیا تھا اور اب اس پینسٹھ برس کی عمر میں کسی وکیل کی جانب سے بھیجے جانے والے خط کو دیکھ کر مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ اشتیاق اور خوف کے ملے جلے احساس کے ساتھ میں نے لفافہ کھولا اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

"تھرٹی ڈربی ایونیو لندن میں قیام پذیر مسٹر جیمس وارن کا پچاسی برس کی عمر میں اٹھائیس نومبر کو انتقال ہو گیا ہے۔ ان کی وصیت میں کچھ دیگر لوگوں کے ساتھ آپ کا نام بھی شامل ہے۔ جیمس کی وصیت پندرہ دسمبر سہ پہر تین بجے ان کی رہائش گاہ پر پڑھی جائے گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ بتائے گئے ایڈریس پر تشریف لائیں یا آفس کے پتے پر فون کے ذریعے مطلع کریں۔"

"یہ جیمس وارن کون ہے؟" سیما نے بے تابی سے پوچھا۔ "میرے سامنے تو آپ نے اس نام کے کسی شخص کا ذکر نہیں کیا۔"

میں جیسے کسی پرانے ٹائم زون میں پہنچ گیا تھا۔ ماضی کے کچھ مناظر ذہن کی اسکرین پر ابھر کر پرانی تمام باتیں میری یادداشت پر تازہ کر گئے۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سیما کو بتانا شروع کیا۔

"میں ان دنوں غیر شادی شدہ تھا اور تنہا لندن میں رہتا تھا۔ میں کبھی کبھی ایونیو پارک چلا جاتا تھا جو میری رہائش گاہ سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں میں اکثر ایک بوڑھے انگریز کو بینچ پر بیٹھا ہوا دیکھتا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ، پینسٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ ہمیشہ اکیلا ہی نظر آتا تھا اور وہاں سے گزرنے والے ہر شخص کو مسکرا کر "گڈ مارننگ" یا "گڈ ڈے" کہہ کر اس طرح مخاطب ہوتا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

"جب انگلینڈ میں دھوپ کھلکھلاتی ہو تو ایسے میں کون اس بوڑھے کی اول جلول باتوں میں اپنا وقت ضائع کرنا پسند کرتا؟ اس خیال سے لوگ بڑے میاں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے...... وہ بینچ پر تنہا ہی بیٹھا رہتا۔ میں بھی دوسروں کی طرح آنکھیں نیچی کیے کترا کر گزر جاتا۔

"وہ ہر روز اندھیرا ہونے سے پہلے اٹھتا اور دھیرے دھیرے چل دیتا۔ میں بھی بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھتا وہ ہاتھ ہلا کر "ہیلو" کہتا اور مسکرا دیتا۔ میں بھی اسی طرح جواب دے کر چل دیتا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ایک رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ ذہن میں مختلف خیالات چکراتے رہے اور ایسے میں بے ربط سوچوں کے درمیان اس بوڑھے کا چہرہ بار بار میرے ذہن میں ابھرتا رہا۔ جب نیند آئی تو صبح دیر تک سوتا رہا۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے اور ناشتا کر کے سیدھا پارک جا پہنچا۔ بوڑھا سر جھکائے اسی بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس بار کترا کر نکلنے کے بجائے میں اس کے قریب چلا گیا اور کہا۔

"ہیلو جنٹلمین!"

اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا۔ چند لمحوں تک اس کی نظریں میرے چہرے پر ٹکی رہیں۔ پھر ایکدم اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ وہ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہیلو ینگ مین! کیا آپ میرے پاس بیٹھیں گے؟"

میں اسی بینچ پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے مجھ سے ہاتھ ملایا...... جیسے برسوں بعد کوئی اپنا ملا ہو۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کیسے ہیں؟"

"جب دو افراد ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو گفتگو کا آغاز ایسے ہی جملے سے کیا جاتا ہے۔ شاید میرے اس عام سے جملے نے بڑے میاں کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ہونٹوں کی لرزش سے احساس ہوا کہ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے۔ آخر کار خاموشی کو میں نے ہی توڑا۔

"آپ قریب ہی رہتے ہیں؟"

اب اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور روانی سے بولنے لگا۔ "میرا نام جیمس وارن ہے۔ میں تھرٹی ڈربی ایونیو، فچلے میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مسٹر وارن......!"

"نہیں، نہیں...... آپ مجھے جیمس کہہ کر پکاریں۔ مجھے اچھا لگے گا۔" اس نے میری بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔

میں جانتا تھا کہ اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے، جسے اس نے اندر ہی اندر دبا رکھا ہے کیونکہ کوئی سننے والا نہیں تھا۔ اس کے جامد من میں پڑی ہوئی پرانی باتیں زبان پر آنے کے لیے مچل رہی ہوں گی...... لیکن تنہائی کے شکار اس بوڑھے کی داستان سننے کے لیے وقت کس کے پاس تھا۔

جیمس نے ایک آہ سی بھری اور کہا۔

"میں اکیلا ہوں۔ چار بیڈروم کے مکان میں بھائیں بھائیں کرتی دیواروں سے پاگلوں کی طرح باتیں کرتا رہتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے چشمہ اتارا اور اسے صاف کر کے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "ایتھل، یعنی میری بیوی خوب صورت ہی نہیں دل کی بھی بہت اچھی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی سنتے تھے۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے فراموش کر دیا تھا کہ دکھ کسے کہتے ہیں...... تنہائی کس چیز کا نام ہے اور جدائی کا عذاب کیا ہوتا ہے۔ اس کی رفاقت میں ہر

طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں...... ایک دن اس نے ایسی خبر دی جسے سن کر میں پھولا نہ سمایا تھا۔ باپ بننے کی خوش خبری نے مجھے ایک ایسے ہوائی تخت پر بٹھا دیا تھا جیسے ایک بہت بڑی مملکت میری ماتحتی میں آگئی ہو...... میری والدہ نے دادی بننے کی خوشی میں دوستوں کو بلوا کر گھر میں پارٹی دے ڈالی۔ اس طرح آٹھ ماہ سکون سے بیت گئے۔ ایتھل نے اپنے آفس سے چھٹی لے لی تھی۔ میں دن بھر بچے اور ایتھل کے بارے میں سوچتا رہتا۔

''ایک رات موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ایتھل کو ایسا درد اٹھا کہ اس کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ میں نے ایمبولینس منگوائی اور ایتھل کی کراہوں اور اپنی گھبراہٹ کے ساتھ اسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے ایتھل کی حالت دیکھ کر فوری طور پر آپریشن کا فیصلہ کیا۔

''اندر ڈاکٹر اور نرسیں اپنے اوزاروں کے ساتھ ایتھل اور بچے کی زندگی اور موت سے لڑتے رہے...... باہر میں اپنے آپ سے لڑتا رہا۔ کافی دیر کے بعد ایک نرس نے آکر بتایا کہ میں ایک بچے کا باپ بن گیا ہوں۔ ''یاہو......'' میں نے خوشی سے نعرہ لگایا اور نرس کو پکڑ کر ناچنے لگا۔ اس نے مجھے زور سے جھنجوڑا لیکن مجھے مضبوطی سے تھامے رہی کہ مبادہ چکنے فرش پر گر جائے۔

''مسٹر وارن! میری بات سنیے...... مجھے بہت دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ڈاکٹر کی تمام تر کوشش کے باوجود آپ کی بیوی نہیں بچ سکی۔''

جیمس نے آنکھوں سے چشمہ اتار کر پھر صاف کیا۔ اس کی پلکیں آنسوؤں کا بوجھ سہار نہ سکیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی دکھ بھری داستان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میری ماں پوتے کی خوشی اور بہو کی موت کے غم سے سمجھوتا کر کے اپنے مختصر سے خاندان کو نارمل زندگی کی طرف لانے کی کوشش کرنے لگی...... میری ماں بہت سمجھدار خاتون تھی۔ انہوں نے بچے کا نام ولیم وارن رکھا کیونکہ ولیم بلیک، ایتھل کا پسندیدہ مصنف تھا۔

''اسی طرح آٹھ برس گزر گئے۔ میری ماں بہت بوڑھی ہو گئی تھی۔ ایک دن وہ بھی ولیم کو مجھے سونپ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی...... اس دن سے ولیم کے لیے میں ہی ماں، دادی اور باپ کی حیثیت سے تمام ذمے داریاں نبھانے لگا۔ اسے ناشتا کرا کے اسکول پہنچاتا اور پھر اپنے آفس جاتا۔ وہاں سے بھی اسکول فون کر کے اس کی ٹیچر سے اس کی خیریت معلوم کرتا۔ ولیم کو ذرا سی چوٹ لگ جاتی تو مجھے ایسا لگتا جیسے میرے پورے جسم میں درد پھیل گیا ہے۔

''اتنے لاڈ پیار میں پل کر وہ اٹھارہ برس کا ہو گیا۔ اے لیول میں اے گریڈ حاصل کرنے کی خبر نے مجھے خوشی سے نہال کر دیا تھا۔ جب اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے آنرز کی ڈگری پاس کی تو میں گویا ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ ولیم کی گرل فرینڈ جینی جب بھی اس کے ساتھ ہمارے گھر آتی تو میرا دل خوشی سے ناچ اٹھتا۔ جینی اور ولیم کی شادی اسی چرچ میں ہوئی جہاں میری اور ایتھل کی ہوئی تھی۔ ایک سال ہی کے عرصے میں ولیم اور جینی نے مجھے دادا بنا دیا۔ اس دن مجھے اپنی ماں اور ایتھل بہت یاد آئیں۔ میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ میں نے اپنے پوتے کا نام جارج وارن رکھا۔

''ہنستے کھیلتے مزید ایک سال بیت گیا۔ اب عمر نے جسم کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی لیکن میں بہت خوش تھا۔ میں نے زندگی میں جو کھویا تھا اتنا ہی...... بلکہ اس سے کہیں زیادہ پا لیا تھا۔

''ڈیڈی! جینی اور مجھے کمپنی کی طرف سے ترقی مل رہی ہے۔ وہ ہمیں آسٹریلیا بھیج رہے ہیں۔ تنخواہ میں خاطر خواہ اضافے کے ساتھ مکان، گاڑی، ہوائی جہاز کے سفر کے ساتھ جارج کے تعلیمی اخراجات بھی کمپنی ادا کرے گی۔'' ولیم نے ایک دن بتایا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ سن کر میں بے جان سا ہو کر دھم سے صوفے میں دھنس گیا۔ ولیم میری کیفیت کو بھانپ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا۔

''ڈیڈی! آپ اکیلے رہ جائیں گے۔ اس لیے ہم دونوں کمپنی کی اس پیشکش کو قبول نہیں کریں گے۔ یہاں بھی ہمیں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔''

''میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا کہ میرا بیٹا اور بہو اعلیٰ عہدوں پر ترقی پا رہے ہیں...... میرے لیے تو یہ فخر کی بات ہے۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو گی؟''

''جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دن تو کسی نہ کسی طرح گزر جاتا لیکن رات کو نیند نہ آتی۔ کبھی ولیم، جینی اور کبھی جارج کی معصوم صورت آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی۔

''آخر وہ دن بھی آ گیا جب لندن ائرپورٹ پر ولیم، جینی اور جارج کو رخصت کر کے مجھے بھیگے من اور نم آنکھوں کے ساتھ گھر لوٹنا پڑا۔ ولیم اور جینی نے روانہ ہوتے وقت بھی اپنا وعدہ دہرایا کہ وہ ہر ہفتے فون کرتے رہیں گے۔ انہوں نے مجھ سے بھی وعدہ لیا کہ میں ان سے ملنے کے لیے آسٹریلیا ضرور آؤں گا، وہ ٹکٹ بھیج دیں گے۔ جدا ہونے کے وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا وجود کٹ کر الگ ہو رہا

ہے۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ میں نے ننھے جارج کو بار بار چوما...... ائرپورٹ سے باہر آنے کے بعد واپس گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ دن بھر کار کو ادھر ادھر دوڑاتا رہا۔ شام کو گھر لوٹنا ہی پڑا۔ سامنے جارج کی دودھ کی بوتل پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر سینے سے لگایا اور اسٹھل کی تصویر کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"چار دن بعد فون کی گھنٹی بجی تو دوڑ کر ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو ڈیڈی!" یہ آواز، یہ جملہ سننے کے لیے میں کب سے بے تاب تھا۔

"تم سب ٹھیک ہو نا؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "جارج اپنے دادا کو یاد کرتا ہے یا نہیں؟"

"جینی سے بھی بات ہوئی۔ یہ جان کر میرے دل کو سکون ملا کہ وہ سب خیریت سے اور خوش ہیں، مجھے بہت یاد کرتے ہیں۔ ولیم نے فون کا ریسیور جارج کے منہ کے آگے کر دیا۔ اس کی "آؤں، آؤں" کی آواز نے کانوں میں امرت سا گھول دیا۔ تھوڑی دیر بعد فون پر وہ آوازیں بند ہو گئیں۔

"تین ماہ تک مسلسل ان کے فون آتے رہے۔ پھر ان میں کمی آنے لگی۔ میں فون کرتا تو کبھی کہہ دیتے کہ کال بیل بج رہی ہے اور فون کاٹ دیتے۔ ان سے بات ہی نہ ہو پاتی۔ چھ ماہ اسی طرح بیت گئے۔ ان کا کوئی فون نہیں آیا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ایک دن میں نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ سڈنی چلے گئے ہیں۔ یہ بتانے پر بھی کہ میں ولیم کا باپ ہوں، نئے کرایہ دار نے اس کا پتا نہیں بتایا۔ اس کی کمپنی کو فون کیا تو بتایا گیا کہ ولیم نے اس کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی ہے۔ یہ جان کر میری فکرمندی میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔

"میرا ایک دوست آرتھر چھٹیاں منانے تین ہفتوں کے لیے آسٹریلیا جا رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا تو اس نے کہا کہ وہ دو دن سڈنی میں بھی ٹھہرے گا۔ اگر اسے ولیم کا پتا معلوم ہوا تو وہ مجھے فون کر کے بتا دے گا۔ آرتھر کا فون نہیں آیا۔ تین ہفتوں کی تاریک راتیں تاریک ہی رہیں۔

"تین ہفتوں کے بعد جب آرتھر واپس آیا تو میری امید، مایوسی میں بدل گئی۔ ولیم اور جینی اسے ایک ریسٹورنٹ میں ملے تھے لیکن وہ اپنے کسی ضروری کام سے اٹھ گئے تھے اور عجلت میں اپنا ایڈریس اور فون نمبر نہیں دے سکے۔ جاتے جاتے انہوں نے آرتھر سے کہا تھا کہ وہ آج شام ہی مجھے فون کر کے اپنا نیا پتا بتا دیں گے۔

"میں اس فون کے انتظار میں ہر شام ٹیلی فون کے قریب بیٹھ کر گزارتا ہوں۔ میں فون کی جس گھنٹی کو سننے کے لیے چھ سال سے بے قرار ہوں...... وہ نہیں سنائی دی۔ شاید وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں باپ آسٹریلیا نہ آ دھمکے۔"

مسٹر جیمس نے ایک گہری سانس لی۔ مجھ سے پتا پوچھا تو میں نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر دے دیا اور اس سے کہا۔ "مسٹر جیمس! آپ کو کسی بھی وقت میری ضرورت ہو تو آپ بلا جھجک مجھے فون کیجیے گا۔ آیئے، میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ میری کار برابر والی گلی میں کھڑی ہے۔"

"شکریہ۔ میں پیدل ہی جاؤں گا۔ یہ میرا روز کا معمول ہے۔ اس طرح میری واک بھی ہو جاتی ہے۔"

گھر پہنچا تو دیکھا کہ ڈاک میں کچھ خطوط پڑے تھے۔ میں نے کوربی ٹاؤن کے ایک اسکول میں شعبۂ حساب میں ملازمت کے لیے درخواست روانہ کی تھی۔ خط پڑھا تو معلوم ہوا کہ مجھے اس ملازمت کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔ میں نے نئے اسکول کے لیے اپنا بائیوڈیٹا بھیج دیا۔ جانے میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔ میں جانے سے پہلے مسٹر جیمس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ طبیعت کی خرابی کے باعث وہ اسپتال میں داخل ہے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اسپتال جا کر اس کی عیادت کرتا۔

ایک دن کی ملاقات یادداشت کے خانے میں زیادہ دیر تک ٹکی نہیں رہ سکی۔ وقت گزرنے کے ساتھ میں جیمس کو بالکل بھول گیا۔ وکیل کے خط کے مطابق میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ اسی دروازے پر گھنٹی کا بٹن دبایا جہاں سے تیس سال قبل جیمس سے ملے بغیر ہی لوٹنا پڑا تھا۔ میں عجیب احساسات کے ساتھ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ لگ بھگ پینتالیس سالہ ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ میں نے اپنا اور سیما کا تعارف کرایا۔ وہ وکیل تھا، ہمیں اندر لے جا کر لاؤنج کے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔ وہاں ایک عورت اور تین مرد پہلے ہی موجود تھے۔

وکیل مارٹن نے ہم سب کا تعارف کرایا۔ ان میں ایک شخص آر، ایس، پی، سی، اے (دی رائل سوسائٹی فار دی پروڈنشن آف کروئلٹی ٹو اینیملس) کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ جیمس وارن کا بیٹا ولیم وارن، اس کی بیوی جینی وارن اور جیمس کا پوتا جارج وارن تھے۔ وہ آسٹریلیا سے آئے تھے۔ بائیں جانب چھوٹے سے نرم گدیلے گول بستر پر ایک پیاری سی سیاہ اور سفید رنگ کی بلی کنڈلی کے انداز

میں سوئی ہوئی تھی۔ اس بلی کا نام ولما بتایا گیا۔

مارٹن نے اپنی فائل سے وصیت کے کاغذ نکال کر انہیں پڑھنا شروع کیا۔ اپنی ملکیت کی تقسیم سے پہلے جیمس وارن نے اپنی تنہائی کا شکار سسکتی ہوئی زندگی کا بیان ان الفاظ میں کیا تھا۔

”لگ بھگ چالیس سال پہلے میرے بیٹے ولیم اور اس کی بیوی جینی نے لندن چھوڑ کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ میں فون پر اپنے پوتے اور ان دونوں کی آواز سننے کو ترس گیا۔ میں فون کرتا تو وہ کسی بہانے سے کاٹ دیتے اور ایک دن اس فون نے بالکل خاموشی اختیار کرلی اور میری رہی سہی امید بھی چھین لی۔ کسی وجہ کے سبب میرے بیٹے نے اپنی رہائش تبدیل کرلی۔ اس نے مجھے نئے پتے حتیٰ کہ فون نمبر سے بھی بے خبر رکھا۔ میں تنہائی سے لڑتا رہا۔ کوئی بات کرنے والا نہیں تھا۔ کون بات کرے گا؟ جس کا اپنا ہی خون سفید ہوگیا ہو۔

”میری زبان چھ سال تک ہلے بغیر بڑے بڑے بے جان سی ہوگئی تھی۔ ایک دن ایک ہندوستانی شخص راکیش ورما نے پارک میں اس خاموش روح کو دیکھا اور اس کے دکھ کو سمجھا۔ اس اجنبی اور انجانے شخص نے ایک عرصے کے بعد احساس دلایا کہ میں بول سکتا ہوں۔ کتنے دن ہوگئے تھے، کسی نے مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ میری بدنصیبی دیکھیے کہ وہ شخص بھی کچھ دنوں کے بعد لندن سے دور چلا گیا۔

”راکیش ورما سے ایک دن کی ملاقات نے مجھے کئی دن تک مسرور رکھا۔ پھر رفتہ رفتہ بھیانک تنہائی نے مجھے گھیر لیا۔ میری اولاد نے میری روح کو زخمی کردیا تھا، بڑھتی عمر کے ساتھ میرا جسم بھی کمزور پڑنے لگا۔ اس پر ذہنی اضمحلال نے گمبھیر صورت اختیار کرلی۔

”ایک دن میری بے مراد زندگی میں امید کی لہر سی جاگی۔ میرے مکان کے باغ میں نہ جانے کہاں سے ایک بلی آگئی۔ شاید اس کا مالک بھی لندن چھوڑ گیا تھا اور میری طرح اسے بھی تقدیر کے حوالے کرکے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ بلی کو میں نے ایک نام دیا ”ولما“

”دو تین دنوں میں ولما اور میں ایسے گھل مل گئے جیسے بچپن ہی سے ہم دونوں ساتھ رہے ہوں۔ میں اسے اپنی کہانی سناتا اور وہ ”میاؤں، میاؤں“ کی زبان میں ہر بات کا جواب دیتی۔ مجھے ایسا لگتا جیسے میں ننھے جارج سے باتیں کررہا ہوں۔

”ایک دن وہ باہر گئی تو رات کو واپس نہیں لوٹی۔ میں

اس رات بہت رویا۔ بالکل اسی طرح جیسے جارج، ولیم اور جینی سے جدا ہو کر دل میں اٹھنے والی ٹیسوں سے پھوٹ پھوٹ کر رو یا تھا۔ میں رات بھر ولما کا انتظار کرتا رہا۔ وہ اگلے دن واپس آ گئی۔ بس، یہی فرق تھا ولما اور ولیم میں جو واپس نہیں لوٹا۔

''ولما کے ساتھ رہتے ہوئے میں خود کو ذہنی طور پر تندرست اور ہشاش بشاش محسوس کرنے لگا۔ کثیر مقدار میں کھائی جانے والی دواؤں نے بھی وہ اثر نہیں دکھایا تھا جو ولما کی رفاقت سے ہوا۔ اس نے مجھے ایک نئی زندگی دی۔ وہ کب کیا چاہتی ہے، میں ہر بات سمجھ لیتا تھا۔''

ولیم، جینی اور جارج، تینوں کے چہروں پر کبھی درشت تاثرات جھلکتے اور کبھی وہاں پچھتاوا نظر آتا۔ مسٹر جیمس وارن نے اپنی وصیت میں واضح طور پر کہا کہ اس کی منقولا اور غیر منقولا جائداد میں سے ٹیکس اور دیگر اخراجات منہا کر کے باقی جو رقم بچے اسے اس طرح تقسیم کیا جائے۔

''مسٹر راکیش ورما کو دو ہزار پاؤنڈز دیے جائیں اور ان سے میری جانب سے درخواست کی جائے کہ وہ اس رقم کو اس ایک دن کی اجرت یا معاوضہ نہ تصور کریں جس کی وجہ سے میری منجمد زندگی میں قدرے ہلچل سی پیدا ہوئی تھی۔ جب میں بول رہا تھا اور وہ پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ ان لمحوں کی اجرت تو میں دے ہی نہیں سکتا...... میرے مذکورہ بالا بیان سے عیاں ہے کہ ولیم وارن، جینی وارن اور جارج وارن اس جائداد کے وارث ہونے کے حق دار نہیں ہیں۔''

وکیل کہتے کہتے کچھ لمحوں کے لیے رک گیا۔ ولیم، جینی اور جارج کے چہروں پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ وہ کبھی سر جھکا کر دانت پیسنے لگتے تو کبھی اپنے کٹھور پن پر پچھتانے لگتے۔ آخر کار ولیم اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا اور سامنے رکھی میز پر زور سے ہاتھ مار کر وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جینی نے اسے سمجھا بجھا کر پھر بٹھا دیا۔

وکیل نے دوبارہ وصیت پڑھنا شروع کی تو یہ جان کر سب ہی حیران رہ گئے کہ باقی تمام جائداد اور دولت ولما نامی بلی کے نام کر دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہا گیا کہ آر۔ ایس۔ پی۔ سی۔ اے کو یہ حق دیا جائے کہ وہ ولما کی دیکھ بھال کریں۔ اس کی تمام ضروریات کی تکمیل انہی کو کرنی ہوگی۔ اسی تنظیم کو منتظم مقرر کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی فہرست نما ہدایت نامہ بھی شامل تھا جس میں ولما کو جیمس کس طرح رکھتا تھا۔ اس کی مکمل تفصیل تھی۔ آگے لکھا تھا۔

''ولما کے مرنے پر ایک یادگار تعمیر کی جائے۔ اس کے بعد باقی بچنے والی رقم راہ بھٹکے ہوئے معصوم جانوروں کی پرورش اور ان کی دیکھ بھال پر خرچ کی جائے۔''

میں نے مارٹن سے کہا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو یہ دو ہزار پاؤنڈز، جو وصیت کے مطابق جیمس وارن مجھے دے رہے ہیں، اس رقم کو بھی ''ولما'' کی وصیت کی رقم میں شامل کر دیا جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''اس میں کچھ قانونی پیچیدگی ہوگی۔'' وکیل نے بتایا۔ ''ہاں، آپ اس رقم کا چیک آر۔ ایس۔ پی۔ اسی۔ اے کے نام کاٹ کر دے سکتے ہیں۔''

آخر میں چند رسمی جملوں کے بعد مارٹن نے وصیت بند کر کے بیگ میں رکھ دی۔ بلی، جو اب بھی تمام کارروائی سے بے خبر سوئی ہوئی تھی...... آر۔ ایس۔ پی۔ اسی۔ اے کے نمائندے کو سونپ دی گئی۔ اس طرح وکیل پر عائد ولما کی دیکھ بھال کی ذمے داری بھی ختم ہو گئی۔ سب مکان سے باہر آ گئے۔

میں نے سیما سے کہا۔ ''میں تمہیں اس مکان پر لے جاتا ہوں جہاں میں شادی سے پہلے رہتا تھا۔''

کار دس منٹ میں 23 ریلے ڈرائیو کے سامنے پہنچ گئی۔ میں نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور نہ جانے کیوں، بنا سوچے سمجھے اس مکان کی کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ ایک بوڑھے انگریز نے دروازہ کھولا۔ اس نے ایک چھوٹا سا کتا اٹھا رکھا تھا۔ کتے نے مہین آواز میں بھونکنا شروع کر دیا۔ میں نے اس بوڑھے کو بتایا کہ لگ بھگ تیس سال پہلے میں اس مکان میں کرایہ دار تھا۔ بس، ادھر سے گزر رہا تھا کہ پرانی یاد ذہن میں اتر آئی۔

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، بوڑھے نے بڑی رکھائی سے کہنا شروع کر دیا۔

''اگر تم اس مکان کو خریدنے کے خیال سے آئے ہو تو واپس چلے جاؤ۔ ان دیواروں میں کیرن اور چارلس کی یادیں بسی ہوئی ہیں۔ چارلس کی ماں، میری بیوی تو مجھے کب کا چھوڑ گئی۔ چارلی امریکا سے ایک دن ضرور آئے گا۔ ہاں...... کہیں اس کا فون نہ آ جائے۔''

اتنا کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اندر سے کتے کے بھونکنے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ میری اور سیما کی نگاہیں بند دروازے پر گڑی ہوئی تھیں۔ مجھے سیما کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

''ایک اور جیمس وارن!''

مخزنِ اصفیا

ضیا تسنیم بلگرامی



کس قدر خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ پیدائش سے قبل ہی اپنی عنایتوں اور کرامتوں سے نوازتا ہے۔ آپ کا شمار بھی ایسے ہی مقرب بندوں میں ہوتا ہے جنہیں ماں کے شکم میں ہی ولایت عطا کی گئی جبکہ آپ کے والدین کا شہرہ بھی اسی حوالے سے دور دور تک پھیلا ہوا تھا... اللہ کی رضا میں راضی رہنے والوں کے حوالے سے آپ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بے شک جب بندہ اللہ کی چاہت کو دل و جان سے اپنا لیتا ہے تو اللہ بھی بندے کی چاہت کا بھرم رکھتا ہے اور اسے کچھ اس انداز سے نوازتا ہے کہ بندہ یقین و بے یقینی کی کیفیت میں سوچتا رہ جاتا ہے۔

ولی باپ اور ولی بیٹے کے کشف و کرامات کے سبق آموز واقعات

خواجہ ابواحمد کی بزرگی اور کشف و کرامت کے قصے بہت مشہور تھے...... آپ ایران کے چشت نامی قصبے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ ابھی خواجہ معین الدین کی ولادت میں تقریباً دو، سوا دو سو برس باقی تھے جن سے خانوادۂ چشت کو شہرتِ دوام ملا۔ خواجہ ابواحمد کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ فرسناقہ کا سلطان خواجہ احمد کا باپ تھا لیکن خواجہ احمد نے اپنے لیے شہریاری کو گوارا نہیں کیا اور فقر فقیری کی راہ اختیار کی۔ اس میں انہوں نے وہ مقام حاصل کیا کہ زمانہ عمدۃ الابرار اور ندوۃ الاخیار کہہ کر پکارنے لگا۔

درویشی کے اس بلند مقام پر فائز ہوجانے کے بعد خواجہ احمد کو اولادِ نرینہ کی خواہش نے بے قرار کر رکھا تھا۔ وہ اپنے

رب سے کہتے۔ ''اے اللہ! کیا میں لاولد ہی رہوں گا، کیا میرا سلسلۂ نسل بجھ پر ختم ہو جائے گا؟''

یہ ایسے سوالات تھے جن کے جوابات نہیں مل رہے تھے۔ ان کی بیوی بھی اپنے نیک اور بزرگ شوہر کی اس خواہش اور پریشانی سے اچھی طرح واقف تھیں لیکن یہ ایسا مسئلہ نہیں تھا جس کا حل ان کے اختیار میں ہوتا۔ وہ بھی غمزدہ اور اشکبار، خدا سے درخواست کرتیں۔ ''بارالٰہی! مجھے اس لائق کر دے کہ میں اپنے شوہر کی خواہش پوری کر دوں۔ میں نے شہریار کے گھر میں آنکھ کھولی، ناز و نعم میں پلی، پھر جب جوان ہوئی تو تیری مشیت نے مجھے اس تارک الدنیا، زاہد شب بیدار کے حوالے کر دیا۔ میں نے اپنی مقدرت بھر یہی کوشش کی ہے کہ اپنے شوہر کو خوش رکھوں اور اسے کسی طرح آزردہ نہ ہونے دوں۔ مگر میں تیری مشیت نہیں جانتی جو مجھے لاولد رکھ کر مجھے پریشان اور میرے شوہر کو آزردہ کیے ہوئے ہے۔ اب میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تو کسی طرح مجھے یہ بتا دے کہ میری قسمت میں کوئی اولاد ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس میں تاخیر کیوں؟ اگر نہیں ہے تو کیا اس 'نہیں' میں تیری کوئی ایسی مصلحت شامل ہے جو ہمارے حق میں بہتر ہو۔''

دونوں کی بے قراری حد کو پہنچ چکی تھی۔ سوتے، جاگتے، کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے، بس اولاد کی ہی فکر گھیرے رکھتی۔

ایک دن خواجہ احمد اداس اور خوفزدہ اپنی بیوی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ بیوی کو ایک دم اپنی لاولدی کا خیال آیا۔ شوہر کو غمزدہ لہجے میں سمجھایا۔ ''آپ کو پریشان یا ملول نہیں ہونا چاہیے کیونکہ خدائی معاملات میں کسی انسان کی دخل اندازی فضول ہے۔ ہمیں یہ سوچ کر صبر کر لینا چاہیے کہ شاید اسی میں ہمارے لیے بہتری ہو۔''

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''نیک بخت! میری اداسی یا غمزدگی کا سبب میری لاولدی نہیں ہے۔ ذرا میرے چہرے کو غور سے دیکھ، تجھ کو میرے چہرے پر مایوسی کے ساتھ ہی خوف کے اثرات بھی نظر آ جائیں گے۔ مجھ کو تسلی دے، دلاسے دے، ڈھارس بندھا اور ہمت افزائی کر۔''

بیوی نے سہم کر پوچھا۔ ''آپ خوفزدہ کیوں ہیں؟''

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے عالم رویا میں مجھے ڈانٹا گیا ہے۔ میں نے ایک آواز سنی جو کہہ رہی تھی کہ اے خواجہ احمد! تو یہ کیا غضب کر رہا ہے کہ تیرا دل جو میرا گھر ہے، آج اس میں اولاد کی خواہش جاگزیں ہے۔ کیا یہی دعویٰ محبت ہے تیرا؟''

بیوی نے آزردگی سے کہا۔ ''اگر خدا کی یہی مرضی ہے کہ میں جس چیز سے محروم ہوں، اس کی خواہش یا ذکر نہ کروں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''

اس کے بعد ان دونوں نے اپنے دلوں سے اولاد کی خواہش نکال دی اور سرتاپا یادِ الٰہی اور ذکرِ رب میں مشغول ہو گئے۔ اب وہ دونوں اپنے رب کے سرتاپا شکر گزار بندے تھے۔ اس حالت کو کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ بیوی کو اپنے آپ میں کچھ تبدیلیاں محسوس ہوئیں اور جس آرزو کو اپنے دل سے نکال باہر کیا تھا، اس کا نخل اپنے پہلو میں نمودار ہوتے محسوس کیا۔ انہیں ڈر لگا کہ کہیں یہ محض خوش فہمی اور خوابیدہ خواہش کی بیداری نہ ہو، جس سے اللہ ان کا امتحان لے رہا ہو، انہوں نے اس کا ذکر اپنے شوہر سے نہیں کیا۔

دوسرا مہینا گزرا تو شبہ یقین میں بدلنے لگا۔ مگر وہ بدستور خاموش رہیں اور شوہر کو کچھ نہ بتایا لیکن تیسرے مہینے نے جملہ شکوک اور خدشات کو رفع کر دیا اور انہیں بارآور ہونے کا یقین ہو گیا تو یہ خوش خبری اپنے شوہر کو سنانا چاہی۔ کئی بار زبان کھولتے کھولتے رہ گئیں اور کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔

آخر ایک دن انہوں نے حتمی ارادہ کر لیا کہ وہ اس راز کو اپنے شوہر پر منکشف کر کے رہیں گی۔ وہ اپنے شوہر کے پاس بیٹھ کر اپنے رب کا ذکر کرنے لگیں، بولیں۔ ''آپ یقین کیجیے کہ میں نے اپنی لاولدی کو اللہ کی مشیت سمجھ کر قبول کر لیا اور اس خیال کو اپنے دل سے اس طرح نکال دیا تھا، جس طرح روح جسم سے نکل جاتی ہے، پھر......''

خواجہ احمد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''یہ 'اپنے دل سے نکال دیا تھا' جملے میں ''تھا'' کا کیا مطلب ہے؟ یعنی تمہارا یہ عمل ماضی کی چیز بن چکا ہے۔ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

بیوی نے گھبرا کر جواب دینے کی کوشش کی۔ ''آخر اللہ کے شکر گزار بندوں کا کیا فرض ہے؟ یہی نا کہ وہ ہر حال میں اپنے مالک کے شکر گزار اور قانع رہیں۔ کیا میں اپنے رب کی شکر گزار نہیں ہوں؟''

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''تیری شکر گزاری پر میں نے کب شک کیا ہے؟ مجھ کو اب اس وقت بھی یہی یقین ہے کہ

میری ہی طرح تو بھی اپنے رب کی شکر گزار بندی ہے۔''
بیوی نے مزید کہا۔ ''اور میں اس پر بھی یقین رکھتی ہوں کہ اپنے رب کی بدلتی ہوئی مشیت کو شکریے کے ساتھ قبول کرلوں۔''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''بے شک بے شک۔ یہی ہر انسان کا ایمان ہونا چاہیے۔''
بیوی نے پوچھا۔ ''میں ایک مسئلہ جاننا چاہتی ہوں۔''
شوہر نے جواب دیا۔ ''پوچھ، پوچھ...... وہ کیا مسئلہ ہے؟''
بیوی نے کہا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ ایک صابر و شاکر شخص نے اپنے رب سے کسی ایسی خواہش کا اظہار کیا جو اس کی مشیت کے خلاف تھا۔ پھر جب اس انسان کو کسی طرح سرزنش ہوئی کہ خدا اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ کسی صابر و شاکر بندے کے دل میں اس کے رب کی خواہش کے علاوہ کوئی اور خواہش بھی جگہ لے تو اس صابر و شاکر بندے نے اپنے آپ کو اور دل کو اپنے رب کی مرضی کے تابع کر دیا اور اپنے دل کو خواہشات ماسوا اللہ سے یکسر خالی کر دیا......''
خواجہ احمد مسکرانے لگے، بات کاٹ کر کہنے لگے۔ ''وہ اللہ کا صابر و شاکر بندہ تیرے سوا کون ہو سکتا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تو کیا کہنا چاہتی ہے؟ میرے رب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں دو مہینے پہلے ہی یہ ذکر چھیڑنا چاہتا تھا...... لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے کہیں وہ میری خوابیدہ خواہش کی جلوہ گری تو نہیں...... لیکن آج تین ماہ بعد میں تجھ سے یہ ذکر کرنے ہی والا تھا کہ بات تو نے شروع کر دی۔''
بیوی کا خوشی سے عجیب حال ہو رہا تھا، پوچھا۔ ''آپ کیا ذکر کرنے والے تھے؟''
خواجہ احمد نے کہا۔ ''جو تو کہنا چاہتی ہے۔''
بیوی نے کہا۔ ''میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟''
جواب ملا۔ ''تو کہنا چاہتی ہے کہ میں اللہ کے دین سے بار آور ہو گئی ہوں۔ تو بتانا چاہتی ہے کہ میرے شکم میں نخلِ آرزو پرورش پا رہا ہے۔''
بیوی نے خوشی سے دونوں ہونٹ بھینچ لیے اور جوشِ مسرت کو دبا کر پوچھا۔ ''یہ بات آپ کو کس طرح معلوم ہوئی؟''
شوہر نے جواب دیا۔ ''میں تین ماہ سے مسلسل یہی دیکھ رہا ہوں کہ میرے جسم سے روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی اور تیرے شکم میں اتر گئی۔ پہلے میں نے یہ منظر عالم رویا میں دیکھا، پھر بیداری میں دیکھا کہ ایک آواز مجھ سے کہہ رہی ہے، خواجہ احمد مبارک ہو کہ تو ایک ایسے بیٹے کا باپ بن چکا ہے جو اللہ کے برگزیدہ بندوں میں سرفہرست ہوگا...... اور مبارک ہو یہ خوشخبری کہ اس کے بعد خدا تجھے ایک ایسی بیٹی سے نوازے گا جو تیرے بیٹے ہی جیسی نورانی شخصیت کی ماں بنے گی اور جو خانوادۂ چشت کے اولین اکابرین میں شمار کیے جائیں گے۔''
بیوی فرطِ خوشی میں شوہر کی باتیں سنتی رہیں اور آخر میں کہا۔ ''مجھے یہ افسوس زندگی بھر رہے گا کہ میں نے بے صبری سے کام لیا اور زندگی کا کچھ عرصہ ناشکری میں گزار دیا۔''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''خود مجھے بھی یہ افسوس زندگی بھر رہے گا۔''
بیوی نے پوچھا۔ ''تو کیا آپ کو یہ یقین ہے کہ میرے شکم میں پرورش پانے والا لڑکا ہی ہے، لڑکی نہیں؟''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''مجھ کو پورا یقین ہے کہ یہ لڑکا ہی ہوگا کیونکہ لڑکی اس کے بعد پیدا ہوگی۔''
اس گفتگو کے کئی دن بعد نصف شب کو خواجہ احمد تہجد کے لیے مصلے پر کھڑے ہوئے اور چند رکعت پڑھنے کے بعد وہ اس خیال سے بیوی کے بستر کے پاس گئے کہ اس سرد رات میں ان کی بیوی کہیں سوتے میں کھل تو نہیں گئی۔ بیوی گہری نیند میں سوئی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے سرہانے جا کھڑے ہوئے اور انہماک شوق سے ان کا معصوم چہرہ دیکھنے لگے۔ اچانک ان کے کانوں میں کسی کے ذکر کی آواز سنائی دی۔ کوئی آہستہ آہستہ کلمۂ طیبہ کا ورد کر رہا تھا۔ خواجہ احمد نے بیوی کے بستر کے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ پھر وہ دم سادھ کر ایک جگہ کھڑے ہو گئے اور آواز کی سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد آواز کی سمت کا تعین ہو گیا۔ یہ آواز بیوی کے وجود سے آ رہی تھی۔ یہ تصدیق و تجربے کے لیے بیوی کے پاس جا کھڑے ہوئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بیوی کے جسم سے کلمۂ طیبہ کی صاف آواز آ رہی تھی۔
خواجہ احمد چپ چاپ اپنے مصلے پر واپس آ گئے اور نماز تہجد میں مشغول ہو گئے۔
کئی دن بعد بیوی نے ان سے کہا۔ ''میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔''

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''تمہیں جو ضروری بات کرنا ہے کرلو، اس کے بعد ایک بات میں بھی تم سے پوچھوں گا۔''
بیوی نے کہا۔ ''کچھ دنوں سے میں ایک پراسرار کیفیت میں مبتلا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے؟''
خواجہ احمد نے کہا۔ ''تو تفصیل سے بتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی وہی بات ہے جو میں تجھ سے پوچھنے والا ہوں۔''
بیوی نے جواب دیا۔ ''میں کئی دن سے اپنے وجود سے کلمۂ طیبہ کی آواز سن رہی ہوں۔ معلوم نہیں یہ کیا ہے؟''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''یہی تو میں خود بھی سوچ رہا ہوں کیونکہ کئی دن پہلے کی بات ہے کہ میں نصف شب کو تیرے کمرے میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ کہیں اس سرد رات میں تو کھل تو نہیں گئی لیکن تو بالکل صحیح لیٹی ہوئی تھی۔ اس وقت میں نے تیرے کمرے میں کلمۂ طیبہ کے ورد کی آواز سنی۔ کوئی آہستہ آہستہ کلمۂ طیبہ کا ورد کررہا تھا۔ میں حیران و پریشان پورے کمرے میں چکر لگانے لگا کہ آواز کا منبع اور سمت کا اندازہ لگاؤں اور کچھ دیر بعد میں نے اس کے منبع اور سمت کا اندازہ لگالیا۔ یہ آواز تیرے جسم سے آرہی تھی۔''
بیوی نے پوچھا۔ ''یہ کیسی آواز ہے؟ اور میرے وجود سے کیوں نکلتی ہے جبکہ میں خود ایسا کوئی ورد نہیں کررہی؟''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس آواز کا تعلق اس ذات سے ہے جو تیرے شکم میں پرورش پارہی ہے۔''
بیوی نے کہا۔ ''یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو ابھی پیدا بھی نہ ہوا ہو، وہ کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگے۔''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''ممکن اور ناممکن کا علم تو صرف خدا کو ہے لیکن میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اللہ کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں، وہ ہر بات پر قادر ہے۔''
بیوی نے کہا۔ ''اس کے علاوہ میرے جسم سے خوشبو کی لپٹیں نکلتی ہیں۔''
خواجہ نے جواب دیا۔ ''اس خوشبو کا بھی تعلق اس معصوم ذات سے ہے جو عنقریب پیدا ہونے والی ہے۔''
پھر وہ دونوں ان باتوں کے عادی ہوگئے اور انہیں یہ عجیب باتیں گوارا ہوگئیں۔
ایک دن ولادت سے چند یوم پہلے، خواجہ احمد اپنی بیوی کے پاس بیٹھے تھے اور بیوی کو خفیف سی تکلیف محسوس ہورہی تھی کہ خواجہ احمد کو یوں محسوس ہوا گویا کوئی انہیں سلام کررہا ہے۔ خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''وعلیکم السلام یاولی اللہ و خلیفتی!''
بیوی نے پوچھا۔ ''یہ آپ نے کس کے سلام کا جواب دیا ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اللہ کے برگزیدہ بندے کے سلام کا جواب دے رہا ہوں، جو میرا خلیفہ بھی ہوگا۔''
بیوی نے کہا۔ ''افسوس کہ میں آپ کی باتیں نہیں سمجھ پارہی ہوں۔''
شوہر نے جواب دیا۔ ''میں تجھے کتنی بار یہ بات بتاؤں کہ تیرے شکم میں پرورش پانے والا بچہ ولی ہوگا۔ ابھی ابھی میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ مجھے سلام کررہا ہے چنانچہ میں نے اس کے سلام کا جواب دے دیا۔''
بیوی نے کہا۔ ''لیکن میں نے وہ آواز نہیں سنی۔''
شوہر نے جواب دیا۔ ''اس نے سلام مجھ کو کیا تھا، میں نے وہ آواز سن لی۔ اگر تجھ کو سلام کیا گیا ہوتا تو، تو بھی سن لیتی۔''
بیوی نے کہا۔ ''لیکن آواز سے تو علم نہیں ہوسکتا اور یہ آپ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ آنے والا لڑکا ہی ہے، وہ لڑکی بھی ہوسکتی ہے۔''
خواجہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، وہ لڑکی نہیں لڑکا ہے۔''
محرم کی نو تاریخ تھی۔ بیوی کی حالت یوں تو خراب نہیں تھی لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ولادت میں اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ خواجہ احمد بیوی سے ذرا فاصلے پر بیٹھے اللہ، اللہ کررہے تھے۔ اچانک ان کی آنکھ لگ گئی اور پلک جھپکتے ہی انہوں نے خواب میں دیکھا کہ خواجہ احمد، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کھڑے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''خواجہ احمد! تیرے گھر میں فرزند پیدا ہوا ہے۔''
خواجہ احمد نے خوش ہوکر جواب دیا۔ ''یارسول اللہ ﷺ! مجھ کو تو پتا نہیں لیکن میں خوش بہت ہوں۔''
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''خواجہ احمد! اپنے اس فرزند کا نام میرے نام پر ''محمد'' رکھنا۔''
خواجہ احمد کی آنکھ کھل گئی اور گھر میں موجود عورتوں سے بیوی کی خیریت معلوم کی۔ عورتوں نے فرزند کی ولادت کی خوشخبری سنائی۔ آپ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور عورتوں سے کہا۔ ''میں اپنے فرزند کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔''
عورتوں نے راستہ دے دیا۔ آپ بیوی کے پہلو میں لیٹے ہوئے فرزند کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ بچے نے پلکیں جھپکائے بغیر باپ کو دیکھا اور باپ نے کچھ دیر محویت سے دیکھ کر کہا۔ ''اے فرزند! میں نے تیرا نام محمد رکھ دیا ہے کیونکہ تیرے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی یہی ہدایت تھی۔''

اس کے بعد خواجہ سجدے میں گر گئے اور دعا کی۔ ''یاالٰہی! میرے بیٹے کو ولی بنادے۔ ولی اللہ، اپنا ولی۔''

ابھی سجدے سے سر اٹھا بھی نہ تھا کہ کانوں میں آواز آئی۔ ''احمد! تیری دعا قبول ہوئی، تیرا فرزند مقبول بندہ بنالیا گیا۔''

پیدائش کے دوسرے دن عاشورہ تھا۔ ماں بچے پر واری ہوتی جارہی تھی۔ فجر سے ذرا پہلے بچے کو دودھ پلایا تھا اور اب آفتاب بھی طلوع ہو چکا تھا لیکن بچے نے دودھ نہیں پیا تھا۔ ماں نے سوچا، بچہ خاصا بھوکا ہوگا لیکن بچے نے دودھ نہیں پیا۔ منہ ہٹالیا۔ ماں نے زبردستی دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن بچے نے منہ بھینچ لیا اور مچلنے لگا۔ جب ماں اپنی کوشش میں ناکام ہو گئیں تو انہیں گمان گزرا کہ شاید بچے کی طبیعت خراب ہے، شوہر سے کہا۔ ''میرا خیال ہے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیونکہ یہ دودھ نہیں پی رہا۔''

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''نہیں، یہ بات نہیں ہے، اس کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔''

بیوی نے پوچھا۔ ''اگر طبیعت ٹھیک ہے تو یہ دودھ کیوں نہیں پیتا؟''

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''بیوی! یہ مادرزاد ولی ہے، انبیاء اور اولیاؒ کا روزِ عاشورہ روزہ رکھنا دستور چلا آرہا ہے۔ یہ اس دستور پر ابھی سے عمل پیرا ہو گیا ہے۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔''

بیوی نے تشویش سے کہا۔ ''اگر آپ کی بات درست ہے تو واقعی بڑی خوشی کی بات ہے اور اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر تشویش اور فکر کی بات ہے۔ ایک دن کے بچے کا دن بھر بھوکا رہنا عجیب بھی ہے اور تشویش ناک بھی۔''

خواجہ احمد نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''بہر حال بڑی خوشی کی بات ہے، شام تک انتظار کرلو میری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔''

بیوی خاموش ہو گئیں اور شوہر کے چلے جانے کے بعد ایک بار پھر کوشش کی کہ بچہ دودھ پی لے لیکن اس نے دودھ نہیں پیا۔ اس طرح پورا دن گزر گیا، شام ہوگئی اور مغرب کی اذان سے فضا گونجنے لگی۔ ماں نے بچے کو دودھ پلایا تو وہ فوراً پینے لگا۔ ماں کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''سبحان اللہ یارالٰہی! میں کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں۔''

شوہر نے نماز کے بعد پوچھا۔ ''بچے نے روزہ افطار کیا؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''ہاں، آپ کی بات درست ہے۔ میرا بچہ پیدائشی ولی ہے۔''

چند ماہ بعد، ایک دن ماں اپنے بیٹے کو دودھ پلارہی تھیں، خواجہ احمد ان کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ان دونوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ بچے نے دودھ پینا تو چھوڑ دیا اور بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔ ماں کو اپنے بیٹے کی اس حرکت پر تعجب ہوا اور شوہر سے پوچھا۔ ''آپ نے کچھ دیکھا؟''

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''ہاں، دیکھا اور تیری ہی طرح میں خود بھی حیران ہوں کہ آخر یہ بے اختیار ہنسا کیوں۔''

بیوی نے کہا۔ ''اگر آپ اس کا سبب نہیں بتائیں گے تو کون بتائے گا؟''

خواجہ احمد نے آنکھیں بند کرلیں اور بیوی سے کہا۔ ''ذرا صبر کر، میں کشف سے معلوم کرتا ہوں۔''

اس کے بعد وہ مراقبے میں چلے گئے اور دیر تک یوں ہی بیٹھے رہے۔ بیوی دم بخود بیٹھی شوہر کی صورت دیکھتی رہیں۔ بچہ دودھ پیتا رہا۔ کچھ دیر بعد خواجہ احمد نے آنکھیں کھول دیں اور بیوی سے کہا۔ ''بیوی! اس وقت میں نے ایک عجیب سماں دیکھا۔ حیران ہوں کہ آخر تیرے بچے کا مقام کیا ہے اور خدا کا یہ کتنا برگزیدہ بندہ ہے۔''

بیوی نے پوچھا۔ ''پھر بھی مراقبے سے کیا معلوم ہوا؟''

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''میں نے مراقبے میں دیکھا، شیطان میرے بچے کی طرف رلانے کے لیے بڑھ رہا ہے لیکن عین اس وقت جبکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والا تھا، چند فرشتوں نے شیطان کی مرمت شروع کردی اور شیطان بدحواس ہوکر بھاگا۔ عالم یہ تھا کہ شیطان بھاگ رہا تھا اور فرشتے مارنے میں مصروف تھے۔ بس اس مضحکہ خیز منظر نے میرے فرزند کو ہنسنے پر مجبور کردیا۔''

☆☆☆

محمد کی عمر ڈھائی سال کی ہو چکی تھی۔ ماں کو بڑی فکر تھی کہ ان کا بیٹا خوب کھائے پیے اور صحت بنائے لیکن محمد کو کھانے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، وہ بہت کم کھاتے تھے۔ ماں نے بیٹے سے کہا۔ ''بیٹے! تم کھانا بہت کم کھاتے ہو؟ آخر کیوں؟''

محمد نے جواب دیا۔ ''ماں! کھانا کم ہی کھانا چاہیے۔''

ماں کو ننھے منے بیٹے کی زبان سے یہ جواب سن کر بڑی حیرت ہوئی اور اپنے شوہر سے یہ واقعہ بیان کر کے پوچھا۔ ''میں

حیران ہوں کہ محمد کے اس جواب کا مطلب کیا ہوا؟ اور یہ کہ کیا اتنا ننھا منا بچہ ایسی بات کر سکتا ہے؟''

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ یہ بچہ اللہ کا ولی ہے۔ یہ ابھی سے کم کھانے کی سنت پر عمل کر رہا ہے۔ اللہ کے پیارے بندے کھانے پینے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔''

ماں نے فرطِ خوشی میں رونا شروع کر دیا۔

اب ماں کا یہ حال تھا کہ اپنے بیٹے کی کسی بات پر بھی انہیں حیرت نہیں ہوتی تھی۔ محمد کی ہر بات، ہر واقعہ اور ہر فعل ایسا تھا جو کسی یادرزاد ولی سے وابستہ ہو سکتا تھا۔ کم کھانا، کم سونا اور کم باتیں کرنا، ہر وقت فکر میں ڈوبے رہنا۔ یہ محمد کی فطرت تھی، محمد کی عادت تھی۔ پاس پڑوس کے بچوں سے محمد کے تعلقات ایسے نہیں تھے جیسے عموماً ہم عمر بچوں میں ہوا کرتے ہیں۔ وہ خواجہ احمد کے بچے سے چڑنے لگے تھے لیکن ننھے محمد کو اس کی نہ تو فکر تھی نہ پروا۔

آپ کو مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ آپ کے شوق اور انہماک کا یہ حال تھا کہ کسی کو مکتب تک پہنچانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اپنے آپ ہی چلے جایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ حسبِ معمول تنہا مکتب جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بزرگ نے انہیں روک لیا، پوچھا۔ ''کیا تم مکتب جا رہے ہو؟''

محمد نے جواب دیا۔ ''ہاں، کیا آپ نے میرے ہاتھ میں کتابیں نہیں دیکھیں؟''

بزرگ نے پوچھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مکتب کیوں جاتے ہو؟''

محمد نے کہا۔ ''میں مکتب تعلیم حاصل کرنے جاتا ہوں، پڑھنے جاتا ہوں۔''

بزرگ نے کہا۔ ''تمہاری تعلیم پر مجھے مقرر کیا گیا ہے۔ تمہیں میں پڑھاؤں گا، تم مجھ سے پڑھو۔''

محمد نے بڑے میاں کو ایک بار پھر بڑی توجہ اور حیرت سے دیکھا، پوچھا۔ ''لیکن آپ ہیں کون؟''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''میں وہ ہوں جو راہنمائی کرتا ہے۔ خدا نے میرے ذمے تم لوگوں کی تعلیم و تربیت اور راہنمائی کا فرض سونپا ہے۔ میں خاصہ خاصان کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا گیا ہوں۔''

محمد نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ''تو گویا آپ خواجہ خضر ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''بیشک، تم نے بہت صحیح پہچانا، میں تمہیں تعلیم دینے آیا ہوں۔''

محمد نے درخواست کی۔ ''پھر آپ اپنا کام شروع کر دیجیے۔ خدا نے آپ کو جو حکم دیا ہے اس کو پورا کیجیے۔''

حضرت خضر علیہ السلام انہیں ایک کونے میں لے گئے اور کچھ یاد کرانے لگے۔ محمد نے اسے بہت جلد یاد کر لیا۔ خواجہ خضر نے کہا۔ ''بیٹے! یہ اسم اعظم ہے۔ اس کا یاد کر لینا ہی کافی ہے۔ اب تمہیں کچھ اور پڑھنے یا یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اولیاء اللہ کے لیے اسم اعظم کا یاد کر لینا ہی کافی ہے۔''

محمد نے واقعی یہ محسوس کیا کہ ان کے سینے میں علم کا سمندر اتر چکا ہے۔ علم و معارف کا بحرِ ذخار دل و دماغ میں ہچکولے لے رہا تھا۔ وہ اس کے بعد مکتب نہیں گئے اور وہیں سے گھر واپس چلے گئے۔ ماں نے خلافِ معمول گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو پوچھا۔ ''کیا آج تم مکتب نہیں گئے؟ راستے ہی سے واپس آ گئے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ماں! میں اب مکتب نہیں جاؤں گا۔ جتنا پڑھ لیا بس اتنا ہی کافی ہے۔''

ماں کو اس جواب سے دکھ پہنچا، پوچھا۔ ''نہ پڑھنے کی وجہ؟ بیٹے علم کے بغیر تو خدا کی معرفت بھی ناممکن ہے کہ بے علم نتواں خدا را شناخت۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''ماں! میرے جواب کا یہ مطلب نہیں کہ میں جاہل رہنا پسند کرتا ہوں۔ نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں فارغ التحصیل ہو چکا ہوں۔ میرے لیے مکتب کی تعلیم غیر ضروری ہو چکی ہے۔''

ماں نے بیٹے کو شک و شبے کی نظروں سے دیکھا۔ ''تو جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے مفہوم سے بھی واقف ہے؟''

محمد نے جواب دیا۔ ''ماں! آپ یقین کریں، میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں اور آپ سے جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا مفہوم بھی جانتا ہوں۔''

ماں نے کہا۔ ''اگر تو غلط فہمی سے یہ سمجھنے لگا ہے کہ تو اس ذرا سی عمر میں فارغ التحصیل ہو چکا ہے تو یہ محض طفلانہ خوش فہمی ہے۔ پڑھتے پڑھتے لوگوں کی زندگیاں گزر جاتی ہیں مگر وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔''

بیٹے نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''ماں! میں نے جو کچھ کہا ہے، آپ اس کا امتحان لے لیجیے۔ میرا خیال ہی نہیں یقین

ہے کہ میں اللہ کے فضل سے ہر امتحان میں پورا اتروں گا کیونکہ میں واقعی فارغ التحصیل ہو چکا ہوں۔''

ماں نے بیٹے سے کتابیں اور تختی لے لی اور کہا۔ ''لاؤ، اپنی تختی لاؤ، میں تمہارا امتحان لوں گی۔''

محمد نے جواب دیا۔ ''ماں! آپ اس تختی اور کتابوں سے میرا کیا امتحان لیں گی۔ میں نے آج جو کچھ اپنے استاد سے پڑھا اور سیکھا ہے، وہ ان کتابوں سے ماورا ہے اور وہ علم نہ تو اس تختی میں سما سکتا ہے اور نہ دنیا بھر کی تختیاں اس کی متحمل ہو سکتی ہیں۔''

ماں نے تعجب سے کہا۔ ''پھر میں تمہارا امتحان کس طرح لوں؟''

محمد نے جواب دیا۔ ''ماں! اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ قرآن پاک کو کھول کر اپنے سامنے رکھ لیں۔ آپ خوب جانتی ہیں کہ میں نے قرآن پاک کو حفظ نہیں کیا لیکن میں نے آج جو کچھ سیکھا ہے، اس کی روشنی میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ مجھے قرآن پاک حفظ ہو چکا ہے۔ آپ اس دعوے کا امتحان لے لیجیے۔''

ماں نے قرآن پاک کو کھول کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ بائیسواں پارہ ان کے سامنے تھا، بیٹے سے کہا۔ ''بیٹے! بائیسواں پارہ سناناتو۔''

محمد نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر بائیسواں پارہ زبانی پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کا لہجہ اور تجوید اتنی درست تھی کہ ماں کو اس پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ فر فر پڑھے چلے جا رہے تھے۔ جب وہ پورا پارہ سنا چکے تو ماں نے فرطِ محبت سے بیٹے کو گلے لگا لیا، بولیں۔ ''بیٹے! یہ کیا بات ہے؟ یہ قرآن پاک کب حفظ کیا تھا تم نے؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''ماں! آپ سے نہ تو جھوٹ بول سکتا ہوں اور نہ کسی مغالطے میں رکھ سکتا ہوں۔ آج جب میں مکتب جا رہا تھا تو ایک بڑے میاں نے میرا راستہ روک لیا اور مکتب جانے سے منع کر دیا، بولے...... ''محمد! مکتب کی تعلیم تیرے لیے ضروری نہیں۔ تو مجھ سے پڑھ کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تیری تعلیم پر مامور کر دیا ہے۔''

ماں نے یہ مختصر سی روداد حیرت و تعجب سے سنی پھر پوچھا۔ ''یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟''

محمد نے بات پوری کی۔ ''ماں! پہلے تو میں نے ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن جب وہ میرے پیچھے ہی پڑ گئے تو میں نے پوچھا کہ حضرت! آخر آپ ہیں کون؟ اور اللہ نے خاص طور پر آپ ہی کو کیوں میرے پاس بھیج دیا؟ ماں، آپ جانتی ہیں کہ انہوں نے میرے اس سوال کا کیا جواب دیا؟''

ماں نے کہا۔ ''میں تیرے بتائے بغیر اس جواب سے کس طرح آگاہ ہو سکتی ہوں جو اس بزرگ نے تمہیں دیا ہوگا۔''

محمد نے کہا۔ ''انہوں نے بتایا کہ میں وہ ہوں جس کو راہنمائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور میں وہ ہوں جو اولیاء اللہ کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا جاتا رہا ہے، میں خواجہ خضرؑ ہوں۔''

ماں چونک پڑیں۔ ''کیا آج تجھے خضرؑ ملے تھے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ہاں ماں! آج میں نے حضرت خضرؑ سے ملاقات کی تھی۔ وہ میرے پاس بطورِ خاص آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ خدا نے انہیں بطورِ خاص میرے پاس بھیجا ہے اس لیے میں نے ان سے تعلیم حاصل کر لی۔ تعلیم تو کیا حاصل کی بس ان سے اسم اعظم سیکھ لیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اسم اعظم یاد کرنے کے بعد کسی اور علم کی ضرورت نہیں رہتی۔''

ماں کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ ان کے ولی بیٹے کو خواجہ خضرؑ نے اسم اعظم یاد کرا دیا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔

اب محمد نے جس راستے پر قدم رکھ دیا تھا، وہ وہی تھا جس پر ان سے پہلے حسن بصریؒ، جنید بغدادیؒ، معروف کرخیؒ، رابعہ بصریؒ اور دوسرے جید صوفیائے کرام چل چکے تھے۔ آپ کے والد کو سماع سے بے حد شغف تھا اور اس کو روحانی غذا کہتے تھے۔ باپ نے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دیا لیکن قوالی سننے کے دوران بیٹے کو دور ہی رکھتے۔ محمد قوالوں کی آواز دور سے سنتے تو انہیں یوں لگتا گویا انہیں غیر مرئی قوت اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ قوالوں کی طرف کھنچنے لگتے۔ کئی بار ان کے جی میں آئی کہ وہ اپنے باپ سے محفل سماع میں شمولیت کی اجازت حاصل کر لیں لیکن ہمت نہیں پڑی اور خاموش رہے۔

ایک دن محفلِ سماع گرم تھی اور خواجہ احمد سماع سننے میں مشغول تھے۔ ان پر وجد طاری تھا۔ دوسری طرف محمد کی یہ حالت تھی کہ وہ خود کو روکے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ان کے قدم بے اختیار محفلِ سماع کی طرف اٹھے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ محفلِ سماع کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں سے خواجہ احمد صاف نظر آ رہے تھے۔ محمد کے لیے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ محفل سماع میں باپ کی مرضی کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے تھے اور باہر کھڑا رہنا دشوار تھا۔ اسی عالم میں باپ کی نظر مضطرب بیٹے پر پڑ گئی۔ باپ نے اشارے سے پاس بلا لیا۔ جب یہ باپ کے پاس پہنچے تو خواجہ احمد نے پوچھا۔ ''تم وہاں رک کیوں گئے تھے؟''

محمد نے جواب دیا۔ ''میں اس محفل میں آپ کی اجازت کے بغیر کس طرح آسکتا تھا۔''

باپ نے کہا۔ ''بیٹے! پہلے میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ تو وقت سے پہلے اس محفل میں آئے لیکن میرا خیال ہے کہ اب تو محفلِ سماع میں آسکتا ہے۔''

لیکن اب محمد کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ ان کے ہوش و حواس رخصت ہو چکے تھے۔ سماع نے انہیں بے حال و بے خود کر دیا تھا۔ انہوں نے بڑی بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا اور مدہوش ہو کر گر گئے۔ باپ نے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی مگر نہیں سنبھال سکے۔ نماز کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ باپ نے افسوس سے کہا۔ ''محمد! اگر وجد و کیف کا یہی عالم رہا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو نماز کس طرح پڑھے گا؟''

بیٹے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باپ نے قوالوں کو روک دیا کہ وہ قوالی نہ گائیں۔ وہ رک گئے۔ کافی دیر بعد محمد کو ہوش آنے لگا۔ باپ نے کہا۔ ''بیٹے! ہوش میں آؤ، نماز کا وقت ہو چکا ہے۔''

بیٹے نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر وضو کرنے چلے گئے۔ اس کے بعد نماز ادا کی۔ نماز کے بعد باپ نے کہا۔

''فرزند! تجھ پر سماع نے جو اثر کیا ہے اس سے یہ ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ وجد و کیف سے تیری نماز قضا ہو جایا کرے گی۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''باوا جان! جب میں وجد و کیف میں مدہوش ہو جاؤں تو اگر میرے کان کے پاس بار بار الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہا جائے گا تو میں ہوش میں آجایا کروں گا کیونکہ اس عالم مدہوشی میں بھی خشیتِ الٰہی کی حس بیدار رہتی ہے۔''

باپ نے کہا۔ ''بیٹے! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اس حد تک آگے بڑھ چکا ہے۔''

محمد نے خواہش کی۔ ''باوا جان! قوالوں کو حکم دیجیے کہ قوالی شروع کریں۔''

باپ نے بیٹے کی خواہش کا احترام کیا اور قوالوں سے کہا۔ ''قوالی شروع کریں۔''

قوالوں نے پوچھا۔ ''کتنی دیر کے لیے؟''

باپ کے بجائے بیٹے نے جواب دیا۔ ''جب تک میں منع نہ کروں۔''

باپ نے تائید کی۔ ''میں اس کی تائید کرتا ہوں۔''

قوالوں نے قوالی شروع کر دی اور محمد پر ایک بار پھر وجد و کیف طاری ہو گیا۔ اب ایک نئی صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ جب نماز کا وقت آتا تو کوئی شخص ان کے کان کے پاس الصلوٰۃ الصلوٰۃ کی صدا لگاتا جس سے وہ ہوش میں آجاتے۔ نماز ادا کرتے اور اس کے بعد پھر کیف میں مبتلا ہو جاتے۔ قوالوں کو ان کا اتنا پاس و لحاظ تھا کہ وہ سات دن تک اسی طرح قوالیاں سناتے رہے، آخر آٹھویں دن خواجہ احمد نے قوالوں کو منع کیا اور کہا۔ ''اب تم لوگ قوالی بند کر دو، بہت ہو چکا۔''

قوالوں نے کہا۔ ''حضرت! ہمیں تو آپ کے فرزند کے حکم کی تعمیل کرنا تھی سو سات دن سے کر رہے ہیں۔ اب خاموش ہو جانے کا حکم دے رہے ہیں تو خاموش ہوئے جاتے ہیں۔''

قوال خاموش ہو گئے۔ خاموشی کے کافی دیر بعد محمد کو ہوش آیا تو بے اختیار قولو، قولو کہنا شروع کر دیا۔ قوالوں نے خواجہ سے پوچھا۔ ''حضرت! کیا حکم ہے، کیا ہم قوالی شروع کر دیں؟''

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بہت ہو چکا۔ اب اس کو ہوش میں آجانا چاہیے۔''

لیکن عشقِ الٰہی میں چور فرزند کا وہی حال تھا کہ نیم مدہوشی میں ''قولو، قولو'' کی صدا لگائے جا رہے تھے پھر اچانک محمد نے قوالوں سے کہا۔ ''کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟ قولو، قولو۔''

قوالوں نے خواجہ احمد کی طرف دیکھا، انہوں نے آنکھ کے اشارے سے چپ رہنے کا حکم دیا۔

محمد نے نیم مدہوشی میں ادھر ادھر دیکھ کر جوش میں کہا۔ ''میں کیا کہہ رہا ہوں کسی نے سنا؟ میں کہہ رہا ہوں قولو، قولو۔ قوالی شروع کی جائے۔''

باپ نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نرمی سے کہا۔ ''فرزند! قوال تھک چکے ہیں۔ آج آٹھواں دن ہے کہ انہوں نے آرام تک نہیں کیا بس قوالی سنائے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے اب انہیں آرام کر لینے دو۔''

لیکن فرزند کی کیفیت سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کس آگ میں پھنک رہا ہے۔ کوئی ایسی شے ضرور ہے جو محمد کو مضطرب اور بے چین کیے ہوئے ہے۔ بیٹے نے باپ کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور قولو، قولو کا نعرہ بلند کیا۔ کچھ دیر بعد جب ان کی خواہش نہیں پوری کی گئی تو انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور قولو، قولو کی صدا لگائی۔ اس صدا کے جواب میں فضا

سے نغمے سنائی دینے لگے۔ باپ کو اس پر یقین نہیں آیا اور آسمانی نغمے کو بغور سننا شروع کر دیا۔ اب یہ آواز اتنی صاف آرہی تھی کہ اس آواز کو ہر کوئی سن سکتا تھا۔

تین دن گزر گئے مگر فضا سے نغمہ سرائی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس سے ہر شخص لطف اندوز ہو رہا تھا۔ محمد کے ہوش و حواس ان کے اختیار اور قابو ہی میں نہیں آتے تھے۔ تین دن بعد بھی فضا سے نغمگی جاری تھی۔ خواجہ احمد نے بیٹے کو ہوش میں دیکھ کر نصیحت کی۔ ”بیٹے! اعتدال۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”باوا جان! پہلے میں سماع کو اہم تو سمجھتا تھا لیکن اتنا اہم نہیں سمجھتا تھا۔“

باپ نے زور دیا۔ ”بیٹے! اعتدال، اعتدال۔“

محمد نے باپ کے قدموں کو بوسہ دے کر عرض کیا۔ ”باوا جان! جو لذت سماع میں ہے اور جیسی کامیابی سماع سے حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسرے شغل سے ممکن نہیں اور باوا جان! میں چند دنوں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کوئی شخص سو برس تک ریاضتِ شاقہ اور مجاہدے میں مشغول رہے تو وہ بھی اس مقام کو حاصل نہیں کر سکتا جو دوسرے شخص کو ایک مرتبہ کے سماع سے حاصل ہو جاتا ہے۔“

خواجہ احمد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”بیٹے! خاموش، سماع ایک راز سربستہ ہے جسے عارفوں نے عوام پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ تو بھی اسے راز میں رکھ اور عام لوگوں سے پوشیدہ رکھ کیونکہ بیچارے عوام اس کی تاب نہیں لا سکتے۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”باوا جان! واقعی اگر سماع کے راز کو ظاہر کر دیا جائے تو ساری دنیا سماع میں مبتلا ہو جائے گی اور خدا سے سماع کے سوا کسی چیز کا مطالبہ ہی نہیں کرے گی۔“

اس دوران خواجہ احمد کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی اور جو بشارت پہلے ملی تھی، وہ پوری ہو گئی۔

آپ اپنی زندگی کے چوبیسویں سال میں داخل ہوئے تو خواجہ احمد نے فرمایا۔ ”بیٹے! میں نے آج تک تجھے اپنا مرید نہیں کیا۔ اب تو میری مریدی میں بھی آجا۔“

بیٹے نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ”میں مریدی کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔“

اس کے بعد محمد نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ باپ نے پوچھا۔ ”بیٹے! تو رو کیوں رہا ہے؟“

محمد نے جواب دیا۔ ”آپ آج میری عمر کے چوبیسویں سال میں مریدی کا ذکر فرما رہے ہیں حالانکہ آپ سالوں پہلے مجھے مرید کر سکتے تھے، چنانچہ میں نے آپ کا اصل مفہوم پا لیا ہے۔“

خواجہ احمد نے پوچھا۔ ”میرے بیٹے! تو نے کون سا مفہوم پا لیا؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”آپ کے ارشاد کی روشنی میں، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب وقتِ جدائی آگیا ہے اور میرے مرید ہو جانے کے بعد آپ ہم میں زیادہ دن نہیں رہیں گے۔“

باپ نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر تیری بات درست ہی ہو تو تجھے خوش ہونا چاہیے کہ تیرا باپ عنقریب اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو مریدی میں آجاتا کہ میں خرقۂ خلافت بھی تیرے ہی حوالے کر دوں۔“

بیٹے نے کہا۔ ”باوا جان! آپ مجھ پر یقین کریں، یہ بات امرِ مسلّم میں سے ہے کہ میں آپ کی جدائی کا صدمہ بمشکل برداشت کر سکوں گا۔“

خواجہ احمد ان باتوں میں زیادہ نہیں پڑنا چاہتے تھے اس لیے موضوع ہی بدل دیا اور کچھ دیر بعد اپنے بیٹے کو اپنی مریدی میں لے لیا اور انہیں اپنا خرقہ پہنا کر جانشین کر دیا۔ آپ نے بیٹے سے کہا۔ ”بیٹے! فقر و فاقے کو کبھی بھی نہ چھوڑنا۔ یتیم اور نادار بچے ہی تمہاری توجہ کے سب سے زیادہ مستحق ہوں گے بیٹے! دولت مندوں سے پرہیز کرنا کیونکہ دولت مندوں کے فتنے اپنے ساتھ صالحین کو بھی رسوا کر دیتے ہیں۔“

بیٹے نے باپ کی نصیحتیں گرہ میں باندھ لیں اور باپ کی اجازت سے لوگوں کو مرید کرنا شروع کر دیا۔

کچھ دنوں بعد خواجہ احمد کا وصال ہو گیا اور محمد نے ان کی جانشینی کا فرض انجام دینا شروع کر دیا۔

چشت اور اس کے آس پاس اب بھی غیر مسلموں کی آبادی موجود تھی، آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی اور انہیں مسلمان کرنے کا کام شروع کیا۔ ان کی زبان میں اتنا اثر تھا کہ جب غیر مسلموں میں جا کر تبلیغ کرتے تو وہ سحر زدہ ہو کر آپ کے ہاتھوں اسلام قبول کر لیتے۔ بہت جلد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ چشت اور اس کے مضافات میں غیر مسلموں کا وجود ہی نہ رہا۔

ایک دن لوگوں نے آپ کی خدمت میں اس لیے حاضری دی کہ آپ کا عام مسلمانوں کی طرف سے شکریہ ادا کریں

کیونکہ چشت کی پوری غیر مسلم آبادی کو مسلمان کر لینا ایک انتہائی اہم واقعہ تھا لیکن آپ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھے۔ آپ کی تلاش شروع ہوئی تو آپ کے انتہائی قریبی مرید نے لوگوں سے کہا۔ ''تم سب انہیں بے سود تلاش کرتے ہو کیونکہ جب وہ زمین پر موجود ہی نہیں تو تم انہیں پاؤ گے کیسے؟''

لوگوں نے پوچھا۔ ''وہ زمین پر موجود نہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''ہاں، اس وقت وہ زمین کے اوپر نہیں، اندر ہیں۔''

لوگوں نے اس کا کچھ اور ہی مطلب لیا اور چیخیں مار کر رونے لگے۔ مرید نے کہا۔ ''اس میں رونے کی کیا بات ہے؟''

ایک شخص نے جواب دیا۔ ''تو بھی ان کا عجیب مرید ہے کہ ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ پیر و مرشد زمین کے اوپر موجود ہی نہیں اندر ہیں اور دوسری طرف یہ پوچھتا ہے کہ اس میں رونے کی کیا بات ہے؟''

مرید نے کہا۔ ''لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ پیر و مرشد رحلت فرما گئے۔ آؤ، میں تم لوگوں کی ان سے ملاقات کرا دوں۔''

مرید ان کو لے کر ایک کنویں کے پاس پہنچا اور کنویں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ذرا اس میں جھانک کر تو دیکھنا۔''

لوگوں نے کنویں میں جھانک کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس میں ان کے پیر و مرشد الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ انہوں نے گھبرا کر مرید سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟ کنویں میں انہیں کس نے اور کیوں لٹکایا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''یہ کس کی مجال ہے، پیر و مرشد خود ہی یہ عمل فرماتے رہتے ہیں اور اس سے ان کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اپنے جسم اور نفس کو اذیتیں پہنچا کر متنبہ کرتے رہیں کہ خبردار جو گمراہی اختیار کی اور تجاوز سے کام لیا۔''

شام کو آپ نے اس مرید کو بہت ڈانٹا اور پوچھا۔ ''تو ان لوگوں کو کنویں کے پاس کیوں لے گیا تھا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! وہ سب آپ سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھے۔''

آپ نے کہا۔ ''ان کی بے چینی اپنی جگہ، میں تو پوچھ رہا ہوں کہ تو انہیں کنویں کے پاس کیوں لے گیا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! وہ آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ میں اگر آپ کے پاس نہ لاتا تو وہ معلوم نہیں کس قسم کے شک و شبہے میں گرفتار ہو جاتے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تیری اس حرکت کا جانتا ہے کیا اثر ہوا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''کیا اثر ہوا؟ مجھے نہیں معلوم۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میرے نفس نے سرکشی کی اور اس نے مجھے باور کرا دیا کہ اے محمد! جن لوگوں نے تجھے کنویں میں الٹا لٹکا دیکھ لیا ہے، ان پر تیری عبادت اور نفس کشی کا بڑا گہرا اور اچھا اثر پڑا ہوگا اور یہ بات میرے لیے تباہ کن ہے۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تیری یہ غلطیاں میرے حق میں وبال بن جایا کریں گی۔ خدا کے لیے ان سے بچ اور میری بربادی کے درپے نہ ہو۔''

☆☆☆

اب آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں میں شہزادگان تک شامل ہو چکے تھے۔ وہ آپ کے پاس حاضریاں دیتے اور نصیحتوں اور دعاؤں کی برکتیں لے کر واپس جاتے۔

ایک دن آپ دجلہ کے کنارے تشریف لے گئے۔ یہاں آپ نے نماز ادا کی اور اس کے بعد پھٹا ہوا خرقہ اپنے ہاتھ سے سینے لگے۔ آپ اس میں اتنے منہمک ہوئے کہ آنے جانے والوں پر نظریں تک نہ ڈال سکے۔ کچھ دیر بعد آپ کو محسوس ہوا کہ کسی شے کا آپ پر سایہ پڑ رہا ہے۔ آپ نے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا تو اپنے سامنے خلیفہ کے بیٹے اور اس کے خدمت گاروں کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ان کے گھوڑے ان کے ساتھ تھے۔ شہزادے نے ان سے نظریں ملتے ہی سلام کیا۔ آپ نے جواب دیا اور پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟ کیسے آنا ہوا؟''

خلیفہ کے بیٹے نے جواب دیا۔ ''آپ کی قدم بوسی کو حاضر ہوا ہوں۔ اس ناچیز کو اپنے تبرکات میں سے کچھ عنایت فرمائیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اس عاجز کے پاس دولتِ دنیا تو ہے نہیں جو تمہیں پیش کی جائے اور دولتِ دنیا کی یوں بھی تمہیں کوئی کمی نہیں۔ خدا نے تیرے باپ کو حکومت عطا فرمائی ہے تو وہی سب کچھ گویا تجھے بھی مل گیا ہے۔''

ابنِ خلیفہ نے اصرار کیا۔ ''میں تو کچھ لیے بغیر جانے سے رہا۔ آیا ہوں تو کچھ لے کر ہی جاؤں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اچھا میں تجھے چند نصیحتیں کرتا ہوں۔ انہی کو میرے پاس سے لے جا اور کوشش کرتا رہ کہ۔۔ زندگی بھر ان پر عمل پیرا رہے اور اگر تو ان کے خلاف کرے گا تو اس کا وبال بھی تجھی پر رہے گا۔''

خلیفہ کے بیٹے نے کہا۔ ''حضرت! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جو نصیحت فرمائیں گے میں اس پر زندگی بھر چلتا رہوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''شہزادے! رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ کسی بادشاہ کی سلطنت میں اگر کوئی بوڑھی عورت بھی ایک رات فاقے سے رہ جائے تو اسے قیامت کے دن اس بادشاہ کا دامن پکڑنے کا حق حاصل ہوگا۔ اللہ نے تم لوگوں کو بادشاہت عطا فرمائی ہے اور اس میں فقراء اور بے سہارا لوگ بھی رہتے ہیں تو تمہیں ایک لمحہ بھی غفلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل قیامت کے دن تمہیں شرمسار ہونا پڑے۔''

آپ کی نصیحتوں کا شہزادے نے یہ اثر لیا کہ شاید آپ اپنی مدد کے لیے اشارہ فرما رہے ہیں۔ اس نے کچھ نقد اور دوسری چیزیں تحفے کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کیں۔ آپ مسکرائے اور فرمایا۔ ''شہزادے! تجھ کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ ہمارے خواجگان میں سے کسی نے بھی ان چیزوں کو قبول نہیں کیا پھر میں کس طرح قبول کرسکتا ہوں۔ میرے لیے فقر کی نعمت سلیمان کی دولت سے زیادہ بہتر ہے۔''

شہزادے نے عاجزی سے کہا۔ ''حضرت! میں نہایت عاجزی سے درخواست کر رہا ہوں کہ انہیں قبول فرمالیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''شہزادے! خدا کے بندوں کے لیے غیب کے خزانے کھلے رہتے ہیں۔ انہیں تمہارے عطیات کی ضرورت نہیں۔''

شہزادے نے پھر خوشامد کی۔ ''حضرت! آپ کو کمی ہو یا نہ ہو، یہ عطیات تو آپ کو قبول کرنا ہی پڑیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''شہزادے! ایک ایسی چیز پر تو کیوں مصر ہے جس کی مجھے ضرورت نہیں۔''

شہزادے نے عرض کیا۔ ''حضرت! مال و زر کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؟ مانا کہ آپ مستغنی ہیں مگر استغنا سے مال و زر کی اہمیت اور قدر و قیمت تو کم نہیں ہوتی۔''

آپ کو شہزادے کی سادگی اور بھولے پن پر ہنسی آگئی۔ آپ نے شہزادے کو اپنے پاس بٹھالیا اور فرمایا۔ ''شہزادے! تو یہاں میرے پاس بیٹھ جا اور جو کچھ میں دکھاؤں اسے دیکھ۔''

شہزادہ آپ کے پاس بیٹھ گیا۔ آپ نے شہزادے کے سر پر ہاتھ پھیرا، اس کے بعد اس کے چہرے اور آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''خداوند! میں نے جو کچھ دیکھا ہے اسے دوسروں کو بھی دکھا دے۔'' اس کے بعد آپ نے شہزادے سے فرمایا۔ ''ذرا دریا کی تہ میں دیکھنا کچھ نظر آرہا ہے؟''

شہزادے نے دجلہ کی سطح پر دیکھا، بولا۔ ''حضرت! مجھ کو تو دریا کی سطح نظر آرہی ہے، اس کی تہ بالکل نظر نہیں آرہی۔''

آپ نے زور دے کر فرمایا۔ ''شہزادے! میں دریا کی سطح کی بات نہیں کر رہا ہوں، تہ کی بات کر رہا ہوں۔ دجلہ کی تہ میں دیکھنے کی کوشش کر اور جو کچھ دکھائی دے اس سے مطلع کر۔''

شہزادے نے ایک بار پھر دجلہ کی سطح پر دیکھا تو اب سطح آب غائب ہوچکی تھی اور شفاف سطح کے نیچے دجلہ کی تہ میں دور تک سونے کے ذخائر نظر آرہے تھے۔ سونے کی ڈلیاں تلے اوپر تہ در تہ رکھی تھیں۔ شہزادہ اس ذخیرے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور حرص و طمع کے زیر اثر بولا۔ ''حضرت! یہاں تو سونا ہی سونا نظر آرہا ہے۔ کیا اس ذخیرے کو کسی طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''شہزادے! تیرے پاس دولت اور مال و زر کی کوئی کمی نہیں لیکن اس کے باوجود تو حرص و طمع کا شکار ہے۔ فقیر ہو کو اس چیز سے محروم رکھا گیا ہے۔ جا اور فقر اور استغنا کی دولت مانگ تاکہ تجھے سب کچھ مل جائے کیونکہ کسی انسان کو اگر فقر اور استغنا کی دولت سے محروم کردیا گیا ہے تو گویا اس کو ہر چیز سے محروم کردیا گیا ہے۔''

شہزادہ حیران و پریشان دیکھتا اور سنتا رہا اور آخر آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ آپ نے اس کو چند نصیحتیں اور کیں اور وہ واپس چلا گیا۔

☆☆☆

آپ کی بہن کی عمر شادی کے لائق ہوگئی لیکن وہ شادی کے لیے نہیں تیار ہوئیں۔ ان کا زیادہ وقت عبادت و ریاضت

میں گزرتا تھا۔ وہ اپنی معاش کے اخراجات چرخہ کات کر اور سوت بیچ کر پورا کرتی تھیں۔ محمد اکثر اشاروں کنایوں میں بہن کو شادی کا مشورہ دیتے رہتے تھے لیکن بہن شادی پر آمادہ ہی نہیں ہوتی تھیں۔

آخر ایک دن انہوں نے اپنی بہن کو اپنے سامنے بٹھایا اور کہا۔ ''بہن! اب تم شادی سے انکار نہ کرو۔ تمہاری کافی عمر ہو چکی ہے، آخر کب شادی کرو گی؟''

بہن نے جواب دیا۔ ''بھائی! آپ شادی پر اصرار نہ کیجیے کیونکہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

بھائی نے پوچھا۔ ''آخر کیوں؟ تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟''

بہن نے جواب دیا۔ ''میرا جی نہیں چاہتا۔ آپ اس پر مجبور نہ کیجیے۔''

بھائی نے کہا۔ ''میں تمہیں اس لیے مجبور کر رہا ہوں کہ یہ رسول علیہ کی سنت ہے اور جب تم عبادت و ریاضت اور روزمرہ اعمال اور اشغال میں سنتِ رسول علیہ ترک نہیں کرتیں تو اس سنت کو کیوں نظر انداز کر رہی ہو؟''

بہن نے جواب دیا۔ ''شادی سنت ہی تو ہے فرض تو نہیں۔ میں فرض چھوڑنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتی۔''

بھائی نے کہا۔ ''بہن، میں شادی پر اس لیے اصرار کر رہا ہوں کہ تمہارے بطن سے ایک ایسا فرزند پیدا ہوگا جو اپنے عہد میں یکتا ہوگا، مادرزاد ولی اور یگانۂ روزگار عارف ہوگا۔''

بہن نے جواب دیا۔ ''میں سوچوں گی لیکن فی الحال شادی کے لیے آمادہ نہیں۔''

دونوں بھائی بہن ایک عرصے تک خاموش رہے اور کسی کی بھی ہمت نہ پڑی کہ اس موضوع کو دوبارہ چھیڑتا۔ بھائی نے یہ محسوس کر لیا کہ ان کی بہن سامنے آنے میں ہچکچاہٹ ظاہر کرتی رہتی ہے۔ بہن اپنی طرف یہ سوچ رہی تھی کہ بھائی کو بحث مباحثے میں شکست نہیں دی جا سکتی، اس لیے ان کی نظروں سے دور ہی رہنا چاہیے۔

ایک دن محمد نے خواب میں دیکھا، ان کے والد خواجہ احمد تشریف لائے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ ''بیٹے! تو نے خاموشی کیوں اختیار کر لی۔ اپنی بہن کو شادی پر مجبور کر، اب وہ چالیس سال کی ہو چکی ہے، اس کو شادی کر لینا چاہیے۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''باوا جان! میں نے بڑی کوشش کی لیکن بہن شادی پر تیار ہی نہیں ہوئیں۔ آپ ہی بتایئے اب میں کیا کروں؟''

باپ نے کہا۔ ''بیٹے! جیسا کہ تو خود بھی اسے بتا چکا ہے کہ اس کے بطن سے ایک ولیِ کامل پیدا ہونے والا ہے۔ اس لیے اس کا شادی کرنا بے حد ضروری ہے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''باوا جان! میں ایک بار پھر کوشش کر دیکھتا ہوں، آپ بھی میری مدد کیجیے۔''

باپ نے کہا۔ ''میں اس سے بھی کہہ رہا ہوں، وہ شادی پر آمادہ ہو جائے گی۔''

آپ نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ''باوا جان! اب ایک بات کی اور فکر ہے اگر بہن نے شادی کے لیے آمادگی ظاہر کر دی تو بتایئے وہ شخص کہاں ہے جس سے بہن کی شادی کی جا سکتی ہے کیونکہ بہن کا شوہر بھی تو ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

باپ نے جواب دیا۔ ''بیٹے! تم اپنے کسی مرید کو چشت کے مغرب میں روانہ کر دو، راستے میں اس کو متعدد مواضع اور قصبے ملیں گے، وہ ان مواضع اور قصبات میں یہ معلوم کرتا جائے کہ اس میں محمد سمعان نامی کوئی ایسا درویش رہتا ہے، جس نے ابھی تک شادی نہیں کی اور وہ سیدزادہ بھی ہو۔ بس جب یہ شخص مل جائے تو اس کو اسی مرید کے ذریعے بلوا لو۔ وہ آ جائے گا، یہی تمہاری بہن کا ہونے والا شوہر ہے۔''

وہ شاید کچھ اور پوچھتے مگر اسی لمحے ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ لیٹے لیٹے دیر تک اس خواب کی بابت سوچتے رہے پھر ایک دم بہن کا خیال آ گیا۔ آپ نے بہن سے ملاقات کی اور پوچھا۔ ''بہن! تم نے اپنی شادی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟''

بہن نے جواب دیا۔ ''بھائی! آپ کی بات دوسری تھی لیکن میں والد مرحوم کی نافرمانی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے خواب میں مجھے تنبیہ کی ہے اور شادی کر لینے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے اب میں شادی کر لوں گی۔''

بھائی نے فرطِ خوشی سے بہن کی پیشانی چوم لی اور صبح ہوتے ہی انہوں نے محمد سمعان کے نام ایک خط لکھا۔

''اے محمد سمعان! میں نہیں جانتا کہ تو کون ہے؟ لیکن والد مرحوم نے تیرا جو تعارف کرایا ہے اس سے میں اتنا واقف ہو چکا ہوں کہ تو ایک پرہیزگار اور عبادت گزار انسان ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تو مجھ سے واقف ہے یا نہیں؟ اگر نہیں واقف ہے تو میں تجھ سے یہ خواہش کروں گا کہ میرے پاس چلا آ اور مجھ سے ملاقات کر...... اور اگر تو مجھ سے واقف ہے اور تیرے دل

میں میری عزت و حرمت ہے تو پھر میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو جس حال میں بھی ہو، اسی حال میں میرے مرید کے ساتھ چلا آ۔ یہاں تک کہ اگر تو نے ایک جوتا پہن رکھا ہو تو دوسرا پہننے کی ضرورت نہیں، اسی ایک جوتے میں میرے پاس چلا آ۔''

مرید اسی وقت خط لے کر روانہ ہو گیا اور مواضع اور قصبات سے گزرتا ہوا ایک ایسے گاؤں میں پہنچا جو مذکورہ شخص کا وطن تھا۔ مرید سیدھا اس شخص کے پاس پہنچ گیا اور خط اسے دے دیا۔ اس شخص نے یہ خط اس حال میں وصول کیا کہ کہیں جانے کی تیاری میں تھا اور واقعی ایک جوتا پہن رکھا تھا اور دوسرا پہننے والا تھا۔ اس نے خط پڑھا تو مسکرا دیا اور کہا۔ ''میں ان بدقسمتوں میں سے نہیں ہوں جو اس بزرگ ذات سے واقف نہیں۔ میں خواجہ احمد کے ان عدیم المثال بزرگ صاحبزادے کو اچھی طرح جانتا ہوں اور پھر یہ کہ مجھے کسی اور سے یہ حکم مل چکا ہے کہ میں خواجہ محمد سے چشت پہنچ کر فوراً ملاقات کروں۔ میں تو خود ہی حاضر ہونے والا تھا۔''

اس کے بعد انہوں نے دوسرا جوتا نہیں پہنا اور جس حال میں تھے، اسی حال میں چشت روانہ ہو گئے۔ شب و روز سفر کرتے ہوئے جب یہ خواجہ محمد کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے محمد سمعان کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا۔ ''محمد سمعان! کیا تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے کیوں بلایا ہے؟''

محمد سمعان نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں واقف تو ہوں لیکن اس کا اظہار اپنی زبان سے نہیں کر سکتا۔''

خواجہ محمد نے کہا۔ ''اے سیدزادے! میں اپنی بہن کی شادی تجھ سے کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ میرے والد مرحوم نے مجھے اس کی ہدایت کی ہے۔''

محمد سمعان نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں جانتا تھا کیونکہ حضرت خواجہ احمد نے مجھے بھی ہدایت کی تھی کہ میں فوراً آپ کے پاس پہنچوں۔''

آپ نے بہن کو مطلع کر دیا۔ ''تیرا ہونے والا شوہر آ چکا ہے۔''

بہن نے شرما کر جواب دیا۔ ''بھائی! میں ہتھیار ڈال چکی ہوں۔''

بھائی نے بہن کی شادی محمد سمعان سے کر دی اور سمعان بھی انہی کے ساتھ رہنے لگے۔

☆☆☆

اس دوران جبکہ خواجہ محمد کی عمر ستر سال ہو چکی تھی، انہیں معلوم ہوا کہ غزنی کا حکمراں محمود غزنوی ہندوستان کے مشہور بت کدے سومنات پر حملہ کرنے جا رہا ہے۔ آپ بھی غزنی چلے گئے اور سلطان محمود کو اپنی مہم میں جب آپ کی شمولیت کا علم ہوا تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ دوسری طرف اسے دوسرے مشہور صوفی ابوالحسن خرقانی کا خرقہ بھی حاصل ہو چکا تھا۔

سومنات کے سامنے جنگ کا آغاز ہوا تو آپ پہلے دن جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ سارے دن کی جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان قدرے پسپا ہو کر جنگل کی طرف ہٹ گئے۔ دوسرے دن آپ بھی جنگ میں شامل ہو گئے اور بہت خوفناک رن پڑا۔ آپ نے میدانِ جنگ ہی سے اپنے مریدِ خاص محمد کاکو، کو آواز دی۔ ''محمد کاکو! تو کیا کر رہا ہے؟ میری مدد کو پہنچ۔''

محمد کاکو ان دنوں چشت میں تھے اور آرام کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے پیر و مرشد کی آواز سنی تو وہ فوراً اٹھے اور ایک لکڑی لے کر دیوار پر بے تحاشا مارنا شروع کر دیا لیکن سومنات کے محاذ پر لوگوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک درویش خواجہ محمد کے پہلو بہ پہلو جنگ میں مشغول ہے اور خواجہ محمد اس کو بار بار ہدایت دے رہے ہیں۔ ''محمد کاکو! ادھر، اس محاذ کو سنبھالنا، ادھر بڑھو، دیکھو وہ کفار بڑھے چلے آ رہے ہیں، انہیں روکو۔''

محمد کاکو آپ کے حکم اور ہدایت پر عمل شروع کر دیتے۔

چشت میں لوگوں نے محمد کاکو کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہا ہے اور وہ بڑے جوش و خروش سے دیوار پر لکڑی مارے جا رہے ہیں۔

اس جنگ میں محمود غزنوی نے ہندوؤں کو شکست دے دی اور اس کا برملا اعتراف کیا کہ اس فتح میں خواجہ محمد کا روحانی تعاون اگر حاصل نہ ہوتا تو بڑی مشکل پیش آتی۔ اس نے آپ کی خدمت میں ارادت مندانہ حاضری دی اور دعا کی استدعا کی۔

آپ اپنے محبوب مرید محمد کاکو سے بہت خوش تھے اور چشت واپس پہنچ کر آپ نے ان کی بڑی تعریف کی۔ آپ کے ایک دوسرے مریدِ خاص استاد مردان کو رشک ہوا اور عرض کیا۔ ''حضرت! کچھ مجھ پر بھی نوازش ہو جائے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تو نوازش چاہتا ہے تو میں از راہِ نوازش تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو اپنے وطن سنجان خواف واپس جا۔''

مرید استاد مردان آزردہ خاطر ہوئے اور مایوسی سے کہا۔ ''حضرت! یہ کیسی نوازش ہے کہ آپ مجھ کو چشت سے نکالے

دے رہے ہیں۔ میں تو وطن واپس نہیں جاؤں گا۔“

آپ نے زور دیا۔ ”استاد مروان! تو نے نوازش کی خواہش کی تھی، میں نے کر دی۔ اب پس وپیش نہ کر چلا جا اپنے گھر۔ لوگ تو وطن جانے کی خواہش میں دیوانے ہو جایا کرتے ہیں، تو کیسا شخص ہے کہ اپنے وطن سے گریز کر رہا ہے؟“

استاد مروان نے عرض کیا۔ ”حضرت! صاف بات تو یہ ہے کہ میں آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔“

آپ نے تسلی دی۔ ”تو اپنے وطن واپس تو جا۔ میں تجھ سے جدا نہیں ہوں گا۔“

استاد مروان نے پھر عرض کیا۔ ”حضرت! سنجان خواف میں چشت کی ہوائیں نہیں ہوں گی۔ وہاں چشت کی روحانی برکت کہاں ملے گی۔“

آپ نے کہا۔ ”تو کیسا مرید ہے کہ تیرا پیر جو حکم دے رہا ہے تو اس کی تعمیل میں تامل اور ہچر مچر سے کام لے رہا ہے۔“

استاد مروان نے شرمساری سے جواب دیا۔ ”پیرومرشد! میری یہ مجال نہیں کہ میں آپ کی حکم عدولی کروں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”پھر وہی بات، میں تجھے اپنے آپ سے دور کب کر رہا ہوں؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”حضرت! جب میں اپنے وطن چلا جاؤں گا تو آپ سے خود بخود جدا ہو جاؤں گا۔“

آپ نے تبسم ہو کر فرمایا۔ ”میرے عزیز مرید! تو میرا مریدِ خاص ہے اور میں خود بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ تو مجھ سے جدا اور چشت سے اوجھل ہو جائے۔“

استاد مروان نے جواب دیا۔ ”حضرت! یہی تو میں کہتا ہوں۔ میں آپ کی مفارقت گوارا نہیں کر سکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”استاد مروان! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کو غور سے سن۔ میں نے یہ انتظام کر دیا ہے کہ جب تو یہاں سے چلا جائے گا تو، تو اپنے وطن سنجان خواف میں رہ یا کہیں اور...... میں اور چشت ہمیشہ تیرے سامنے رہیں گے۔“

استاد مروان نے حیرت سے پوچھا۔ ”حضرت! یہ کس طرح؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ اس طرح کہ جب تو اپنے وطن میں مجھ سے ملنا اور دیکھنا چاہے گا اور چشت کی یاد ستائے گی تو میں چشت سمیت تیرے سامنے موجود ہوں گا اور ہماری مفارقت کا تیرے دل میں خیال تک نہیں آئے گا۔“

استاد مروان نے قدرے پس وپیش سے پوچھا۔ ”تو میں اپنے وطن چلا جاؤں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں تجھے حکم جو دے رہا ہوں اور تیرے حق میں میری نوازش ہے کہ میں محض تیری خاطر خدا سے یہ درخواست کر چکا ہوں کہ وہ سنجان خواف میں، جب تو چاہے چشت اور میرا دیدار کرا دیا کرے چنانچہ میری یہ درخواست منظور ہوئی اور میرے رب نے مجھ کو یہ بشارت پہنچائی کہ استاد مروان کو یہ اختیار دیا گیا کہ اپنے وطن میں میرا اور چشت کا دیدار کر لیا کریں۔“

استاد مروان نے آپ کی باتوں پر یقین کیا اور اپنے وطن چلے گئے۔

جاتے ہی انہوں نے چشت اور اپنے پیرومرشد خواجہ محمد کا خیال کیا اور انہیں دیکھنے کی خواہش کی۔ چنانچہ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے سامنے چشت بھی موجود تھا اور پیرومرشد خواجہ محمد بھی اور آپ زیرِلب فرما رہے ہیں کہ اے استاد مروان! تجھے اب میری باتوں کا یقین آ گیا؟

مرید نے عاجزی وانکساری سے جواب دیا۔ ”حضرت! یقین تو مجھے پہلے بھی تھا لیکن اس کا عملی مشاہدہ اب کیا۔ میں آپ کا شکریہ کس زبان سے اور کس طرح ادا کروں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”شکریے کی بات کوئی نہیں۔ میں نے تجھ سے جو وعدہ کیا، اس کو پورا کر دیا۔“

آپ کی عمر کا پیمانہ لبریز ہونے کو تھا۔ آپ نے اپنے تین مریدوں کو خلافت بخشی۔ ان میں دو کے نام وہی ہیں جن کا ذکر پیچھے کیا جا چکا ہے۔ محمد کاکو اور استاد مروان...... تیسرے خلیفہ بہن کے صاحبزادے ابو یوسف تھے۔

آپ کا وصال 4 ربیع الثانی 411 ہجری میں ہوا اور چشت ہی میں آخری رسوم ادا کی گئیں۔

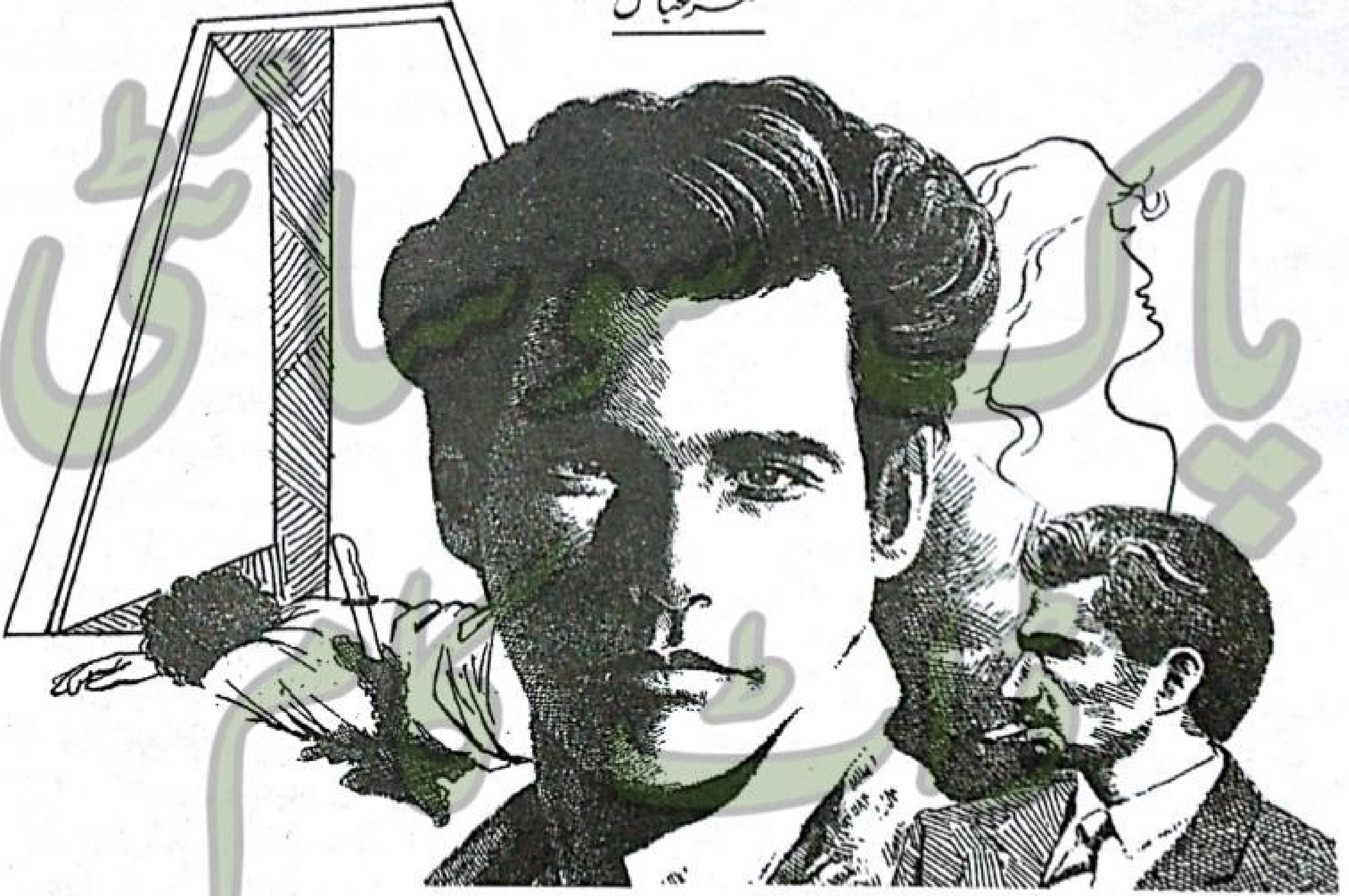
ماخذات
اذکار ابرار، محمد غوثی شطاری۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ تحفۃ الکرام، میر علی شیر قانع۔ بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمن۔ خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ سفینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ تاریخ فیروز شاہی، ضیاالدین برنی۔ حضرت بوعلی قلندر، اقبال صلاح الدین

خطرات کے کھلاڑی کی مہم جوئی کا لرزہ خیز انجام

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم مانگتے کچھ اور ہیں اور ملتا کچھ اور ہے پھر... ایسا بھی ہوتا ہے کہ مانگتے کسی اور کے لیے ہیں اور ملتا کسی اور کو ہے۔ قدرت ایسے کمالات نہ دکھائے تو انسان اندھیروں میں بھٹکتا رہ جائے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی سفر پر نکلا تھا جس کی منزل کوئی اور تھی لیکن تقدیر نے پہنچایا کسی اور جگہ۔

مہم جو

ثمر عباس



ڈون ڈیمی نے غصے سے اپنا سر ہلایا اور ہیلی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ”یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ میں حوالات میں بند ہوں اور جس کی وجہ سے یہاں تک پہنچا، وہ آزاد پرندے کی طرح اڑتا پھر رہا ہے۔“

ہیلی جانتا تھا کہ ڈون کی کسی بات سے اختلاف کرنا بھی جرم ہے لیکن ملاقات کا وقت کم تھا اور اسے اسی محدود دورانیے کے درمیان ڈون کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کرنا تھا۔ لہٰذا وہ جلدی سے بولا۔

”باس! تم فکر نہ کرو۔ وکیل تھوڑی دیر میں پہنچنے ہی والا ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گا۔“

”جہنم میں گیا وکیل۔“ ڈون اتنی زور سے دہاڑا کہ شیشے کی کھڑکی کے باہر کھڑا ہوا محافظ بھی اس جانب متوجہ ہو گیا۔ ڈون کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ نسبتاً دھیمی آواز میں بولا۔ ”وہ ٹیکسی ڈرائیور اس واقعے کا عینی شاہد ہے اور اس کی وجہ سے ہی میں گرفتار ہوا ہوں۔ تم نہیں جانتے کہ اس نے مجھے کس مشکل میں ڈال دیا ہے۔“

ہیلی مزاج شناس تھا۔ فوراً ہی سمجھ گیا کہ ڈون کیا سوچ رہا ہے لہٰذا اس نے خاموش رہنے میں عافیت جانی اور تائید میں سر ہلا دیا۔ ڈون آگے کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”میری بات غور سے سنو ہیلی۔ میں اس کا

خاتمہ چاہتا ہوں۔ اس کی گواہی پوری تنظیم کو تباہ کر دے گی۔ اب اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے خطرناک ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

ہیلی نے مایوسی کے انداز میں کہا۔ ''ہم پہلے ہی دو مرتبہ ایسی کوشش کر چکے ہیں جس کے نتیجے میں ہمارے دو آدمیوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ہمارا ایک آدمی سڑک پار کرتے ہوئے ٹرک کے نیچے آ گیا جب وہ بیکن کا پیچھا کر رہا تھا جبکہ سامی کو سانپ نے ڈس لیا حالانکہ وہ بیکن کے بہت قریب پہنچ چکا تھا لیکن جس جھاڑی کے پیچھے چھپ کر وہ بیکن کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا، وہاں سانپوں کا ایک جوڑا بھی تھا۔ سامی کو اپنا پستول نکالنے کی مہلت بھی نہ ملی اور وہ دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔ ان دو واقعات کے بعد بیکن محتاط ہو گیا ہے اور فی الوقت شہر چھوڑ کر موئی چلا گیا ہے۔''

ڈون پہلے سے سب کچھ جانتا تھا۔ اس لیے بیزار ہوتے ہوئے بولا۔ ''موئی...... یہ کہاں ہے؟''

''ہوائی میں۔''

ڈون کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ غراتے ہوئے بولا۔ ''یہاں میں حوالات کی سردی میں ٹھٹھر رہا ہوں اور مجھے یہاں تک پہنچانے والا ہوائی کی سیر کر رہا ہے۔ میرے لیے یہ ناقابلِ برداشت ہے۔''

ہیلی جانتا تھا کہ غصے کی حالت میں ڈون کے سامنے کچھ کہنا اس کے غضب کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ اس نے تھوڑا سا توقف کیا اور جب ڈون کے چہرے کی رنگت اصل حالت پر واپس آئی تو ڈرتے ڈرتے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں روڈی کو اس مہم پر بھیجنا چاہیے۔''

''جب تک وہ اپنا وزن کم از کم سو پونڈ کم نہ کرے، اسے کسی ایسی مہم پر نہیں بھیجا جا سکتا۔ بیکن جیسے پھرتیلے شخص کا تعاقب کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ تم نے لارل اور ہارڈی کی فلمیں دیکھی ہیں؟ وہ بالکل ہارڈی جیسا نظر آتا ہے۔''

''میں نے اسی لیے اس کا نام تجویز کیا ہے۔ اس سے پہلے جن دو لوگوں کو بھیجا تھا وہ بیکن کی نظروں میں آ گئے تھے لیکن روڈی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہے۔ وہ واقعی ہارڈی جیسا لگتا ہے۔''

بوئنگ 737 نے جب موئی کے ائرپورٹ پر لینڈنگ شروع کی تو روڈی دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ جہاز رن وے پر غیر ضروری چکر لگانے کے بجائے سیدھا ائرپورٹ سے باہر جانے والے راستے کے سامنے رک جائے۔ وہ جتنی جلدی اس چھوٹی سی نشست سے نجات حاصل کر لیتا، اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہوتا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لوگ اس جزیرے پر تفریح کرنے آتے ہیں لیکن اس طرح کا تکلیف دہ سفر ان کا سارا مزہ خراب کر دیتا ہوگا۔ ایسا سوچتے وقت وہ بھول گیا تھا کہ جہاز کی نشستیں عام جسامت کے مسافروں کے لیے بنائی جاتی ہیں اور روڈی جیسے شخص کو ان میں پھنس کر ہی بیٹھنا پڑتا ہے۔ کینیڈی سے ہونولولو تک کی پرواز بہت اچھی رہی لیکن اس کے بعد کا سفر کچھ زیادہ خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ اسے نہ صرف اپنی نشست چھوٹی لگ رہی تھی بلکہ سامنے والی نشست سے فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے اسے اپنے پاؤں پھیلانے میں بھی مشکل پیش آ رہی تھی اور وہ اپنی نشست پر اس طرح سمٹا ہوا بیٹھا تھا جیسے کسی نے اسے شکنجے میں جکڑ دیا ہو۔

گو کہ ابھی تک وہ جہاز سے باہر نہیں آیا تھا لیکن سردی سے اس کے کان اور ناک بند ہونے لگے تھے اور وہ ہر سانس کے ساتھ .... ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ اسے بیکن پر غصہ آنے لگا۔ اگر اسے فرار ہونا ہی تھا تو وہ شکاگو یا لاس اینجلس چلا جاتا۔ ان جگہوں پر موسم کی شدت اتنی زیادہ نہیں ہوتی اور وہ بڑی آسانی سے اسے کسی بھی سڑک پر اس طرح نشانہ بناتا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ البتہ ہوائی کے بارے میں اس کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں اور وہ بس اتنا جانتا تھا کہ یہاں اناناس بکثرت پیدا ہوتا ہے۔

جیسے ہی جہاز کے پہیوں نے رن وے کی سطح کو چھوا تو وہ مزید اپنی نشست میں دھنستا چلا گیا۔ جہاز کا دروازہ کھلتے ہی اس کے برابر میں بیٹھا ہوا جاپانی مسافر اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہ روڈی پر گئی۔ وہ جھکا اور اس نے روڈی کی نشست کا بازو اوپر اٹھا دیا۔ اس طرح روڈی کے لیے اتنی گنجائش پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے جسم کو حرکت دے سکے.... وہ بمشکل تمام کھڑا ہوا تو پتا چلا کہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے اس کے پیر سن ہو چکے تھے۔ وہ جیسے تیسے ائرپورٹ کی عمارت سے باہر آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہونولولو واپس جانے کے لیے وہ بحری سفر کو ترجیح دے گا۔

غنیمت تھا کہ تنظیم کے ایجنٹ نے اس کے لیے کرائے کی گاڑی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس نے ایڈورڈ رائس کے نام سے اپنی شناخت کروائی۔ ڈرائیونگ لائسنس رکھ کر کچھ کاغذات پر دستخط کیے اور کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادائیگی کر دی۔ پھر اس نے شہر کا نقشہ حاصل کیا اور منی وین میں سوار ہو کر روٹ 380 کی جانب چل دیا جو اس کا پہلا اسٹاپ تھا۔ دو میل جانے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی دکان پر رک گیا جہاں بظاہر الیکٹرانک اشیا کی مرمت ہوتی تھی۔ پہلے سے طے شدہ

انتظام کے تحت اسے ایک بیگ پکڑا دیا گیا جس میں کوئی وزنی چیز تھی۔

منی وین کا دروازہ بند کر کے اس نے بیگ کو کھولا۔ اس میں ایک باکس موجود تھا جس پر کسی چاکلیٹ کا لیبل لگا ہوا تھا۔ اس نے باکس کو کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک سیمی آٹو میٹک پستول رکھا ہوا تھا۔ روڈی نے مطمئن ہو کر باکس بند کیا اور اسے دوبارہ بیگ میں رکھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اب اسے صرف بیکن کو تلاش کرنا تھا اور اس وقت تک اس کا پیچھا کرنا تھا جب تک اسے ختم کرنے کا موقع نہ مل جاتا۔ تنظیم کی جانب سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق وہ اس شہر میں لونی کے نام سے رہ رہا تھا۔ اگر روڈی اسے مارنے میں کامیاب ہو جاتا تو تنظیم میں اس کی کئی درجے ترقی ہو جاتی۔ روڈی کے خیال میں یہ ایک سنہری موقع تھا جو قسمت سے ہی ملتا ہے۔ تنظیم کے مخبروں نے یہ کھوج بھی لگا لیا تھا کہ بیکن اب لونی کے نام سے موئی بریکر ہوٹل میں ویٹر کے طور پر کام کر رہا ہے۔

پچاس منٹ بعد وہ بریکر ہوٹل کے کاؤنٹر پر موجود تھا۔ رسمی کارروائی مکمل ہوئی تو استقبالیہ پر بیٹھی سیاہ بالوں والی پرکشش ایشیائی لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”امید ہے کہ اس ہوٹل میں آپ کا قیام خوش گوار رہے گا اور آپ اس کے ٹیرس میں بیٹھ کر ہوائی کے سورج سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔“

روڈی نے مسکراتے ہوئے سر کو خم کیا تو وہ ایک ادا سے بولی۔ ”کرسمس مبارک ہو مسٹر رائس۔“

جب روڈی ایک ویٹر کے ہمراہ لفٹ کی جانب جا رہا تھا تو اسے ایک بار پھر سردی کا احساس ہونے لگا۔ اس کی ناک اور کان بند ہو چکے تھے اور وہ مشکل سے گٹار کی دھن سن سکتا تھا جو لابی میں لگے ہوئے اسپیکر سے سنائی دے رہی تھی۔

ساتویں منزل پر واقع اس کا کمرا سمندر کے رخ پر تھا۔ ویٹر نے اس کا سامان بانس سے بنے ہوئے ریک پر رکھا اور کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ سامنے لانائی کا جزیرہ نظر آ رہا ہے۔ اس کے دائیں جانب مولوکائی ہے۔ یہاں سے کناپلی کے ساحل کا منظر بالکل صاف دکھائی دیتا ہے۔ البتہ ہالی کالا نظر نہیں آئے گا۔“

”یہ ہالی کالا کیا ہے؟“

”خاموش آتش فشاں۔ یہاں آنے والے سیاحوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے لیکن گہرے بادلوں کی وجہ سے اس کی چوٹی نظر نہیں آ رہی۔ بہر حال اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا دینا۔“

روڈی نے اسے پانچ ڈالر بطور ٹپ دیے اور وہ اس کا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد روڈی نے میز پر رکھی ہوئی سروس ڈائریکٹری اٹھائی۔ ٹیرس پر ہی مرکزی طعام گاہ تھی اور اسے بتایا گیا تھا کہ لونی کی ڈیوٹی بھی وہیں ہوتی ہے۔ اس نے کوٹ، ٹائی اتاری اور قمیص کے اوپری بٹن کھول دیے پھر اس نے بیگ میں سے چاکلیٹ باکس نکال کر سوٹ کیس میں رکھا اور کمرے کو تالا لگا کر لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔ طعام گاہ میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے کھانا کھائے کتنی دیر ہو چکی ہے۔

”گڈ ایوننگ!“ ایک ویٹر نے اس کے قریب آکر مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”آپ مینیو میں سے کچھ منگوانا چاہیں گے یا روسٹ بیف بوفے کو ترجیح دیں گے؟“

روڈی نے اس کے سینے پر لگے ہوئے بیج پر نظر ڈالی۔ اس کا نام ہیر اللہ تھا۔ روڈی نے پچھلے گیارہ گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ماسوائے اس کھانے کے جو پرواز کے دوران دیا گیا تھا۔ لہٰذا اس نے مینیو سے کچھ منگوانے کے بجائے بوفے کو ترجیح دی تاکہ وہ پیٹ بھر کر کھا سکے۔

اس نے تین بار اپنی پلیٹ کو بیف، آلو کے چپس، میکرونی اور پنیر سے بھرا۔ ہر مرتبہ اپنی میز سے بوفے ٹیبل تک جاتے ہوئے وہ مختلف ویٹرز کے نام پڑھتا رہا۔ ایڈورڈ، رومیو، جان، پرنس لیکن ان میں لونی نظر نہیں آیا۔ پھر جب وہ کافی لینے کے لیے اسٹینڈ پر گیا تو ایک ویٹر کے سینے پر لگا ہوا بیج دیکھ کر ٹھٹک گیا، وہ لونی ہی تھا۔

روڈی کا خیال تھا کہ وہ کوئی لمبا چوڑا صحت مند شخص ہوگا جس کو ٹھکانے لگانے کے چکر میں تنظیم کے دو اہم افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے لیکن لونی کو دیکھ کر اسے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ دبلا پتلا بے رونق چہرے والا شخص تھا اور اس کے بارے میں روڈی کو صرف یہی بتایا گیا تھا کہ اسے ہر قیمت پر راستے سے ہٹانا ہے۔ روڈی کو اس سے زیادہ تفصیل نہیں بتائی گئی تھی اور نہ ہی وہ یہ جانتا تھا کہ لونی کے نام سے ویٹر کا روپ دھارنے والا بیکن دراصل وہی ٹیکسی ڈرائیور ہے جس نے ڈون کو اپنے حریف ایڈمنڈ پر گولی چلاتے ہوئے دیکھا اور اس کی اطلاع پولیس کو دے دی تھی۔ پولیس اس کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق ڈون تک پہنچ گئی۔ اب اس کا زندہ رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ فی الحال پولیس نے اسے محفوظ مقام پر منتقل کر دیا تھا لیکن جب مقدمے کی کارروائی شروع ہوتی اور وہ عدالت میں گواہی دے دیتا تو دنیا کی کوئی طاقت ڈون کو سزا

سے نہیں بچا سکتی تھی۔ وہ اتنا پھرتیلا ثابت ہوا کہ اس کو مارنے کے چکر میں ڈون کے دو ساتھی بھی جان سے گئے اور اب روڈی کو یہ اہم کام سونپا گیا تھا۔

بوفے کا بل خاصا مہنگا تھا لیکن روڈی کو اس کی فکر نہیں تھی۔ اب اس کے اچھے دن آنے والے تھے۔ لونی کو ٹھکانے لگانے کے بعد وہ تنظیم کا اہم ترین رکن بن جاتا اور عین ممکن تھا کہ ڈون کے بعد تنظیم میں اس کی دوسری پوزیشن ہوتی۔ لہٰذا اس نے سرشاری کے عالم میں بل کی ادائیگی کرتے ہوئے ویٹر رونالڈ سے کہا۔

''کیا تم کل بھی کام پر آؤ گے؟ میرا خیال ہے کہ یہ مناسب نہیں۔ کرسمس سے ایک دن پہلے تو چھٹی ملنی چاہیے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ویٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کل ہماری چھٹی دو بجے ہو جائے گی۔''

''کیا تمہارے سب ساتھی دو بجے فارغ ہو جائیں گے؟'' روڈی نے پوچھا۔

''ہاں۔ شام کی شفٹ کے لیے ہوٹل والوں نے پارٹ ٹائم کام کرنے والے لوگوں کو بلایا ہے۔''

روڈی نے فوراً ہی اپنے ذہن میں پروگرام ترتیب دینا شروع کر دیا۔ لونی کو بھی دوسرے ویٹرز کے ساتھ دو بجے ہی نکل جانا تھا۔ اس کا تعاقب کرنے کے لیے یہ انتہائی مناسب وقت تھا۔ روڈی نے بل ادا کیا اور ڈائننگ ہال سے باہر آ گیا۔

اب وہ بڑے ہی محتاط انداز میں ہوٹل کے دوسرے حصوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے غور کیا کہ ہوٹل میں دو پارکنگ لاٹ تھے۔ ان میں سے ایک سامنے کی جانب تھا جہاں عام گاہکوں اور مہمانوں کی گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں جبکہ دوسرا پارکنگ لاٹ ہوٹل کے عقب میں واقع تھا۔ وہاں اس نے مختلف کوسٹرز، منی وینز اور اسٹاف کی گاڑیاں کھڑی دیکھیں۔ ان میں سے ایک کار یقیناً رونی کی ہوگی۔

کمرے میں آ کر اس نے لباس تبدیل کیا اور ٹی وی آن کر دیا لیکن چند ہی منٹوں بعد اشتہارات کی بھرمار سے اسے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اس نے جھلا کر ٹی وی بند کر دیا اور اپنے منصوبے کے بارے میں غور کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دوسرے دن اس کی آنکھ کافی دیر سے کھلی۔ وہ گھبرا کر بستر سے باہر نکلا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی جلدی شیو بنایا اور لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ ناشتے کا وقت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ایک خوب صورت لڑکی نے اس کا استقبال کیا اور اس کی مخصوص میز تک لے گئی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں گزشتہ شب لونی اپنے گاہکوں کی خدمت میں مصروف تھا۔ روڈی کو دیکھتے ہی وہ لپک کر اس کے پاس آیا اور بڑے مؤدبانہ انداز میں بولا۔

''جناب! میں لونی ہوں۔ آپ کا میزبان۔ آپ کیا لینا پسند کریں گے...... کافی؟''

روڈی نے غور سے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ لونی نے سلیقے سے اپنے سیاہ بالوں میں کنگھی کر رکھی تھی اور اس کے چہرے پر بڑی معصوم سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ روڈی کو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ تنظیم کے دو بہترین آدمیوں کی موت کا ذمے دار ہو سکتا ہے۔

''ہاں۔'' روڈی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کافی کے ساتھ بوفے بھی لوں گا۔''

لونی نے بوفے ٹیبل تک اس کی راہنمائی کی۔ جہاں سے روڈی نے اپنے مطلب کی چیزیں پلیٹ میں ڈالیں اور اپنی میز پر واپس آ گیا۔ اسی دوران لونی اس کے لیے گرم کافی بھی لے آیا۔ روڈی نے ناشتا کرنے کے بعد بل منگوایا اور ساتھ ہی لونی کو بھی دس ڈالر ٹپ میں دے دیے۔ اس نے دل میں سوچا کہ اچھا ہے مرنے سے پہلے اسے تھوڑی سی خوشی مل جائے۔

لونی نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''آج سردی بہت زیادہ ہے۔ آپ کو خاص طور پر احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔''

''بے فکر رہو۔ میں خیال رکھوں گا۔''

ہوٹل کی لابی میں واقع گارمنٹ شاپ سے اس نے اپنے لیے بڑے سائز کی قمیص خریدی جس میں بہ آسانی وہ اپنا پستول چھپا سکتا تھا۔ پھر وہ کمرے میں آیا اور نئی قمیص پہن کر وقت گزاری کے لیے ٹی وی دیکھنے لگا۔ ڈیڑھ بجے اس نے ٹی وی بند کیا اور اپنے سوٹ کیس سے پستول نکال کر اپنی پیٹی میں باندھ لیا۔ وہ قمیص چونکہ پتلون سے باہر تھی اس لیے پستول پوری طرح اس میں چھپ گیا پھر وہ لفٹ کے ذریعے نیچے لابی میں آیا۔ سامنے پارکنگ لاٹ میں اس کی ڈاج منی وین کھڑی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے چلاتے ہوئے پارکنگ لاٹ سے اس طرح نکلا جیسے گھومنے جا رہا ہو۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد اس نے گاڑی واپس موڑی اور ہوٹل کے عقبی پارکنگ لاٹ کی جانب چل دیا۔ اس نے اپنی وین ایسی جگہ کھڑی کی جہاں سے ہوٹل اسٹاف کی آمد و رفت پر نظر رکھی جا سکے۔ اس نے دھیمی آواز میں ریڈیو آن کر دیا اور نشست کی پشت سے سر لگا کر مقامی موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگا۔

☆☆☆

دو بج کر سات منٹ پر لونی اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ باہر آتا دکھائی دیا۔ پھر وہ دونوں ان سے رخصت ہو کر اس ٹویوٹا وین کی جانب بڑھ گئے جو روڈی کی گاڑی سے دو لائنیں چھوڑ کر کھڑی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور پارکنگ سے باہر آنے کے بعد اس کا رخ دائیں جانب موڑ دیا۔ آگے جا کر اس نے ایک اور موڑ لیا اور اس کی گاڑی ہائی وے پر جنوب مشرق کی جانب بڑھنے لگی۔ روڈی نے جلدی سے نقشے پر نظر ڈالی اور سوچنے لگا کہ وہ گاڑی لاہینا کی طرف جا رہی تھی جہاں بالعموم سیاحوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ کیا وہاں پر وہ اسے نشانہ بنا سکے گا لیکن اس کا اندیشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ دس منٹ بعد وہ گاڑی لاہینا کو چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد موئی کی مغربی پہاڑیوں کے دامن میں ایک چوراہا نظر آیا جہاں پہنچ کر وین، روٹ 380 کی جانب گھوم گئی۔ تین منٹ بعد دائیں جانب ایک اور موڑ آیا اور اس کے ایک منٹ بعد وین ایک بار پھر دائیں جانب مڑ گئی۔ اب وہ ایک کھلے میدان میں واقع ایک تنگ سی پٹی پر گزر رہی تھی۔ روڈی نے ایک بار پھر نقشہ دیکھا۔ اس مقام سے دس میل کے فاصلے پر پوکالانی نامی قصبہ تھا۔ گویا لونی اس قصبے میں رہتا تھا۔

اگلا موڑ کاٹنے کے بعد وہ ایک نسبتاً بہتر سڑک پر آ گئے جو سیدھی پوکالانی کی طرف جا رہی تھی لیکن کچھ دیر بعد وہ قصبہ بھی گزر گیا۔ روڈی کی نظر ایک بورڈ پر گئی جس پر ہالی کالا ہائی وے لکھا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ نام اس نے پہلے بھی سنا ہے۔ اس کے بعد کافی دور تک اس سڑک پر کسی قصبے کا بورڈ نظر نہیں آیا۔ وہ بالکل کھلا علاقہ تھا اور دور دور تک آبادی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ بائیں جانب اونچی اونچی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ چھ میل بعد ایک اور چوراہا نظر آیا۔ اس نے ایک بار پھر نقشے پر نظر ڈالی۔ اوہ خدا...... یہ وہی آتش فشاں تھا جس کا تذکرہ گزشتہ روز ویٹر نے کیا تھا۔ اس نے بالکل صحیح کہا تھا۔ گہرے بادلوں نے آتش فشاں کی چوٹی کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔

اب ٹویوٹا وین بائیں جانب مڑ گئی تھی اور چڑھائی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ روڈی نے بیک مرر میں دیکھا۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی گاڑی نہیں تھی اور نیچے ڈھلان میں وہ جگہ نظر آ رہی تھی جہاں گزشتہ روز اس کا جہاز اترا تھا۔ آگے چل کر وہ بل کھاتی سڑک ایک بار پھر سیدھی ہو گئی۔ اس نے سکون کا سانس لیا گو کہ سردی کی وجہ سے اس کی ناک سرخ ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ سطح سمندر سے دو ہزار فٹ بلندی پر آ گئے ہیں۔

ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹویوٹا صنوبر کے جنگل کے پاس سے گزری اور پھر دائیں جانب موڑ کاٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جب روڈی وہاں پہنچا تو اس کی ناک جنگل میں پھیلی ہوئی بو سونگھنے سے قاصر تھی جبکہ اسے ہمیشہ سے ہی یہ خوشبو پسند تھی۔ وین اب دوبارہ چڑھائی کی طرف جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ٹمپریچر دکھانے والی سوئی بھی آگے کی جانب بڑھنے لگی۔ چند منٹ بعد اس کی گاڑی سڑک کے دائیں جانب واقع لکڑی سے بنی ہوئی ایک چھوٹی عمارت کے سامنے سے گزری۔ وہاں ایک براؤن رنگ کی وین کھڑی ہوئی تھی جس پر سرکاری نمبر پلیٹ آویزاں تھی۔ روڈی نے عمارت کے باہر لگے ہوئے زنگ آلود بورڈ کو پڑھا جس پر سطح سمندر سے بلندی سات ہزار فٹ لکھی ہوئی تھی۔

اس نے نقشہ نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس سڑک سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ سڑک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر ختم ہو رہی تھی اور وہاں اس وقت صرف یہی تین گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ روڈی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لونی یہاں کیوں آیا ہے۔ شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ موت اس کا تعاقب کر رہی ہے۔

گہرے بادلوں نے زمین اور آسمان کے درمیان ایک دبیز چادر تان دی تھی اور لگتا تھا کہ وہ آسمان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک جگہ روڈی کو سڑک بادلوں سے ملتی ہوئی نظر آئی۔ وہاں سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹویوٹا وین گہری دھند میں غائب ہو گئی۔ روڈی نے اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن کرنے کے لیے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا لیکن فوراً ہی ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس طرح تو لونی کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس کی گاڑی آہستہ آہستہ چڑھائی کی جانب رینگتی رہی اور پھر اسے چند فٹ کے فاصلے پر وین نظر آ گئی۔

یہاں پہنچ کر روڈی نے سکون کا سانس لیا۔ اب لونی کی موت قریب تھی۔ اس نے منہ کے ذریعے زور زور سے سانس لینا شروع کر دی۔ اس کی ناک مکمل طور پر بند ہو چکی تھی اور کان بھی سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ان کے درمیان بیس فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ روڈی نے گیئر بدلا اور گاڑی کی رفتار پندرہ میل فی گھنٹا کر دی۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے دونوں جانب بھورے اور سیاہ پتھر پڑے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ آتش فشاں سے بہنے والا لاوا ہے جو جم کر پتھروں کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ شدید دھند کی وجہ سے اسے سامنے کی چیزیں نظر نہیں

آرہی تھیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے کی کوشش کی تو اسے کچھ فاصلے پر ٹویوٹا وین کھڑی ہوئی دکھائی دی۔

روڈی نے فوراً ہی بریک لگایا اور انتظار کرنے لگا لیکن اسے وہاں کسی حرکت کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس نے انجن بند کیا۔ کمر کی پیٹی سے بندھا ہوا پستول نکالا۔ اس کا چیمبر چیک کیا اور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ دھند کی دبیز چادر نے ٹویوٹا وین کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکتا ہوا آگے بڑھا اور ٹویوٹا سے لگ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے کار کے اندر جھانکا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔

اب کیا کیا جائے؟ گہرے بادلوں اور دھند کی وجہ سے قریب کی چیزیں بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔ ایسے میں لوئی کو کیسے تلاش کیا جائے' وہ کار کی اوٹ میں رک کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ سردی کی شدت نے اسے نڈھال کر دیا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اسی طرح کھڑا رہا تو اس کی رہی سہی توانائی بھی ختم ہو جائے گی۔

یکایک اسے کچھ آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی پتھروں پر چل رہا ہو۔ شاید کسی وجہ سے لوئی نے یہ مناسب سمجھا ہو کہ اپنی کار یہیں چھوڑ کر پیدل چلتا ہوا کہیں چھپ جائے، غالباً اسے اپنے تعاقب کا شبہ ہو گیا ہوگا۔ روڈی اس احمقانہ حرکت پر مسکرا کر رہ گیا۔ بھلا وہ اس دھند میں کتنی دور تک جا سکتا ہے لیکن قدموں کی آہٹ نزدیک آتی جا رہی تھی۔ روڈی نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑی اور عجلت میں ایک سائن بورڈ سے ٹکرا گیا جو ایک پگڈنڈی کے کنارے لگا ہوا تھا۔ اس پر لکھا تھا مہمانوں کا مرکز، بلندی دس ہزار فٹ۔

قدموں کی آہٹ اور قریب ہوتی گئی۔ اس نے اپنا پستول سیدھا کیا اور پگڈنڈی کی طرف چل دیا پھر اسے کسی کے دوڑنے کی آواز آئی تو اس نے بھی تیز تیز قدم اٹھانا شروع کر دیے۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے بہت سے نقطے رقص کرنے لگے۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا لیکن اسے یوں لگا جیسے اس کے سامنے سیاہ چادر تان دی گئی ہو جیسے وہ کسی دیوار سے ٹکرایا ہو اور اس کے گھٹنے جسم کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہ رہے ہوں۔ اسے بہت زور کا چکر آیا اور وہ وہیں پگڈنڈی پر گر گیا۔

''کرسمس مبارک ہو۔'' اس کے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی پھر اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ اسے اپنی گردن پر کسی کی انگلیوں کا دباؤ محسوس ہوا پھر اس کی گردن ایک جانب لڑھک گئی۔

وہ لوئی کا طنزیہ جملہ سننے سے قاصر تھا جو کہہ رہا تھا۔ ''تم سے پہلے دو آئے تھے۔ اب تم بھی ان کے پاس پہنچ جاؤ گے۔ دیکھتا ہوں کہ اب تمہارا ڈون کس کو میرے تعاقب میں بھیجتا ہے۔''

تیس منٹ بعد رینجرز کی گشتی وین وہاں آئی۔ اس میں سے دو سپاہی اترے اور پگڈنڈی کے قریب کھڑی ہوئی ڈاج منی وین کا معائنہ کرنے لگے۔ ان میں سے لمبے قد والا اپنے ساتھی سے بولا۔

''ہیری! تم ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ دو گاڑیاں اس طرف آئی تھیں لیکن ان میں سے ایک ہی واپس گئی۔''

ہیری نے گہری دھند میں آنکھیں پھاڑتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی پھر چونکتے ہوئے بولا۔

''یہ کیا؟ اوہ میرے خدا! یہاں تو ایک شخص زمین پر پڑا ہوا ہے۔''

انہوں نے اسے ہلایا جلایا۔ تنفس بحال کرنے کی کوشش کی۔ وین میں رکھے ایمرجنسی آکسیجن سلنڈر کے ذریعے اسے آکسیجن دینے کی کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ روڈی اس منزل سے بہت دور جا چکا تھا۔

لمبے قد والے نے اپنی ٹوپی اتاری اور سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''ہیری! ان لوگوں کو کتنی بار سمجھایا ہے لیکن ان سیاحوں کی عقل میں یہ بات نہیں آتی۔ اتنی بلندی پر ہوا کا دباؤ بہت کم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری اور تھکن ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر اس جیسے وزنی لوگوں کو اتنی بلندی پر نہیں آنا چاہیے۔''

ہیری نے جھک کر روڈی کے بے جان جسم کو دیکھا اور تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''موٹے لوگ سردی برداشت نہیں کر سکتے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی ناک اور کان کیسے سرخ ہو رہے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ یہاں کیا لینے آیا تھا۔ بادلوں نے پہاڑ کی چوٹی کو پوری طرح ڈھانپ رکھا ہے۔ ایسے عالم میں یہاں کچھ نظر نہیں آتا۔''

''خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ یہاں کیوں آیا تھا۔'' دوسرا شخص ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو یہ کوئی مہم جو معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہی سوچ کر اتنی بلندی پر آیا ہوگا کہ واپس جا کر اپنے لوگوں کو بتا سکے کہ اس نے پہاڑ کی چوٹی سر کر لی ہے۔ اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور قریبی پولیس اسٹیشن کا نمبر ملانے لگا۔

▼▼



بے پروائی اور بے وقعتی کے سبب عہدِ حاضر کا انسان نہ تو اپنے قول کی پاسداری کرتا ہے اور نہ ہی اپنے فعل کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کھیل اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا جارہا تھا جس کے قول و فعل میں اگرچہ کوئی تضاد تو نہ تھا مگر اس کی زندگی ایک خاموش وعدے کے عوض گروی رکھ دی گئی تھی جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی ورنہ... بے وفائی کی صورت میں ویرانے اس کے منتظر تھے لیکن جس لمحے کا انتظار اس نے برسوں کیا... جب اس کی برسات میں بھیگنے کا وقت آیا تو تپتی دھوپ میں اس کے قدم صحرا کی جانب اٹھ گئے۔ جانے یہ اسی بھولے بسرے عہد سے منحرف ہونے کا نتیجہ تھا یا مقدر کی ستم ظریفی کہ کسی کے ہاتھوں کی مہندی اور سہرے کے پھولوں کی مہک بھی اس کے قدموں کو روک نہ سکی... اس نے منہ کیا پھیرا کہ خوابوں نے بھی آنکھوں سے رختِ سفر باندھ لیا... بے سمت بھٹکتے ہوئے اس لمبی مسافت میں اب اسے اجنبی چہروں کے سوا اور کیا ملنا تھا۔ تاریک رستوں پر اس کا ہم سفر بس ایک سایہ تھا جو آسیب کے مانند اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا تھا، خدا جانے یہ محبتوں کی انتہا تھی یا نفرتوں کا انتقام... جو بھی تھا اسے زندگی سے دور جانا تھا، چاہے آگ کا دریا عبور کرتے ہوئے یا گرم صحرا پار کرتے ہوئے... بہرحال میں اس عہد کی پاسداری لازم تھی کہ جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی۔



تیسرا اور آخری حصہ

ہمیں کولانچ کے ذریعے سفر کرنا تھا اور یہ بھی خبر نہیں تھی کہ یہ قانونی تھا یا غیر قانونی مگر ہم سب لوگ تین چار ٹولیوں میں نکل گئے۔ میں اور ابراہیم علیحدہ نکلے۔ ہم نے کچھ خشک راشن لیا جس میں بسکٹ، کھجوریں اور ملک پاؤڈر وغیرہ شامل تھے۔ میں نے خاص طور پر چند شاپرز لیے۔

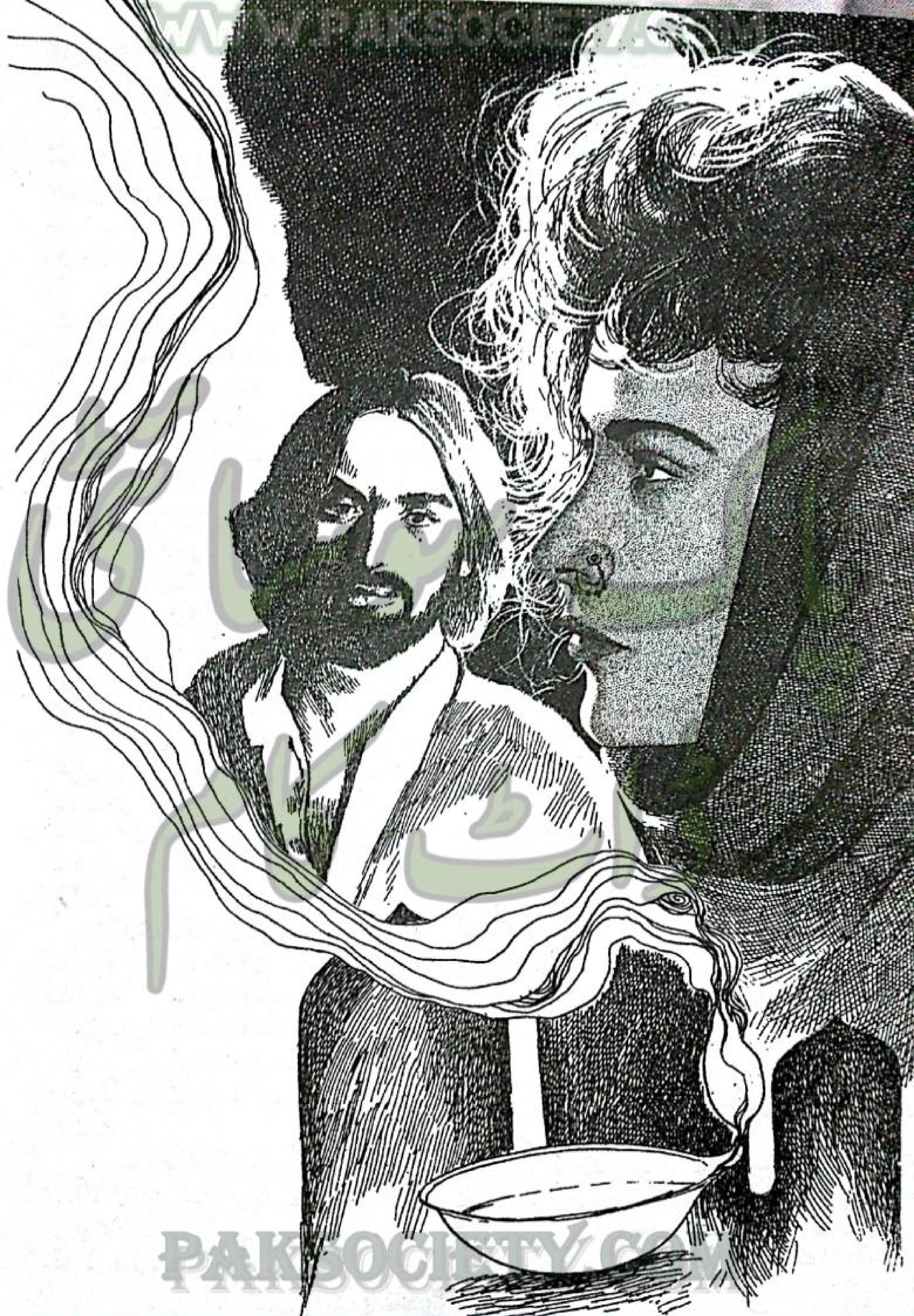
''سائیں! ان کا کیا کرو گے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''یہ میرے اور تمہارے کام آئیں گے۔'' میں نے کہا۔

''کس کام؟''

''بھئی یہ پلاسٹک کے شاپرز ہیں۔ ان میں رکھ کر ہم اپنی چیزوں کو واٹر پروف کرلیں گے۔ سمندر کا پانی بڑا ظالم ہوتا ہے۔''

''تو سائیں، تمہارا خیال ہے کہ ہمیں سمندر میں غوطہ



لگانا پڑے گا؟''

''کیا پتا ایسا ہی ہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

غربت کے مارے ہوئے بصرہ شہر میں دو تین گھنٹے گھوم پھر کر ہم اپنے ڈیرے پر واپس پہنچ گئے۔ گروپ کے سارے لوگ ایک دوسرے کو اپنی شاپنگ دکھا رہے تھے۔ میرے پاس بڑے بڑے شاپرز دیکھ کر دیگر لوگوں کے ذہن میں بھی وہی سوال ابھرے جو ابراہیم نے مجھ سے کیے تھے۔

سورج غروب ہوتے ہی مغرب کی اذان ہوئی۔ باقر نے رات دس بجے کے قریب آنے کا کہا تھا۔ جوں جوں وقت نزدیک آرہا تھا ہماری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم سب نے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی اور دیر تک نم آنکھوں کے ساتھ دعائیں مانگتے رہے۔ کئی ایک نے نمازِ حاجات بھی ادا کی۔ نماز کے بعد ہم نے اپنا اپنا سامان باندھ لیا۔ میں نے تین چار شاپرز ابراہیم کو بھی دیے۔ ایک شاپر میں، میں نے اپنا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات رکھے اور اس کی کئی تہیں بنا کر اوپر سے باندھ دیا۔ ایک شاپر میں کھانے پینے کی اشیا اور ایک میں جوتے اور کپڑوں کا جوڑا رکھ لیا۔ ابراہیم نے بھی میری ہی طرح کیا...... میں نے پاسپورٹ والا لفافہ اپنی پنڈلی سے باندھا تھا۔ مکمل تیاری کے بعد ہم بڑی بے قراری سے روانگی کا انتظار کرنے لگے۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کمال رشید اور باقر دونوں کوٹھی میں نہیں ہیں۔ اندیشے دل ودماغ کو گھیرنے لگے۔ نظریں بار بار گھڑی کی سوئیوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ہمیں باقر کی شکل نظر آئی اور ہمارے جسموں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ باقر کے ساتھ دو کمانڈو ٹائپ افراد تھے۔ باقر نے ہمیں اٹھنے اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

ہم کٹھ پتلیوں کی طرح کھڑے ہوگئے اور اپنا اپنا سامان اٹھا کر اس کے ساتھ چل دیے۔ آفتاب گل سب سے آگے تھا۔ ہم ایک نیم تاریک گلی میں کھڑے ایک ٹرک تک پہنچے۔ اس کھٹارا ٹرک کی چھت نہیں تھی۔ بیٹھنے کے لیے کوئی سیٹ بھی نہیں تھی۔ مسافروں نے احتجاج کیا تو ایک عراقی نے گرج کر ہمیں بیٹھنے کا حکم دیا۔ ہم ٹرک کے فرش پر ہی بیٹھ گئے۔

دس پندرہ منٹ بعد ٹرک نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ٹوٹی پھوٹی نیم تاریک سڑکوں پر آگے بڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم شہر سے دور بالکل تاریک راستے پر سفر کر رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ٹرک کی ہیڈ لائٹس بھی آن نہیں کی گئی تھیں۔ ہم سب پتھر کے مجسموں کی طرح بالکل گم صم بیٹھے تھے۔ حتیٰ کہ ہر وقت بولنے والا آفتاب گل بھی خاموش تھا۔

قریباً دو گھنٹے تک ٹوٹی پھوٹی بدحال سڑکوں پر سفر کرنے کے بعد ہمارا ٹرک ایک ویران ساحل پر پہنچ گیا۔ رات کے سناٹے میں لہروں کا مدھم شور سنائی دیتا تھا۔ ہمیں ٹرک سے اتارا گیا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ٹرک کے اگلے کیبن میں سے دو لڑکیاں بھی نیچے اتریں۔ ان میں سے ایک وہی ادھورے لباس والی فرح تھی.... فی الوقت اس کا لباس کچھ مناسب ہی تھا۔ ہم سب اندھیرے میں چلتے ہوئے کچھ چٹانوں کی اوٹ میں پہنچ گئے۔ باقر نے کہا۔ ''سب چپ چاپ بیٹھ جائیں۔ کوئی کسی طرح کی لائٹ نہیں جلائے گا۔ کوئی اونچی آواز میں بات نہیں کرے گا۔''

ہم سب ڈرے سہمے چٹانوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ دونوں لڑکیاں بھی ایک طرف خاموش بیٹھی تھیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کتنی دیر انتظار کرنا ہے اور آگے کیا پیش آنا ہے۔ اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ باقر یا اس کے ساتھیوں سے کچھ پوچھ سکتے۔ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ دور کہیں سمندر کے سینے پر روشنیاں سی ٹمٹما رہی تھیں۔ غالباً یہ نامعلوم سمتوں میں سفر کرنے والے بحری جہاز تھے۔ ہمیں قریباً آدھ گھنٹا انتظار کرنا پڑا اور یہ انتظار، ناقابلِ بیان حد تک مشکل تھا۔ بالآخر لانچ کے انجن کی آواز آئی مگر روشنی پھر بھی دکھائی نہیں دی۔

''سب لوگ لانچ میں چلو۔'' باقر نے بڑے تحکم سے کہا۔

ہم سب روبوٹس کی طرح اٹھے اور بجلی کی سی تیزی سے لانچ میں جا بیٹھے۔ لانچ کافی بڑی تھی، بری بھلی نشستیں بھی موجود تھیں۔ کہیں سے ڈیزل کی بو آرہی تھی۔ دو مسلح محافظ لانچ میں موجود تھے۔ دونوں لڑکیاں لانچ کے چھوٹے سے کیبن میں چلی گئیں۔ ایک آواز تاریکی میں ابھری۔ ''سب آگئے؟''

میں چونک گیا۔ یہ امین کی آواز تھی۔ اس کے سوال کا جواب آفتاب گل نے دیا۔ ''ہاں سب آگئے۔''

لانچ روانہ ہوگئی۔ اس کی لائٹس اب بھی آف تھیں۔ سب خاموش اور خوفزدہ تھے۔ باقر اور اس کے ساتھی وہیں ساحل پر رہ گئے تھے۔ اب ہم نئے لوگوں کے حوالے تھے۔ بہرحال امین کی موجودگی سے مجھے کچھ تسلی ہو رہی تھی۔ امین کے ساتھ میری علیک سلیک ہوئی اور ہم لانچ کے پچھلے حصے میں کیبن کے پاس جا بیٹھے۔ ''تم کہاں تھے؟

اتنے دن نظر ہی نہیں آئے؟'' میں نے پوچھا۔
''بس مصروفیت چل رہی تھی۔'' امین نے مختصر جواب دیا۔
''وہ تمہاری دوست کرسٹی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ ہوٹل میں ہی ہے۔'' امین نے پھر مختصر جواب دیا۔ وہ ٹینشن میں نظر آتا تھا۔

اگلے چار پانچ منٹ میں ہمارے درمیان جو باتیں ہوئیں، ان سے پتا چلا کہ ہمارا یہ سفر تقریباً دو گھنٹے کا ہوگا۔ ہم ایک محفوظ راستے سے کویت کے ساحل تک پہنچیں گے۔ کمال رشید بھی ساتھ تھا اور کیبن میں موجود تھا۔

لانچ درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس میں دو مسلح افراد موجود تھے اور وہ گاہے بگاہے ٹیلی اسکوپس کے ذریعے اردگرد کا جائزہ بھی لیتے تھے۔ اب امین قدرے ''ریلیکسڈ'' نظر آنے لگا تھا۔ شاید ہم لوگ زیادہ خطرناک علاقے سے گزر گئے تھے۔ اسی دوران میں مجھے فرح نظر آئی۔ وہ کیبن سے نکلی تھی اور ایک بار پھر مختصر لباس میں نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ٹرے میں گلاس اور بیئر وغیرہ لے کر پھر کیبن میں چلی گئی۔

میں نے امین سے پوچھا۔ ''کمال رشید کے حمام میں اور لڑکیاں بھی ہیں لیکن یہ فرح ہمیشہ بیہودہ لباس میں نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ اسپیشل سلوک کیوں ہو رہا ہے؟''

''بس، یہ اس کی اپنی بیوقوفی ہے۔''
''کیا مطلب؟''

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''بندہ مجبور ہو اور اس میں اکڑ بھی ہو تو پھر وہ اسی طرح ذلیل ہوتا ہے۔ کمال رشید کی نوکری کرنا اس لڑکی کی مجبوری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اڑی (مزاحمت) بھی کرتی ہے۔ پچھلے مہینے کمال رشید کے کچھ مہمان انڈیا سے آئے تھے۔ اس نے ان کے سامنے تھوڑے کپڑے پہننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ صرف حمام میں تھوڑے کپڑے (مختصر لباس) پہننے کی پابند ہے۔ کمال رشید اس پر چڑ گیا۔ اب دیکھو یہ نہ صرف حمام میں بلکہ اس کے علاوہ بھی یہی لباس پہننے پر مجبور ہے۔ باقی لڑکیوں نے اس سے نصیحت پکڑی ہے۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے امین سے پوچھا۔ ''اب یہ دو لڑکیاں کہاں جارہی ہیں؟''

اس نے لوفر انداز میں آنکھ دبائی اور بولا۔ ''ذرا کویت میں ''مہمان نوازی'' کرنے کے لیے۔''
''مہمان نوازی؟''
''یہاں سب کچھ چلتا ہے ہارون بھائی! کویت کے

مشورہ

ایک سیاح ہوٹل میں گیا تو بیرے نے آکر آرڈر لیا۔ سیاح نے فرائی مچھلی منگوائی۔
بیرا مچھلی لے آیا اور پوچھا۔ ''اور کچھ؟''
سیاح نے کہا۔ ''ہمدردی کے دو بول۔''
بیرا اپنا منہ سیاح کے کان کے پاس کر کے بولا۔ ''مچھلی نہ کھانا دو دن کی باسی ہے۔''

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

کسی شیخ نے ایک دو ہفتوں کے لیے مانگا ہے ان دو لڑکیوں کو۔ مال شال اکٹھا کر کے واپس آجائیں گی۔ اس میں زیادہ حصہ کمال رشید کا ہوگا۔ تھوڑا بہت ان کو بھی ملے گا۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ بااختیار لوگ اور دولت کے پجاری، عورت کو کس کس طرح رسوا کرتے ہیں۔ یہ رسوائی ہر دور میں اور ہر خطے میں ہوتی رہی ہے اور شاید آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ جب تک عورت اپنا مقام نہیں پہچانے گی اور اپنی اصل طاقت و توانائی کا ادراک نہیں کرے گی، وہ ایسے ہی کچلی جاتی رہے گی۔ کبھی مذہب اور رسم و رواج کے نام پر۔ کبھی رشتوں ناتوں کے جال پھینک کر اور کبھی صرف اس کی جسمانی کمزوری کو جواز بنا کر اسے پامال کیا جاتا رہے گا۔

میں امین کو سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ کمال رشید جیسے شخص کے ساتھ نہ چلے...... اور اس گورکھ دھندے سے دور ہو جائے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ مانے گا نہیں۔ وہ بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد لانچ کے عملے میں بے چینی سی نظر آئی۔ وہ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے اور بار بار ٹیلی اسکوپس کے ذریعے کچھ دیکھنے لگے تھے۔ امین بھی اٹھ کر مسلح گارڈز کے پاس چلا گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ لانچ کو ایک جگہ تاریکی میں روک دیا گیا اور انجن بند کر دیا گیا۔ اسی دوران میں لمبا تڑنگا کمال رشید بھی کیبن میں سے نکل آیا۔ وہ واضح طور پر نشے میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے واکی ٹاکی نکالا اور عربی میں کسی سے باتیں کرنے لگا۔ ہم پچیس مسافر بالکل بچوں کی طرح ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ پتا نہیں یہاں کیا ہونے جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد لانچ پھر چل پڑی۔ اس مرتبہ اس کی

اسپیڈ تیز تھی۔ امین ابھی تک مسلح گارڈز کے پاس ہی موجود تھا۔ اچانک ایک گارڈ نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ کمال رشید پھر کیبن سے باہر نکل آیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے ہارون سائیں!" ابراہیم نے پریشانی کے عالم میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "کچھ گڑبڑ ہی لگ رہی ہے۔"

ہمیں دو روشنیاں بڑی تیزی سے اپنی طرف بڑھتی دکھائی دیں۔ کچھ ہی دیر میں یہ روشنیاں قریب پہنچ گئیں۔ یہ ایک بڑے سائز کی اسپیڈ بوٹ تھی۔ اس کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ سرکاری بوٹ ہے۔ سامنے ہی ڈیک پر دو باوردی افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید رائفلیں تھیں...... بوٹ میں سے کسی نے میگا فون کے ذریعے لانچ چلانے والے کو لانچ روکنے کا حکم دیا۔ لانچ کی رفتار آہستہ ہوئی اور سرکاری بوٹ اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ ہماری حالت بہت بری تھی۔ گلے خشک ہو چکے تھے۔ ہم ڈری ڈری نظروں سے کمال رشید اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ خود بھی پریشانی کی انتہا کو چھو رہے تھے۔

ہماری لانچ سرچ لائٹس کی روشنی میں نہا گئی۔ ساحلی محافظوں کا انچارج ڈیک پر آیا اور اس نے کرخت لہجے میں کچھ پوچھا۔ اس کی بات کا جواب کمال رشید نے دیا۔ دونوں میں سات آٹھ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ باوردی محافظوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں۔ کمال رشید کے دو مسلح گارڈز کیبن کے عقب میں تھے اور نظر نہیں آ رہے تھے۔ اچانک باوردی انچارج کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا۔ وہ بوٹ کو چلا کر آگے لے آیا۔ غالباً وہ لوگ لانچ پر اترنا چاہتے تھے۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ نشے میں دھت کمال نے وہ غلطی کی جو شاید اسے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ تیزی سے نیچے جھکا اور اس نے ایک ترپال کے نیچے رکھی ہوئی گن اٹھالی۔ یہ جی تھری ٹائپ کی گن تھی۔ اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ باوردی انچارج پر فائر کیا...... لیکن اس کا نشانہ خطا گیا۔ نشانہ خطا ہونے کی وجہ بڑی عجیب تھی۔ اس "وجہ" کا نام فرح تھا۔ وہ کمال کے قریب ہی کھڑی تھی۔ میں نے دیکھا وہ بے دریغ کمال رشید کی طرف بڑھی اور اس کی رائفل پر جھپٹا مارا۔ رائفل کا رخ بدلنے سے فائر خالی گیا۔

فرح رائفل سے چمٹ گئی تھی۔ کمال رشید نے رائفل کو زوردار جھٹکے دیے۔ پھر اپنی ٹانگ کی ضرب سے فرح کو دور پھینک دیا۔ وہ جیسے غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے فرح کو نشانہ بنانا چاہا لیکن تب میں نے جی دار پٹھان آفتاب گل کو دیکھا۔ وہ فرح کو بچانے کے لیے کمال رشید پر جھپٹ پڑا۔ "نہیں استاد نہیں۔" وہ پکارا۔

کمال رشید نے گولی چلا دی جو سیدھی آفتاب گل کی ران میں لگی۔ سرکاری کشتی میں موجود گارڈز شاید گولی چلاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ لانچ میں موجود مسافروں کو نقصان پہنچے گا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ کمال رشید بے دریغ فائرنگ کر رہا ہے تو انہوں نے بھی گولی چلا دی۔ ان کی رائفلوں نے دھماکے سے شعلے اگلے۔ میں نے کمال رشید کو پہلو کے بل گرتے دیکھا۔ جی تھری ٹائپ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

کمال کو گرتے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے کیبن کے پیچھے سے سرکاری کشتی پر فائرنگ شروع کر دی۔ "لیٹ جاؤ...... فرش پر لیٹ جاؤ۔" میں نے پکار کر ساتھیوں سے کہا۔

ہم سب اوندھے منہ لانچ کے فرش سے چپک گئے۔ یہی وقت تھا جب میں نے امین کو زخمی ہو کر پانی میں گرتے دیکھا۔ گولی شاید اس کے پیٹ میں کہیں لگی تھی۔ اکثر مسافر بلند آواز سے کلمہ پڑھ رہے تھے۔ ان کی آوازیں دھماکوں کے شور میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھیں۔

یکایک لانچ کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔ لانچ ڈرائیور نے پوری رفتار سے لانچ بھگا دی تھی۔ جونہی لانچ بھاگی، کسی نے لانچ کے اندر سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ یہ فرح تھی۔ میں نے سرچ لائٹ میں اس کے سرخ لباس کی جھلک صاف دیکھی۔ وہ مختصر لباس جو اس کے جسم کو چھپاتا کم اور دکھاتا زیادہ تھا۔

سرکاری بوٹ نے بھی اسٹارٹ لیا اور تیزی سے لانچ کے پیچھے آئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ سرکاری بوٹ سے بھی دو گارڈز نے پانی میں چھلانگیں لگائی ہیں۔ انہوں نے لائف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ وہ یقیناً فرح کو پانی سے نکالنا چاہتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ زخمی امین بھی ان کے ہاتھ لگ جاتا۔

اب لانچ انتہائی رفتار سے نامعلوم سمت میں اڑی جا رہی تھی۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ وہ اچھل کر ہوا میں تیرنے لگی ہے۔ سرکاری بوٹ بھی پوری اسپیڈ سے پیچھے آ رہی تھی۔ سرکاری بوٹ سے اب فائر نہیں ہو رہا تھا۔ وجہ یقیناً یہی تھی کہ وہ لوگ عام مسافروں کو نشانہ بنانا نہیں چاہتے تھے۔ مجھ سے چند فٹ کی دوری پر آفتاب گل لہولہان پڑا تھا۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ گولی اس کی ران میں نہیں بلکہ

ناف میں لگی ہے اور اس کی حالت اچھی نہیں۔ لانچ کو لگنے والے جھٹکوں کے سبب آفتاب کے منہ سے بے ساختہ کراہیں نکل جاتی تھیں۔ میں رینگتا ہوا اس کے قریب گیا۔ اس کا پیٹ اور دونوں ہاتھ خون میں لت پت تھے۔ ''یہ کیا ہو گیا آفتاب بھائی۔'' میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

وہ ہمت کر کے بولا۔ ''تم سب تو ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں ہم ٹھیک ہیں لیکن......''

میری بات منہ میں ہی رہ گئی۔ کسی نے مجھے دھکا دے کر آفتاب گل سے دور ہٹا دیا۔ یہ لانچ کے مسلح گارڈز میں سے ایک تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ یہ مدراسی تھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتا تھا۔ اس نے گرج کر کہا۔ ''پیچھے ہٹو، اس کتے کو گولی مار کر سمندر میں پھینکنا ہے۔''

اس نے رائفل آفتاب گل کی طرف سیدھی کرنی چاہی تو میں نے ہمت کر کے اس کی رائفل پکڑ لی۔ ''نہیں، اس کا کوئی قصور نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے صرف ایک لڑکی کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔''

''ایک لڑکی نہیں...... ایک غدار لڑکی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب اسی کتیا کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اسی حرامزادی نے مخبری کی ہے۔'' مدراسی دہاڑا۔ اس نے ایک بار پھر رائفل آفتاب گل کی طرف سیدھی کرنا چاہی۔ اسی دوران میں ابراہیم اور جندل خاں وغیرہ بھی سامنے آگئے۔ ہمیں دیکھ کر دوسروں کو بھی ہمت ہوئی اور وہ گارڈز کی منتیں کرنے لگے کہ آفتاب گل پر گولی نہ چلائی جائے۔ پتا نہیں کہ یہ منت سماجت کا اثر تھا یا پھر گارڈز کو صورت حال کی سنگینی نظر آرہی تھی۔ وہ آفتاب گل کو نظر انداز کر کے دوسری طرف چلے گئے۔ وہ بار بار ٹیلی اسکوپس کی مدد سے عقب میں دیکھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا کہ سرکاری بوٹ کی روشنی اب کچھ فاصلے پر نظر آرہی تھی۔ ایسا تو نہیں تھا کہ سرکاری بوٹ، لانچ کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اصل بات کیا تھی، اس کا پتا پانچ دس منٹ بعد لگا۔

لانچ لہروں کا سینہ چیرتی ہوئی نیم دائرے کی شکل میں آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ آفتاب گل کی ناف سے مسلسل خون بہہ رہا ہے۔ اس کے قریب لانچ کے فرش پر خون کا چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ میں نے ایک پرانا کپڑا آفتاب گل کے زخم پر رکھا اور اس کی کمر کے گرد کس کے پٹی باندھ دی۔ ''یار! پیاس لگ رہی ہے ام کو۔'' آفتاب گل نے کہا۔

جندل خاں جلدی سے کپ میں پانی لے کر آیا۔ جب میں اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا تھا، لانچ نے ایک بار پھر تیزی سے موڑ کاٹا۔ پانی نیچے بہہ گیا اور میں آفتاب کے اوپر گرتے گرتے بچا۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ لانچ تیز رفتاری سے دوسری طرف مڑی۔ یہ موڑ پہلے موڑ سے بھی زیادہ کاٹ دار تھا۔ لانچ کی ایک سمت بہت اوپر اٹھ گئی۔ ایسا ہونے سے کوئی وزنی شے لڑھکتی ہوئی ہمارے قریب پہنچ گئی۔ غور سے دیکھا تو یہ تنومند کمال رشید کی لاش تھی...... جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ ایک گولی سیدھی کمال رشید کے منہ پر لگی تھی۔ دو گولیوں نے اس کے سینے کو چھلنی کیا تھا۔ وہ مر چکا تھا مگر اس کے جسم سے اب بھی شراب کی بو اٹھ رہی تھی۔ کچھ ہی منٹ پہلے تک یہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ گرج دار آواز میں باتیں کر رہا تھا اور کھا پی رہا تھا۔ کیبن کے اندر دو لڑکیاں اس کی خدمت گزاری میں مصروف تھیں مگر اب یوں لگتا تھا جیسے وہ کبھی زندہ ہی نہیں تھا۔ بس یہی ہے انسان کی حقیقت۔ شاید اسی لیے زندگی کو پانی کے بلبلے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

پھر ہم نے ایک اور عبرت ناک منظر دیکھا۔ مدراسی گارڈ آگے آیا۔ اب رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے لانچ کا جنگلا تھام رکھا تھا۔ وہ ابراہیم اور جندل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پکڑو اس کو۔ سمندر میں ڈالنا ہے۔'' اس کا اشارہ کمال کی لاش کی طرف تھا۔

اس نے ابراہیم اور جندل کے ساتھ مل کر بڑی...... بے پروائی سے لاش کو لانچ سے باہر پھینک دیا۔ چھپاکا سا ہوا۔ لاش ایک سیکنڈ کے لیے خلیج فارس کے جھاگ اڑاتے پانی پر نظر آئی پھر اوجھل ہو گئی۔ بیکراں سمندر میں گہری تاریکیوں نے اسے ڈھانپ لیا۔ ایک گھنٹا پہلے تک بھی اس شخص نے کہاں سوچا ہو گا کہ اس کا یہ انجام ہونے والا ہے۔ اس نے ایک عورت کو ذلیل کیا اور اپنے اس عمل میں آخری حد تک چلا گیا۔ اس نے اسے مردوں کی نگاہوں کے سامنے ایک مستقل تماشا بنایا...... اور بھول گیا کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے اور یہ بھی بھول گیا کہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق کبھی کبھی ایک کمزور سا جانور بھی جان بچانے کے لیے درندے پر حملہ کر دیتا ہے۔ شاید کچھ دیر پہلے مدراسی گارڈ نے ٹھیک ہی کہا تھا، آج اس لانچ اور لانچ کے مسافروں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا اس کے پیچھے فرح کا ہاتھ تھا۔ ''طمانچے کھانے والی'' نے آج ایک جوابی طمانچہ مارا تھا اور یہ کمال کے لیے موت کا طمانچہ ثابت ہوا تھا۔

لانچ اڑی جا رہی تھی اور ہم پچیس افراد سکتے کی سی حالت میں تھے۔ لانچ نے ایک بار پھر موڑ کاٹا اور ہم پھسلتے

ناف میں لگی ہے اور اس کی حالت اچھی نہیں۔ لانچ کو لگنے والے جھٹکوں کے سبب آفتاب کے منہ سے بے ساختہ کراہیں نکل جاتی تھیں۔ میں رینگتا ہوا اس کے قریب گیا۔ اس کا پیٹ اور دونوں ہاتھ خون میں لت پت تھے۔ ''یہ کیا ہو گیا آفتاب بھائی۔'' میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

وہ ہمت کر کے بولا۔ ''تم سب تو ٹھیک ہونا؟''

''ہاں ہم ٹھیک ہیں لیکن......''

میری بات منہ میں ہی رہ گئی۔ کسی نے مجھے دھکا دے کر آفتاب گل سے دور ہٹا دیا۔ یہ لانچ کے مسلح گارڈز میں سے ایک تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ یہ مدراسی تھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتا تھا۔ اس نے گرج کر کہا۔ ''پیچھے ہٹو، اس کتے کو گولی مار کر سمندر میں پھینکنا ہے۔''

اس نے رائفل آفتاب گل کی طرف سیدھی کرنی چاہی تو میں نے ہمت کر کے اس کی رائفل پکڑ لی۔ ''نہیں، اس کا کوئی قصور نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے صرف ایک لڑکی کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔''

''ایک لڑکی نہیں...... ایک غدار لڑکی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب اسی کتیا کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اسی حرامزادی نے مخبری کی ہے۔'' مدراسی دہاڑا۔ اس نے ایک بار پھر رائفل آفتاب گل کی طرف سیدھی کرنا چاہی۔ اسی دوران میں ابراہیم اور جندل خاں وغیرہ بھی سامنے آ گئے۔ ہمیں دیکھ کر دوسروں کو بھی ہمت ہوئی اور وہ گارڈز کی منتیں کرنے لگے کہ آفتاب گل پر گولی نہ چلائی جائے۔ پتا نہیں کہ یہ منت سماجت کا اثر تھا یا پھر گارڈز کو صورت حال کی سنگینی نظر آ رہی تھی۔ وہ آفتاب گل کو نظر انداز کر کے دوسری طرف چلے گئے۔ وہ بار بار ٹیلی اسکوپس کی مدد سے عقب میں دیکھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا کہ سرکاری بوٹ کی روشنی اب کچھ فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ ایسا تو نہیں تھا کہ سرکاری بوٹ، لانچ کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اصل بات کیا تھی، اس کا پتا پانچ دس منٹ بعد لگا۔

لانچ لہروں کا سینہ چیرتی ہوئی نیم دائرے کی شکل میں آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ آفتاب گل کی ناف سے مسلسل خون بہہ رہا ہے۔ اس کے قریب لانچ کے فرش پر خون کا چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ میں نے ایک پرانا کپڑا آفتاب گل کے زخم پر رکھا اور اس کی کمر کے گرد کس کے پٹی باندھ دی۔ ''یارا پیاس لگ رہی ہے ام کو۔'' آفتاب گل نے کہا۔

جندل خاں جلدی سے کپ میں پانی لے کر آیا۔ جب میں اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا تھا، لانچ نے ایک بار پھر تیزی سے موڑ کاٹا۔ پانی نیچے بہہ گیا اور میں آفتاب کے اوپر گرتے گرتے بچا۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ لانچ تیز رفتاری سے دوسری طرف مڑی۔ یہ موڑ پہلے موڑ سے بھی زیادہ کاٹ دار تھا۔ لانچ کی ایک سمت بہت اوپر اٹھ گئی۔ ایسا ہونے سے کوئی وزنی شے لڑھکتی ہوئی ہمارے قریب پہنچ گئی۔ غور سے دیکھا تو یہ تنومند کمال رشید کی لاش تھی...... جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ ایک گولی سیدھی کمال رشید کے منہ پر لگی تھی۔ دو گولیوں نے اس کے سینے کو چھلنی کیا تھا۔ وہ مر چکا تھا مگر اس کے جسم سے اب بھی شراب کی بو اٹھ رہی تھی۔ کچھ ہی منٹ پہلے تک یہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ گرج دار آواز میں باتیں کر رہا تھا اور کھا پی رہا تھا۔ کیبن کے اندر دو لڑکیاں اس کی خدمت گزاری میں مصروف تھیں مگر اب یوں لگتا تھا جیسے وہ کبھی زندہ ہی نہیں تھا۔ بس یہی ہے انسان کی حقیقت۔ شاید اسی لیے زندگی کو پانی کے بلبلے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

پھر ہم نے ایک اور عبرت ناک منظر دیکھا۔ مدراسی گارڈ آگے آیا۔ اب رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے لانچ کا جنگلا تھام رکھا تھا۔ وہ ابراہیم اور جندل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پکڑو اس کو۔ سمندر میں ڈالنا ہے۔'' اس کا اشارہ کمال کی لاش کی طرف تھا۔

اس نے ابراہیم اور جندل کے ساتھ مل کر بڑی بے پروائی سے لاش کو لانچ سے باہر پھینک دیا۔ چھپاکا سا ہوا۔ لاش ایک سیکنڈ کے لیے خلیج فارس کے جھاگ اڑاتے پانی پر نظر آئی پھر اوجھل ہو گئی۔ بیکراں سمندر میں گہری تاریکیوں نے اسے ڈھانپ لیا۔ ایک گھنٹا پہلے تک بھی اس شخص نے کہاں سوچا ہو گا کہ اس کا یہ انجام ہونے والا ہے۔ اس نے ایک عورت کو ذلیل کیا اور اپنے اس عمل میں آخری حد تک چلا گیا۔ اس نے اسے مردوں کی نگاہوں کے سامنے ایک مستقل تماشا بنایا...... اور بھول گیا کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے اور یہ بھی بھول گیا کہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق کبھی کبھی ایک کمزور سا جانور بھی جان بچانے کے لیے درندے پر حملہ کر دیتا ہے۔ شاید کچھ دیر پہلے مدراسی گارڈ نے ٹھیک ہی کہا تھا، آج اس لانچ اور لانچ کے مسافروں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا اس کے پیچھے فرح کا ہاتھ تھا۔ ''طمانچے کھانے والی'' نے آج ایک جوابی طمانچہ مارا تھا اور یہ کمال کے لیے موت کا طمانچہ ثابت ہوا تھا۔

لانچ اڑی جا رہی تھی اور ہم پچیس افراد سکتے کی سی حالت میں تھے۔ لانچ نے ایک بار پھر موڑ کاٹا اور ہم پھسلتے

ہوئے کیبن کی دیوار سے لگ گئے۔

''یہ کھلے پانی میں اس طرح موڑ کیوں کاٹ رہے ہیں۔'' ابراہیم نے مجھ سے پوچھا۔

بھارتی مسلمان ذکی احمد نے کہا۔ ''مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔'' یہ ذکی احمد وہی تھا جو اپنی تین بچیوں کی شادیاں کرنے کے لیے پردیس کاٹنا چاہتا تھا۔

''کیا اندازہ ہو رہا ہے؟'' جندل خاں نے پوچھا۔

ذکی احمد لرزاں آواز میں بولا۔ ''یہاں سمندر زیادہ گہرا نہیں ہے اور نیچے چٹانیں وغیرہ ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ لوگ اس چور راستے کے بہت زیادہ بھیدی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس والوں کی بوٹ پیچھے رہ گئی ہے۔''

ذکی احمد کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ ہمیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن لانچ والے کو پتا تھا کہ اس نے کس طرف جانا ہے۔

یہ سب کچھ بہت خطرناک بھی تھا۔ اندھیرے میں اندازے کی تھوڑی سی غلطی تیز رفتار لانچ کو کسی پتھر سے ٹکرا کر تباہ کر سکتی تھی۔ یعنی پیچھے شیر اور آگے کنواں والی صورتِ حال تھی۔ میرا منہ بالکل خشک ہو رہا تھا۔ دل کی رفتار دگنی تو ضرور ہو گئی ہوگی۔ یقیناً دوسروں کی حالت بھی یہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص جھنگلے کو تھامے باقاعدہ رو رہا تھا اور بلند آواز سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ سرکاری کشتی کی روشنیاں اب نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن لانچ کی رفتار بدستور تیز تھی۔ پتا نہیں کہ یہ سلسلہ کتنی دیر مزید جاری رہنا تھا۔ ہم میں سے کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ گارڈز سے کچھ پوچھ سکتا۔

قریباً آدھ گھنٹے کے نہایت خطرناک اور تیز رفتار سفر کے بعد ہمیں ایک ویران ساحل نظر آیا۔ لانچ والوں نے ساحل سے تقریباً ڈیڑھ سو میٹر دور ہی لانچ کھلے پانی میں روک دی۔ مدراسی گارڈ نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔ ''چلو بھئی۔ نیچے اترو سب...... جلدی کرو۔''

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

گارڈ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''یہی ہے تمہاری ماں کویت...... اب چمٹ جاؤ اس سے اور دودھ پیو اس کا۔ چلو، جلدی اترو۔''

ہم نے ڈری ہوئی نظروں سے لہریں لیتے پانی کو دیکھا۔ ہم میں سے کئی ایسے تھے جو تیرنا نہیں جانتے تھے اور ان میں، میں بھی شامل تھا۔ میں نے ہمت کر کے مدراسی گارڈ سے کہا۔ ''یہاں پانی گہرا ہے۔ ہم میں سے کئی ڈوب جائیں گے۔ لانچ کو تھوڑا آگے لے جاؤ۔''

''بکواس بند کرو اور جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔'' سیاہ فام مدراسی گرجا۔

''یہاں کتنا پانی ہوگا؟'' ذکی احمد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''جتنا بھی ہے لیکن اترو۔ آگے جائیں گے تو یہ تمہاری بہن (لانچ) پھنس جائے گی ریت میں۔ جلدی اترو۔''

دونوں گارڈز نے اپنی رائفلیں کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں لے لیں۔ یہ قیامت کے لمحے تھے۔ کم از کم ان کے لیے تو قیامت ہی تھی جو تیرنا نہیں جانتے تھے۔ پانی میں ہلکے درجے کی طغیانی تھی اور لانچ ہچکولے کھا رہی تھی۔ ہر ہچکولے پر آفتاب گل تکلیف سے کراہ اٹھتا تھا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا اور افق کی طرف ہلکی سی سفیدی نظر آنے لگی تھی۔

مسافروں نے اترنے سے انکار کیا تو گارڈز نے انہیں بے دریغ رائفلوں کے دستوں سے مارنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ گالیاں بھی بک رہے تھے اور شوٹ کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ مسافروں نے خوفزدہ ہو کر پانی میں چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ کچھ کو گارڈز نے خود دھکے دے دیے۔ وہ جلد از جلد لانچ خالی کر کے یہاں سے بھاگ نکلنا چاہتے تھے۔ ہم خالی ہاتھ تھے، کسی طرح کی مزاحمت بے سود تھی۔ وہ لوگ اتنے مشتعل تھے کہ کسی بھی لمحے گولی چلا سکتے تھے۔ میں نے ابراہیم کو پانی میں چھلانگ لگاتے دیکھا، پھر آفتاب گل کو دیکھا۔ وہ خود کو بہ مشکل گھسیٹ کر لانچ کے کونے تک پہنچا اور پانی میں لڑھک گیا۔ ایک رائفل میری طرف بھی سیدھی ہو چکی تھی۔ میں نے بھی پانی میں چھلانگ لگا دی۔ میرے کانوں میں دہشت زدہ آوازیں گونج رہی تھیں۔ ان میں ''اللہ اکبر'' کے نعرے بھی شامل تھے۔ یہ وہ نعرے تھے جو پانی میں کودنے والے خوفزدہ لوگ لگا رہے تھے۔ اسی دوران میں مجھے ایک فائر کی آواز بھی سنائی دی۔ مجھے شک گزرا کہ یہ فائر آفتاب گل پر کیا گیا ہے۔ بہرحال اس وقت کسی کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میں تیرنا نہیں جانتا تھا اور گہرے پانی میں کود چکا تھا۔ مجھے اپنے بالکل قریب ہی جندل خاں کی آواز سنائی دی۔ وہ شاید مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ اگر اس نے مجھے پکارا تھا تو غلطی کی تھی۔ مجھے تو خود مدد کی ضرورت تھی۔ پانی میں گرنے کے بعد ایک دفعہ تو

معروف اور مقبول قلم کار

طاہر جاوید مغل

کی نئی سلسلے وار کہانی

انگارے



جولائی 2015ء

جاسوسی ڈائجسٹ

میں پیش کی جارہی ہے

زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں

اپنے دامن میں سمیٹے

ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحیر انگیز کہانی

جسے قارئین ایک ہی نشست میں پڑھنے پر

خود کو مجبور پائیں گے

میں ڈوبتا چلا گیا پھر پانی نے مجھے اچھالا۔ میں نے لمبا سانس لیا۔ دوسرا سانس لینے کی کوشش کی تو سمندر کا نمکین پانی میرے پھیپھڑوں میں داخل ہو گیا۔ مجھے لگا کہ سانس رک گیا ہے اور آخری وقت آ گیا ہے۔ کیا یہ سمندر میری قبر بن جائے گا؟ کیا میں اب کبھی اپنے پیاروں کی شکلیں نہ دیکھ سکوں گا؟

جان بچانے کی فطری خواہش کے تحت میں نے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں چلانے شروع کیے۔ پیچھے سے ایک زوردار لہر آئی۔ میں اس لہر میں ڈوبتا ابھرتا غوطے کھاتا جانے کس طرح ساحل پر پہنچ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا اور میں مسلسل الٹیاں کر رہا تھا۔ ساحل پر میں نے کئی مسافروں کو بڑی بری حالت میں دیکھا۔ ایک دو نیم بے ہوش پڑے تھے۔ جو تیر سکتے تھے، وہ قدرے بہتر حالت میں تھے۔

خود کو سنبھالنے کے بعد میں نے سب سے پہلے ابراہیم اور آفتاب گل کو تلاش کیا۔ ابراہیم تو میرے قریب ہی موجود تھا۔ آفتاب گل پندرہ بیس میٹر دور ریت پر چت پڑا تھا۔ چار پانچ مسافر اس کے گرد جمع تھے۔ مجھے فوراً اس فائر کا خیال آیا جو آخری وقت لانچ پر سے کیا گیا تھا۔ ''تو کیا آفتاب گل مر چکا ہے؟'' یہ سوال درد کی ایک ٹیس کی طرح دماغ میں ابھرا۔ میں اور ابراہیم لپکتے ہوئے آفتاب گل کے پاس پہنچے...... وہ زندہ تھا لیکن اس کے سینے پر دائیں جانب گولی کا ایک اور زخم نظر آ رہا تھا...... تو یہ اندیشہ درست ثابت ہوا تھا کہ سفاک گارڈز نے آخری فائر آفتاب گل پر ہی کیا تھا۔ انہوں نے آفتاب کی اس غلطی کو معاف نہیں کیا تھا کہ اس نے تصادم کے وقت فرح کی جان بچانے کی کوشش کی۔

لانچ کا اب دور دور تک پتا نہیں تھا۔ ہمارے سامنے سمندر کی جھاگ اڑاتی لہریں تھیں اور ہمارے پیچھے ایک ویران ریتیلا ساحل تھا جس پر کہیں کہیں کھجوروں کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود آفتاب ابھی تک ہوش میں تھا اور سر ہلا کر ہمارے سوالوں کے جواب بھی دے رہا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ جندل خاں کے سامان میں ایک ٹارچ بھی تھی...... ''جندل خاں! کہاں ہو؟'' میں نے آواز دی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ ''جندل کہاں ہے؟'' میں نے ساتھیوں سے پوچھا۔ سب ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اتنے میں ایک وزیرستانی پٹھان آگے آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''امارا خیال ہے کہ جندل خاں نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں قریباً چلا اٹھا۔

ہم سب نے بے تابی سے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ جندل کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

اتنے میں ذکی احمد نے ایک اور شخص کا نام لیا اور کہا کہ وہ بھی نظر نہیں آ رہا۔ ہم نے افراتفری میں اپنی گنتی کی۔ پچیس میں سے چار افراد گنتی میں نہیں تھے اور ان میں جندل خاں بھی شامل تھا۔ ایک ہلکی سی امید اب بھی موجود تھی کہ شاید ان چار میں سے کچھ افراد ڈر کر ادھر ادھر بھاگ گئے ہوں۔

اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہم ادھر ادھر پھیل گئے اور تلاش کرنے لگے لیکن کہیں کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اچانک مجھے کنارے کے بالکل پاس کوئی چیز ہچکولے کھاتی نظر آئی۔ قریب جا کر دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ جندل خاں کی گٹھڑی تھی۔ ابراہیم گھٹنے گھٹنے پانی میں اترا اور یہ گٹھڑی نکال لایا۔ میں نے گٹھڑی کھولی۔ دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ یہ جندل خاں کی چیزیں تھیں۔ اس کا رختِ سفر تھا۔ کپڑوں کا ایک جوڑا، ایک چادر، مونگ پھلی، گڑ، نسوار کی ڈبیا، شیشہ، کنگھی۔ پلاسٹک کے ایک تہ کیے ہوئے لفافے میں دو تین تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں جندل خاں اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ دوسری تصویر میں یقیناً اس کے بچے اور بیوی تھی۔ بیوی سر تا پا چادر میں تھی، بس اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ ایک پھول سی بچی جندل خاں نے گود میں اٹھا رکھی تھی۔ تین لڑکے پاس پاس کھڑے تھے۔ ان کی عمریں تین اور آٹھ سال کے درمیان ہوں گی۔

کتنی محبت سے اس نے سنبھالی ہوئی تھیں یہ تصویریں۔ اب یہ تصویریں تو تھیں لیکن وہ خود نہیں تھا۔ اپنے بچوں کے لیے حق حلال کی روزی تلاش کرتے کرتے وہ خلیج فارس کے پانیوں میں دفن ہو چکا تھا۔ اس کی آخری آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا...... ہاں وہ ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اپنی پھول سی بچی کے لیے اور ان سب کے لیے جو اس سے پیار کرتے تھے اور اس کی راہ دیکھتے تھے۔

ہم سب حواس باختہ تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ ہم فوراً یہ جگہ چھوڑ دیں اور صحرا میں کچھ آگے چلے جائیں۔ کنارے پر کسی بھی وقت کوئی ہمیں دیکھ سکتا تھا اور ہم مزید مصیبت میں

گرفتار ہوسکتے تھے۔ آفتاب گل کے شدید زخمی ہونے کے بعد میری حیثیت ایک بار پھر گروپ لیڈر کی سی ہوگئی۔ مشورے کے بعد ہم نے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ حالت کسی کی بھی اچھی نہیں تھی۔ کئی مسافر ابھی تک قے کر رہے تھے۔ زیادہ تر کھانے پینے کا سامان لانچ کے اندر ہی رہ گیا تھا یا پھر چھلانگیں لگاتے ہوئے پانی میں گر گیا تھا۔ جو بچا کر لائے تھے، وہ بھی بری طرح بھیگا ہوا تھا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ جن مسافروں کے پاس سفری کاغذ...... پاسپورٹ وغیرہ موجود تھے، وہ سب کے سب بھیگ کر...... بے کار ہوگئے تھے۔ میرے عین سامنے ایک جہلمی نوجوان سر پکڑ کر بیٹھا رو رہا تھا۔ اس کے پاسپورٹ کا ستیاناس ہو چکا تھا۔ پورے گروپ میں شاید صرف میں اور ابراہیم تھے جن کے سفری کاغذ محفوظ رہے تھے اور ایسا ان شاپرز کی وجہ سے ہوا تھا جو میں نے بازار سے خریدے تھے۔ ابراہیم کا باقی سارا سامان بھی پانی میں بہہ گیا تھا۔ وہ بس ایک چھوٹی سی تھیلی بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ریگزین کی بنی ہوئی اس براؤن تھیلی میں کیا ہے۔

سب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے کوشش کر کے زخمی آفتاب گل کو اپنی کمر پر لادا۔ پیچھے سے ابراہیم نے سہارا دیا اور ہم درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھے۔ اب صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ ہم دور تک دیکھ سکتے تھے۔ چلتے چلتے میں دو لمحے کے لیے رک گیا۔ میں نے مڑ کر سمندر کی طرف دیکھا۔ شاید دل میں ابھی یہ امید تھی کہ وہاں جندل خاں نظر آئے گا اور پکار کر کہے گا۔ ”ٹھہرو ہارون! ام آرہا ہے۔“

لیکن جندل کہیں نہیں تھا۔ سمندر کی لہروں پر، صحرا کی ریت اور کھجوروں کے پیچھے کہیں اس کا نشان نہیں تھا۔ وہ تین دیگر افراد سمیت ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔

میں تھک گیا تو ابراہیم نے آفتاب کو اپنی پشت پر اٹھالیا۔ ساحل سے قریباً دو کلومیٹر آگے ہم خشک درختوں کے اس جھنڈ تک پہنچ گئے۔ عارضی طور پر خود کو چھپانے کے لیے یہ جگہ مناسب تھی۔ یہ کھجور کے آٹھ دس درخت تھے اور یہاں تھوڑا بہت سایہ بھی موجود تھا۔

ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں اور کس ملک کی حد میں ہیں۔ ہر جگہ ریت ایک جیسی ہوتی ہے اور کھجوریں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہر جگہ ایک ہی طرح کی ہوا چلتی ہے اور آسمان کا رنگ بھی ایک سا دکھائی دیتا ہے...... ہاں لانچ والوں نے کہا تھا کہ یہ کویت ہے۔

آفتاب گل کی حالت بری تھی۔ پہلی گولی تو اس کی ناف میں شاید اپینڈیکس کے آس پاس کہیں لگی تھی۔ دوسری گولی سینے میں دائیں طرف لگی تھی اور شانہ چیر کر عقب سے نکل گئی تھی۔ دونوں زخم مسلسل خون اگلے رہے تھے۔ ذکی احمد کے سامان میں سے مرہم پٹی کی کچھ اشیا نکل آئیں۔ ہم نے کوشش کر کے آفتاب گل کے زخموں سے خون کا اخراج بند کر دیا۔ بہرحال ناف والی گولی، اس کے جسم کے اندر ہی تھی اور یہی زیادہ خطرناک زخم تھا۔

کھانے پینے کی بہت معمولی سی چیزیں ہمارے پاس تھیں۔ خاص طور سے پانی تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ جوں جوں سورج اوپر آتا گیا، پیاس کی شدت بڑھتی گئی۔ گلے میں کانٹے سے پڑ گئے۔ اگلے دو ڈھائی گھنٹوں میں ہمارا گروپ مکمل طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ دونوں حصوں کی اپنی اپنی رائے تھی۔ ذکی احمد مجھے ایک طرف لے گیا اور سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”ہارون! زیادہ ساتھیوں کا خیال یہی ہے کہ ہم آفتاب گل کو اپنے ساتھ لیے لیے نہیں پھر سکتے، بہتر ہے کہ اس کے پاس کچھ خوراک اور پانی وغیرہ چھوڑ دیا جائے اور اسے اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی اس کی مدد کے لیے آجائے۔“

”نہیں ذکی صاحب! کم از کم میرا ضمیر تو یہ گوارا نہیں کرتا۔“ میں نے صاف جواب دیا۔

ابراہیم نے بھی فوراً میری تائید کی۔

مصطفیٰ نامی جہلمی نوجوان بولا۔ ”ہم لکڑیوں سے ایک اسٹریچر سا بنا سکتے ہیں اور خان صاحب کو اس پر لٹا کر اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔“

اس معاملے پر کچھ دیر چپکے چپکے بحث ہوئی، پھر کچھ اور لوگ بھی دوسرے گروپ کے ہمنوا بن گئے۔ آخر میں صرف میں، ابراہیم، مصطفیٰ اور ذکی احمد رہ گئے۔ ذکی احمد زیادہ عمر کا تھا اور کمزور بھی تھا۔ میں نے کہا۔ ”ذکی صاحب! آپ کی حمایت کا بہت شکریہ۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ خود کو مصیبت میں نہ ڈالیں۔ آپ ان لوگوں کے ساتھ چلے جائیں۔ ہم کچھ نہ کچھ کرلیں گے۔“

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد ہم نے ذکی احمد کو جانے پر آمادہ کرلیا۔ کچھ دیر بعد ہمیں معلوم ہوا کہ علیحدہ ہونے والا گروپ بھی دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک ٹولی شمال کی طرف جانا چاہ رہی تھی، دوسری شمال مشرق کی طرف۔ یہ سب کچھ بس اندازے سے ہی ہو رہا تھا۔ رخصت کے

وقت ذکی احمد کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ''خدا حافظ!'' اس نے خشک ہونٹوں کے ساتھ کہا۔

''خدا حافظ!'' ہم نے بھی جواب دیا۔ وہ لوگ دو ٹولیوں کی شکل میں ہم سے دور ہوتے چلے گئے۔ میری نگاہیں دیر تک ذکی احمد پر جمی رہیں۔ اس کا خاکی کرتہ پاجامہ دور سے بھی نظر آرہا تھا۔ اپنے جھکے ہوئے کندھوں پر تین جوان بیٹیوں کے مستقبل کا بوجھ اٹھائے وہ چلتا چلا جارہا تھا۔ پھر وہ اپنی ٹولی سمیت ٹیلوں کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ زندگی کی ریل گاڑیاں ایسے ہی پٹریاں بدلتی ہیں اور مسافروں کی راہیں اور منزلیں تبدیل ہوتی ہیں۔

☆☆☆

درختوں کے اس جھنڈ میں آج ہمیں دوسرا روز تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا اور سورج سوا نیزے پر چمک رہا تھا۔ جو تھوڑا بہت خشک راشن ہمارے پاس تھا، وہ اب دو دن سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔ پانی بھی بہت احتیاط سے استعمال کیا جاتا تو مشکل سے ڈھائی تین دن گزر سکتے تھے۔ آفتاب گل کا ناف کا زخم خراب ہونا شروع ہوگیا تھا۔ وہ جگہ سرخ بھی اور اسے بخار بھی تھا۔ وہ بڑے صبر کا مظاہرہ کررہا تھا لیکن جب پیاس شدت پکڑ جاتی تو وہ مجبور نظروں سے ہماری طرف دیکھتا۔ ہم پانی کے چند قطرے اس کے منہ میں ٹپکا دیتے۔ مصطفیٰ صبح سویرے کا نکلا ہوا تھا، میں نے ہی اسے کہا تھا کہ وہ اردگرد کسی بستی یا گھر کا کھوج لگائے اور یہ پتا کرنے کی کوشش بھی کرے کہ کیا واقعی ہم کویتی علاقے میں ہیں؟

سہ پہر کے پانچ بجے تک گرمی اور پیاس کی وجہ سے ہمارا دم جیسے آنکھوں میں آگیا۔ آفتاب گل نے مجھے اشارے سے قریب بلایا اور بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ہارون! امارے لیے اپنا جان خطرے میں نہ ڈالو۔ میں اب نہیں بچوں گا۔ تم لوگ چلے جاؤ۔ اگر تم......''

میں نے آفتاب کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں آفتاب بھائی! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

ابراہیم بولا۔ ''سائیں! مجھ کو لگتا ہے کہ مصطفیٰ واپس آرہا ہے۔'' واقعی دور ایک مدھم ہیولا نظر آرہا تھا لیکن یہ کوئی بدو بھی ہوسکتا تھا۔ بہرحال تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں اندازہ ہوگیا کہ یہ پتلون شرٹ والا مصطفیٰ ہی ہے۔ ہم پُرامید نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ تھکا ہارا اور ہانپتا کانپتا ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس کا رنگ سیاہ ہو رہا تھا اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ وہ ناکام لوٹا ہے۔

اس نے نفی میں سر ہلا کر ہمارے اندازے کی تصدیق کی۔ ''نہیں جی...... اس طرف تو دور تک کسی بندے یا بستی کا نام ونشان نہیں۔ پانی بھی کہیں نظر نہیں آیا۔''

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے اسے ایک گھونٹ پانی دیا۔ وہ ہونٹوں کو تر کرکے بولا۔ ''اور مجھے تو لگتا ہے کہ...... شاید...... ہم کویتی علاقے میں بھی نہیں ہیں۔''

''کیسے لگتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کافی آگے ریت میں ایک پرانا بورڈ دبا ہوا نظر آیا ہے۔ اس کے لفظ مٹ چکے ہیں مگر دو چار پڑھے بھی جاتے ہیں۔ ان میں بصرہ اور نصیریہ کا لفظ بھی پڑھا جاتا ہے۔ آگے شاید تیر کا نشان ہے۔''

مایوسی اور بے بسی کی ایک اور لہر سینے میں دوڑ گئی۔ تو کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ لانچ والوں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے ہمیں پھر عراقی علاقے میں اتار دیا...... یا پھر ہم ہی غلط سمت میں چل کر اس طرف آگئے؟ بہرحال ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

پہاڑ جیسا دن گزرنے میں نہیں آرہا تھا۔ خدا خدا کرکے شام ہوئی اور گرمی کی جگہ ہلکی ہلکی خنکی نے لے لی۔ ریت جتنی جلدی گرم ہوتی ہے، دھوپ کے بغیر اتنی ہی جلدی ٹھنڈی بھی ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پیاس کی شدت بھی قدرے کم محسوس ہونے لگی۔ یہ ایک چاندنی رات تھی۔ مشرق کی طرف سے چاند کا سنہری گولا سمندر کے اندر سے نمودار ہوا اور دھیرے دھیرے افق پر بلند ہونے لگا۔ ہم نے چند کھجوریں کھائیں۔ دو دو بسکٹ لیے اور ایک ایک گھونٹ پانی پی کر آفتاب گل کے دائیں بائیں لیٹ گئے۔ میں آج سارا دن لکڑی کا ایک اسٹریچر تیار کرتا رہا تھا۔ اس کے لیے میں نے کھجور کی تین چار مضبوط شاخیں استعمال کی تھیں۔ اس کے علاوہ بدنصیب جندل خاں کی گٹھری سے برآمد ہونے والی ایک بڑی چادر بھی کام آئی تھی۔

ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوئی تو ہم پیاس اور تھکن کے ماروں کو نیند آنے لگی...... بہت دیر تک تکلیف میں کراہنے کے بعد اب آفتاب گل پر بھی غنودگی طاری ہورہی تھی۔ وہ سویا تو ابراہیم اور مصطفیٰ بھی سوگئے۔ میں جاگتا رہا اور عرب کے آسمان کے تارے گنتا رہا۔ دو دن پہلے کے خونی واقعات ایک ایک کرکے نگاہوں کے سامنے آئے۔ امین کا زخمی ہوکر پانی میں گرنا۔ کمال رشید کا گولیوں سے چھلنی ہونا

اور پھر گارڈز کی خوفناک دھمکیوں کے بعد ہمارا سمندر میں چھلانگیں لگانا۔ یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں دل میں یہ اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ شاید ہم زندہ سلامت اس ویرانے سے نکل نہیں سکیں گے۔ اسی صحرا میں چلتے چلتے ہم کہیں یکے بعد دیگرے گریں گے اور ہمارے اوپر ریت کی قبریں بن جائیں گی۔ ہمارے پیچھے بے رحم سمندر تھا اور آگے قاتل ریت تھی جس کا کوئی کنارہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رات کے پونے نو بجے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق پاکستان میں یہی کوئی دس ساڑھے دس کا وقت ہوگا۔ میں نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا۔ میرے گھر والے کھانا کھا چکے ہوں گے اور اب سونے سے پہلے شاید ٹی وی وغیرہ دیکھ رہے ہوں۔ امی بھیگی آنکھوں کے ساتھ نوافل پڑھ رہی ہوں گی۔ اسلم بھائی جان.... بے چینی سے گھر کے سامنے گراؤنڈ میں ٹہل رہے ہوں گے۔ انہوں نے میری تلاش میں لوگوں کو دور دور دوڑا رکھا ہوگا۔ ابا جان وظائف میں مصروف ہوں گے۔ میری دلہن میرے ننھے بھتیجے ذوالفقار سے کھیل رہی ہوگی۔ اس کی شرارتوں میں اپنا دکھ بھلانے کی ناکام کوشش کر رہی ہوگی۔ مجھے اپنی دو چھوٹی بہنیں، جنہیں میں نے کبھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی، بری طرح یاد آئیں۔ میں نے تصور کی نظر سے دیکھا۔ میری چھوٹی بہن، ابا جان کے کہنے پر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اٹھائے میرے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ بڑوں کی طرح اس کا چہرہ بھی کملایا ہوا تھا۔ ''اللہ میاں میرے بھائی جان کو واپس لے آ۔ ہمیں پھر ان کی شکل دکھا دے۔'' پھر میری آنکھوں کے سامنے میرے دوستوں کی شکلیں آئیں۔ لاہور میں مزنگ چونگی کی رونقیں، ملتان روڈ کی گہما گہمی لکشمی چوک کی روشنیاں۔ ٹھنڈے مشروبات گردش کر رہے تھے، پکوان کھائے جا رہے تھے، خوشی سے بھرپور قہقہے گونج رہے تھے۔

کچھ اسی طرح کا ''احساس'' پیدا ہوا جو اعتبار ساجد کی یہ مشہور نظم دل میں جگاتی ہے

اے اس شہر کے پیارے لوگو!
تم نے کب یہ سوچا ہوگا
دور کہیں ایک صحرا ہوگا
جس میں سبز رتوں کا شاعر
جنم جنم کا پیاسا ہوگا
کیسے ہر شب کٹتی ہوگی؟
کیسے ہر دن ڈھلتا ہوگا......؟

آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔ دوبارہ بیدار ہوا تو چاند نصف نہار پر چمک رہا تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ آفتاب گل نیند میں کراہ رہا تھا۔ مصطفی بھی سویا ہوا تھا لیکن ابراہیم اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ آفتاب کو دیکھنے کے بعد میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ چاندنی میں دور تک نظر آ رہا تھا مگر ابراہیم کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شاید پیشاب وغیرہ کے لیے گیا ہے۔ اس کی ریگزین کی براؤن پوٹلی اس کے بچھونے کے نیچے سرہانے کی طرف پڑی تھی۔ وہ اپنے سارے سامان میں سے بس اس پوٹلی نما تھیلی کو ہی بچا سکا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس نے یہ تھیلی کیوں بچائی ہے۔ اس میں اس کا سب سے قیمتی سامان تھا۔ ہیرے جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی۔ اس میں مہرو کی نشانیاں تھیں۔ میں نے یونہی سرد ریت پر بیٹھ کر اس تھیلی کی زپ کھولی۔ اس میں کئی چیزیں تھیں، مجھے بس چند ہی یاد رہیں۔ ان یاد رہنے والی چیزوں کا تعلق مہرو سے ہی تھا۔ شاپر میں لپٹی ہوئی اس کی ایک پرانی جوتی۔ ایک پڑیا میں رکھے ہوئے اس کے چند بال، اس کی قمیص کا سرخ بٹن اور سبز نیلے رنگ کی کچھ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں۔ کیسی انوکھی محبت تھی اس کی؟ کیسے جنونی جذبے تھے اس کے سینے میں؟ اور اب وہ کہاں تھا؟ کافی دیر ہو گئی تھی۔ اسے آ جانا چاہیے تھا۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا نکلا۔ وہ مجھے خشک کھجوروں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ کے پیچھے نظر آیا۔ اس نے ایک سوکھے تنے سے ٹیک لگا رکھی تھی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں چند لمحے تو ساکت کھڑا رہا، پھر آگے بڑھ کر کہا۔ ''کیا بات ہے ابراہیم؟ کیا ہوا؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر اپنا سر اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھ کر چہرہ چھپا لیا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا، اسے تسلی دینے لگا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اسے ہوا کیا ہے۔

اس نے کہا۔ ''ہارون سائیں! آج بری رات ہے۔ بہت بری رات ہے۔''

''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔'' میں نے اس کا تر بتر چہرہ اپنی طرف پھیرتے ہوئے پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''شاید تم کو یاد نہیں رہا سائیں! آج بغداد میں مہرو کی منگنی ہے۔ وہ چمکدار جوڑا پہنے، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، سج کر بیٹھی ہوگی اور وہ حرام زادہ...... وہ زبیر...... وہ اس کی انگلی میں مندری

پہنائے گا، اپنے ہاتھوں سے مندری پہنائے گا۔''
اس کی آواز غم کی شدت سے ٹوٹ گئی۔
ابراہیم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے بھی یاد آ گیا۔ چاند کی چودھویں رات کو جعفر کے گھر زبیر اور مہرو کی منگنی ہونا تھی۔
میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''ابراہیم! حوصلہ کرو۔ یہ منگنی ہی ہے، خدانخواستہ شادی تو نہیں ہے۔''
''لیکن سائیں...... وہ میری مہرو کے پاس بیٹھے گا۔ اس کو چھوئے گا۔ اس کو ہتھ لگائے گا۔''
''ہاتھ لگائے گا؟ وہ کیوں؟''
''جب لڑکا مندری پہناتا ہے تو لڑکی کے ہاتھوں کو ہاتھ تو لگتے ہیں نا...... میں یہ برداشت نہیں کر سکتا...... سائیں بالکل نہیں کر سکتا۔ وہ کیوں اسے ہتھ لگائے...... کیوں؟''
اس نے شدید بے چینی کے عالم میں اپنا سر کھجور کے تنے سے رگڑا۔ میں نے دیکھا اس کے دائیں ہاتھ کی کھال بری طرح چھلی ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ جنون کے عالم میں کھجور کے تنے پر مکے رسید کرتا رہا ہے۔
وہ دردناک آواز میں بولا۔ ''میں بھی جندل خاں کی طرح سمندر میں ہی کیوں نہ رہ گیا۔ کیوں میری جان ان عذابوں سے چھوٹ نہ گئی۔''
میں نے اسے جھڑکا۔ ''مایوسی گناہ ہے۔ خدا سے اچھے دنوں کی امید رکھنی چاہیے۔ ابھی کوشش کرنے کے لیے تمہارے پاس کافی وقت ہے ابراہیم۔''
''کافی وقت تو ہم کہہ رہے ہیں نا سائیں...... مجھے تو...... یہ ڈر بھی ہے کہ کہیں اس کے پا جعفر نے منگنی کو اس کے نکاح میں ہی نہ بدل دیا ہو۔ اس کے گھر والے مشورہ دے رہے تھے کہ جب اتنا خرچہ کرنا ہے تو پھر کیوں نہ ساتھ ہی نکاح بھی کر دیا جائے۔''
''یہ سب تمہارے وہم ہیں ابراہیم۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تمہاری لگن سچی ہے تو تمہیں کامیابی ضرور ملے گی۔ خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔''
''لیکن ابھی تک تو ہر طرف اندھیرا ہی ہے...... کوئی بھی وسیلہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ جو تھوڑی بہت پونجی تھی میرے پاس وہ بھی پانی میں رہ گئی۔ کویت جانے...... اور کمائیاں کرنے کی سوچ بھی بس سوچ ہی رہی۔ نہ ہم کویت جا سکے ہیں، نہ بغداد میں ہیں۔ پتا نہیں کہاں پڑے ہوئے ہیں، اگر پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو پتا نہیں کیا حشر ہوگا۔''
''ہمارا دین کہتا ہے ابراہیم کہ مایوسی گناہ ہے۔ امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

''لیکن سائیں! دین یہ بھی تو کہتا ہے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ اپنی حیثیت کو دیکھے بغیر، جاگتی آنکھوں سے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ میں نے اپنے خط میں کیا کیا نہیں لکھ دیا تھا مہرو کو...... اب وہ سب کچھ شرمندگی کا پہاڑ بن گیا ہے۔ تم نے ہی تو کہا تھا سائیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے دن بدل جائیں گے۔ ہم کیا سے کیا ہو جائیں گے۔''
میں سمجھ گیا کہ وہ اس طویل خط کی بات کر رہا ہے جو آٹھ دن پہلے بغداد چھوڑنے سے پیشتر اس نے مہرو کو لکھا تھا۔ یقیناً اس خط میں اس نے مہرو کو بھی لکھا ہوگا کہ وہ کویت جا رہا ہے اور بہت جلد اسے کچھ بن کے دکھا دے گا۔ اب وہ ساری باتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔
میں اس کے پاس بیٹھ کر اسے دیر تک سمجھاتا رہا اور تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا۔ حالانکہ تسلی تو میرے اپنے پاس بھی نہیں تھی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ واپس درختوں میں لے آیا۔
اگلے روز صبح منہ اندھیرے پروگرام کے مطابق ہم نے زخمی آفتاب کو لکڑی کے اسٹریچر پر ڈالا اور روانہ ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ آگ برساتا سورج طلوع ہوتا اور اس ویرانے کو جہنم زار بنا دیتا، ہم آٹھ دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ اس سفر کے دوران میں ابراہیم کی سخت جانی اور ہمت کا صحیح اندازہ ہوا...... اس نے بہت کم ریسٹ کیا اور میرے یا مصطفیٰ کے ساتھ مل کر مسلسل اسٹریچر کو اٹھائے رکھا۔ شاید یہ جسمانی مشقت اس کی ذہنی اذیت کو کم کرنے میں بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔ ہماری نگاہیں ہر پل کسی ذی نفس کا کھوج لگانے میں لگی ہوئی تھیں لیکن ذی نفس کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ ہم بس اندازے سے چلتے جا رہے تھے اور اندازہ یہی تھا کہ ہم عراقی علاقے کی طرف جا رہے ہیں۔ مصطفیٰ کے سوا ہم تینوں کے پاس سفری کاغذات ٹھیک حالت میں موجود تھے۔ اگر ہمیں کسی قانون نافذ کرنے والی ایجنسی سے آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو زیادہ خطرے کی بات نہیں تھی۔
وہ بڑا ہی مشکل دن تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میلوں تک کہیں سائے کا نام و نشان نہیں۔ پیاس سے دم آنکھوں میں آ چکا تھا۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ شاید ہم یکے بعد دیگرے چکرا کر گر جائیں گے اور کبھی اٹھ نہ سکیں گے۔ دور اوپر چمکیلے آسمان پر اڑتے ہوئے گدھ ایک ایک کر کے نیچے اتریں گے اور اپنی لمبی چونچوں سے ہمارا گوشت نوچنا

شروع کردیں گے۔ سورج ڈھلا اور تمازت کچھ کم ہوئی تو ہم جیسے موت کے منہ میں سے واپس آنا شروع ہوگئے۔ صحرا کی شام زندگی کی نوید کی طرح لگی۔ مگر یہ عارضی نوید تھی۔ کل پھر یہی آگ برساتا سورج ہونا تھا اور یہی جان لیوا راستہ ہونا تھا۔

آفتاب گل بار بار بے ہوشی میں بڑبڑانے لگتا تھا۔

''ام کو چھوڑ دو۔ یہاں بہت ٹھنڈا پانی ہے۔ تم جاؤ......''

زخم کے زہر نے شاید اس کے اعصاب کو متاثر کرنا شروع کردیا تھا...... وہ رات بھی جیسے تیسے کٹی۔ صبح ابراہیم نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ ''کیا ہوا؟'' میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''مصطفیٰ نہیں ہے۔'' ابراہیم نے بتایا۔

''کہیں ادھر ادھر نکلا ہوگا۔''

''نہیں، میں نے دیکھ لیا ہے، کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ چلا گیا ہے شاید۔''

میں تیزی سے اشیائے خورونوش کی طرف لپکا...... یعنی بسکٹ اور پانی...... دونوں چیزیں موجود تھیں لیکن وہ اپنے حصے کا پانی لے گیا تھا اور بسکٹ بھی۔ بہرحال یہ بھی اس کی مہربانی تھی۔ اگر وہ سارا راشن لے جاتا تو بھی ہم کیا کرلیتے۔ غالباً اس سے اسٹریچر اٹھانے کی مشقت برداشت نہیں ہوئی تھی اور اس نے اکیلے سفر کرنا مناسب سمجھا تھا۔

ایک بار پھر منہ اندھیرے ہم نے آفتاب والا اسٹریچر اٹھایا اور چل پڑے۔ آفتاب پر تھوڑا سایہ رکھنے کے لیے ہم نے جندل خاں کے ایک بڑے رومال کو سائبان کی طرح استعمال کیا ہوا تھا۔

ایک جگہ دو نیم خشک درختوں کا تھوڑا سا سایہ نظر آیا۔ یہ جگہ مشکل سے آدمی چارپائی جتنی ہوگی، پھر بھی ایک نعمت کی طرح لگی۔ ہم نے یہاں رک کر ایک ایک گھونٹ پانی سے اپنے گلے تر کیے اور کچھ پانی نیم بے ہوش آفتاب کے منہ میں ٹپکایا۔

ابراہیم...... مصطفیٰ کے چلے جانے پر اظہارِ افسوس کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ابراہیم! ہر کام میں اللہ نے کوئی نہ کوئی بہتری بھی چھپا رکھی ہوتی ہے۔''

''مثلاً کیا سائیں؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ہم تینوں کے پاس پاسپورٹ وغیرہ موجود ہیں۔ مصطفیٰ کا پاسپورٹ پانی میں خراب ہوچکا ہے بلکہ ختم ہی ہوگیا ہے۔ پاسپورٹ پر دخول والا صفحہ ہی غائب ہے۔ وہ ہمارا ہمسفر رہتا تو اس کی وجہ سے ہم بھی مشکل میں پڑ سکتے تھے۔'' ابراہیم سوچ میں پڑ گیا۔

یکایک مجھے اپنی بائیں جانب ریت کے ٹیلے کے پیچھے حرکت نظر آئی۔ پہلے تین چار سر نمودار ہوئے پھر باقی دھڑ نظر آئے۔ پتا چلا کہ پانچ کے قریب افراد تیزی سے ہماری طرف لپک رہے ہیں۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کریں۔ فاصلہ اتنا کم تھا کہ ردعمل کا موقع ہی نہیں تھا۔ ان افراد کے کپڑے سیاہی مائل تھے۔ اپنے حلیے سے یہ بدو لگتے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے کہ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چھوٹی نال والی رائفل تھی۔

میں اور ابراہیم ہراس کے عالم میں کھڑے ہوگئے۔

ہمارے قریب پہنچتے ہی یہ لوگ ناقابل فہم زبان میں چلانے لگے۔ ان کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔ ان کے اشاروں سے پتا چلتا تھا کہ وہ ہمیں ہاتھ کھڑے کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ ہم نے ہاتھ کھڑے کردیے۔ انہوں نے ہمیں اوندھے منہ ریت پر لیٹنے کو کہا۔ ہم نے ذرا تذبذب دکھایا تو ایک دراز قد بدو نے چلا کر کچھ کہا اور رائفل بردار شخص نے رائفل کا دستہ بے رحمی سے ابراہیم کی گردن پر رسید کیا۔ ابراہیم کے چہرے پر طیش کے آثار نظر آئے لیکن جب اس نے دیکھا کہ میں لیٹنے کے لیے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا ہوں تو وہ بھی بیٹھ گیا۔ ہم لیٹ گئے تو انہوں نے بڑے غصیلے انداز میں ہماری جامہ تلاشی لی اور جو کچھ ہاتھ لگا، وہ نکال لیا۔ میری کلائی میں ابھی تک شادی والی گھڑی موجود تھی اور ایک انگلی میں چھوٹی طلائی انگوٹھی بھی تھی۔ یہ دونوں چیزیں بھی ان کے قبضے میں چلی گئیں پھر وہ لکڑی کے اسٹریچر پر پڑے آفتاب گل کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی جیب سے بھی نقدی وغیرہ نکال لی۔

وہ عربی سے ملتی جلتی زبان ہی بول رہے تھے اور ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ صحرائی لٹیرے ہیں، ان کی خودرو ڈاڑھیاں جھاڑ جھنکاڑ کی طرح تھیں۔ تین افراد کے چہرے پر بڑی بڑی پگڑیاں تھیں اور ان بوسیدہ پگڑیوں کے پلو سے انہوں نے اپنے چہرے بھی ڈھانپ رکھے تھے۔ ایک ایسے ہی شخص کے ہاتھ میں مجھے ایک خم دار چھری بھی نظر آئی۔ میں نے آنکھوں میں ابراہیم کو سمجھا دیا کہ ہمیں مزاحمت کرکے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔

ہمارے مختصر سامان کو بھی الٹ پلٹ کیا گیا اور اس میں سے جو چیز ان کو اپنے کام کی لگی، وہ انہوں نے نکال

لی۔ اب وہ ہمیں، ہمارے حال پر چھوڑ کر واپس جانے کے لیے تیار نظر آتے تھے لیکن اس موقع پر ان میں سے ایک شخص سے ایک ایسا کام ہو گیا جس نے سارا نقشہ ہی بدل دیا۔ جاتے جاتے اس شخص کی نظر ریگزین کی اس براؤن تھیلی پر پڑی جو پلاسٹک کے ایک شاپر میں سے جھانک رہی تھی۔ اس نے تھیلی اٹھائی تو ابراہیم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

لٹیرا تھیلی اٹھا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دوڑا تو ابراہیم بھی بے ساختہ اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ ''رک جاؤ...... چھوڑ دو اسے...... چھوڑ دو۔'' وہ پکارا۔

اس کی پکار میں موجود تڑپ سے لگتا تھا جیسے یہ لٹیرا اس کی ساری عمر کی پونجی لے کر بھاگ رہا ہے۔

لٹیروں نے جب ابراہیم کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تو وہ رک گئے۔ رائفل بردار نے ابراہیم کو ڈرانے کے لیے اس کے پاؤں کے قریب فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ بہت سی ریت اچھلی لیکن اگر فائر کرنے والا یہ سمجھتا تھا کہ ابراہیم ڈر کر رک جائے گا تو ایسا نہیں ہوا۔ وہ تھیلی کی طرف لپکتا چلا گیا۔

''ٹھہرو ابراہیم۔'' میں بھی پکارا۔

لیکن وہ ٹھہرنے والا نہیں تھا۔ یہ تھیلی اس کا عشق تھی اور عشق انمول ہوتا ہے۔ رائفل بردار نے دوسرا فائر سیدھا ابراہیم پر کیا۔ گولی ابراہیم کے کندھے کے اوپر سے گزری۔ وہ چلاتا ہوا تھیلی بردار پر جا پڑا۔ تب تک میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ابراہیم کی طرف دوڑ لگا چکا تھا۔ ان لوگوں کی ساری توجہ ابراہیم کی طرف تھی جو تھیلی بردار سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اندھا دھند رائفل والے بدو پر جا پڑا۔ میں نے اس کی رائفل کا بیرل نیچے جھکا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے سر کی بھرپور ضرب اس کے چہرے پر لگی۔ وہ کراہتا ہوا پشت کے بل گرا۔

دراز قد شخص نے مجھے رائفل بردار کے اوپر سے کھینچ لیا اور میرے ساتھ لپٹ گیا۔ ایسی لڑائی بھڑائی میں کالج کے زمانے میں خوب کر چکا تھا۔ میں نے اس شخص کی ناف میں گھٹنے کی زوردار چوٹ لگائی اور پھر اڑنگا لگا کر اسے گرا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ ابراہیم بھی اپنے دو حریفوں سے پوری پوری ٹکر لے رہا ہے۔ دراز قد شخص جب میرے نیچے آیا تو اس نے اپنے لبادے کے اندر سے خم دار چھری نکال لی۔ مجھے اپنا سر پیچھے ہٹانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوتی تو شاید میں یہ روداد آپ کو سنانے کے لیے آج زندہ نہ ہوتا۔

چھری میری گردن کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے دراز قد شخص کے چہرے پر مکوں کی بارش کر دی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے ہم دونوں سے ایسی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔

یکا یک اوپر تلے تین چار فائر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹیلے کے عقب سے ایک جیپ برآمد ہوئی تھی اور تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ فائرنگ بھی اسی پر سے کی گئی تھی۔ جس وقت میں جیپ کی طرف دیکھ رہا تھا، دراز قد شخص نے میرے نیچے سے نکل کر دوڑ لگا دی اور صرف وہی نہیں باقی افراد بھی ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ریتیلے ٹیلے کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ انہوں نے جو چیزیں ہم سے چھینی تھیں، ان میں سے دو چار ریت پر ہی پڑی رہ گئی تھیں۔ ریگزین کی براؤن تھیلی بھی ان میں شامل تھی۔ اس میں مہرو کی نشانیاں تھیں اور یہ ابراہیم کی متاعِ حیات تھی۔

اس نے جلدی سے تھیلی اٹھا کر اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس لی۔ جیپ میں چار افراد سوار تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر دو ہوائی فائر کیے اور ہمارے پاس آ کر رک گئے۔ لٹیروں کی طرح ان لوگوں نے بھی اپنے چہرے ڈھاٹوں میں چھپائے ہوئے تھے تاہم ان کے لباس کچھ بہتر تھے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں رائفل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ لوگ کھلی چھت والی جیپ میں سے چھلانگیں لگا کر نیچے اترے۔ تب ایک شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ یہ نوجوان حافظ احسان تھا۔ یہ لانچ کے بدقسمت مسافروں میں سے ایک تھا اور ساحل پر اترنے کے بعد اس کا بھی کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ بھی جندل خاں وغیرہ سمیت سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ حافظ احسان مقامی طرز کے لباس میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر ہم سے لپٹ گیا۔ اسی دوران میں جیپ کے عربی سوار بھی اپنے چہروں سے ڈھاٹے کھول چکے تھے۔ وہ اپنی صورتوں سے صحرائی باشندے ہی نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک رعب دار شخص کی پیشانی پر نماز کا محراب بہت نمایاں تھا۔

حافظ احسان نے پہلے اس رعب دار شخص سے عربی میں بات کی۔ پھر ہمیں بتایا کہ اب ہمیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم بالکل محفوظ جگہ پر ہیں۔ اس نے رعب دار شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''ان کا

نام شیخ حارث ہے۔ یہاں ان کا ایک احاطہ ہے جس میں یہ بھیڑیں وغیرہ پالتے ہیں۔ بہت نیک آدمی ہیں۔ اگر یہ نہ ملتے تو شاید میں اسی ویرانے میں گھوم گھوم کر مر جاتا۔''

پھر حافظ احسان نے مجھے اور ابراہیم کو سرتاپا دیکھا اور پوچھا کہ ہمیں کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں لگی۔ ہم دونوں بالکل ٹھیک تھے۔ صرف ابراہیم کے سر سے تھوڑا سا خون رس رہا تھا۔ حافظ احسان نے کہا۔ ''یہ وہی لوگ تھے جن کو ہم اپنی زبان میں راہزن کہتے ہیں۔ اپنے علاقے میں کسی بھولے بھٹکے مسافر کو دیکھ کر اسے لوٹنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ شیخ حارث ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ شام تک ان کا پتا چل جائے گا۔''

پھر حافظ احسان، زخمی آفتاب گل کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کی حالت پر تشویش کا اظہار کیا۔ وہ گاہے بگاہے اپنے میزبان شیخ حارث کے سوالوں کا جواب بھی دے رہا تھا۔

کھلی چھت والی یہ جیپ پرانی تھی لیکن کافی کشادہ تھی۔ کچھ دیر بعد ہم نے زخمی آفتاب کو احتیاط سے جیپ کی سب سے پچھلی نشست پر لٹایا اور خود بھی سوار ہو گئے۔ اب ہم ایک نئی منزل کی طرف جا رہے تھے اور ایک طرح سے یہ ہماری غیبی مدد ہی تھی۔

☆☆☆

شیخ حارث کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ یہاں سات آٹھ کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ اردگرد چند درخت موجود تھے۔ ٹیلوں کے اردگرد صحرائی جھاڑ جھنکاڑ نظر آ رہا تھا۔ احاطے میں بھیڑوں کے دو علیحدہ علیحدہ ریوڑ تھے۔ بھیڑوں کی مجموعی تعداد تین سو سے کم نہیں ہوگی۔ ایک بیڈفورڈ ٹرک بھی یہاں موجود تھا جو جانوروں کے لیے چارا وغیرہ لانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ شیخ یہاں اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ شیخ حارث کے گھر میں جس سب سے اہم اور دلچسپ ہستی سے ہماری ملاقات ہوئی، وہ شیخ حارث کے والد محترم تھے۔ حافظ احسان کے مطابق ان کی تصدیق شدہ عمر ایک سو دس برس تھی۔ ان کی کمر جھک کر کمان بن چکی تھی اور لمبی سفید ڈاڑھی گھٹنوں سے چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں اونٹنی کے دودھ کا صرف آدھا گلاس پیتے تھے اور یہی ان کی کل خوراک تھی۔ ان کے دن اور رات کا اکثر حصہ عبادت میں گزرتا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ نوے سال کے بعد ان کی ''اندر کی آنکھیں'' کھل گئی تھیں اور اب وہ ماضی اور مستقبل کے بارے میں بہت کچھ جان لیتے ہیں۔ میں نے ان کو جائے نماز پر دوزانو بیٹھے دیکھا اور مجھے ان کے چہرے پر وہی نورانی جھلک نظر آئی جو صرف ''اللہ والوں'' کا نصیب ہوتی ہے۔

شیخ حارث کے ٹھکانے پر پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے آفتاب گل کی نازک حالت پر توجہ دی۔ شیخ کا ایک آدمی کہیں سے ایک ہنرمند جراح کو لے آیا۔ اس نے دستیاب اوزاروں کی مدد سے آفتاب گل کی ناف میں ایک کٹ لگایا اور کسی نہ کسی طرح گولی نکالنے میں کامیاب ہوا۔ تب اس نے زخم کو سی کر بینڈیج کر دی اور کھانے کے لیے کچھ ایلوپیتھک دوائیں بھی دیں لیکن وہ زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ جیسے ہی مریض کی حالت کچھ بہتر ہوا سے بصرہ یا پھر بغداد لے جایا جائے۔

شیخ حارث اور حافظ احسان سے ملنے کے بعد اس بات کی مکمل تصدیق ہو چکی تھی کہ ہم عراق میں ہی ہیں...... اور یہ بڑی تکلیف دہ سچائی تھی۔ رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ اتنی تکلیفیں اٹھانے کے بعد بھی ہم اسی جگہ موجود تھے جہاں سے چلے تھے۔ پچھلے چند دنوں کی صعوبتوں نے جسم اور ذہن کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرا وزن دس پندرہ دنوں میں کم وبیش دس پاؤنڈ کم ہو گیا تھا۔ میری پتلون کی بیلٹ بہت ڈھیلی ہو گئی تھی۔ بال منتشر اور ڈاڑھی بڑھ چکی تھی۔ حافظ احسان بھی پہلے سے بہت کمزور نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر مجھے چوٹوں کے نشان بھی نظر آئے۔ اس نے بتایا کہ سمندر کے نمکین پانی میں غوطے کھاتے ہوئے وہ ساحل کے قریب پہنچا تو اس نے جندل خاں کو ڈوبتے دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ کنارے پر پہنچتے ہی حافظ احسان کے ذہن میں خوف جاگا کہ ابھی پولیس کی موٹر بوٹ...... لانچ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے گی اور وہ سب پکڑے جائیں گے۔ وہ اندھا دھند وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس نے کہا۔ ''ہارون بھائی! میں نے قریباً دس کلومیٹر تک سخت گرمی میں سفر کیا اور پھر پیاس سے بدحال ہو گیا۔ میرے پاس پینے کے لیے ایک قطرہ نہیں تھا اور دور دور تک کوئی مددگار نظر نہیں آتا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے بارڈر پولیس کے کچھ لوگوں نے مجھے پکڑا اور اپنی چوکی پر لے گئے۔ انہوں نے وہاں اڑتالیس گھنٹے تک مجھے بری طرح مارا اور مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کس چکر میں یہاں گھوم رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی بار بار پوچھا کہ میں صدام حسین

کے بارے میں کس طرح کے خیالات رکھتا ہوں۔ وہ میری کسی بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ بھیگا ہوا پاسپورٹ میرے پاس تھا، اگر وہ بھی نہ ہوتا تو وہ میری اور بری حالت کر دیتے۔ تیسرے روز انہیں کسی وجہ سے اچانک اپنی چوکی سے جانا پڑا۔ گاڑی میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے۔ پتا نہیں ان کے دل میں کیا آئی کہ انہوں نے برا بھلا کہنے کے بعد مجھے چھوڑ دیا۔ کچھ پانی بھی انہوں نے مجھے دے دیا تھا لیکن میں ایک بار پھر راستہ بھول گیا۔ اگر شیخ حارث رحمت کا فرشتہ بن کر نہ آتے تو پتا نہیں میرا کیا حال ہوتا۔''

ہم نے حافظ احسان کی پوری روداد سنی۔ روداد ختم ہوئی تو شیخ کا ایک ملازم ہمارے لیے دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے لے آیا۔ ہم نے شیو وغیرہ بنائی اور ٹھنڈے پانی سے پُرلطف غسل کیا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو ہم نے شیخ حارث کی امامت میں باجماعت نماز ادا کی۔ شیخ کے عمر رسیدہ والد ایک وھیل چیئر پر نماز میں شریک تھے۔ شیخ حارث نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ابراہیم میرا رشتے دار ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ شیخ حارث نے کہا کہ میری اور ابراہیم کی شکل میں تھوڑی سی مشابہت پائی جاتی ہے۔

شیخ حارث کی مالی حالت بہت بری تھی، نہ بہت اچھی تھی۔ بہرحال انہوں نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اصل عرب ہونے کا ثبوت دیا۔ ہم مسلسل آفتاب کی دیکھ بھال بھی کر رہے تھے۔ اسے دوا ہضم نہیں ہو رہی تھی اور وہ کسی وقت قے بھی کر دیتا تھا۔ اس کی طرف سے دل بہت پریشان تھا۔ ابراہیم مسلسل اس کے سرہانے موجود رہتا تھا، وہ اٹھتا تھا تو میں بیٹھ جاتا تھا۔

اگلے روز ظہر کی نماز کے بعد میں نے شیخ حارث کے والد محترم سے ملاقات کی سعادت حاصل کی۔ اتنی عمر میں بھی ان کی قوتِ سماعت زبردست تھی اور بینائی بھی زیادہ کم نہیں ہوئی تھی۔ میں ان کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا۔ میرے پہلو میں حافظ احسان تھا۔ بزرگوار نے اپنی گھنی سفید بھوؤں کے نیچے سے مجھے بغور دیکھا۔ پھر اپنا دستِ شفقت میرے سر پر رکھا۔ میں صرف پانچ دس منٹ ان کے پاس بیٹھنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن میری خوش نصیبی کہ ان کے ساتھ میری ملاقات طویل ہوتی چلی گئی۔ یہ وہی اپنائیت تھی جو عام لوگ بھی مجھ سے محسوس کرنے لگتے تھے۔ بزرگوار نے مجھ سے کئی باتیں پوچھیں۔ میں نے ان کا جواب دیا اور حافظ احسان نے میرے جوابات کا عربی میں ترجمہ کر کے ان تک پہنچایا۔ ان کی اپنائیت دیکھ کر میرا دل بھر آیا تھا۔ میں نے انہیں اپنی داستانِ غم سنائی اور ان پراسرار حالات کا ذکر بھی کر دیا جو اب تک وقتاً فوقتاً پیش آتے رہے تھے۔

عصر کی نماز کے بعد بھی ہماری نشست جاری رہی۔ میں نے پوچھا۔ ''بزرگوار! کیا واقعی ہمارے اردگرد ایک ایسی دنیا موجود ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ جنات، روحیں، نوری اور ناری ہیولے؟''

میرا سوال احسان نے ان تک عربی میں پہنچایا، پھر ان کا جواب عربی میں لے کر اردو میں مجھے بتایا۔ بزرگوار نے کہا۔ ''بہت کچھ برحق ہے لیکن ابھی ہم اس کی اصل حقیقت نہیں جانتے۔ سائنس بے چاری کوشش کر رہی ہے لیکن ابھی وہ ان منزلوں سے بہت دور ہے، جب اس کائنات میں موجود ایک دوسری کائنات کے راز ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ ہم پر کھل سکیں، ہم خدا کی ان مخلوقات سے مل سکیں جو مختلف شکلوں میں ہمارے آس پاس موجود رہتی ہیں۔''

میں نے بزرگوار کو اس ہیولے کے بارے میں بتایا جو مجھے وقتاً فوقتاً نظر آتا تھا اور وہ ناقابلِ فہم الفاظ جو میرے کانوں میں گونجا کرتے تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان بزرگوار نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی جو کچھ عرصہ پہلے روضے کے درویش صفت بزرگ عالی مقام نے کہی تھی۔ بزرگوار کی شکن شکن پیشانی پر کچھ مزید شکنیں ابھریں اور انہوں نے احسان کی وساطت سے کہا۔ ''بیٹا، مجھے لگتا ہے کہ تمہارے آباؤاجداد دین سے جو رغبت رکھتے تھے، وہ تمہاری رغبت سے بہت زیادہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے، اس کا تعلق تمہارے دادا، پڑدادا...... یا پھر اس سے بھی اگلی کسی پیڑھی کے ساتھ ہو۔''

''کس قسم کا تعلق بزرگوار۔'' میں نے عاجز لہجے میں کہا۔ میری آنکھوں میں نمی تھی۔

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ ان کی کمر اتنی جھکی ہوئی تھی کہ ان کا سر گود میں نظر آتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہ ماضی میں جھانک لیتے ہیں۔ شاید وہ اب بھی یہی کوشش کر رہے تھے۔ کتنی ہی دیر بعد انہوں نے اپنا سر تھوڑا سا اٹھایا اور بولے۔ ''آگے کچھ نظر نہیں آ رہا ایک اندھیرا سا ہے۔ ایک جگہ پہنچ کر ایک دیوار سی سامنے آ جاتی ہے۔ بہرحال تم اس کی

تفصیل میں زیادہ نہ جاؤ۔ اللہ رب العزت کی طرف دھیان دو اور جتنا بھی ہو سکے گناہوں کی معافی مانگو۔''

''مم...... مجھے کوئی وظیفہ بتائیں یا حضرت...... جو میری مشکلوں کو آسان کرنے میں میری مدد کرے۔ میرے لیے واپسی کی کوئی امید پیدا ہو۔''

''اللہ کے ذکر اور نیک بندوں کی صحبت سے بڑھ کر کوئی وظیفہ نہیں......'' انہوں نے کہا اور پھر ذرا توقف کر کے بولے۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا بیٹا۔ اس ہیولے کے نظر آنے کو معمولی چیز نہ سمجھنا۔ یہ ہر وقت تمہارے آس پاس موجود ہے اور کسی وقت تمہاری جان بھی لے سکتا ہے۔ خاص طور سے جب یہ رات کو نظر آئے گا تو زیادہ خطرناک ہوگا۔''

میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ میرے اصرار پر بزرگوار نے مجھے ایک وظیفہ بھی بتایا اور کہا کہ میں عشا کے بعد کثرت سے اس کا ورد کروں...... اور یہ بھی کوشش کروں کہ اندھیرا پھیلنے کے بعد تنہا نہ رہوں۔

اگلے روز شام کے فوراً بعد آفتاب گل کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ جراح آیا تاہم اس نے بھی یہی کہا کہ سفر کرنے کے لیے مریض کی حالت کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ایک بڑے لیمپ کی روشنی میں ابراہیم اور میں مسلسل آفتاب کے سرہانے بیٹھے رہے اور وہ سب کچھ کرتے رہے جو ہمارے بس میں تھا۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کی حالت میں آفتاب کسی وقت بڑبڑانے لگتا تھا اور مکہ معظمہ کی باتیں کرتا تھا۔ شاید اسے لگتا تھا کہ وہ اپنی منزل یعنی خدا کے گھر پہنچ چکا ہے۔

کسی وقت اس کا رنگ انگارے کی طرح سرخ تھا لیکن اب یہ انگارہ راکھ بن چکا تھا۔ رات کے گیارہ بجے ہوں گے جب آفتاب گل ذرا ہوش میں آیا۔ اس نے اشارے سے مجھے کہا کہ میں اس کا سفری بیگ اس کے پاس لے کر آؤں۔ میں بیگ اس کے پاس لے گیا۔ بیگ تقریباً خالی تھا۔ اس میں جو بھی کوئی قابلِ استعمال چیز تھی، وہ لٹیرے نکال کر لے گئے تھے۔ اس بیگ کا پیندا لکڑی کا تھا۔ آفتاب نے پیندے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس پیندے کو دھیان سے دیکھوں۔

میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ اس پیندے کی دو پرتیں ہیں اور ان کے درمیان بھی شاید کچھ ہے۔ آفتاب کے کہنے پر ہم نے چاقو کی مدد سے پیندے کو کھولا تو اس میں سونے کے کچھ زیورات نظر آئے۔ اس کے علاوہ چند بڑے کرنسی نوٹ بھی تھے۔ ہم حیران رہ گئے۔ اگر لٹیرے یہ بیگ ہی اٹھا کر لے جاتے تو یقیناً فائدے میں رہتے۔ یہ کوئی دس ہزار پاکستانی روپیا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق زیورات کی مالیت بھی ایک لاکھ روپے سے کم نہیں تھی۔ یاد رہے کہ یہ 1973ء کی بات ہے۔ اس وقت کا ایک لاکھ آج کی بہت بڑی رقم ہے۔

آفتاب نے میرا اور ابراہیم کا ہاتھ ایک ساتھ پکڑا اور بہت نحیف آواز میں بولا۔ ''تم دونوں نے امارا بہت خدمت کیا۔ امارے سگے بیٹے یا بھائی بھی ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔ اپنی جان تک کا پروانہ کیا تم دونوں نے...... اب امارا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اب امارے پاس جو کچھ ہے، یہ ام تم دونوں کو دیتا ہے۔ یہ تم آدھا آدھا لے لینا اور بس کبھی کبھی پڑھ کر ام کو بخش دیا کرنا۔''

''نہیں آفتاب بھائی۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم تمہیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ تمہاری طبیعت ذرا بہتر ہوتی ہے تو ہم شیخ صاحب کے ٹرک میں بستر بچھا کر تمہیں بصرہ لے جائیں گے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا کہ اس نے بہت فاصلہ طے کر لیا ہے، اب وہ واپس آنا نہیں چاہتا۔

......اور وہ واقعی واپس نہیں آیا۔ قریباً دو گھنٹے بعد وہ مر گیا۔ اس کی سانس کی الجھی ہوئی ڈور ٹوٹ گئی۔ وہ دلیر تھا۔ اپنی پیاری بیٹی کی خاطر اس نے دو قتل کیے پھر ایک دوسری بیٹی کو بچانے کے لیے کمال رشید کی گولی سے جان لیوا طور پر زخمی ہوگیا۔ وہ اپنے گناہوں کی معافی حاصل کرنے کے لیے خانہ خدا جانا چاہتا تھا لیکن اس کی معافی شاید راستے میں ہی قبول ہو گئی تھی۔

شیخ حارث نے آفتاب گل کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ شیخ کے والد اور ملازمین نے بھی شرکت کی۔ ہم نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان اسے احاطے سے تھوڑی دور کھجوروں کے ایک جھنڈ کے نیچے دفن کر دیا۔ یہاں پہلے سے چار پانچ پرانی قبریں موجود تھیں۔

ایک دو روز بہت اداسی رہی۔ آفتاب گل کا سامان میرے پاس ہی تھا۔ میں نے ابراہیم سے کہا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھ لے مگر وہ بولا۔ ''نہیں سائیں! ابھی اسے پاس ہی رکھو۔''

ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ آفتاب گل مالی طور پر اتنا مضبوط شخص ہوگا اور جاتے جاتے وہ اپنا اثاثہ اس طرح ہم دونوں کو دے جائے گا۔ جس طرح لانچ کے دیگر مسافر اسے

چھوڑ کر نکل گئے تھے اگر ہم بھی نکل جاتے تو یقیناً آفتاب بہت تکلیف جھیل کر دنیا سے رخصت ہوتا۔ اب کم از کم یہ تو ہوا تھا کہ اسے ہمدردی، محبت اور مسلسل توجہ ملی تھی۔ اس کا آخری وقت نسبتاً آسان گزرا تھا۔

تیسرے روز ہمیں اس سامان میں سے کچھ واپس مل گیا جو صحرائی لٹیرے ہم سے چھین کر لے گئے تھے۔ اس میں میری کچھ نقدی بھی شامل تھی، بہرحال زیادہ تر اشیا ان کے پاس ہی رہ گئی تھیں۔ ان میں میری شادی کی انگوٹھی بھی تھی جس کا مجھے بہت افسوس تھا۔ معلوم ہوا کہ ان لٹیروں میں سے دو پکڑے گئے تھے۔

رات کو میں دیر تک جندل خاں اور آفتاب گل کی چھوڑی ہوئی اشیا دیکھتا رہا۔ خاص طور سے جندل خاں کی اشیا مجھے بہت دکھی کر دیتی تھیں۔ اس کی کنگھی، شیشہ، نسوار کی ڈبیا، کپڑے اور وہ دو تصویریں۔ ایک تصویر میں وہ اپنی پھول سی بچی کو گود میں اٹھائے کھڑا تھا۔ باقی بچے اس کے دائیں بائیں تھے۔ نہ جانے وہ کہاں تھے؟ کس حال میں تھے؟ میرے کانوں میں ایک گیت کے بول گونجنے لگے۔

سات سمندر پار سے۔ گڑیوں کے بازار سے
چھوٹی سی گڑیا لانا
گڑیا چاہے نہ لانا۔ پپا جلدی آ جانا

......لیکن اب پپا کو کبھی واپس نہیں جانا تھا۔ وہ سات سمندر پار ہی نہیں کر سکا تھا۔ اب کچھ نگاہوں کو ہر شام اس کے خط کا انتظار کرنا تھا مگر اب خط کو نہیں آنا تھا۔ نہ خط لکھنے والے کو خود آنا تھا۔ آہستہ آہستہ آسیں ٹوٹ جاتی تھیں، رو رو کر آنسو خشک ہو جانا تھے مگر زخمی دل تو کسی کے لیے دھڑکتے رہنے تھے، یہ جانے بغیر کہ ان کی خاطر پردیس کی خاک چھاننے والا خلیج فارس کے پانیوں میں گم ہو چکا ہے اور یہ کسی ایک جندل خاں کی کہانی تو نہیں تھی۔ پتا نہیں ایسے کتنے پردیسی اسی طرح اپنے بچوں کے ماتھے چوم کر انجانے دیسوں کی طرف جاتے ہیں اور ان کی خوشیوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے موت کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ کبھی ان کا سراغ نہیں ملتا۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں، جو مر جاتے ہیں ان کے لیے آخر قرار آ جاتا ہے لیکن جو کھو جاتے ہیں، وہ ہمیشہ تڑپاتے رہتے ہیں۔

کیا میرے گھر والے بھی اسی طرح ہمیشہ میرے لیے تڑپتے رہیں گے؟ میری ماں ہر صبح دروازہ کھول کر کھڑی رہے گی، میری دلہن ہر شام میرا انتظار کرتی رہے گی، میرے لیے ہر بدلتے موسم میں آہیں بھری جائیں گی، ہر تہوار پر آنسو بہائے جائیں گے؟ کیا اب میرے گھر کے در و دیوار کبھی مجھے دوبارہ نہیں دیکھ سکیں گے؟ دل سے ایک شدید ٹیس اٹھی۔ نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں ہر وہم اور خوف کے جال کو توڑ دوں گا۔ میں واپس جاؤں گا۔ جیسے بھی ہوا واپس جاؤں گا۔ مجھے جندل خاں نہیں بننا۔ مجھے اپنے گھر والوں کو ہمیشہ کا دکھ نہیں دینا۔ کل شیخ حارث نے بھی یہی بات کہی تھی۔ میری ساری روداد سننے کے بعد اس نے کہا تھا...... ہارون! تم نے اپنی دلہن کے ساتھ اور اپنے گھر والوں کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ یہاں رہو گے تو کسی دن کسی جگہ تم بھی جندل اور آفتاب کی طرح کھو جاؤ گے۔ جتنی جلدی ہو سکے اپنی واپسی کے بارے میں سوچو۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ بغداد میں ان کے ایک دو جاننے والے ہیں۔ وہ واپسی کے سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی سے اس مختصر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ صحرا کی خشک اور سنسان رات نے قرب و جوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ بس احاطے کی طرف سے کسی وقت کسی جانور کے بولنے کی آواز آتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں میں نے آئینے کے اندر اپنا چہرہ دیکھا۔ رنگ سانولا ہو چکا تھا، رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ سر کے بال جھاڑ جھنکار کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ کیا یہ وہی ہارون انور تھا...... وہی دُلہا تھا جو اپریل کی اس پراسرار رات کو خوشیوں اور روشنیوں سے بھرے ہوئے اس گھر کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا تھا۔

آئینے میں دیکھتے دیکھتے اچانک میں چونک گیا۔ میرے پیچھے کوئی کھڑا تھا۔ میں نے آنکھیں سکوڑ کر غور سے دیکھا اور سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ یہ وہی تھا...... یہ وہی تھا جس نے ہر موڑ پر مجھے اپنی خطرناک موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ میں بے ساختہ گھوما۔ اپنے عقب میں دیکھا۔ عقب خالی تھا۔ سفید مٹی کی دیوار تھی اور لکڑی کی ایک تپائی تھی جس پر اونٹ کی کھال کا نمدہ بچھا ہوا تھا۔ میں نے پھر آئینے میں دیکھا، وہ تپائی کے ساتھ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ میرے کانوں میں وہی لرزا دینے والی آواز گونجی۔ کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا نا...... اور ایسا نہیں ہوا۔

اس مرتبہ اس آواز میں قہر تھا اور ایک ناقابلِ بیان حرارت تھی۔ ان ساعتوں میں اچانک مجھے شیخ حارث کے والد محترم کی بات یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ رات کے اندھیرے میں میرے لیے اندیشے ہیں۔ خاص طور سے اس وقت جب میں تنہا ہوں اور اب اندھیرا تھا اور تنہائی بھی تھی۔ میں کمرے سے نکلنے کے لیے پلٹا لیکن مجھے لگا کہ

کسی نے مجھے پیچھے سے جکڑ لیا ہے۔ اس نے نہ صرف مجھے جکڑ لیا تھا بلکہ میرے منہ کو بھی مضبوطی سے ڈھانپ لیا تھا۔

میں چلانا چاہتا تھا لیکن چلا نہیں سکتا تھا۔ بھاگنا چاہتا تھا لیکن بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میرے پاؤں جیسے زمین میں گڑ چکے تھے۔ میں نے اپنا منہ کھولنا چاہا۔ مدد کے لیے پکارنا چاہا مگر ناکام رہا۔ مجھے لگا کہ مجھ پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے۔ مجھے جکڑنے والی قوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سانس سینے میں گھٹنے لگی۔ پسلیاں کڑکڑا اٹھیں۔ باڑے کی طرف بہت سی بھیڑیں زور زور سے بول رہی تھیں۔ حالانکہ پہلے ایسا نہیں ہوا تھا۔ مجھے لگا میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میرے پاؤں کے ساتھ لیمپ ٹکرایا اور گر گیا۔ گہرا اندھیرا چھا گیا۔

میں کچھ بھی بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کر رہا۔ نہ اس میں اپنے احساسات شامل کر رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ سب میرا وہم تھا، میرے اندر کا خوف تھا۔ نہ ہی یہ کہوں گا کہ وہ سفید پوش ہیولا واقعی اس کمرے میں موجود تھا اور مجھے عقب سے دبوچ چکا تھا۔ بس وہی کہہ رہا ہوں جو مجھ پر بیتا۔ مجھے نہیں پتا میں نے کس طرح دروازے کی کنڈی کھولی، کس طرح باہر نکلا اور کس طرح اس کمرے تک پہنچا جہاں ابراہیم اور حافظ احسان سو رہے تھے۔ میں نے اندھا دھند ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرے منہ سے اب بھی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کوئی اب بھی میرے پیچھے تھا اور مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کی سانسوں کی سرسراہٹ اور مشک و کافور کی بو میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ وہ مجھے اتنے زور سے دبا رہا تھا کہ سانس کی آمدورفت ختم ہو گئی تھی۔

پھر میں تیورا کر گر پڑا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر پھیلتی چلی گئی۔ میں نے جو آخری آواز سنی وہ دروازہ کھلنے کی تھی۔

دوبارہ جب ہوش آیا تو میں اسی کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ حافظ احسان میرے سرہانے کی طرف بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ابراہیم میرے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ میرا سارا جسم آگ میں جل رہا ہے۔ ابراہیم نے ایک دوبار کپڑے سے میری ناک صاف کی تو مجھے پتا چلا کہ میری ناک سے تھوڑا تھوڑا خون رس رہا ہے۔ ابراہیم بولا۔ ''خطرے کی بات نہیں سائیں۔ یہ نکسیر کی طرح کا خون ہے۔''

قریباً دو گھنٹے بعد میری طبیعت کچھ سنبھلی تو ابراہیم نے مجھ سے سوال جواب شروع کیے۔ دوسروں کی طرح اس کا خیال بھی یہی تھا کہ میں سوتے میں ڈر گیا ہوں اور کچھ زیادہ ہی ڈر گیا ہوں لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں جاگتے میں ڈرا ہوں اور جس چیز سے ڈرا ہوں، وہ ابھی نہیں بہت پہلے سے میرے پیچھے ہے۔

میں کوئی کمزور آدمی نہیں ہوں لیکن میرے دل میں ڈر بیٹھ چکا تھا۔ مجھے اب اس کمرے سے ہی خوف آنے لگا تھا۔ وہی آئینہ تھا، وہی تپائی، وہی سفید دیواریں۔ میں نے حافظ احسان سے کہا کہ میں اس کمرے میں رہنا نہیں چاہتا۔ اس نے جا کر شیخ سے بات کی۔ شیخ نے مجھے ساتھ والے کمرے میں بھیج دیا۔ میں نے ابراہیم سے بھی کہہ دیا کہ وہ میرے پاس سے ادھر ادھر نہ ہو۔ میں مسلسل بخار میں پھنک رہا تھا۔

ابراہیم مجھے مسلسل باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید میرے دل میں کچھ وہم بیٹھ گئے ہیں۔ میں خود کو بھی یہی سمجھانے اور یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس سے پہلے بھی یہی کرتا رہا تھا۔ فجر کی نماز میں نے وہیں کمرے میں ابراہیم کے ساتھ پڑھی۔ ٹانگوں میں سکت نہیں تھی، اس لیے بیٹھ کر پڑھی۔ سلام پھیرا تو اپنے کندھے پر سے مشک اور کافور کی خوشبو آئی۔ دل ایک بار پھر لرزنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے ابراہیم سے کہا۔ ''ذرا میرا یہ کندھا سونگھو۔''

اس نے دایاں کندھا سونگھا پھر بایاں...... کہنے لگا۔ ''ہارون سائیں! آپ کی قمیص سے خوشبو آ رہی ہے۔''

''کس چیز کی؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''شاید...... مشک کی...... کافور کی۔''

میں نے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیں۔ سر کے اندر جیسے دھماکے سے ہونے لگے۔ ''یا الٰہی! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں۔''

رات تک طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو میں پھر شیخ کے عمر رسیدہ والد محترم کے پاس چلا گیا اور ان کے سامنے اپنا سارا رونا رویا۔ انہوں نے ایک تعویذ میرے بازو سے باندھا اور پڑھنے کے لیے ایک دو مزید وظیفے بتائے۔ اس کے علاوہ ایک بار پھر ہدایت کی کہ میں کچھ عرصے کے لیے رات کے وقت اکیلا نہ رہوں۔ میرے کمرے میں کوئی نہ کوئی ہونا چاہیے۔ میری ناک سے رسنے والا خون بند کرنے کے لیے مجھے انہوں نے ایک سونگھنے والی دوا بھی دی۔ یہ کوئی قدیم عراقی نسخہ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اخراج خون بند کرنے والی یہ دوا ایران اور ہندوستان کے بادشاہ تک استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ واقعی تیر بہدف تھی۔

مجھے اب پورا پورا یقین ہو چکا تھا کہ میں بھی پاکستان واپس نہیں جا سکوں گا۔ جو کچھ دو دن پہلے میرے ساتھ ہوا وہ دل دہلا دینے والا تھا۔ مجھے بالکل یہی لگا تھا کہ میں

موت کے منہ میں سے واپس آیا ہوں۔ مشک اور کافور والی بات بھی بری طرح ذہن میں جم چکی تھی۔ اگر وہ سب کچھ خیال تھا تو یہ خوشبو کہاں سے آئی تھی؟ ایک بات یہ سوچی جاسکتی ہے کہ اس واقعے سے صرف ایک دن پہلے ہم آفتاب گل کو دفن کر کے آئے تھے...... اس کے کفن پر بھی خوشبو وغیرہ لگائی گئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وہی خوشبو ہو لیکن اگر یہ وہی خوشبو تھی تو پھر ایک دن پہلے کیوں نہ آئی؟ اور یہ میری پوری قمیص پر کس طرح پھیلی؟ اور ابراہیم، احسان وغیرہ نے بھی تو میت کو کندھا دیا تھا۔ ان کے لباس خوشبو سے کیسے محفوظ رہ گئے؟ اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ یہ وہ ''خوشبو'' ہی نہیں لگتی تھی۔

☆☆☆

قریباً پانچ روز بعد ہم نے اپنے مہربان میزبان اور ان کے والد گرامی کو خدا حافظ کہا اور ان کی ہی گاڑی پر بصرہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیپ ڈرائیور کے علاوہ دو مسلح محافظ ہمارے ساتھ تھے۔ شیخ حارث نے وقتِ رخصت ہمیں بہت سا سامانِ خورونوش دیا۔ اس میں ان کی بھیڑوں کا مکھن، مقامی طور پر تیار کی گئی مٹھائی اور کھجوریں وغیرہ شامل تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہمیں دو دو چادریں بھی دیں، جن میں سے ایک چادر ٹھنڈی اور دوسری گرم تھی۔ ہمارے کپڑے دھو کر صاف ستھرے کر دیے گئے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں گھر سے ایسے رخصت کیا جیسے کوئی اپنے قریبی عزیزوں کو کرتا ہے۔ وہ ہمیں کافی کچھ دے کر بھیج رہے تھے لیکن اس میں سے جو سب سے اہم چیز تھی وہ محترم بزرگوار کی دعائیں تھیں۔ وہی جھکی ہوئی کمر والا ایک سودس سالہ عرب...جس کی بوڑھی آنکھوں میں روحانی چمک تھی۔ بصرہ وہاں سے کم و بیش آٹھ میل دور تھا۔ ہماری جیپ گمنام صحرائی راستوں پر چلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ آفتاب گل اور اس کی قبر بہت پیچھے رہ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کی مٹی اسے پکارتی ہے۔ خیبر ایجنسی کے آزاد علاقے میں رہنے والے آفتاب کو کسی ویرانے کی مٹی نے پکارا تھا۔

ابراہیم اور میں خستہ حال جیپ کی درمیانی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ابراہیم کی آنکھیں حسبِ معمول سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ راتوں کو روتا رہتا ہے۔ اس کے رونے کی وجہ مجھ سے بڑھ کر اور کون جانتا تھا۔ وہ سرتاپا مہرو کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہچکولے کھاتی ہوئی جیپ میں وہ کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا لیکن اس نے اپنا ہاتھ مسلسل

ریگزین کی براؤن تھیلی پر رکھا ہوا تھا جو اس کی گود میں تھی۔ یہ تھیلی اس کے لیے ہر شے سے زیادہ قیمتی تھی۔ میں نے تجربے کے طور پر اس تھیلی کو اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکالنا چاہا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنی سوجی ہوئی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

اتنے میں عقب سے حافظ احسان کی آواز آئی۔ ''وہ دیکھو ہارون بھائی! سمندر نظر آرہا ہے۔''

واقعی بائیں جانب ٹیلوں کے پیچھے گاہے بگاہے سمندر کی جھلک نظر آتی تھی۔ سمندر دیکھ کر دل مزید آزردہ ہوگیا۔ اپنا وہ سفر یاد آگیا جو بڑی آسوں امیدوں کے ساتھ شروع ہو کر آہوں اور سسکیوں پر ختم ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر جندل خاں بھی یاد آگیا۔ پانی کی خاموش لہروں پر جیسے پھر ایک گیت گونجنے لگا۔ سات سمندر پار سے...... گڑیوں کے بازار سے...... چھوٹی سی گڑیا لانا......

مجھے یاد آیا۔ ڈوبتے ہوئے جندل خاں مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب تھا، جہاں میں نے اور بہت کچھ سیکھا تھا کاش تیرنا بھی سیکھا ہوتا۔

ہم سیدھا بصرہ کے بس اڈے پر پہنچے۔ وہی بوسیدہ شہر تھا، وہی دھول اڑاتی سڑکیں۔ شیخ حارث کے آدمیوں نے ہمارے ٹکٹ خود لیے اور بڑے احترام کے ساتھ ہمیں بس میں سوار کرایا۔ بس جب تک روانہ نہیں ہوگئی وہ وہیں کھڑے رہے۔ بس حرکت میں آئی تو انہوں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلائے اور آخر تک ہلاتے رہے۔

جو کچھ ہمارے ساتھ بیت چکا تھا، اس کے بعد روضے میں واپس جانے کی ہمت تو ہم میں نہیں تھی۔ بغداد پہنچ کر ہم ایک مسافر سرائے میں ٹھہر گئے۔ یہ جگہ عباسیہ کہلاتی تھی اور حضرت عبدالقادر کے روضے اور مسجد سے کافی دور تھی۔ میں بھرے پرے اور جانے پہچانے شہر بغداد میں آچکا تھا لیکن میرا خوف ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ خاص طور سے سورج غروب ہوتے ہی میری بے چینی میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ ایسے میں میری کوشش ہوتی تھی کہ ابراہیم یا حافظ احسان میں سے کوئی میرے ساتھ رہے۔ ان دنوں مجھے آئینے کے سامنے جاتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ لگتا تھا کہ میں جب بھی آئینے کے سامنے جاؤں گا، وہ سفید پوش میرے پیچھے آن کھڑا ہوگا۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میں کوئی بزدل یا کمزور شخص نہیں ہوں لیکن میرے اندر کی کیفیت کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ میں ہر وقت اپنے اردگرد ایک جان لیوا خطرہ محسوس کرتا تھا۔

بغداد پہنچنے کے تیسرے روز صبح سویرے ابراہیم مجھے بتائے بغیر کہیں نکل گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مہرو کے بارے میں سن گن لینے گیا ہے۔ میں شام تک سخت بے قرار رہا۔ شام کو ابراہیم واپس آیا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ مہرو کے بارے میں معلومات لے کر آیا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ مرجھایا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ نہ صرف مقررہ پروگرام کے مطابق مہرو کی منگنی ہوگئی ہے بلکہ شادی کا مہینا بھی طے ہوگیا ہے۔ اب نئے پروگرام کے مطابق اس کی شادی صرف پانچ ماہ بعد ہونا تھی۔

میں نے کہا۔ ”تم مجھے بتائے بغیر کیوں گئے؟“

اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ بولا۔ ”سائیں! مجھ سے رہا نہیں گیا۔“

میں نے غصے سے کہا۔ ”اگر جعفر کو پتا چل گیا تو وہ ہڈیاں توڑ کر تمہیں کوڑے کے کسی ڈھیر پر پھینک دے گا...... یا مار کر لاش غائب کرادے گا تمہاری۔“

”تو مار ڈالے۔ ایسے جینے سے تو مرنا چنگا ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ جعفر کے گھر کے سامنے ایک انڈین حجام کی دکان پر گیا تھا اور اس نے وہیں سے سن گن لی ہے۔ مجھے شدید خطرات کا احساس ہوا...... ابراہیم کسی بھی وقت بدترین صورتِ حال کا شکار ہوسکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا اور جلد سے جلد کرنا ہوگا۔

اس رات مسافر سرائے کی میلی سی چٹائی پر میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ میرے پاؤں کی طرف احسان اور دائیں طرف ابراہیم سو رہے تھے۔ اب میرے دل کے اندر سے یہ پراسرار گواہی آنا شروع ہوگئی تھی کہ میں مستقبل قریب میں پاکستان نہیں جاسکوں گا۔ میں جب بھی واپس جانے کا سوچوں گا، میرے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوجائے گا بلکہ اب تو ایسا ہوگیا تھا کہ پاکستان کا تصور ذہن میں آتے ہی میرا دم گھٹنے لگتا تھا اور مجھے اپنے اردگرد کافور کی بو پھیلتی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے سوچا میں نے اس روپے کا کیا کرنا ہے جو آفتاب گل مجھے اور ابراہیم کو آدھا آدھا سونپ گیا ہے۔ اگر میں اپنا حصہ بھی ابراہیم کو دے دوں تو شاید اس کے حالات کچھ بدل جائیں۔ ایک اندازے کے مطابق نقد اور زیور کی شکل میں میرا حصہ تقریباً ساٹھ ہزار روپے تھا۔ ان دنوں یہ ایک بڑی رقم تھی۔

میں جاگ رہا تھا اور مجھے پتا تھا کہ دکھ کا مارا ابراہیم بھی جاگ رہا ہے۔ میں نے اس کا شانہ ہلایا، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زیرو کے بلب کی مدھم روشنی میں ہم دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے اسے اپنا سارا پروگرام بتایا۔ اس پروگرام کے مطابق میں اپنے حصے سے دستبردار ہو رہا تھا۔ اس دستبرداری کے بعد ابراہیم قریباً ایک لاکھ دس پندرہ ہزار روپے کا اکلوتا مالک تھا۔ جن دنوں میں عطا صاحب کی ورکشاپ میں کام کر رہا تھا، مجھے پتا چلا تھا کہ بازار میں موٹر سائیکل کے اسپیئر پارٹس اور مرمت وغیرہ کی ایک دکان کی شدید ضرورت ہے۔ ٹیکنیکل کام میں اپنے تجربے کی بنیاد پر میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ بازار میں ایک ایسی دکان ہو تو فوراً چل پڑے گی۔ عطا صاحب کی ورکشاپ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک دکان پگڑی پر مل بھی رہی تھی۔ پگڑی ادا کر کے بھی ابراہیم کے پاس یقیناً اتنی رقم بچ جاتی کہ وہ دکان میں اسپیئر پارٹس رکھ لیتا...... اگر کسی طرح جعفر کو آمادہ کرلیا جاتا اور وہ ابراہیم کی سرپرستی اور کفالت پر آمادہ ہوجاتا تو یقیناً ابراہیم کی مالی حیثیت مہرو کے منگیتر زبیر سے کہیں بہتر ہوجاتی۔

ابراہیم نے پوری بات سنی، اس کے بعد اس نے وہی کہا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس نے کسی بھی صورت میرا حصہ لینے سے انکار کردیا۔ اسے آمادہ کرنے میں مجھے قریباً ایک گھنٹا لگا اور درجنوں دلائل دینا پڑے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اسے قرضِ حسنہ سمجھ لے اور جب وہ مالی طور پر مستحکم ہوجائے...... اور وہ ضرور ہوگا...... تو پھر مجھے رقم لوٹادے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ ابراہیم جا کر جعفر سے یہ ساری بات کس طرح کرے؟ اور کس طرح اسے بتائے کہ وہ اور مہرو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور اگر مہرو کی شادی زبیر سے ہوگئی تو یہ ایک جھوٹی زندگی کا آغاز ہوگا۔ ایک ایسی زندگی جس کی بنیاد صرف مجبوری اور سمجھوتے پر ہوگی۔

اس بارے میں میرے اور ابراہیم کے درمیان دیر تک گفتگو ہوئی۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ ابراہیم، خود جا کر جعفر سے یہ بات نہیں کرسکے گا اور اگر کرے گا بھی تو شاید اسے قائل نہ کرسکے۔ میں نے کچھ دیر سوچا پھر ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”ٹھیک ہے ابراہیم...... جعفر سے میں بات کروں گا۔“

”لیکن...... اگر سائیں! اس نے آپ سے کوئی

بدتمیزی کی تو......''

''نہیں ابراہیم! انشاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ میں کل روضے پر جاؤں...... اور وہاں سے چچا سیاف کو بھی ساتھ لے لوں۔ چچا سیاف کی موجودگی سے جعفر اور اس کی فیملی پر اثر پڑے گا۔''

اگلے روز ہم نے سب کچھ طے کرلیا۔ شام کے فوراً بعد میں چچا سیاف سے ملنے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے بازار سے خریدا ہوا عربی لباس پہن لیا تھا اور سر پر عربی رومال بھی رکھ لیا تھا۔ اس سے مجھے اپنی شناخت چھپانے میں کافی مدد ملی۔ عراق آنے کے بعد عربی لباس میں نے ایک دو مرتبہ پہلے بھی پہنا تھا۔ بذریعہ بس میں عشاء سے تھوڑی دیر پہلے روضے پر پہنچا۔ آنکھیں ایک بار پھر نم ہوگئیں...... سارے بھولے بسرے منظر نگاہوں کے سامنے آگئے۔ میں صحن میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ دل میں امید سی تھی کہ شاید کہیں حضرت عالی مقام کی نورانی صورت دکھائی دے جائے لیکن وہ کہیں نہیں تھے۔ میں چچا سیاف کے حجرے پر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ توقع کے مطابق چچا سیاف نے ہی دروازہ کھولا۔ ماتھے پر تیوری تھی۔

''کیا بات ہے؟'' چچا نے عربی میں پوچھا۔

پھر غور سے مجھے دیکھا اور حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ''اوئے پوتم؟'' آواز کانپ رہی تھی۔

بے چارگی سے میرے آنسو چھلک پڑے۔ میں چچا سیاف کے گلے لگ گیا اور سسکیوں سے رونے لگا۔

''تم...... کویت نہیں گئے؟'' چچا سیاف نے مجھے گلے سے لگائے لگائے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں چچا...... ہمارے ساتھ وہی کچھ ہوا، جس سے تم نے ڈرایا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے بس اپنی جانیں ہی بچا سکے ہیں۔''

میرے اندر آنے کے بعد چچا سیاف نے جلدی سے حجرے کا دروازہ بند کردیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور چچا سیاف چٹائی پر آمنے سامنے بیٹھے تھے اور میں اپنی دکھ بھری روداد بیان کررہا تھا۔ میں نے چچا سیاف کو بتایا کہ کس طرح ایک لڑکی کی مخبری پر ساحلی محافظوں نے لانچ کا پیچھا کیا۔ کس طرح فائرنگ کے تبادلے میں کمال نامی شخص ہلاک اور امین شدید زخمی ہوا اور کس طرح لانچ والوں نے راہِ فرار اختیار کرنے کے بعد ہمیں گہرے سمندر میں چھلانگیں لگانے پر مجبور کیا۔ ہم نے ان واقعات پر کافی دیر تک بات کی۔

اس روداد نے سیاف کو بھی غمزدہ کردیا۔ اس نے کہا کہ پہلے بھی اس طرح کے کچھ واقعات پیش آچکے ہیں لیکن ان کے پیچھے طاقتور ٹولہ ہے۔ انتظامیہ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد یہ لوگ پھر سرگرم ہوجاتے ہیں۔ کافی دیر ہم اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ میں نے ابوسیاف کو بتایا کہ ابراہیم بھی میری طرح جان بچانے میں کامیاب رہا ہے اور ہم دونوں عباسیہ کے ایک مسافر سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

ابراہیم کا ذکر شروع ہوا تو میں نے اس کی پوری کہانی چچا سیاف کو سنا ڈالی۔ اس کی غیر معمولی لگن اور اس کے غیر متزلزل عزم نے چچا سیاف کو بھی متاثر کیا۔ وہ یہ سن کر حیران ہوا کہ ابراہیم نے اپنے سینے اور بازوؤں کو جگہ جگہ سے مہرو کے نام کی مہر سے داغ رکھا ہے اور وہ اس کی خاطر اپنی جان کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے۔ میں نے سیاف کو جعفر کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا اور کہا کہ میں اس سے ابراہیم کے لیے مہرو کا رشتہ مانگنا چاہتا ہوں۔

''میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' چچا سیاف نے اپنی عربی نما اردو میں پوچھا۔

''چچا! میں بات کرنے کے لیے تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''

چچا سیاف تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑگیا۔ پھر بولا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن جیسا کہ تم نے بتایا ہے چودہ تاریخ کو لڑکی کی منگنی ہوگئی ہے۔ یہاں منگنی کی رسم کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ لڑکی کے گھر والوں کے لیے اپنی بات سے پھرنا کافی مشکل ہوجائے گا۔''

''لیکن یہاں دو زندگیوں کا سوال ہے چچا! میں سمجھتا ہوں کہ یہاں خاموشی گناہ ہے۔''

ہمارے درمیان تین چار منٹ تبادلہ خیال ہوا، آخر میں چچا سیاف کو رضامند کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ طے ہوا کہ ہم دونوں کل شام کو جعفر سے ملنے اس کے گھر جائیں گے۔

وہ رات کافی بے قراری میں گزری۔ خدا خدا کرکے شام ہوئی۔ ابراہیم کافی تناؤ میں نظر آتا تھا۔ مغرب کی نماز کے فوراً بعد میں چچا سیاف کی طرف روانہ ہوگیا۔ روضے سے چچا سیاف کو لینے کے بعد نو بجے کے قریب ہم دجلہ کنارے جعفر کے گھر پر پہنچ گئے۔ مجھے پتا تھا کہ جعفر کہیں بھی ہو، آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک گھر واپس آجاتا ہے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ دستک کے جواب میں تیرہ چودہ سالہ ملازمہ لڑکی نے دروازہ کھولا اور پھر ایک منٹ

بعد دراز قد جعفر ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ ''تم یہاں؟ خیریت تو ہے؟'' اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

''جی ہاں۔ آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔''

جعفر نے ایک نگاہ چچا ابوسیاف پر ڈالی اور کوئی سخت بات کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے بیٹھک نما کمرے کا دروازہ کھلوایا۔ ہم عربی طرز کے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ چچا سیاف نے عربی میں اپنا تعارف خود کرایا اور جعفر کو بتایا کہ وہ روضے شریف کے خاص خادموں میں سے ہیں۔

''جی، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' جعفر نے پوچھا۔

اب بولنے کی باری میری تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بات کا آغاز کیا۔ میں نے اسے ابراہیم کے بارے میں بتایا۔ جعفر ابراہیم کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا۔ جب وہ مہرو کو یہاں لانے کے لیے پاکستان گیا تھا اور نواب شاہ پہنچا تھا تو ابراہیم سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے بڑے محتاط لفظوں میں جعفر کو بتایا کہ ابراہیم اور مہرو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ابراہیم صرف مہرو کی خاطر نواب شاہ سے ہزاروں میل کا سفر کر کے یہاں بغداد پہنچا ہے۔

جعفر ان لوگوں میں سے تھا جن کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ جان کر کہ ابراہیم یہاں بغداد میں موجود ہے، اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔ بہرحال وہ بولا کچھ نہیں۔

اس نے میری پوری بات خاموشی سے سنی۔ بس ایک دو جگہ سوال کیا۔ آخر میں میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''میں جانتا ہوں جعفر بھائی! منگنی کے بعد آپ کے لیے یہ سب بہت مشکل ہو چکا ہے، اس کے باوجود میں کہوں گا کہ آپ بڑے پن کا ثبوت دیں۔ میں آپ کو اپنی اور چچا سیاف کی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ مہرو بہت خوش رہے گی۔ بہت خوشی والی زندگی گزارے گی۔''

جعفر نے عربی ملی اردو میں کہا۔ ''میں ابھی تک تمہاری بات پوری طرح سمجھ نہیں پایا۔ تم کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جعفر بھائی! ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کی خوشی اور ان کی بھلائی کی خاطر...... آپ مہرو کے لیے ابراہیم کا رشتہ قبول کرلیں۔''

جعفر خاموش رہا۔ اس کی نظریں میز پر جمی ہوئی تھیں جہاں کچھ دیر پہلے ملازمہ چائے کی پیالیاں اور کھجور کے بنے ہوئے بسکٹ رکھ گئی تھی۔

چند سیکنڈ بعد جعفر اٹھا اور اس نے ٹہلنے والے انداز میں کمرے کے اندر چند قدم اٹھائے۔ اس کی زخمی ٹانگ میں ابھی ہلکا سا لنگ باقی تھا۔ اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ نوعمر ملازمہ گھبرائی ہوئی اندر آئی۔ جعفر نے شکستہ اردو میں اس سے کہا۔ ''یہ چائے اور بسکٹ اٹھاؤ اور واپس لے جاؤ۔''

ملازمہ پہلے ٹھٹکی پھر آقا کے حکم کے مطابق ٹرے اٹھا کر واپس لے گئی۔ میں اور چچا سیاف دم بخود بیٹھے تھے۔ جعفر نے میری طرف انگلی اٹھائی اور سرد لہجے میں بولا۔ ''تمہارے ساتھ روضے کے معزز خادم ہیں، ورنہ میں آج یہ تمہاری پتلون ضرور گیلی کر دیتا...... چلے جاؤ یہاں سے...... فوراً چلے جاؤ۔'' آخری الفاظ اس نے گرج کر کہے تھے۔

لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھے پورے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ لگا کہ پورے جسم کا خون سر کو چڑھ رہا ہے۔ شاید میں کچھ کہتا یا جعفر کو پکارتا لیکن اسی دوران میں چچا سیاف نے مضبوطی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں، بس اب چپ رہو۔'' چچا نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آئے۔

بے عزتی کے شدید احساس سے میرے جسم کے ہر مسام نے پسینا اگل دیا تھا۔ مجھے خود سے زیادہ چچا سیاف کی توہین تکلیف دے رہی تھی۔ بہرحال چچا سیاف مجھے اپنے ساتھ لیتے چلے گئے۔ گلی میں مڑتے ہوئے میں نے ایک نظر جعفر کے گھر پر ڈالی۔ مجھے ایک کھڑکی میں مہرو کا چہرہ نظر آیا۔ جونہی میں نے دیکھا، چہرہ اوجھل ہو گیا۔ چاندی کی نتھ بھی اوجھل ہو گئی۔ کھڑکی بند ہو گئی۔ میں نے چہرے کی بس ایک جھلک ہی دیکھی تھی لیکن وہ جھلک یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ مہرو بے حد اداس اور غمزدہ ہے۔ اس نے کھڑکی بند کر دی تھی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ دیا ہو...... میرے لیے پریشانیاں نہ اٹھاؤ بابو سائیں...... اور اس (ابراہیم) سے بھی کہہ دو، مجھے بھول جائے۔ جو کچھ ہماری تقدیر میں نہیں ہے، وہ ہم کیسے حاصل کرسکتے ہیں۔

چچا سیاف کو روضے میں چھوڑ کر میں مسافر سرائے واپس پہنچا تو ابراہیم بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آس کے دیے جل رہے تھے۔ وہ میرے چہرے سے نتیجے کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے بھی کوشش کی کہ اس کو کچھ پتا نہ چلے اور اپنی کوشش میں

میں کسی حد تک کامیاب ہوا۔

''کیا بنا ہارون سائیں؟'' ابراہیم نے بڑی امید سے پوچھا۔

''بن جائے گا یار! ایسے کام آہستہ آہستہ ہی بنتے ہیں نا۔''

''جعفر نے کوئی سخت بات تو نہیں کی؟''

''نہیں بھئی! اچھے طریقے سے ملا ہے۔ پوری بات سن کر تھوڑا سا ''شاک'' تو اسے لگا...... لیکن...... سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے اس نے۔''

ابراہیم نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''ہارون سائیں! کہیں میرا دل رکھنے کے لیے تو نہیں کہہ رہے ہو؟''

''مجھے پتا ہوتا کہ تم اس طرح شک کرو گے تو ایک ٹیپ ریکارڈر ساتھ لے جاتا۔'' میں نے ذرا غصے سے کہا۔

وہ ایک دم میرے گھٹنے دبانے لگا۔ ''نہیں ہارون سائیں! آپ پر شک کیوں کروں گا۔ آپ تو میرے لیے وہ کر رہے ہیں، جس کا قرض میں ساری عمر نہیں اتار سکتا۔ آپ نہ ہوتے تو شاید میں اب تک کہیں مرکھپ گیا ہوتا۔'' اس کی سیاہ آنکھوں میں نمی آگئی۔

وہ مجھ سے تفصیل پوچھنے لگا کہ کیا باتیں ہوئیں؟ انہوں نے مجھے کیا کھلایا پلایا...... اور کس کس سے ملاقات ہوئی وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اسے مختصر جواب دیے اور سردرد کا بہانہ کرکے لیٹ گیا۔ رات کو میں دیر تک جاگتا رہا۔ رہ رہ کر مہرو کا خیال بھی آرہا تھا کہ کہیں آج ہونے والی گفتگو کی وجہ سے مہرو کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ ہوجائے۔ جعفر کا رویہ دل ودماغ میں چنگاریاں سی بکھیر رہا تھا۔ اس نے مجھے سرخ جھنڈی دکھائی تھی اور واضح کردیا تھا کہ میں اس سے آگے بڑھوں گا تو خطرناک زون شروع ہوجائے گا لیکن میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ اگر کرخت بغدادی تھا تو میں بھی کڑک لاہوری تھا اور پھر میں جس طرح کے حالات سے گزر رہا تھا، مجھے جینے مرنے کی زیادہ پروا ہی بھی نہیں تھی۔ دن بہ دن ایک عجیب طرح کی بے حسی مجھ پر طاری ہوتی جارہی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے جعفر کے گھر فون کیا۔ یہ فون نمبر مجھے عطا صاحب سے ملا تھا۔ کم عمر ملازمہ نے فون اٹھایا۔ وہ اردو جانتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تمہاری مالکن مہرو سے بات ہوسکتی ہے؟''

اس سے پہلے کہ ملازمہ کوئی جواب دیتی، فون پر جعفر کی گرج دار آواز ابھری۔ اس نے عربی میں پوچھا۔ ''من انتا؟'' (کون ہے)

میں نے دل کڑا کرکے کہا۔ ''جعفر بھائی! میں ہارون بول رہا ہوں۔''

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر جعفر پھنکارا۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ میرے گھر میں فون کرو۔''

میں نے کہا۔ ''جعفر بھائی! میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے یہ بات ہم دونوں کے لیے بہت فائدہ مند ہوگی اور یہ آخری بات ہوگی۔ میرا وعدہ ہے اس کے بعد میں آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔''

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر جعفر نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہ بات فون پر مناسب نہیں ہوگی جعفر بھائی! آپ کسی بھی جگہ کا بتادیں، میں وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ میں آپ کا زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا۔''

وہ پھر تھوڑی دیر خاموش رہا۔ شاید ضبط کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ''کب آنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جب بھی آپ کہیں۔''

ڈیڑھ دو منٹ کی گفتگو کے بعد ہم میں طے ہوگیا کہ ہم دو گھنٹے بعد سینٹرل چلڈرن پارک میں ملیں گے۔

مقررہ وقت پر میں اکیلا ہی مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ یہ خوب صورت پارک تھا۔ جھولے وغیرہ تھے۔ چھوٹی سی مصنوعی جھیل میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ چونکہ یہ ایک ورکنگ ڈے تھا اس لیے یہاں اِکا دُکا لوگ ہی نظر آتے تھے۔ میں جھیل کے قریب لکڑی کے ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ چار پانچ منٹ بعد ہی جعفر کی پرانے ماڈل کی ٹویوٹا بھی وہاں پہنچ گئی۔ وہ پینٹ کوٹ میں تھا۔ گاڑی سے نکلنے کے بعد اس نے مجھے دیکھ لیا اور سیدھا میری طرف آیا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے بس اپنی انگلیوں کی پوریں میرے ہاتھ سے چھُوئیں۔ ہم دونوں لکڑی کے بینچوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ گھڑی دیکھ کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''میں بھی زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ میں آپ سے مہرو کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''وہ میری چھوٹی بہن ہے۔ تم اپنی زبان سے اس کا نام لیتے ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ تم مجھے بتاؤ کیا خاص بات کہنا چاہتے ہو۔''

"یہ بات اسی بارے میں ہے جعفر بھائی۔ آپ میری بات حوصلے سے سنیں اور برا نہ مانیں۔ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"بکواس ہے یہ۔" جعفر گرجا۔ "میں نے رات کو بھی بات کی ہے اس سے۔ وہ ابراہیم کو بس ایک کزن سمجھتی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہے بس اسی خبیث کے ذہن کا فتور ہے۔"

میں نے ہمت کر کے کہا۔ "اس ساری بات میں یہی سچ ہے جعفر بھائی۔ وہ آپ سے بھی بہت پیار کرتی ہے۔ آپ کی ذرا سی ناراضی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیے وہ چپ ہے۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لے کر سب کچھ برداشت کر رہی ہے۔ وہ آپ کی بات مان لے گی اور اپنی ہر خواہش آپ پر قربان کر دے گی۔ مگر وہ زندگی بھر خوش نہیں رہ سکے گی۔ ابراہیم کو بھول نہیں سکے گی اور مجھے یقین ہے ابراہیم بھی یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ ضرور اپنے آپ کے ساتھ کچھ کر گزرے گا۔ وہ عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے جعفر بھائی۔"

"تم کسی ڈرامے یا فلم کی کہانی نہیں لکھ رہے ہو۔ یہ جیتی جاگتی زندگی ہے۔" جعفر پھنکارا۔ "بڑے دیکھے ہیں ایسے محبت کرنے والے اور مرنے والے...... اور میں تمہیں بتا دوں میں بہت سن چکا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں سنوں گا۔ بہتر ہے کہ اس بات کو اب یہیں ختم کر دو۔ ہمیشہ کے لیے۔"

جعفر شکستہ اردو کے ساتھ ساتھ عربی کے الفاظ بھی بول رہا تھا۔ میں اس کی کہی ہوئی باتوں کو اپنے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں۔

اس کے تیور خراب ہوتے جا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پینترا بدلا۔ میں نے دھیمے لب و لہجے میں کہا۔ "جعفر بھائی! جب میں آپ کے گھر میں اس رات رہا تھا، آپ نے مجھ سے ایک بات کہی تھی۔"

"کون سی بات؟"

"جب میں رخصت ہو رہا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ میں نے آپ پر احسان کیے ہیں اور آپ کسی کا احسان اپنے سر پر نہیں رکھتے۔ آپ نے کہا تھا کہ میں کچھ مانگنا چاہوں تو مانگ سکتا ہوں۔ جعفر بھائی! میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کبھی آپ پر کوئی احسان کیا ہے۔ میں تہ دل سے کہتا ہوں کہ وہ جو بھی تھا میرا اخلاقی فرض تھا۔ لیکن اگر آپ مجھ ناچیز پر کوئی مہربانی کر سکتے ہیں تو پلیز...... آج کر دیں۔ میں اپنے دوست کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ آپ اس کی زندگی بچا لیں۔" میری آواز بھرا گئی۔ میں نے جعفر کے دونوں گھٹنے پکڑ لیے۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ "پلیز جعفر بھائی! میں آپ کا یہ احسان مرتے دم تک نہیں بھولوں گا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ابراہیم بھی ہمیشہ آپ کی غلامی کرے گا۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے میرے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے پیچھے ہٹائے اور دھیمی آواز میں بولا۔ "مجھے پتا نہیں کہ تمہارے ہاں، زبان سے پھرنے والے شخص کو کیا کہتے ہیں، لیکن ہمارے قبیلے میں اسے سور کا پیشاب پینے والا کہا جاتا ہے۔ تم میرے ساتھ یہی گندی کوشش کر رہے ہو اور ساتھ پلیز پلیز بھی کہہ رہے ہو۔ تمہارے صدقے واری جانے کو دل چاہ رہا ہے۔"

میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہو گئی تھیں۔ اس نے تیزی سے میرا گریبان پکڑا اور زور سے جھنجوڑ کر زہریلی سرگوشی میں بولا۔ "اگر تم دونوں کتے کی موت مرنا نہیں چاہتے...... تو پھر دفع ہو جاؤ یہاں سے...... اور یہ بھی سن لو، میں اپنی بہن کا نکاح آج ہی کر رہا ہوں...... ابھی، تین گھنٹے کے اندر اندر...... اور اگر آج ظہر تک مجھے تم دونوں میں سے کوئی کمینہ دوبارہ اپنے اردگرد نظر آیا تو میں شوٹ کر دوں گا اسے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ "خدا کے لیے جعفر صاحب! ایسا نہ کریں۔ ان کی زندگیاں برباد ہو جائیں گی، وہ بے موت مر جائیں گے۔"

"دفع ہو جاؤ۔" وہ چنگھاڑا اور اس نے میرے منہ پر لات رسید کی۔ میں پیچھے کی طرف گر گیا۔ میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلنے لگا۔ چوٹ کھا کر دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ میں نے کہا۔ "جعفر صاحب! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔"

وہ ایک دم مزید بپھر گیا۔ "تو کیا کرو گے تم؟ کیا کرو گے؟ لڑو گے مجھ سے؟ تو ٹھیک ہے آؤ لڑو...... آؤ۔"

اس نے طیش کے عالم میں اپنا نیلا کوٹ اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔ آستینیں اڑس لیں اور کسی باکسر کی طرح میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا لمبوترا چہرہ دہک رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "میں آپ سے لڑنے کی جسارت نہیں کر سکتا لیکن میں آپ کو اس طرح جانے بھی نہیں دوں گا۔"

"تو پھر کیا کرو گے؟" وہ دہاڑا اور طیش کے ریلے

میں بہہ کر مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے دیوانہ وار مجھ پر ٹھوکریں اور مکے برسائے۔ جو چند افراد پارک میں موجود تھے، وہ دور دور کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک دیوار سے دے مارا۔ میرے اندر بھی ایک ضد نمودار ہوگئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے جتنا مرضی ماریں...... لیکن میں آپ کو یہ سب کرنے نہیں دوں گا۔''

''تیرا تو باپ بھی کرنے دے گا۔'' وہ پھر گرجا اور مجھے گھما کر دور گھاس پر پھینک دیا۔

اس کے بعد وہ پھر تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ اندر بیٹھ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ انجن اسٹارٹ کرتا، میں ایک بار پھر اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''نہیں جعفر صاحب! آپ ایسے نہیں جاسکتے...... یا پہلے مجھے ماردیں۔''

اس نے ایک بار پھر مجھے زور سے دھکا دیا اور گاڑی کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ میرا بازو دروازے کے اندر آگیا اور شدید چوٹ لگی لیکن میں نے اس کا بازو نہیں چھوڑا۔ اس نے ایک بار پھر وزنی دروازے کو زور سے بند کیا مگر ناکام رہا۔ کہنی سے نیچے میرا بازو چوٹ سے سنتا گیا۔ وحشت کے عالم میں اس نے بار بار دروازہ بند کیا اور میرے بازو کو شدید ضرب پہنچائی۔ آخر ناکام ہوکر وہ باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے گاڑی کا وزنی ''اسٹیئرنگ لاک'' بھی نکال لیا تھا اور اسے کسی ڈنڈے کی طرح پکڑا ہوا تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں اس نے اس آہنی راڈ کے ذریعے مجھے روئی کی طرح دھنک دیا۔ میرے ایک گھٹنے پر شدید چوٹ آئی۔ دو جگہ سے سر پھٹ گیا اور آنکھیں خون سے بھر گئیں...... میرے کانوں میں فاصلے سے کچھ آوازیں آرہی تھیں۔ یقیناً یہ وہ لوگ تھے جو دور سے یہ مار پیٹ دیکھ کر شور مچارہے تھے۔

میں بھی جعفر پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا لیکن میں نے نہیں اٹھایا۔ اس نے ملاقات کے شروع میں ہی مجھے مار پیٹ کا ڈراوا دیا تھا۔ اب میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں تک جاسکتا ہے...... اور وہ کافی دور تک گیا۔ میری آنکھوں میں خون جمع ہوگیا تھا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک مجھے زوردار دھکا لگا اور مجھے پتا چلا کہ میں پانی میں گر گیا ہوں۔ یہ بہت گہرا پانی تھا اور مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ یہ وہی مصنوعی جھیل تھی جس کے کنارے پر ہم بیٹھے تھے۔ مجھے لگا کہ میری کہانی ختم ہوگئی ہے...... میں نیم سرد پانی میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر جان بچانے کے فطری عمل کے تحت میں نے اندھادھند ہاتھ پاؤں چلائے...... لیکن ہر بار تو قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ میں نے سانس لی اور ڈھیروں پانی میرے پھیپھڑوں میں چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے تھوڑی سی روشنی نظر آئی۔ شاید میں مرنے سے پہلے آخری بار سطح پر ابھرا تھا۔ کسی لڑکی کی مدھم ''قیس قیس'' سنائی دی۔ دل میں امید جاگی کہ شاید کوئی مجھے تھام لے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں پھر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ سانس بند ہوچکی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ آخری وقت کیسا ہوتا ہے۔

☆☆☆

کیا میں مرچکا ہوں؟ کیا یہ دوسری دنیا تھی؟ میں کہاں تھا؟ میرے اردگرد کون لوگ تھے؟ میں نے بہت کوشش کرکے آنکھیں کھولیں۔ مجھے اپنے اردگرد متحرک سائے نظر آئے۔ نتھنوں میں کسی دوا کی تیز بو گھس گئی۔ میرا مثانہ پیشاب سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے لگا، میں بہت دیر تک...... بے ہوش رہا ہوں۔ میں نے ہمت کرکے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کسی لڑکی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا اور ملائمت سے بولی۔ ''نو...... نو...... پلیز۔''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پیشاب آرہا ہے۔''

اسی آواز نے کہا۔ ''یو کین ڈو اٹ ہیئر، یورین بیگ از اٹیچڈ ٹو یو۔''

مجھے پتا چلا کہ مجھے پیشاب کی نالی لگی ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے کچھ سکون محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ میرے ہونٹ سوجے ہوئے ہیں۔ میں نے ہونٹوں کو... بہ مشکل حرکت دی اور کہا۔ ''میں کہاں ہوں؟ جعفر کہاں ہے...... اور...... اور۔'' اچانک مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میرے سینے میں ایک شدید ٹیس اٹھی۔ جعفر نے کہا تھا کہ وہ دو تین گھنٹے کے اندر اندر مہرو کا نکاح کرنے کے لیے جارہا ہے۔ تو کیا وہ نکاح ہوچکا تھا؟ مہرو ہمیشہ کے لیے ابراہیم سے بچھڑ چکی تھی؟ میں تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ ایسا کرتے ہوئے میرے سینے میں معدے کے قریب شدید ٹیس اٹھی اور میں بے حال ہوگیا۔ گھنگرالے بالوں والے ایک عراقی ڈاکٹر نے مجھے جھڑکا اور ہاتھوں سے دوبارہ لیٹنے کا اشارہ کیا۔ نرس نے میرے کندھے تھام کر مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ میں نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ ''خدا کے لیے میری مدد کرو۔ مجھے ابراہیم سے ملاؤ...... یا ابوسیاف سے ملاؤ...... یہ بہت ضروری ہے۔ میں جلدی ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

نرس نے عربی میں کچھ کہا اور پھر مجھے تسلی دیتی ہوئی

باہر نکل گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی اسپتال کے کمرے میں ہوں اور میری بائیں ٹانگ پٹیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ دواؤں کی وجہ سے ذہن پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ سامنے کیلنڈر پر پانچ تاریخ نظر آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا میں قریباً 72 گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ وال کلاک پر دن کے دس بجے کا وقت نظر آرہا تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ معدے میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ دیر بعد کسی نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور ہولے سے کہا۔ ''کیسے ہو سائیں؟''

میں نے جلدی سے آنکھیں کھولیں۔ میرے سامنے ابراہیم کھڑا تھا۔ میں نے پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر ابراہیم نے مجھے لیٹے رہنے پر مجبور کردیا۔ ''نہیں سائیں! آپ کا آپریشن ہوا ہے۔ ٹانکے خراب ہوجائیں گے۔''

میں نے آپریشن والی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''مہرو کہاں ہے؟ اس کے بارے میں کچھ پتا چلا تمہیں؟'' میری آواز لرز رہی تھی۔

''وہ ٹھیک ہے سائیں! سب ٹھیک ہے۔ بس تم ٹھیک ہوجاؤ۔ اللہ سوہنے نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔'' ابراہیم کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''میں یہاں کیسے آیا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

جواب میں ابراہیم نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ جب مجھے جھیل سے نکالا گیا تو میں تقریباً مردہ تھا۔ میری سانس رک چکی تھی اور نبض بھی ختم ہوچکی تھی۔ ایمبولینس والوں نے میرے پیٹ سے پانی نکالنے کے بعد میرے سینے کو بجلی کے شاک دیے تو میرے دل میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی۔ مجھے فوراً قریبی اسپتال میں پہنچایا گیا۔ میرے جسم میں اندرونی اخراجِ خون بھی تھا۔ پتا چلا کہ کسی سخت ضرب کی وجہ سے معدے کے پیچھے جانے والی نالی زخمی ہوچکی ہے۔ اس کے علاوہ میرے گھٹنے میں بھی فریکچر تھا۔ مجھے فوراً آپریشن تھیٹر لے جایا گیا اور سینہ چاک کرکے متاثرہ نالی کا آپریشن کیا گیا۔ ڈاکٹر میری مسلسل بے ہوشی کی وجہ سے بھی پریشان تھے۔ اس بے ہوشی کا سبب ''پانی میں ڈوبنا'' اور دماغ کو آکسیجن کا نہ ملنا تھا۔ خدا خدا کرکے آج صبح کے وقت میری حالت بہتر ہونا شروع ہوئی تھی۔

میں ابراہیم سے مہرو اور جعفر کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن اسی دوران میں گھنگرالے بالوں والا سخت گیر ڈاکٹر کمرے میں واپس آگیا اور اس نے ابراہیم کو کمرے سے باہر نکال کر مجھے ہر طرح کی بات چیت سے منع کردیا۔

ابراہیم سے میری دوسری ملاقات رات آٹھ بجے کے قریب ہوئی۔ میری حالت قدرے بہتر ہوچکی تھی۔ بہر حال یہ سارا وقت میں نے سخت بے قراری میں گزارا تھا۔ ابراہیم کے ساتھ چچا سیاف بھی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں نے ابراہیم سے پھر پوچھا کہ مہرو کہاں اور کس حال میں ہے؟

وہ بولا۔ ''وہ ٹھیک ہے سائیں۔''

''ٹھیک تو ہے لیکن اس کا نکاح......؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوا سائیں......جعفر پولیس کی حراست میں ہے۔''

ابھی ہم بات ہی کررہے تھے کہ انتظامیہ کا ایک بندہ اندر آگیا۔ اس نے چچا سیاف اور ابراہیم کو باہر نکلنے کا کہا......اور مجھے بتایا کہ پولیس میرا بیان ریکارڈ کرنے کے لیے آئی ہے۔

چند منٹ بعد تین پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک لمبے قد کا تھا اور اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ دو کافی ہٹے کٹے تھے۔ ان دونوں کے درمیان جعفر تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور ایک رخسار پر چوٹ کا سرخ نشان نظر آرہا تھا۔ شاید یہ چوٹ گرفتاری کے وقت یا گرفتاری کے بعد اسے لگی تھی۔

عینک والا آفیسر میرے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ باقی افراد کھڑے رہے۔ آفیسر نے کہا۔ ''کیا میں انگریزی میں بات کرسکتا ہوں؟''

''کسی حد تک۔'' میں نے انگریزی میں جواب دیا۔

آفیسر نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور جعفر کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ ''مسٹر ہارون! کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''کیا یہی وہ شخص ہے جس نے تمہیں مارا اور پھر پانی میں پھینکا؟''

میں نے ایک نظر جعفر کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا اس کے ہاتھ لرز رہے ہیں۔ اس کا سر بدستور مجرمانہ انداز میں جھکا ہوا تھا۔ وہ سخت مصیبت میں لگتا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بیان کی بے انتہا اہمیت ہے۔ اگر میں نے حقیقت بتا دی تو شاید......وہ کئی برسوں کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ یہ آزمائش کی گھڑیاں تھیں اور پھر میں نے فیصلہ کرلیا۔

میں نے کہا۔ ''ہاں آفیسر! میرا جھگڑا انہی کے ساتھ ہوا تھا لیکن یہ ہمارا نجی معاملہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں میری بھی غلطی تھی۔ ویسے بھی یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ مجھے جان سے بھی مار دیں تو یہ ان کا حق بنتا ہے۔'' میری آواز بھرا گئی۔

جعفر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ آفیسر بھی حیران نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مسٹر ہارون! تم جانتے ہو، تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''جی ہاں، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں بہت شرمندگی بھی محسوس کر رہا ہوں کہ میری وجہ سے بات اتنی بڑھی کہ میرا اور بڑے بھائی کا تماشا بنا۔ بہرحال بات یہاں تک نہیں پہنچنی چاہیے تھی۔''

آفیسر بولا۔ ''تم کہتے ہو کہ یہ تمہارے بڑے بھائی کی طرح ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر تمہارا بڑا بھائی یہ بھی جانتا ہوگا کہ تم کو تیرنا نہیں آتا۔ اس نے تمہیں پانی میں پھینکا۔ یہ قتلِ عمد کا اقدام تھا۔''

''نہیں آفیسر! یہاں آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ہم میں لڑائی ضرور ہوئی لیکن پانی میں مجھے انہوں نے نہیں گرایا تھا۔ کنارے پر میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔ یہ واپس مڑ گئے۔ ان کو پتا نہیں تھا کہ پانی اتنا گہرا ہے۔ آپ جہاں بھی کہیں، میں یہ بیان دینے کو تیار ہوں۔''

جعفر کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔ آفیسر نے یکے بعد دیگرے مجھ سے کئی سوالات کیے لیکن میں جو فیصلہ کر چکا تھا، اس کے مطابق جواب دیے۔ آفیسر نے میرا بیان قلم بند کیا۔ مجھے تحریری بیان پڑھنے کے لیے کہا پھر اس پر میرے دستخط وغیرہ لیے۔ یہ ساری کارروائی ختم ہونے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ وہ لوگ جعفر سمیت واپس چلے گئے۔

رات گئے تک میں جاگتا رہا اور میری آنکھیں بار بار نم ہوتی رہیں۔ دل سے دعا نکلتی رہی۔ یا خدا! جعفر کا دل نرم کر دے۔ تو دلوں کو پھیرنے والا ہے تو پھیر سکتا ہے۔ ہم ناچیز بندے تو بس حقیر کوششیں ہی کر سکتے ہیں۔ سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہے۔

اگلے روز دوپہر کے بعد جب حافظ احسان میرے بستر کے قریب بیٹھا تھا، مجھے پتا چلا کہ جعفر مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر طیش آمیز سنجیدگی تھی۔ حافظ احسان باہر چلا گیا۔ جعفر میرے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ پھر بڑے طیش سے بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو؟''

''تم...... میں سمجھا نہیں جعفر بھائی؟''

''تم نے ٹھیکا لیا ہوا ہے کرم نوازیاں کرنے کا۔ تم کیا سمجھتے ہو تم احسان کرتے جاؤ گے اور میں لیتا جاؤں گا...... ؟ لیتا جاؤں گا؟ نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔''

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں نے تو آپ کو ایک بہت بڑی مشکل میں ڈالا ہے۔ آپ میری جان بھی لے لو تو شاید یہ آپ کا حق بنتا ہے۔''

''تم اسے مشکل کہہ رہے ہو۔ یہ عذاب ہے، بہت بڑا عذاب ہے میرے لیے۔'' اس نے اپنی کہنیاں اپنے گھٹنوں پر رکھیں اور ذرا آگے جھک کر اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسی طرح گم صم بیٹھا رہا۔ مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جانے کیوں پہلی بار مجھے یوں لگا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ یہ میری خوش فہمی تھی یا واقعی پتھر پگھل رہا تھا؟ دفعتاً وہ اٹھا اور میری طرف دیکھے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ ذہن میں کئی خدشے سر اٹھانے لگے۔ کہیں وہ پھر طیش کے منہ زور ریلے میں نہ بہہ جائے...... کہیں اس کا غصہ ابراہیم یا پھر مہر و کو نقصان نہ پہنچا دے۔

میں نے حافظ احسان کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ ابراہیم کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ غوث پاک کے روضے کے ساتھ والی مسجد میں جمعہ پڑھنے گیا ہے۔

میں نے شام تک بے چینی سے ابراہیم کا انتظار کیا لیکن وہ نہیں آیا۔ میں نے حافظ احسان سے کہا کہ وہ چچا سیاف کو فون کرے۔ اس نے فون کیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ ابراہیم نے عصر کی نماز مسجد میں پڑھی تھی۔ ابوسیاف کے ایک ساتھی نے بتایا کہ نماز کے بعد وہ ایک لمبے قد کے عراقی کے ساتھ کہیں چلا گیا۔

میرے دل کی دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔ قوی امکان تھا کہ وہ لمبے قد والا شخص جعفر ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں؟ میں نے سوچا کہ احسان سے کہوں، وہ جعفر کے گھر پر فون کرے...... لیکن اسی دوران میں ابراہیم آتا دکھائی دیا۔ میں نے فاصلے سے ہی دیکھ لیا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور جذباتی انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا، اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''کیا ہوا ابراہیم؟'' میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"ہم جیت گئے سائیں...... سب کچھ ٹھیک ہوگیا بلکہ...... میں تو کہوں گا، آپ جیت گئے۔ آپ نے سب کچھ ٹھیک کردیا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میرا دل یکبارگی دھڑک اٹھا تھا۔

وہ میرے ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگاتے ہوئے بولا۔ "سائیں! جعفر بھائی مان گئے۔ انہوں نے میرے اور مہرو کے رشتے کے لیے ہاں کہہ دی ہے۔ انہوں نے ہی مجھ کو بھیجا ہے کہ میں جاکر آپ کو بتاؤں۔"

میری آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو امڈ آئے۔ میں چند لمحے ابراہیم کی شکل دیکھتا رہا۔ میں نے اپنا سر سرہانے سے اٹھایا اور بیٹھے بیٹھے ابراہیم کو گلے سے لگالیا۔ آپریشن کی جگہ پر شدید ٹیسیں اٹھیں لیکن خوشی کی لہر اتنی شدید تھی کہ ان ٹیسوں کا پتا ہی نہیں چلا...... ہم کتنی ہی دیر ایک دوسرے کو گلے سے لگائے رہے، پھر ابراہیم نے بڑی احتیاط سے مجھے دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ اسی دوران میں دروازے پر حافظ احسان نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں عربی مٹھائی کا چھوٹا سا ڈبا تھا۔

☆☆☆

اگلے دس پندرہ روز میں کئی اہم کام ہوئے۔ میں نے اپنی مرضی سے خود کو کمرے سے وارڈ میں شفٹ کرالیا تھا۔ جعفر اور عطا صاحب کے تعاون سے ابراہیم، ورکشاپ والے بازار میں کرائے کی دکان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا...... اور میری توقع کے عین مطابق پہلے دوسرے دن سے ہی اس کی دکان چلنا بھی شروع ہوگئی۔ جعفر نے اس کے ویزے میں توسیع کے لیے ایمبیسی میں درخواست بھی جمع کرادی۔ اصل صورتِ حال جاننے کے بعد مہرو کے منگیتر نے دانش مندی کا مظاہرہ کیا اور خود ہی راستے سے ہٹ گیا۔ اس نے خوش دلی کے ساتھ جعفر کو خدا حافظ کہہ دیا۔ جعفر نے اسے کوفہ میں اپنے ایک واقف کار کے پاس بہتر ملازمت دلا دی۔ جس روز میں اسپتال سے فارغ ہوا اس سے تیسرے روز دریائے دجلہ کے کنارے کے علاقے میں جعفر کا دو منزلہ مکان روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ یہ مہرو اور ابراہیم کی شادی کی رات تھی۔ میرے لیے یہ بڑی خوشی کا موقع تھا۔ پروگرام کے مطابق مہرو کو فی الحال رخصت ہوکر اسی مکان کے نیچے والے پورشن میں رہنا تھا۔ شادی مقامی رسموں کے مطابق ہوئی۔ رخصتی کے وقت میں نے مہرو کے سر پر پیار دیا۔ وہ ایک دم رونے لگی اور میرے کندھے سے لگ گئی۔ "بابو سائیں! آپ نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوسکتا تھا۔"

اس نے سرگوشی کی۔

میں نے کہا۔ "لیکن تم نے پھر بھی میرے لیے کچھ نہیں کیا۔"

"جی؟"

"بھئی! ایک بریانی تک تو کھلائی نہیں تم نے۔"

وہ روتے روتے مسکرا دی۔ "میں آپ کو جرور کھلاؤں گی...... بلکہ ہر روج کچھ نہ کچھ پکا کے کھلاؤں گی۔"

وہ دونوں اپنے حجلۂ عروسی میں چلے گئے لیکن میں پتا نہیں کیوں اردگرد ہی گھومتا رہا۔ دل میں اداسی تھی اور انجانے اندیشے تھے۔ ایک رات مجھ پر بھی تو ایسی آئی تھی، ایک رات میرے گھر میں بھی تو شادیانے بجے تھے اور روشنیاں جگمگائی تھیں۔ میری دلہن سیج پر بیٹھی انتظار کرتی رہی تھی اور میں ہزاروں میل دور آگیا تھا...... شاید کبھی واپس نہ جانے کے لیے۔ پتا نہیں کیوں آج بھی دھڑکا سا تھا کہ کچھ ہو نہ جائے۔

اس رات میں بہت تھوڑی دیر کے لیے سویا۔ صبح ابراہیم کو خوش و خرم دیکھ کر تسلی ہوئی۔

جعفر کا گھر کافی کشادہ تھا۔ اس نے زیریں منزل پر ایک کمرا مجھے اور حافظ احسان کو رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم جب تک چاہیں یہاں رہ سکتے ہیں لیکن چوتھے پانچویں روز ہی میں نے جعفر اور عطا صاحب سے جانے کی اجازت مانگ لی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں روضے میں اپنے دوستوں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ جعفر اور عطا صاحب تیار نہیں تھے، عطا صاحب کی بیٹیاں بھی بڑی معصومیت کے ساتھ یہ زور دے رہی تھیں کہ میں ان کے گھر پر رہوں لیکن میں نے ان کو قائل کرلیا۔

روضے میں جانے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ حافظ احسان اب پاکستان واپس جارہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں کمرے میں تنہا رہنا نہیں چاہتا تھا۔ بس ایک انجانا سا خوف تھا جو کسی صورت دل سے نکلتا نہیں تھا۔ درحقیقت میں نے اسپتال میں کمرا چھوڑ کر وارڈ میں جانا بھی اس لیے پسند کیا تھا کہ میں شیخ حارث کے والد کی ہدایت کے مطابق رات کو اکیلا رہنا نہیں چاہتا تھا۔ میں پھر کہوں گا کہ میں کوئی کمزور دل شخص نہیں ہوں لیکن جو کچھ بار بار میرے ساتھ ہوچکا تھا اس کے بعد ایسی دلیری...... بے وقوفی کے زمرے میں ہی آتی تھی۔

میں اور حافظ احسان روضے میں واپس پہنچ گئے۔ سارے پرانے دوستوں نے خوش دلی سے میرا استقبال

کیا۔ ''پو واپس آ گیا۔'' کی کئی آوازیں سنائی دیں۔

روضے میں آنے کے بعد ایک چھوٹا سا اندیشہ ضرور دل میں موجود رہا اور وہ یہ کہ کہیں کمال رشید کے کسی ساتھی سے دوبارہ ملاقات نہ ہو جائے۔ بہرحال ایسا کچھ نہیں ہوا۔

چھ سات روز بعد جب حافظ احسان پاکستان واپس جانے کے لیے روانہ ہوا تو میں بہت اداس ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ وہ ایک ایسے دیس میں جا رہا ہے، جہاں میں اب کبھی قدم نہیں رکھ سکوں گا اور جب کبھی قدم رکھنے کا سوچوں گا نادیدہ حالات مجھے گھیر لیں گے۔

احسان کی فلائٹ رات دس بجے تھی۔ میں روضے کے احاطے میں سر کے نیچے تکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ احسان کو بغداد ائرپورٹ سے کراچی لے جانے والا جہاز مجھے یہاں سے نظر آئے گا اور وہ واقعی نظر آیا۔ بغداد کے تاریک آسمان پر ایک پُرگونج آواز کے ساتھ یہ طیارہ مشرق کی سمت بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے نیچے ایک روشنی بار بار چمک رہی تھی۔ وہ پاکستان جا رہا تھا۔ میرے بچھڑے ہوئے دیس میں، میری کھوئی ہوئی سرزمین کی طرف۔ میں اسے حسرت سے دیکھتا رہا۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے لیکن میں نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے اور اپنا دھیان کسی دوسری طرف لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے دل میں یہ خوف جاگزیں ہو چکا تھا کہ میں جب بھی اس رخ پر سوچوں گا، میرے اردگرد کچھ ہو جائے گا۔ کچھ ویسا ہی، جو شیخ حارث کے گھر میں ہوا تھا اور جس نے مجھے موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا۔

آنسو پونچھنے سے آنسو ختم تو نہیں ہو جاتے۔ یہ پانی تو جب امڈتا ہے، ہر رکاوٹ کو توڑ دیتا ہے۔ میں بھی منہ چھپا کر روتا رہا...... اور روتا رہا۔ ''یا اللہ میری مدد کر۔ میری خطائیں بخش دے۔'' میں بے بسی کے عالم میں بار بار یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔ اچانک میرے سرہانے کی طرف آہٹ ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ میرے سامنے حضرت عالی مقام کھڑے تھے۔ وہی، جن کو میں نے بغداد میں دیوانوں کی طرح ڈھونڈا تھا۔ جن کی تلاش میں دور دور گیا تھا۔ آج وہ بغیر میری کسی کوشش کے میرے سامنے موجود تھے۔ انہوں نے خاکی جبہ پہن رکھا تھا اور سلیٹی رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ چہرے سے نور پھوٹ رہا تھا۔ پتا نہیں، میرے دل میں کیا آئی، میں نے ایک دم ان کے پاؤں پکڑ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''یا حضرت! کہاں چلے گئے تھے آپ...... آپ نے کیوں مجھ سے منہ پھیر لیا...... کس غلطی کی سزا دی مجھ کو؟''

وہ بیٹھ گئے۔ میری پشت پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ میری بلند آواز سن کر ابوسیاف بھی حجرے سے نکل آیا۔ حضرت عالی مقام نے مجھے کندھوں سے تھاما اور اپنے پاؤں سے جدا کر کے مجھے اپنے سامنے بٹھایا۔ میرے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ حضرت عالی مقام نے اپنا بازو بڑھایا اور مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں ہچکیاں لینے لگا۔ انہوں نے کچھ کہا۔ چچا سیاف نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''حضرت پوچھ رہے ہیں، اپنے گھر جاؤ گے؟''

میں بلک پڑا۔ ''میں کیسے جا سکتا ہوں حضرت! وہ مجھے جانے نہیں دے گا۔ کبھی جانے نہیں دے گا۔''

چچا سیاف نے میری بات کا ترجمہ حضرت عالی مقام تک پہنچایا۔ چچا سیاف کے ذریعے میرے اور عالی مقام کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ اس طرح تھی۔

وہ بولے۔ ''کون جانے نہیں دے گا؟ تم جا سکتے ہو۔ تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ہاں بچے! تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ تم نے کفارہ ادا کر دیا ہے۔ تم نے بھوکے کو کھانا کھلا دیا ہے۔ کھلا دیا ہے نا۔'' وہ عجیب لہجے میں بول رہے تھے۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، حضرت عالی مقام۔ آپ...... کس بھوکے کی بات کر رہے ہیں؟''

''تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ اس کا نام ابراہیم ہے۔''

میرا سر چکرانے لگا۔ ''ابراہیم؟'' میں نے بھیگی آنکھوں میں حیرت لے کر عالی مقام کی طرف دیکھا۔ وہ دور خلا میں جیسے کسی نامعلوم چیز پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ بولے۔ ''وہ بھی ایک طرح کی بھوک ہی تھی نا۔ محبت کی بھوک...... کسی کو حاصل کرنے کی بے پناہ طلب۔ اس طلب کی وجہ سے وہ جیتے جی مر رہا تھا۔ قبر میں جا رہا تھا۔ تم نے اس کا تقاضا پورا کر دیا۔ اسے اس کی چاہت سے ملا دیا، اس کا عشق کامل کر دیا۔ تم نے کفارہ ادا کر دیا۔ بس یہی تھا تمہارے ذمے...... اور تم اس ذمے داری سے سبکدوش ہوئے......''

''میری عقل آپ کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہے عالی مقام۔'' میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

وہ بہ دستور کھوئے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''بہت سی باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں لیکن وہ ہوتی ہیں۔ ان باتوں کی، ان واقعات کی ایک ترتیب ہوتی ہے۔ ان کو ویسے ویسے ہونا ہوتا ہے جیسے جیسے لوحِ محفوظ میں لکھا گیا ہوتا

ہے۔ اناج کہیں اگتا ہے...... مسافر کہیں سے چلتا ہے، روٹی کہیں پکتی ہے...... اور لقمہ مقررہ وقت پر منہ میں پہنچ جاتا ہے۔ تم کہیں تھے، وہ لڑکی کہیں تھی، ابراہیم کہیں تھا لیکن تم تینوں نے ایک کہانی کو تکمیل دینا تھا اور تمہاری قربانی اور ہمت سے وہ کہانی مکمل ہوگئی ہے۔''

انہوں نے شاباش دینے والے انداز میں ایک بار پھر میری کمر پر ہاتھ پھیرا۔ مجھے لگا جیسے میں جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ حضرت عالی مقام نے شفیق لہجے میں کہا۔ ''میں نے سنا ہے تم نے پاکستان میں اپنے گھر والوں کو ایک خط لکھا تھا اور پھر پھاڑ دیا تھا۔''

''جی حضرت۔'' میں نے کانپتی آواز میں اقرار کیا (میرا سر چکرا رہا تھا)

وہ بولے۔ ''وہ خط دوبارہ لکھو اور اگر چاہو تو ابھی لکھو۔''

انہوں نے چچا سیاف کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے حجرے میں گیا اور ایک کاغذ قلم لے آیا۔ عالی مقام نے کاغذ قلم میرے ہاتھ میں تھمایا اور کہا کہ لکھو۔ میرے ہاتھ لرزنے لگے۔ مجھے کافور کی بو آئی۔ مجھے لگا، ابھی کہیں سے وہ ہیولا نمودار ہونے والا ہے۔ عالی مقام نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا اور تسلی بخش انداز میں کہا۔ ''لکھو، اطمینان سے لکھو...... میں یہیں تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔''

میرے اندر عجیب سا حوصلہ پیدا ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد میں کاغذ پر سر جھکائے، کانپتے ہاتھوں سے لکھ رہا تھا۔ مجھ سے چندفٹ کے فاصلے پر عالی مقام تسبیح پکڑے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میری نگاہوں کے سامنے میرے سب پیاروں کی صورتیں آگئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ لفظوں کے ذریعے ان سے لپٹ رہا ہوں۔ ان کو اپنے دکھڑے سنا رہا ہوں۔ میں نے یہ خط اس بار اپنے عزیز ترین دوست شیخ تنویر کے نام لکھا۔ یہ خط کیا تھا، بس آنسوؤں کا ایک دریا تھا۔ میں نے تنویر کو لکھا کہ میں نہیں جانتا کہ میرے بعد وہاں لاہور میں کیا ہوا ہے لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہاں ایک بڑی قیامت گزری ہے۔ اس قیامت کی ہولناکی اور تپش میں یہاں تک محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے اس خط میں تنویر پر انکشاف کیا کہ میں یہاں لاہور اور پاکستان سے ہزاروں میل دور بغداد میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے پر موجود ہوں اور تقریباً ملنگ کی شکل اختیار کر چکا ہوں۔ میں نے ان دردناک حالات کی بھی تھوڑی سی تصویر کھینچی جو مجھے یہاں پیش آئے تھے۔ آخر میں، میں نے لکھا...... میں شرمندگیوں اور ندامتوں کے سمندر میں ڈوبا

ہوا ہوں تنویر۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنے گھر والوں کا سامنا کرسکوں۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا۔ اب جو کرنا ہے تم نے کرنا ہے۔

خط لکھنے کے بعد اسے پوسٹ کرنے کا مرحلہ تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے پھر وہی نقشہ گھوم گیا جب مجھے پوسٹ آفس کے دروازے کے سامنے سے واپس آنا پڑا تھا اور خوف کے سبب میں دو دن تیز بخار میں مبتلا رہا تھا۔

عالی مقام نے جیسے میرے چہرے سے میرے خیالات پڑھ لیے۔ انہوں نے ابوسیاف سے کچھ کہا۔ ابوسیاف نے ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''حضرت کہہ رہے ہیں۔ کل جب خط پوسٹ کرنا ہوگا تو وہ تمہارے ساتھ جائیں گے۔''

یہ بات سن کر میرے سینے میں اطمینان کی ایک بلند لہر دوڑ گئی۔

اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ میں مرکزی پوسٹ آفس پہنچا۔ عالی مقام میرے ساتھ تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک ایسے مضبوط حفاظتی حصار میں ہوں جس سے ٹکرا کر دنیا کی ہر مصیبت چکنا چور ہوسکتی ہے...... دروازے کے سامنے پہنچ کر میں نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ آج وہاں کوئی نہیں تھا۔ اردگرد بھی کوئی نہیں تھا۔ کوئی دل دہلا دینے والی سرگوشی بھی نہیں تھی۔ کافور اور مشک کی بو بھی نہیں تھی۔ آج کچھ نہیں تھا۔ بس عالی مقام تھے اور ان کے چہرے سے پھوٹتی ہوئی روشنی تھی۔

میں خط پوسٹ کر کے واپس روضے پر پہنچا تو مجھے یوں لگا جیسے ایک بہت بڑا پہاڑ میرے کندھوں پر سے ہٹ گیا ہے۔ میں نے خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اب میری ساری سوچیں اس خط کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے تصور کی نگاہ سے اس خط کو سفر کرتے دیکھا۔ وہ بحرہند کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا، ریگستانوں اور پہاڑوں کو پھلانگتا ہوا پاکستان پہنچا اور پھر زندہ دلوں کے شہر لاہور پہنچ گیا۔ میں نے تصور کی نظر سے دیکھا...... میرا خط اچھرہ کی سردار مارکیٹ میں شیخ تنویر کی دکان پر ہے۔ وہ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ میرا خط کھول رہا ہے، پڑھ رہا ہے...... پھر وہ میرے گھر کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہیں۔ وہ میرے گھر والوں کو میرے خط کے بارے میں بتاتا ہے، وہاں ایک تہلکہ سا مچ جاتا ہے۔ خط کو دل کی آنکھوں سے پڑھا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے سے چھینا جا رہا ہے (بعدازاں ثابت ہوا کہ خط پہنچنے کے بعد لاہور میں وہی

کچھ ہوا جس کا میں نے تصور کیا تھا)

☆☆☆

خط پوسٹ ہوئے سات روز ہو چکے تھے۔ اب مجھے خط کے ردعمل کا انتظار تھا اور یہ بڑا کٹھن انتظار تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ ردعمل کیا ہوا ہوگا بلکہ یہ خبر بھی نہیں تھی کہ خط منزل پر پہنچ سکا ہے یا نہیں۔

ہاں...... ان چار پانچ دنوں میں یہ بات ضرور ہوئی کہ میرے اندر کا خوف بتدریج ختم ہو گیا تھا۔ اندھیرا پھیلتے ہی جس طرح بے چینی مجھے گھیرتی تھی اور تنہائی جس طرح مجھے ہراساں کرتی تھی، وہ سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ عالی مقام آج کل روضے میں ہی تھے اور ان کی نورانی صورت گاہے بگاہے میری ڈھارس بندھاتی تھی۔ انہوں نے کتنے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ کے فضل وکرم سے بلاٹل چکی ہے...... اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ کفارہ ادا ہو چکا ہے۔

ان کی کچھ باتیں میری سمجھ میں آتی تھیں، کچھ نہیں آتی تھیں لیکن ان کی ساری باتوں میں ایک خاص قسم کی روحانی مضبوطی ضرور ہوتی تھی اور شاید ان کی باتیں حقیقت کے عین مطابق بھی تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ انہوں نے کہا تھا ہر مصیبت کے ٹلنے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ بندہ اپنے رب سے اپنا رشتہ مضبوط رکھے اور انتظار کرے۔

میرے گھٹنے کی چوٹ اب ٹھیک تھی لیکن آپریشن والی جگہ پر اب بھی کبھی کبھی درد ہوتا تھا۔ جسم کی دیگر چوٹیں بھی دھیرے دھیرے ٹھیک ہو رہی تھیں۔ ابراہیم ایک بار روضے میں آکر مجھ سے مل چکا تھا۔ ایک دن وہ پھر آ گیا۔ وہ اچھے لباس میں تھا۔ چہرے پر خوشی کی چمک تھی۔ وہ پہلے بھی نماز روزے کا پابند تھا لیکن اب کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ اس نے چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھ لی تھی جو اسے اچھی لگتی تھی۔ اس نے بتایا کہ جعفر بھائی اس پر بہت مہربان ہیں اور وہ سوچ رہا ہے کہ وہ کچھ عرصے تک اپنی والدہ کو بھی پاکستان سے یہاں بلالے۔ اس کا کام بغیر کسی انتظار کے چل نکلا تھا۔ وہ میرے لیے کافی سارا پھل لے کر آیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''سائیں! مہرو آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ جعفر بھائی بھی کہہ رہے تھے کہ جس طرح بھی ہو سکے، میں آپ کو گھر لے کر آؤں۔ زیادہ نہیں تو ایک رات تو ہمارے پاس رہیں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میری چھوٹی بہن سے کہنا میں جمعے کے دن آؤں گا...... وہ میرے لیے بریانی پکا کر رکھے۔''

''سائیں! جمعہ تو بہت دور ہے۔ آپ کل کا رکھ لیں۔ کل بھی تو چھٹی ہے۔''

تھوڑی سی تکرار کے بعد اس نے مجھے تیسرے دن آنے پر آمادہ کر لیا۔ مہرو کو حاصل کرنے کے بعد وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ جو پھل لایا تھا وہ ہم سب نے مل کر کھایا۔

عشا کی نماز کے بعد میں دیر تک دعا مانگتا رہا۔ جندل خاں اور آفتاب گل کی بخشش کی دعا مانگی۔ اپنے لیے بھی التجائیں کیں۔ پھر وہیں احاطے میں مصلے پر لیٹے لیٹے سو گیا۔

کسی نے مجھے ہلا کر جگایا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی میں بڑے بھائی جان اسلم میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ غنودگی کی حالت میں مجھے بالکل یہی لگا کہ یہ میرا وہم ہے لیکن جب ''ہارون'' کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی چھٹنے لگی۔ بھائی جان میرے سامنے کھڑے تھے۔ یہ وہم نہیں تھا، نہ ہی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ وہ میرے سامنے تھے اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں تڑپ کر اٹھا۔ انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ میں ان سے چمٹ گیا...... اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ بھی رونے لگے۔ ہماری آوازیں سن کر اردگرد موجود لوگ جاگ گئے۔ آنکھیں ملتے ہوئے ہمارے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ پتا نہیں میں نے کیا، کیا کہا اور بھائی جان نے کیا، کیا سنا۔ مجھے بس اتنا پتا ہے کہ انہوں نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا اور میری کمر پر ہاتھ پھیرے چلے جا رہے تھے۔ ہمارے ملاپ کا وہ منظر دیدنی تھا اور بہت رقت آمیز بھی۔ روضے کے کسی انڈین خادم کی اڑتی اڑتی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''ہارون کے وارث آ گئے۔''

کچھ ہی دیر بعد چچا ابوسیاف بھی موقع پر پہنچ گئے۔ سفر اور تھکن کے سبب بھائی کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ میں ان سے بہت کچھ جاننا چاہتا تھا اور وہ بھی مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن ابھی ہم دونوں کے لیے یہی کافی تھا کہ میں خیریت سے تھا اور میرے گھر میں بھی خیریت ہی تھی۔ یہ رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ چچا سیاف نے کھانے کا پوچھا لیکن بھائی کو بھوک نہیں تھی یا شاید مجھے دیکھ کر ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے قہوے اور خشک میووں سے تواضع کی۔ پھر ہم دونوں بھائی نم آنکھوں کے ساتھ باہر احاطے میں آ بیٹھے اور باتیں کرنے لگے...... میرے گھر والوں کو صرف چار دن

پہلے میرا خط ملا تھا۔ بھائی جان نے اسی وقت ارجنٹ پاسپورٹ بنوایا اور کل سہ پہر چار بجے کی فلائٹ بغداد کے لیے پکڑلی۔ وہ رات قریباً ایک بجے بغداد ائرپورٹ پر اترے تھے۔ وہ اکیلے تھے، انجان لوگ تھے۔ انجان زبان تھی۔ سیکیورٹی کا ماحول بڑا سخت تھا۔ ایک نیک دل پاکستانی نے ان کی پریشانی دیکھ کر ان کی مدد کی تھی اور یوں وہ بذریعہ ٹیکسی روضے پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

ہم نے پُرنم آنکھوں کے ساتھ بہت باتیں کیں لیکن بھائی کی مہربانی کہ انہوں نے مجھ سے وہ سوال نہیں پوچھے جن کے جواب میں دینا نہیں چاہتا تھا اور ان میں سے سب سے اہم سوال یہی تھا کہ میں اپنی سہاگ رات میں سب کو روتا چھوڑ کر اچانک غائب کیوں ہوگیا تھا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا اور اگر میں جواب دیتا بھی تو کوئی یقین نہ کرتا۔

اگلے روز صبح سویرے ہم نے قریبی بازار سے ناشتا کیا اور واپسی کے پروگرام پر بات کی...... میں اس سے آگے کی باتوں کو تفصیل سے لکھوں گا تو یہ روداد بہت طویل ہوجائے گی...... مختصر یہ کہ ہم دونوں اس روز روضے سے رخصت ہوکر ایک اچھے ہوٹل میں پہنچ گئے۔ وقتِ رخصت روضے کے بہت سے خادموں نے مجھے بھیگی آنکھوں کے ساتھ الوداع کہا اور دعائیں دیں۔ چچا سیاف نے بہت دیر تک مجھے گلے لگائے رکھا۔ میں حضرت عالی مقام کی قدم بوسی کرنا چاہتا تھا لیکن میرے راستے آسان کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر کہیں اوجھل ہوچکے تھے لیکن وہ کہیں بھی ہوتے' میرے دل میں تھے۔ ان کی باتیں میرے سینے کو روشن کررہی تھیں۔ میرے پاس تھوڑی سی رقم تھی جو میں نے برے بھلے وقت کے لیے بچا کر رکھی ہوئی تھی، وہ میں نے روضے کے تین غریب خادموں میں بانٹ دی۔ یہ کوئی پچاس کے قریب عراقی دینار تھے۔ میں نے اس مقام پر بہت سخت دن بھی گزارے تھے لیکن جب میں بھائی کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوا تو مسجد اور روضے کے در و دیوار کو دیکھ کر دل بھر آیا۔

میرے پاکستان روانہ ہونے میں ایک دو قانونی الجھنیں تھیں لیکن اسی نیک دل پاکستانی نے ایک بار پھر ہماری مدد کی جو ائرپورٹ پر بھائی جان کا واقف بنا تھا۔ سیکیورٹی اور نگرانی کافی سخت تھی۔ صرف چند دن پہلے اسلام آباد ائرپورٹ پر عراقی سفارت خانے کے سامان میں سے کچھ اسلحہ برآمد ہوا تھا جس کی وجہ سے سفارتی سرگرمیاں متاثر ہوئی تھیں اور دونوں طرف ذرا کشیدگی کا ماحول تھا۔ بھائی نے ہوٹل سے ہی اپنے اس پاکستانی مددگار کو فون کیا اور اس سے کافی دیر تک باتیں کیں۔ اس نے تسلی دی کہ پریشانی کی بات نہیں وہ صبح تک سب ٹھیک کرلے گا۔ یہ شخص ائرپورٹ کا ہی ملازم تھا۔

وہ رات ہم نے اس آرام دہ ہوٹل میں گزاری۔ بھائی جان ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے جدا نہیں ہوئے۔ انہیں جیسے یہ اندیشہ تھا کہ میں پھر کہیں ان کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوجاؤں۔ مجھے ان کی حالت پر ترس آرہا تھا اور انہیں یقیناً میری حالت پر آرہا ہوگا۔ اگلے روز ہم دونوں نے تھوڑی دیر بغداد کی سیر بھی کی۔ سیر کیا ہونا تھی، ہر وقت یہی دھڑکا لگا تھا کہ ائرپورٹ سے کیسے گزریں گے۔ آئندہ چوبیس گھنٹے میں کیا میں واقعی پاکستان پہنچنے والا تھا؟ اپنے گھر والوں کو اور اپنی بیوی کو دیکھنے والا تھا؟ یہ سوال بار بار ذہن میں ابھر رہا تھا۔ ہم ایک پاکستانی کی دکان کے قریب سے گزرے تو وہاں ٹیپ ریکارڈر پر ایک کافی کے بول گونج رہے تھے۔ آواز بھی ریشماں جیسی کسی لوک گلوکارہ ہی کی تھی۔ بول کچھ اس طرح تھے کہ اے خدا میں اپنے وعدوں کا پاس نہ رکھ سکا، اب شرم کے سمندر میں غرق ہوں......

بقول عالی مقام میری کہانی بھی تو ایک وعدے کی خلاف ورزی کی کہانی ہی تھی۔ وہ وعدہ جو میرے آباؤ اجداد میں سے کسی نے کیا اور اسے نبھایا مگر مجھ تک پہنچتے پہنچتے اس وعدے کی اہمیت بہت کم ہوگئی اور نتیجے میں مجھے ایک سزا بھگتنا پڑی، میں دیر تک اس کافی کے بولوں میں گم رہا۔

ائرپورٹ پر ہونے والی کاغذی کارروائی کے دوران میں میرا دل بری طرح دھڑکتا رہا۔ کسی بھی وقت کوئی پریشانی سامنے آسکتی تھی۔ مجھ میں اب اور تکلیف جھیلنے کی ہمت نہیں تھی۔ بھائی جان بھی سخت تناؤ میں تھے۔ خدا خدا کرکے وہ گھڑی آئی جب ہم بورڈنگ کارڈز لے کر ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچے۔ ہم نے عشا کی نماز پڑھی۔ میں نے رو رو کر خدا کا شکر ادا کیا جس نے بالآخر میری مشکلیں آسان کی تھیں۔ ہمارا جہاز فضاؤں میں بلند ہوا تو نیچے روشنیوں کا سمندر نظر آیا۔ یہ بغداد تھا۔ میری نشست کھڑکی کی طرف تھی۔ میں نے نیچے دیکھنا شروع کیا۔ مجھے دریائے دجلہ اور اس میں رواں کشتیوں کی روشنیاں نظر آئیں۔ اس دجلہ کے کنارے پر کہیں جعفر کا گھر بھی تھا۔ اس گھر میں معصوم صورت والی مہرو اور ابراہیم بھی رہتے تھے۔ پچھلے دو روز میں کئی بار میرے دل میں آیا تھا کہ رخصت ہونے سے پہلے ایک بار ان سے مل لوں لیکن سفر کی تیاری کے لیے وقت

بہت کم تھا اور جو کچھ ہو رہا تھا اتنی تیزی سے ہو رہا تھا کہ اس کی مہلت ہی نہیں ملی۔ میں نے آسمان کی بلندیوں سے ہی ان دونوں کو خدا حافظ کہا اور ان کو پُرمسرت زندگی کی دعائیں دیں۔

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ مہرو کی پکائی ہوئی بریانی ایک بار پھر میرے ہونٹوں تک نہیں پہنچ سکی تھی (آج میں نے ان کے گھر کھانا کھانے کا وعدہ کیا ہوا تھا) سچ کہتے ہیں کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔

ہمارا جہاز کچھ دیر کے لیے کویت میں رکا اور پھر وہاں سے دوبارہ پرواز کر کے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ جوں جوں منزل قریب آتی گئی میری حالت خراب ہوتی گئی۔ دل جیسے سینے کے بجائے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا، مجھے کیسی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ مجھ سے کیا، کیا سوال پوچھے جائیں گے؟ میں عارفہ کا سامنا کیسے کروں گا؟ اپنے والدین سے کیسے معافی مانگوں گا...... بھائی جان جہاز کے اندر مجھے مسلسل تسلی دے رہے تھے۔ جب لاہور کے درودیوار نظر آئے تو میں اپنے دکھ کو ضبط نہ کر سکا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بھائی جان نے مجھے گلے سے لگا کر حوصلہ دیا۔ وہ بولے۔ ''تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ تم سمجھو کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہو جائے گا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ بے شک ایک غلطی ہوئی ہے لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ کبھی کوئی اس غلطی کا ذکر تک نہ کرے گا۔ تم اپنی مرضی سے کچھ بتانا چاہو تو ٹھیک ہے، ورنہ ہم تم سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ کبھی نہیں پوچھیں گے۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ تم پھر سے ہمارے پاس ہو۔''

بھائی جان کی باتوں نے میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو کافی حد تک کم کر دیا...... ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی جب ہم لاہور ائرپورٹ پر اترے۔ گھر میں کسی کو خبر نہیں تھی کہ ہم لاہور میں لینڈ کر چکے ہیں۔ بھائی جان نے ائرپورٹ سے فون پر اپنی آمد کی خوش خبری سنائی۔ ائرپورٹ سے چوبرجی پارک تک میں نے ٹیکسی میں جو سفر کیا وہ ایک مشکل ترین سفر تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور لگتا تھا کہ میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ٹیکسی گھر کے سامنے پہنچی تو وہاں اہلِ خانہ کے علاوہ خاندان کے کئی افراد بھی جمع تھے۔ میں ان مناظر کو شاید لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا اور نہ اس کیفیت کا نقشہ کھینچ سکتا ہوں جو وہاں موجود تھی۔ میں جیسے صدیوں کا سفر طے کر کے اپنے پیاروں تک پہنچا تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ رہے تھے، مجھے چوم رہے تھے، دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور میں بھی رو رہا تھا۔ پورا گھر آوازوں سے گونج رہا تھا۔ میں اپنی ماں کے قدموں میں گر گیا۔ ''مجھے معاف کر دیں...... میں نے آپ کو بہت دکھ دیے...... آپ کی خوشیوں کو غارت کیا...... میں آپ کا مجرم ہوں۔''

ہر طرف سے جیسے ایک ''خاموش آواز'' ابھر رہی تھی اور چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ دُولہا واپس آ گیا...... دُولہا واپس آ گیا۔

لوگوں کے ہجوم میں، میں نے اپنی دلہن کو بھی دیکھا۔ وہ اللہ کی بندی خاموشی سے میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے...... یہ آنسو کہہ رہے تھے...... میں کوئی شکوہ نہیں کروں گی...... نہ ہی کچھ پوچھوں گی، تم بھی کچھ نہ بتانا۔ بس میرے لیے یہی کافی ہے کہ تم آ گئے ہو۔

☆☆☆

قارئین! ان واقعات کو اب قریباً چالیس برس گزر چکے ہیں۔ میری عمر 67 سال کے لگ بھگ ہے۔ میرے ماشاءاللہ تین بچے ہیں اور ان کے بھی بچے ہیں۔ میں ایک خوش و خرم زندگی گزار کر ریٹائرمنٹ کے دور میں پہنچ چکا ہوں۔ کافی عرصے سے میں بہت تبدیل ہو چکا ہوں۔ نماز روزے کی پابندی کرتا ہوں۔ چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھ لی ہے۔ اپنی طاقت اور حیثیت کے مطابق صدقہ خیرات بھی کرتا ہوں، خاص طور سے ضرورت مند، مستحق لوگوں کو کھانا کھلانے سے مجھے بہت راحت ملتی ہے۔ اپنے بڑوں کی ہدایت کے مطابق اپنی طویل گمشدگی کے سلسلے میں میں نے اپنی زبان تقریباً بند ہی رکھی ہے۔ اس زبان بندی کی وجہ سے مختلف افواہیں بھی پھیلتی رہی ہیں۔ کسی نے کہا ہارون کو ہوائی چیزیں اٹھا کر لے گئی تھیں، کسی نے کہا یہ جھوٹ بولتا ہے۔ بغداد وغیرہ نہیں گیا تھا، یہیں کہیں چھپا ہوا تھا۔ کسی نے خیال ظاہر کیا، یہ شادی سے بھاگا ہے اور کچھ ایسے بھی تھے، جنہوں نے کہا کہ اس کے بھائی جان اسے کراچی سے لے کر آئے تھے اور شاید کسی نے اسے اغوا کیا تھا۔ بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں۔ جب کوئی بہت پوچھتا تو میں یہی بتاتا کہ مجھے کسی نے کوئی نشہ آور چیز کھلا دی اور اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا، میں نے خود کو کراچی میں پایا...... اور پھر اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ واپس آنے کے بجائے آگے جانا بہتر سمجھا۔

میں جانتا تھا کہ اگر میں حقیقت بتاؤں گا اور ان واقعات کا ذکر کروں گا جو پیش آئے تو کوئی یقین نہیں

کرے گا۔ اسے میری دیوانگی کہا جائے گا۔ بہر حال اپنے طور پر میں گئے برسوں میں بہت سوچ بچار کرتا رہا ہوں۔ اللہ والوں سے ملا ہوں، سائیکالوجسٹ اور پیرا سائیکالوجسٹ سے بھی رجوع کیا ہے۔ روحانیت کے دعوے دار لوگوں سے بھی تبادلہ خیال کیا ہے لیکن آج چالیس سال گزرنے کے باوجود کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ وہ سب کیا تھا؟ کیا واقعی اس کائنات میں کچھ ہیولے ہمارے اردگرد موجود رہتے ہیں؟ کیا ایسے ہی ایک ہیولے نے مجھے شادی کی رات لاہور سے اٹھایا اور میرا پیچھا کرتے کرتے مجھے بغداد تک پہنچایا؟ جہاں مجھے ایک کہانی کو مکمل کرنا تھا۔ ایک مجبور شخص کے بے پناہ دکھ کا مداوا کر کے اسے اس کی بچھڑی محبت سے ملانا تھا۔ شاید جس طرح خود کھانا کھانے سے پہلے ایک فاقہ زدہ کو کھانا کھلایا جاتا ہے، اسی طرح قدرت نے میرے ذمے بھی یہ لگا دیا تھا کہ میں خود ازدواجی خوشیاں حاصل کرنے سے پہلے کسی دوسرے کو ان خوشیوں سے ہمکنار کروں...... اور اگر نہ کروں تو خود بھی انجانی سرزمینوں پر بھٹکتا رہوں...... اوپر والے کے رمز اوپر والا ہی جانتا ہے۔

میں چالیس سال پہلے کے ان واقعات کو اپنے دل ودماغ سے کھرچ دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں دوبارہ کبھی ان کرداروں سے نہیں ملا جن سے اس ہولناک سفر میں میرا واسطہ پڑا تھا۔ فیروز خاں، جعفر، من موہنی صورت والی مہرو جیسی محبت کی آگ میں کندن بننے والا ابراہیم، عطا صاحب، چچا سیاف...... میں نے کبھی کسی سے ملنے یا اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے بغداد سے پرواز کرتے ہی ان سب کرداروں کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ دیا تھا۔ وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔ ان کرداروں میں سے بھی کسی نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ کرتے بھی کیسے؟ صرف رحیم یار خان والے امین کے سوا کسی کے پاس میرا اتا پتا نہیں تھا اور مجھے یقین تھا کہ امین اس ہولناک رات میں، لانچ پر ہونے والی خونی جھڑپ میں زندہ نہیں بچ پایا ہوگا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس نے کبھی نہ کبھی رابطہ ضرور کرنا تھا۔

آخر میں پھر وہی سوال کہ اس سفید پوش ہیولے کی حقیقت کیا تھی؟ کیا وہ صرف میرے ذہن کی پیداوار تھا یا سچ مچ اس کا کوئی وجود تھا۔ اگر میں ایک پڑھا لکھا، روشن خیال شخص نہ ہوتا تو میرے لیے اس کے وجود پر یقین کرنا بالکل مشکل نہیں تھا لیکن میں اپنی سوچ کے انداز اور اپنے سائنٹیفک مزاج کا کیا کروں جو مجھے ہمیشہ ایک کرب میں مبتلا رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں کینیڈا سے آئے ایک معروف مذہبی اسکالر سے ملا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ”قدرت نے ہمارے ذہن میں اتنی طاقت رکھی ہے کہ وہ کسی بھی سوچ کو ایک جیتی جاگتی ٹھوس شکل دے کر ہمارے سامنے لا سکتا ہے اور کسی بھی ٹھوس شکل کو بیچ بیچ ناپید کر سکتا ہے۔“ تو کیا وہ ہیولا بھی حقیقت اور خیال کے درمیان کی ایک شکل تھا اور ان سچائیوں میں سے ایک تھا جن کے بارے میں ہمیں آنے والے دور کی سائنس بتائے گی؟

میں آخر میں ایک بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ بات پڑھنے والوں کو ضرور چونکائے گی اور کچھ سوچنے کی دعوت دے گی۔ میری کہانی کا آغاز شادی کی رات ہوا تھا۔ میں نے شامیانے کے اندر بیٹھی ہوئی دو محلے دار عورتوں کی زہریلی گفتگو سنی تھی۔ یہ گفتگو میرے بارے میں تھی۔ اس گفتگو نے میرے اندر کی ساری روشنیاں ایک دم بجھا دیں اور مجھے تاریکیوں کے سفر پر روانہ کر دیا۔ بغداد سے واپس آنے کے دو تین دن بعد میں نے باتوں باتوں میں والدہ سے پوچھا۔ اور مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ وہ دو عورتیں تو شادی میں آئی ہی نہیں تھیں (ان میں سے ایک کا نام استانی فوزیہ اور دوسری کا آنٹی ممتاز تھا) وہ دونوں پڑوسنیں تھیں اور عین میری شادی کے دن ان دونوں کو ایک فوتگی میں گجرات جانا پڑا تھا۔

مجھے یقین نہیں آیا...... مجھے لگا شاید والدہ کو کوئی مغالطہ ہو رہا ہے لیکن جب دیگر اہلِ خانہ نے بھی یہی بات بتائی تو میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں نے ان دونوں آنٹیوں کو نہ صرف سنا تھا بلکہ دو تین بار انہیں اپنی برات میں دیکھا بھی تھا۔ مجھے ان کے کپڑوں کے رنگ تک یاد تھے...... بہر حال میں نے اس بارے میں بھی کسی سے بحث نہیں کی۔

اور اس سے بھی زیادہ پراسرار بات یہ ہے کہ ان دونوں آنٹیوں کو میرے علاوہ میری دلہن عارفہ نے بھی دیکھا اور باقاعدہ ان سے بات کی تھی۔

تاہم جب بعد میں ان عورتوں سے بات ہوئی اور انہوں نے خود کہا کہ وہ اس دن لاہور میں نہیں گجرات میں تھیں تو پھر میری بیوی نے بھی یہی سمجھا کہ اسے دھوکا ہوا تھا میرے لیے اس سلسلے میں خاموش رہنا ہی بہتر تھا اور میں خاموش ہی رہا۔

اب ان باتوں کو کیا کہا جائے، اتفاق...... وہم...... ماورا یا پھر انسانی ذہن کی بے بسی۔ فیصلہ آپ کریں۔